

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ
سینس ڈائجسٹ
ماہنامہ

دسمبر 2017

میراج راول

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com



مدیر اعلیٰ

عذرار سوال

مدیرہ
نائب مدیر
بمئی احمد
اظہر حسین

مینجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن مینجر

سید منیر حسین

0333-3285269

07

انشائیہ

جون ایلینا

خوش امید کی کاثر وہ سنانے والے
ایک بھلے انسان کا نظریہ

08

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت دستار بنی کی تلو
شیریں باتیں گلے شکوے اور چٹوس مشورے

16

نوشت اتحاد

ڈاکٹر مساجد امجد

ماضی کا آئینہ بہ ہفتیوار اور سب اختیار
انڈیا کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

70

رنگ آسمان

لے آر راجپوت

مشرق و مغرب کے عجیب ترین اور تاریخی حقائق خبریں
کے عبرت انگیز واقعات میں اہل انڈیا کی دلچسپی

63

مات

ناہید سلطانہ اختر

رشتوں کی خوشیوں سے معمور
ایک ناکام عاشق کی زندہ دلی

53

ہوشیاری

محمد یاسر اعوان

مغربی معاشیہ میں پینے
والے جبرائیل کی پڑھ پڑی کا ٹکٹ اتلاز

116

ناک تکی

ملک حیدر جیوان

مشرق و مغرب کے عجیب ترین اور تاریخی حقائق خبریں
کے عبرت انگیز واقعات میں اہل انڈیا کی دلچسپی

107

تیسری کوشش

تنویر ریاض

فائل سے متعلق بننے والے ایک
محبس کی کارروائی کا ماحیرا

103

جیون ان

وسید بن اشرف

جیون وان کرنے والے ایک
مخلص دوست کا قصہ

جلد 47 • شماره 12 دسمبر 2017 • ذر سالانہ 800 روپہ • دہلی، انڈیا • 60 روپہ

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بک نمبر 215 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) mail: jdggroup@hotmail.com



تہائی کا شکار ہونے والے آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
چنڈن کے مہمان کا انداز بیان آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



تہائی کا شکار ہونے والے آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
چنڈن کے مہمان کا انداز بیان آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



ایک مضطرب انسان کے
عجیب سفر کی منظر دور روداد



تیزی سے گزرتے حالات کی
ذوری بھٹائے ایک حسین کی فہانت



تفیشی وقت اعلیٰ میں ہاتھ ساتھ
ہنسنے والے خط کار کی کی حبالا کی



ایک عزم بازی گر کی بازی گری..... سنسی
خیر واقعات پر تمل ایک لبر باطویل داستان



سکلتی راکھ... کبھی بھرتے شعلوں
کے لوسیان تڑپتے دلوں کا جھولہ



اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی
سوانح حیات کے سبق آموز پہلو



خبر پڑھیں خوار شہان
والے ایک ادھ انسان کا قصہ



دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیف، چٹکے
اقباسات، ہنر لائیں اور قلمی بکریاں آپ کے لیے



قدم قدم پر شکست کھانے
والی دوشیزہ کی حیران کن فتح



حیرت کو چھپانے کے لیے انوکھا
انداز اختیار کرنے والی حسین کی مکاری

مژدہ

ہم جو کھٹکھٹاتی ہوئی مٹی سے بنائے گئے، ہم جو خاک کے خمیر سے اٹھائے گئے اور ہم جو خاک میں ہی ملائے جائیں گے۔ ہم فتنہ و فساد کے زمانے میں زندہ ہیں اور بے گناہوں نے ہمارا گھر و کچھ لیا ہے۔ سو ہم پر لازم آیا کہ ہم اپنے اپنے جھروں سے باہر آئیں اور مرنے والوں اور مارنے والوں کو اس المناک حقیقت سے آگاہ کریں کہ زندگی مارنے والوں اور مارے جانے والوں، دونوں ہی سے سو تیلی ماڈن کا سا سلوک کرتی ہے۔ کسی کو ریشم و کنو اب کے بستری پر سلاتی ہے اور کسی کو بچھانے کے لیے گدڑی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن موت سب ہی کو ایک نظر سے دیکھتی ہے، سب کو اپنی چھائی میں سمیٹ لیتی ہے اور سب کو ایک ہی طور خاک میں ملاتی ہے۔

وہ جو زمین پر بہت اینڈ کر چلتے ہیں، ان کے لیے کسی بھی میدان سے، کسی بھی کمیت یا کھلیاں سے ایک مٹی اٹھائی جائے اور پھر دل و دماغ کی آنکھوں کے چراغوں کی روشنی میں اسے دیکھا جائے تو اس میں اب سے لاکھوں برس، ہزاروں اور کیلاؤں برس پہلے گزر جانے والے ہمارے اجداد کے بدن کے ریزے نظر آئیں گے۔ کسی عالم کے سر پر غرور کا ایک ذرہ، کسی مظلوم کے چہرے ہوئے جگر کا ایک ریشم اور کسی مقتول کی کتڑی جانے والی انگلیاں اس مٹی بھرمی میں مکمل مٹی ہوں گی۔ اس کے کسی ذرے سے کسی نفس امارت اور برکزیہ انسان کی خوشبو آ رہی ہوگی اور کسی ذرے سے خبث باطن کی مڑا اندھ رہی ہوگی۔ لیکن جون ایلیا، تم جو ایک مٹی مٹی لیے بیٹھے ہو اور اس میں گڑھتگاں کی جھلکیاں دیکھ رہے ہو تو تم ان جھلکیوں کو دیکھ کر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا سیکنا اور کیا سکھانا چاہتے ہو؟

میرے بھائی، میرے دوست، میں گویا مٹی سے محروم ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا اور میں نے تو ابھی زندگی کے کتب سے کچھ بھی نہیں سیکھا تو میں تمہیں یا کسی کو بھلا کا سکھاؤں گا۔ میں یہ مٹی بھرمی اپنے حکمرانوں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں اپنے بارے میں اور اپنے ایسے کروڑوں کے بارے میں بتاؤں، ان بستیوں کی گلیاں دکھاؤں جن کے نصیب ہمیشہ تیرہ و تار رہے، جن کے مقدر میں کبھی سکھ کی گھڑیاں نہیں لکھی گئیں۔

میرے بھائی، انہیں بتایا جائے کہ یہاں حکمرانوں نے محض تجربے کیے، زیادہ مطلق العنانی کے، زیادہ فرعونیت کے تجربے، ہمارے یہاں عوام کے نام پر آنے والوں نے سب سے پہلے عوام کا ہی ٹیٹو اچھایا۔ اس بستی کے معصوم و مظلوم رہنے والوں کے سینے میں امید کے دریا لہراتے ہیں۔ وہ ہر آنے والے کا دامن بہت دردمندی سے، بہت خوش امید سے تھامتے ہیں اور ہر مرتبہ دھتکارے جاتے ہیں۔

ایک بار پھر لوگوں کو مژدہ سنایا جا رہا ہے، ایک ایسے بندوبست کی نوید دی جا رہی ہے جہاں پیسے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگوں کو عزت کی روٹی مل سکے گی، جہاں مظلوموں کو انصاف فراہم ہو سکے گا، جہاں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا کوئی گڑہ نہ ہوگا۔

یہ تمام اچھے جملے، یہ سارے خوب صورت خواب، اس سے پہلے بھی یہاں کے لوگوں کو دکھائے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی اور یہاں رہنے والوں کی عزت نفس کا احترام کیا جائے گا۔

یہاں کے لوگوں نے پہلے بھی ان وعدوں پر اعتبار کیا تھا، یہاں کے لوگ ایک بار پھر نئے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس مژدے کو اس امید کے ساتھ سنا ہے کہ یہ وعدے، وعدہ فرمائیں ہوں گے۔ وہ اس آس میں ہیں کہ انہیں ایک بار پھر زنا نہیں کیا جائے گا۔

مژدہ سنانے والوں نے بستیوں کو تاشے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اس دور میں کارفرمادی کا دعویٰ یقیناً ایک بڑا دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ جنہوں نے کیا وہ اس پر پورے اتریں اور کروڑوں کے سامنے سرخرو ہوں کہ یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔



سینس ڈائجسٹ

آموزگاہی ہے۔ محمد الیاس کی عمدہ کاوش بھی۔ جن شادی شدہ مستورات کے شوہر بیرون ملک چل جاتے ہیں لیے عرصے کے لیے، ان کے ساتھ منزہ جیسا ہوتا نظر آتا ہے اور ان پڑھ لوگ بیروں کے غلط چکر میں پڑ جاتے ہیں جو سادہ لوح عوام کو لوٹنے میں پہلے ہی بدنام ہوتے ہیں جتنی بھریاں بیماری کو جنتا سے منسوب کرتے ہیں اور عام آدمی ان کے چکر میں آ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ علم طب کی ایک بیماری ہسٹریا ہوتی ہے۔ وقت بات سنو پڑے۔ اسد علی اور اس کی ماں سہلی کا ملاپ ہونے کے بعد کہانی ایک نئی ڈگر میں داخل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسد علی کو سننے دشمنوں سے برسر پیکار ہونا پڑے گا۔ کہانی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ڈاکٹر شہ شاد کی تحریریں جاندار ہوتی ہیں اور وہ طبی دنیا کے مسائل اور انجمنوں پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحب کی کہانیوں پر مضبوط گرفت ہوتی ہے۔ زندگی اداس ہے اس کا ثبوت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام..... رضوانہ ساجد کی تحریر پورے خشوع و خضوع سے پڑھتا ہوں۔ انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے آزماتیں بھیجیں اور پھر انہیں سرخرو بھی فرمایا۔ ان کی اگلی قسطوں کا انتظار ہے گا۔ شاطر میں استاد اور شاگرد دونوں ایک ضعیف عورت سے مات کھا گئے شاکر لطیف کی عمدہ تحریر ہے۔ استاد و شاگرد ایک دوسرے سے بھی تخلص نہ تھے اور پھر دھوکا کھاتے اور بیٹے گڑھے میں جا گرے۔ طاہر جاوید غفل کی تحریریں اپنی مثال آپ ہیں۔ تحریر میں منظر کشی غفل صاحب کا طرہ امتیاز ہے۔ واقعی کھلاڑی مند کیچھے رہ جاتے ہیں اور ناٹائی جیت جاتے ہیں۔ غفل صاحب نے جو کھسا ہے کہ جو جنتا بڑا بے ایمان وہ اتنا بڑا فنکار پاکستان میں آج کل ایسی فضائی ہوتی ہے اور ہم پاکستانی سیاست اور عدالتوں کی جنگ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔“

✽ پچھلے شمارے میں ایک کہانی کے چند فقروں کی طرف ایمانے زار شاہ، طلعت مسعود اور مرزانو روز بیگ نے توجہ مبذول کرائی ہے جو سہو آغلی ہوئے۔ اس کے لیے مصنف، مدیر اور ادارہ پیدل سے معذت خواہ ہیں۔

✽ زرین خان آفریدی کا تمبرہ حیدر آباد سندھ سے۔ ”نومبر 2017ء کے سپنس نے اکتوبر کے سپنس کا شکوہ دور کر دیا۔ ناسل سے لے کر آخری اسٹوری دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بقول طاہرہ آگنی میں ممکن نہیں لگا رہی حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ کہانیوں کی تعداد اور ڈائجسٹ کے صفحات بھی زیادہ تھے۔ ناسل خوب صورت رنگوں سے مزین تھا۔ شکر ہے اسلاف اعلیٰ مقام۔ انشاء میں جون الیہ صاحب دہرے معیار والے لوگوں کا تحویل بیان کر رہے تھے۔ ایسے لوگ مذاق ہی تو ہوتے ہیں۔ ادارہ میں مدیر صاحب نے پیار معاشرے کا ذکر کیا ہے۔ مدیرہ بی بی پاکستانی ماشاء اللہ اسنے حوصلہ مند پُر جرأت و ہمت والے ہیں کہ اس پیار معاشرے کو تندرست کر کے بیٹے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں استقلال نصیب کرتا رہے آمین اور اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اپنی پناہ میں رکھے۔ آگے اپنی پر بہار محفل پر نظر پڑی تو جنتا دینی انصاری صاحب مدارات پر قابض تھے، مہارک باد۔ تمبرہ بھی کمال تھا۔ محمد صفدر، اشفاق شاہین، اور لیس احمد اور رمضان پاشا صاحبان کے تمبرے دھمال کمال بے مثال تھے۔ ڈاکٹر نازک، ایمانے شاہ اور اوشا راگھی صاحبہ زبردست تمبروں کے ساتھ دقت محفل تھیں۔ محمد قدرت اللہ نازی صاحب بھی سو بر تمبرے کے ساتھ موجود تھے۔ باقی تمبرہ لگا رہی اپنی رائے دینے میں کامیاب رہے۔ دربان، علی اختر صاحب کو خراج تحسین کہ تاریخی واقعات کو بہت خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں کہ انسان اس دور میں چلا جاتا ہے۔ پرتھوی راج کے حالات زندگی واقعات پھر جنتا کی بے مثال محبت بہت ہی زبردست۔ اپنے دربان پرتھوی راج کے ساتھ سچی ہو جانا عام بات نہیں۔ رنگب آسمان، اسے آرا جنتا مشر شوی اور ریتا نیم کے ساتھ پاس ہو گئی ہے۔ کہانی کارویم اور الفاظ کا چناؤ بھی بہتر ہے۔ اب بتائیں یہ داستان کتنے عرصے ہمارے ساتھ رہے گی۔ شرعاً اس کی غلط بھی اچھی رہی۔ کبھی بھی آکھوں دیکھی بات بھی غلط ثابت ہوتی ہے جیسے ایلٹ سے ہوئی۔ عشق کا تمام، ظفر اقبال ظفر صاحب کی بہت عمدہ رہی۔ دل کشا اور نواب صاحب تھیں۔ تندی رہی ہے۔ شاطر شاکر لطیف صاحب کی بہت شاندار رہی۔ نہ استاد نہ ہی شاگرد کچھ پاسکے۔ مارتھا واقعی شاطر تھی۔ اپنی چیز کی حفاظت بھی اچھی بات ہے۔ ٹارگٹ اور مرزا صاحب و یلڈن۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چلے میں پھر پور کو شمرزا احمد بیگ صاحب کی تھی۔ شاگرد اور انیلانے عارف سے چھٹکارا پانے کا کاپر یقہ دھونڈا لیکن خود ہی گڑھے میں گرے۔ شکست کی فتح، طاہر جاوید غفل صاحب، نام بھی اچھا کام بھی اچھا۔ اس بار تحصیل پھالیہ کے گاؤں موران والی کی مین النور کے کارنامے لے کر حاضر ہوئے۔ گومان یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ گاؤں گوٹھ کی لڑکیاں شہری لڑکیوں سے زیادہ اونچی اڑان بھرتی ہیں۔ اکثر نقصان بھی اٹھاتی ہیں۔ نور کا جوڑی وار ذوالقرنین تھا۔ اسٹوری بہت جاندار ہے آگے کیا کیا ہوتا ہے اس کا انتظار ہے۔ آج ایک اور بات کی طرف توجہ دلاؤ جاہوں کی کہ ڈائجسٹ کی تمام اسٹوریز اور داستانوں میں ٹاپک یا نام کے ساتھ جو تصویریں بنی ہوئی ہیں، میٹ اینڈ بیٹ ہوئی ہیں۔ رنگب آسمان کی ریتا اور وقت کی شادو کی انصاویہ بے حد خوب صورت ہیں۔ اس طرح ہر اسٹوری کے متعلق مصوری بہت اچھی ہوتی ہے۔ سوانے مرزا احمد بیگ صاحب کے۔ (آپ کی نشاندہی کا شکریہ)۔ اس بار سلسلہ دار داستان وقت کو نام نہیں دے پائی کہ پٹار سے ہمارے گھر کیسٹ آئے ہوئے ہیں تو ان میں مصروف ہیں۔ باقی کتریں کافی اچھی ہیں۔ محفل شعر و سخن تو ہمیشہ کی طرح اوسم رہی۔ (آئی مصروفیات میں بھی



❧ رابعہ آفرین، غمو کر نیاز بیگ لاہور سے شریک محفل ہیں۔ ”بہت دیر سے دل ہاتھ باندھے ہمارے سامنے کھڑا تھا کہ خدا ارادے جذبات شہر کر دو۔ سامنے کہتے ہیں کہ دل کی بات دل میں رکنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ آج ہم بھی قتلِ لب محمول دیتے ہیں۔ (مہربانی جناب کی..... محفل میں خوش آمدید)۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمیشہ میری نظروں کے سامنے اک نئے سبق کے ساتھ آیا اور ہمیشہ مجھے دعوت دیتا آؤ مجھے پڑھ کر سمجھاؤ قیمتی جو ہر تلاش کرلو۔ ذرا کراٹھیں! میں آپ کو کیوٹ کیوٹ سرورق تخلیق کرنے پر مبارکباد بالکل بھی نہیں دوں گی کیونکہ مبارک باد تو غیر ملکی کو دی جاتی ہے اور آپ تو ہمارے اپنے ہیں؟ کیوں عذرا آپ کی بیج کہاں؟ (جی بالکل بیج کہاں)۔ لوگوں کی زندگی میں سسپنس نے بہت اچھا کر دار ادا کیا، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کو میں نے زندگی کی صحیح حقیقتوں سے نظریں ملاتے دیکھا ہے ان ڈائجسٹ کی وجہ سے۔ اس کی زندہ مثال میری دوست کے دادا ابوبیہ، جن کو پیار اور عزت سے میں خود دادا ابوبیہ کہتی ہوں۔ وہ بہت باہمت ہیں، ان کا جگر بھی پھڑپھڑے اور بہت سی اندرونی چیزیں انھیں کھڑے ہو کر ختم ہونے کے قریب ہو چکی ہیں مگر پھر بھی وہ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں اور کام پر بھی جاتے ہیں وہ صرف اور صرف آپ کے میگزین پڑھتے ہیں اس کے علاوہ کوئی بھی رسالہ نہیں پڑھتے۔ سسپنس اور پاکیزہ نے بہت سے لوگوں کی صلاحیتوں کو نہ صرف ابھارا بلکہ انہیں ایک نام، ایک مقام بھی دیا۔ محی الدین نواب کی جتنی بھی تحاریر پڑھیں، وہ لا جواب تھیں کیا ہم دوبارہ ان کے علم و ذوق سے مستفید ہو سکیں گے؟ (جی جناب بالکل محفوظ ہو سکیں گے..... ”سسپنس کلاسک“ کے عنوان تلے ہم گامے گامے خوب صورت کہانیاں دوبارہ شائع کرتے رہیں گے۔ آپ کے خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں لیکن کیا یہ اچھا ہوتا کہ آپ سسپنس کی کہانیوں پر بھی کچھ تبصرہ فرمائیں۔ آپ کو اگر لکھنے کا شوق ہے تو فوراً میں تحریر بھیجے اگر کہانی میں دم ہوا اور انداز بھی دلچسپ ہو اور سالے میں ضرور جگہ ملے گی ورنہ دوسری صورت میں ہم محدثت کریں گے لیکن..... آپ سے تاثر کر نہیں توڑیں گے)۔“

❧ عبدالغفور خان ساغری فنک کی ضلع ایک سے آمد۔ ”کچھ مصروفیات کی وجہ سے خط ارسال نہیں کر سکا لیکن جاسوسی سسپنس کے ساتھ رازِ اہل بحال تھا۔ اب بھی کچھ تاثر نکال کر خط ارسال کر رہا ہوں۔ اس ماہ کی کہانی نکلت کی فتح بہت زیادہ پسند آئی۔ لکھاری بھی تو جاوید مغل صاحب تھے، ویلڈن۔ اب کچھ ذکر خطوط کی محفل کا۔ عبدالجبار رومی کو صدارت کی کرسی پر دیکھا مبارک ہو۔ خطوط میں ٹوک جھونک اچھی رہی۔ اشعار کی محفل اچھی تھی۔ ایم نسیم سکھر، ملائکہ حریم کے اشعار اچھے تھے۔ باقی بھی بہتر تھے۔ باقی کہانیاں زیر ملاحظہ ہیں۔ اس ماہ کا سسپنس میوا پتھل کے نزدیک انجینی سے لیا۔ ٹائٹل میں محبت کے رنگ بھر دیے تھے، بہت ہی عمدہ۔ باقی میں اپنی شادی میں بھی مصروف تھا۔ (ارے واہ بھی مبارک! جی..... منہ تو میٹھا کرادیں ہمارا)۔“

❧ محمد خواجہ کورنگی، کراچی سے شامل محفل ہیں۔ ”نومبر کا شمارہ آپ دنا۔ کے ساتھ ہاتھ میں ہے۔ سرورق لڑکی کی آنکھیں خوب صورت لیکن یاس اور امید کا پرلا اظہار، ارد گرد دو دلوں کا ٹکس، یقیناً یہ محبت کی ہی فنوں کا رسی کا اداس پن۔ جون ایلیا کا ایک صفحہ بہت سے رموز و اسرار لیے ہوئے ہے ذرا غور سے پڑھتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں دل میں اضطراب ہے، ہر شخص ملک کے اندرونی خلفشار میں جتنا ہے۔ کوئی اپنا جرم قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ملک بد سے بدترین حالات، مہنگائی، آمدنی میں کمی کا ہر جربہ استعمال۔ قومی بچت جو لوگوں کی دال روٹی چٹا رہا ہے اس پر حملہ، بے پناہ قرض کہاں جا رہا ہے۔ ٹھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کچھ کر نہیں سکتے۔ لیڈر اتنا کچڑا اچھال رہے ہیں کہ صورت تک صاف نظر نہیں آ رہی ہے۔ بیرونی دشمن دیکھ رہے ہیں کہ ہم اپنی موت کا خود ہی سامان کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے ملک خدا داد کے خود ہی دشمن بن بیٹھے ہیں۔ کورنگی میں ٹوڈیڈنگ کا دورانیہ 12 گھنٹے سے 18 تک پہنچ گیا ہے۔ بجلی کے بلوں میں ہزاروں روپے کا غیر ضروری اضافہ لگا رہے ہیں میرے مل میں خرچ کے علاوہ 32 ہزار روپے علیحدہ سے لگا کر 260 پونٹ کا کل 36 ہزار سے زیادہ کا بیجھا گیا۔ کے الیکٹرک کوئی وجہ بتانے سے قاصر۔ اتنی زبردست ٹوڈیڈنگ کے بعد کیا میٹر خود بخود چلتا رہے گا؟ آخر مجھے وفاقی منتخب کی مدد کتنی بڑی اتنے پانڈیلے کے بعد کے الیکٹرک کے خلاف فیصلہ آیا۔ اتنا ظلم اتنی نا انصافی۔ پچھلے دو ماہ سے دوستوں کی محفل سے دور رہا لیکن کا وقت نہیں اور ڈپریشن کی انتہا رہی۔ دوستوں میں عبدالجبار رومی انصاری کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ باقی خطوط بھی کم نہ تھے۔ دربار، تاریخ کی ولولہ انگیز داستان سے بہت سی معلومات ملیں۔ اعلیٰ ظرف، واقعی یہ کہانی ایک اعلیٰ ظرف نوجوان کی ہے جس کی بچ بیانی نے ہوتا ہوا شہر ختم کر دیا اور آج کل رشتوں کے لیے ایک جھوٹ کا طوفان نظر آتا ہے جو آخر خود خاندانوں کو جنم رسید کر دیتا ہے۔ اس کہانی میں لڑکی کے والد کا فیصلہ مجھے غیر موزوں لگا۔ باقی ان کی سوچ۔ رنگ آساں، بڑی فیس آسایز اور سنسنی خیز سیریل، آگے اور بھی دلچسپی کا قہقہہ ہے۔ محبت رنگ نسل غلامی آزادی نہیں دیتی۔ بس محبت کا انجام اچھا نکلے۔ غلط فہمی، بڑی منفرد کہانی۔ دو علیحدہ ہونے والے لوگ ایک عجیب حادثے سے دو جا ہو کر پھر ایک ہونے پر راضی، کہانی کا تسلسل بہت اچھا لگا۔ ٹارگٹ۔ وکیل صاحب کا ایک اور عظیم کارنامہ۔ ایک بدو یا پتی پر شروع ہونے والا الجھاؤ صرف بیگ صاحب نے ہی اس کو احسن طریقے سے نبھادیا۔ معاشرے کی



نامواری، اداواروں کی خرابی اور جعلی آستانوں کا احوال کل کر سامنے آتا ہے۔ ایسی ہی خرابیاں ہمارے معاشرے میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور ہم مذہب معاشرے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ عشقِ تمام، بکھنؤ کی تہذیب پر اچھا لکھا ہوا قصہ۔ انجام بہت درد مندانه مگر برا ہی دلگداز انجام اور فیصلہ۔ بہت عمدہ تحریر۔ وقت، یہ کہانی بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس قسط میں بہت چونکا دینے والی حقیقتیں مکتبیں کہیں بے جا طوالت بھی نظر آئی۔ اب اگلی قسط کے دلچسپ اور نگین ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ کچھ بیچ رقم میں اضافے کی بھی امید ہے۔ زندگی اداس ہے۔ ایک آسودہ اور مطمئن خاندان کی کہانی لیکن اچانک خاتون پر اداسی کا خطرناک دورہ اور ایسا کہ اس نے زندگی ختم کر ڈالی۔ یہ مہماس کہانی میں مل نہ ہوا کہ اصل وجہ کیا تھی جس کا علاج تک نہ ہو سکا۔ دیدہ لہر، مختصر جرم و سزا کی کہانی۔ ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر کا جذباتی حالات کا مظاہرہ جس نے بڑوں کو پیچھے چھوڑ کر جرم کو سمجھا اور جرم کی نشاندہی کر ڈالی۔ کہتے ہیں اولڈ از کوڈ۔ حضرت یوسف علیہ السلام ان تغیر کی اولاد جو حسن و جمال کا مرتعہ تھے بہت سنا پڑھا لیکن جو تفصیل اس کہانی میں بیان کی گئی، بہت معلوماتی ہے آخر فن۔ شاطر، دیدہ کردار ڈاکو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے بد نیت مگر ایک بوڑھی کی اداکاری نے دونوں کو چاروں خانے چت کر دیا۔ معمولی مگر مزیدار کہانی۔ شکست کی فتح۔ پہلی قسط ہمارے معاشرے کی الٹ پھیر کی داستان ہے۔ ایک بے عزت لڑکی کی داستان حیات جو خاندانی رسم و ریت میں رہ کر بھی ایک جستجو کے لیے تکلیف برداشت کرتی ہے۔ اس قسط میں وہ ہارتی نظر آ رہی ہے شاید اگلی قسط میں وہ شکست پر قابو پالے اور نقد پر اس کے لیے بہتر فیصلہ لکھ دے۔ کتر میں ہمیشہ کی طرح لا جواب۔ کچھ کہانیتیں تو ڈائری میں نوٹ کر لینے والی ہیں۔“

ایم سخاوت کرنا ہی کا آڈا کشمیر سے گزشتہ شمارے پر ترمیم۔ ”اکتوبر کا خوب صورت شمارہ سنسنس پُرسوز وافر بہ کہانیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ اگر میں یہ کہوں کہ جہان ہوس و نفس میں یہ شمارہ لوگوں کے چہروں پر سکرابٹ لانے میں بڑا کردار ادا کر رہا ہے تو یہ مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ ابتدا میں عظیم شاعر جون ایلیا کا انشائیہ شامل تحریر کر کے اس شمارے کو مزید موثر بنا دیا جو کہ اس عالم دولت و ثروت کا آئینہ دار ثبوت ہے۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک نئی فکر و آہنگ کی ترجمان تھیں۔ بالخصوص باغی میں محترم محمد طاہر عمیر نے زندگی کے تین کرداروں کی بھرپور وضاحت کی ہے جس سے ایک تعمیری سوچ کی راہ نکلتی ہے۔ کامران کا قلم کے خلاف آواز بلند کرنا وہ بھی اپنے والد کے خلاف اس طرف ہماری سوچ کو کمبزل کر داتے ہیں کہ انسان کا وجود سچائی کا پیکر ہے۔ علاوہ ازیں آشتی کے کردار نے بھی اس طرف ہماری فکر کو مت جتنی ہے کہ ہوس بھی انسانی فطرت کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ آشتی کا آخر میں اپنی ہوس کو شکست دینا اور وہ بہرے بطور تحفہ مای کو دینا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ محبت سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ باہی کا کردار شروع سے آخر تک ایک ایسے لازوال جذبے کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے جو کہ ہمیشہ امر رہنے والا ہوتا ہے۔ وقت میں حسام بٹ نے ایک عظیم رشتہ ماں کی فضیلت سے بھی ہماری توجہ کو ایک نکتے پر لائے ہیں کہ ماں کی محبت کے بغیر دنیا کی ہر محبت کچھ نہیں۔ ایک تجویز بھی ہے۔ اگر آپ کی توجہ کاغذورین سکھ دے کہ آپ کے سلسلے شعر و سخن میں اگر اشعار کے بجائے مکمل غزلیات کا انتخاب کیا جائے تو کوئی سودمند ہوگا۔ آپ کے شمارے کے لیے میں بھی اپنی غزلیات کو آپ کی طرف بھیج رہا ہوں۔ یقیناً آپ انہیں شامل کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔“

ادریس احمد خان ناظم آباد کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”سنسنس ڈائجسٹ موصول ہوتے ہی اب انتظار نہیں ہوتا۔ بے تابی دل بڑھ جاتی ہے۔ سارے ضروری غیر ضروری کام ہر طرف صرف اور صرف ڈائجسٹ کا ہی مطالعہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا کچھ جتنی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ نومبر کا ڈائجسٹ خوش رنگ سرورق کے ساتھ ڈاکر صاحب کے ہنر کو واضح کیے ہوئے تھا۔ انشائیہ بھی بے مثال تھا پھر ناموں پر نظر پڑی تو سرفہرست عبدالباری انصاری نظر آ رہے تھے۔ مبارک باد۔ دیگر نئے پرانے دوست بھی بھرپور حاضری لگا رہے تھے۔ تیرے کی پند پند کی پردہ ستوں کا شکر ہے۔ اس کے بعد تاریخی کہانی در بان پڑھی تاریخ سے آگاہی حاصل کی پھر منظر امام کی اعلیٰ طرف پڑی۔ منظر امام صاحب کی ہر کہانی دل پر اثر کرتی ہے اور در یک اثرات رہتے ہیں۔ اس کے بعد سلسلے اور کہانی رنگ۔ سماں پڑھی۔ کہانی جدوجہد آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی خوب صورت کہانی ہے۔ امید ہے اپنے اختتام تک دلچسپی پر قرار رہے گی۔ بدلہ بھی اچھے انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ عشقِ تمام پرانی قدروں اور وضع داری کو نبھانے کی روایات پر بڑی اچھی کہانی تھی۔ شعر و سخن کی محفل میں بھی اچھے اور منتخب اشعار نے بہت محفوظ کیا۔ محمد الیاس کی ساپیچی اچھی لگی۔ اس کے بعد حسام بٹ صاحب کی وقت سلسلے دار کہانی بڑی کامیابی سے جاری ہے اور دلچسپی کا عنصر ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی زندگی اداس ہے ہمیشہ کی طرح پیغام دیتی کہانی تھی۔ دیدہ لہر بہتر تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان حیات بھی جاری ہے جس نے دل کو روشنی سے منور کر دیا ہے۔ بہت تفصیل سے حالات لکھے گئے ہیں۔ شاطر بھی دلچسپ کہانی تھی جس میں امرتالے چہروں کو بھی مات دے دی اور استادوں کے استاد کو بھی چاروں خانے چت کر دیا۔ راجہ جی مند دیکھتا رہ گیا۔ آخری صفحات کی کہانی شکست کی فتح طاہر جاوید منٹل صاحب کی کہانی حاصل مطالعہ رہی، بہت خوب صورت کہانی ہے۔ امید ہے آگے بھی دلچسپی جاری رہے گی۔ کتر میں بھی اچھی لکھیں۔ (سنسنس سے پیار بھرا نا تا برقرار رکھنے کا شکر یہ)۔“



✽ انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے شرکت۔ ”سپنس آج بھی کنگ ڈائجسٹ ہے۔ مائل خوش رنگ اور روانوی تاثر پر مشتمل ہے لیکن اس بار ڈاکر صاحب نے نزاکت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سپنس نے اپنے اجراء سے لے کر آج تک بہترین معاشرتی کہانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ ماضی کے آئینے سے مجاہدکارِ دہان کا عکس خوب ہے۔ نہرست میں باجی عذرارسل کے نام کے نیچے آپ کا نام شائع کر کے آپ کے اور پرے کے وقار میں اضافہ کیا گیا۔ (شکر ہے)۔ اعلیٰ ظرف اچھی کاوش ہے۔ اختتام خوب تھا۔ خطوط کی محفل بھر پور اور دلچسپ تھی۔ ریاض بٹ صاحب کا خط خوب ہے۔ صادق معادیہ کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔ رنگو آسان اچھی تحریر ہے۔ شاطر، دیو قامت، گھیراؤ اچھی تحریریں ہیں۔ نارنگ اپنے مخصوص انداز میں خوب تھی۔ عدالتی کارروائی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ نکست کی فتح خوب صورت تحریر ہے۔ سازش اور غلط فہمی متاثر نہ کر سکیں۔ سایہ، عشقِ ناتمام، بدلتا اور زندگی اداس ہے انہی زیرِ مطالعہ ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایمان افروز کاوش ہے۔ محفل شعر و سخن میں بھی قارئین نے دلچسپی اور اشتیاق سے اپنی ذوقِ مندی کا ثبوت دیا۔ وقت تیزی سے اپنے نقوش ثبت کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ (پسندیدگی کا شکر ہے۔ آپ کی تحریر راجھی زیرِ غور ہے)۔“

✽ ریاض بٹ حسن ابدال سے شامل محفل ہیں۔ ”سرور کی حینہ کی مسکراہٹ مالے کی خشک چھانک جھینگی۔ (یہ کیا بات ہوئی جناب)۔ خیر آگے بڑھے۔ جون ایلپا کے انشا سے محفل پر نظر پڑی ہمیشہ کی طرح سیدھا دل میں اتر گیا۔ جیسے لفظ بہت کچھ سمجھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد پینچے اپنے خطوں کی محفل میں۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی اور طمانیت کا احساس ہوا۔ کرسی صدارت پر عبدالجبار رومی انصاری بیٹھے ہیں۔ مبارک ہو آپ کا تبصرہ میر حاصل اور خوب صورت لفظوں کا مرقع ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے خوب کہا ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکر ہے۔ محمد معاذ معادیہ کا تبصرہ بھی ان کے کہنے میں قلم کا منہ پھوٹا ثبوت ہے۔ رمضان پاشا کافی پرانے تبصرہ نگار ہیں۔ ان کے تبصرے بھی محفل کی جان ہوتے ہیں۔ سبکی بات زرین آفریدی بہن کے لیے بھی ہے۔ ادنیٰ رائی میرے مشورے پر عمل کرنے کا شکر ہے۔ بانی لوگوں کے تبصرے بھی قابلِ غور اور قابلِ تحریف ہیں۔ علی اختر کی تاریخ کے اوراق سے نکلید کردہ کہانی دربان ایک خوب صورت کہانی ہے۔ محبت، محبت ہوتی ہے جو اپنا آپ منوائی ہے۔ شکیانے محبت کی۔ اس کو بنا کر دکھاو یا دور آخریں ان کی راہ بھی ایک ہو گئی اور ان کی کہانی تاریخ کے اوراق میں امر ہو گئی۔ منظر امام کی چھوٹی سی کہانی اعلیٰ ظرف بہت کچھ کہتی۔ محبت کی جس مہارت میں اختلا کا سینٹھ ہودہ حالات کے ایک ہی جھٹکے سے کسی وقت بھی دھڑا سے زمین یوں ہو سکتی ہے۔ تنویر ریاض کی سازش اس بار ڈاکر سے لائق تھی جیسا کہ کسی سائنے کا قول ہے کہ آپ اپنے بچوں کی خاطر دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح والدین کے درمیان غلط فہمی کو دور کر کے بچہ اپنے والدین کو ملا بھی سکتا ہے۔ شرماس کی کہانی غلط فہمی میں بنی ہوا۔ پرے میں حقیقت کے رنگ اچھے لگتے ہیں۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی نارنگ بھی ہمارے معاشرے کی عکاس کہانی ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے روایتی داؤ پیچ سے جھلی اور ڈباہی کو جادو خانے چت کر دیا۔ جو بندہ بھی جرم کرتا ہے وہ بے شک نیک نیتی سے یہ کام کرے لیکن جس بندے کو قربانی کا ٹکڑا بنایا جاتا ہے اس کا تو کوئی قصور نہیں ہوتا پھر قانون جب حرکت میں آتا ہے تو مرزا امجد بیگ صاحب جیسے وکیل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے ہیں۔ شاکر لطیف کی کہانی شاطر بھی ایک چونکا دینے والے انجام کی کہانی ہے۔ کچھ کام حفظِ انقدم کے طور پر کیے جاتے ہیں پھر میر کو سراسر اور نئے کو بلا ضرورت ملتا ہے۔ مار تھانے ایک ایسے انسان کو مات بلکہ شہادت دے دی جو اپنے آپ کو بہت کامیاب اور عقلمند سمجھتا تھا، ویلڈن..... رضوان ساجد کی حضرت یوسف علیہ السلام کی چھوٹی قسط بھی ایمان کو تازہ کر رہی ہے۔ یہ قصہ جتنی بار پڑھیں اپنا تاثر ضرور چھوڑتا ہے۔ محفل شعر و سخن کی محفل خوب تھی ہوئی ہے۔“

✽ پرویز احمد لاٹکا، حیدر آباد، جاشور سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”آج کل چھٹیوں پر پاکستان آیا ہوا ہوں تو بس ہر طرف ویس کی خوشبو ہی محسوس ہو رہی ہے۔ گھر والوں اور دوستوں سے ملاقاتیں تو ہو رہی رہی ہیں لیکن میری اصل خوشی کا سبب بنی ہے کراچی کا تازہ۔ پچھلے دنوں میں نے بے ڈی پی کے معروف رازِ حضرتز سے ملاقات کی۔ یقین کریں آپ کے توسط سے پیدا ہونے والی یہ یمنیں اور ملاقاتیں اتنی خوشی سے سرشار کر چکی ہیں کہ یادوں کا بھی خزانہ اٹکھا ہو گیا ہو۔ سپنس کے تازہ شمارے کا خصوصی انتھار تھا کیونکہ محفل صاحب کی آمد کی اطلاع پاکیزہ میں آئے اشتہار سے مل چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور ہمارے دلوں کو فتح کر گئے۔ جاری ہے دیکھ کر بڑا غصہ آیا لیکن لی گئے کہ نکست کی فتح کا اٹکا جھبھی تو پڑھنا ہے۔ وقت واقعی ایک ایسا دوا گر ترین سلسلہ ہے۔ حام بٹ صاحب اپنی صلاحیتیں وکیل باپ اور پولیس باپ پر ضائع کر رہے تھے۔ (ملا جھبھی کبھی ضائع نہیں جاتیں وہ جی اپنی ایک الگ کاوش ہے)۔ یہ قسط فٹوزی سلو کی لیکن امید ہے کہ اعلیٰ بار بٹ صاحب ایشین اور ہنگاموں کو کراچی کی سڑکوں پر لے آئیں گے۔ مقبول یعنی کار و تجارت کا باعث ہے اور دیکھتے ہیں کہ اس کی پیش گوئی پر اب ویلڈینیا یا شارو میں سے کون سا نئے آتا ہے؟ ناصر ملک بھی طویل عرصے سے غائب ہیں۔ ان کو بھی تلاش کر کے لے آئیں۔ چھوٹی کہانیوں میں منظرِ امام چھا گئے۔ سازش، دیو قامت اور دیدہ دلیر بھی بہترین تراجم تھے۔ ایم الیاس کی سایہ دل پر گہرا اثر چھوڑ گئی اور مزہ ہی آ گیا۔“

✽ محمد زریان سلطان اردو بازار کراچی سے چلے آ رہے ہیں۔ ”عرصہ ہوا سپنس سے نانا جوڑے مگر اب کبھی شریکِ محفل

سوشل میڈیا قارئین کے لیے اہم اطلاع

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ادارے کی کوئی OFFICIAL WEBSITE نہیں ہے۔ جو ایڈمن اپنی WEBSITES پر آفیشل کالغظ استعمال کر رہے ہیں، اسے فوری ترک کر دیں تاکہ قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ بصورت دیگر ادارہ سائبر کرائمز ایکٹ کے تحت کارروائی کرے گا۔

بھی ہو جاتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے اپنا خط و کلمہ کر۔ نومبر کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح لا جواب رہا۔ دربان تاریخی کہانی نے دل جیت لیا۔ بہت اچھی رہی۔ وقت کی رفتار اگر چست رہی مگر وقت جیسا بھی ہو گزر رہی جاتا ہے۔ لہذا اسے بھی پڑھ لیتے ہیں دیے حسام بٹ صاحب برائے مہربانی وقت کی رفتار تھوڑی تیز کر دیں تو کہانی کا مزہ دو بالا ہو جائے۔ نیا سلسلہ رنگ آسمان پڑھا ڈراما مختلف انداز میں شروع ہونے والی یہ نئی داستان دیکھیے آگے چل کر کیا رخ اختیار کر رہی ہے۔ لہذا اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے ہم مرزا احمد بیگ کی جانب بڑھ گئے جنہوں نے اپنے مطلوبہ ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لیے دلائل اور بیٹوں کا انبار لگا دیا اور عدالت کے کٹھنرے میں دشمن کے چیرا لکھا دیے۔ ویلڈن۔ ڈاکٹر شیر شامید کے تو کیا ہی کہنے..... ہمیشہ کہانی ختم کرنے کے بعد بھی کافی دیر تک ایک سحر ساطاری رہتا ہے اور دل و دماغ کہانی کے پیچ و خم میں ہی الجھا رہتا ہے۔ زندگی اداس ہے اس بار بھی ایسی کہانی ثابت ہوئی۔ غفر اقبال غفر کی کہانی عشق نامتام نے تو اس بار چونکا دیا۔ بہت خوب صورت تحریر۔ احساسات و جذبات کی دشین عکاسی محمد الیاس کی سایہ نے بھی ایک اچھا تاثر چھوڑا۔ انسان جب بھی قدرت اور فطرت سے دور بھاگتا ہے کسی نہ کسی معیبت میں ضرور گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہی حال منزہ کا بھی ہوا مگر بے چاری جلی پیر فقیری کے ظلم و ستم کا شکار ہوئی جبکہ اصل خطا و اس کا شوہر تھا جس کی وجہ سے منزہ کو اپنی اذیت سہمی پڑی۔ تو ریر یاض کی سازش اور شاہ زین رضوان کی بدلے بھی بہت متاثر کیا۔ ویلڈن۔ آخری صفحات کی کہانی نکست کی جگہ کے تو کیا ہی کہنے۔ طاہر جاوید مغل کا اعزاز ہی اتنا سحر انگیز ہوتا ہے کہ موضوع کوئی بھی ہو۔ دل پر ضرور اثر کرتا ہے۔ اس بار بھی خواتین کی اہمیت عزت اور صلاحیتوں پر بہت شاعرانہ تحریر ہے۔ اب دیکھیے اگلے حصے میں کیا ہوتا ہے کیونکہ آخر میں جاری ہے نئے ہمیں منہ چڑا دیتا۔ بہر حال۔ شاکر لطیف کی شاطر کہانی بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ اب پرانے معنف کے ساتھ ساتھ نئے رانزد کو بھی جگہ ملتی جا رہی ہے یہ بھی ایک اچھا قدم ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی۔ بے حد ضروری ہے کیونکہ آنے والے کل میں جانے کون بڑے تھکانے کی حیثیت سے اپنا لوہا منوالے۔ ویلڈن۔ (بہت شکریہ جناب آپ کے ذریعے خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں۔ سسپنس کی تحریروں سے آپ محفوظ ہوئے یہ جان کر ہمیں بھی اچھا لگتا ہے اور یہی بات ہمیں مزید اچھا کام کرنے پر کساتی ہے)۔“

اوشا رانجھی مضمی سندھ سے۔ ”18 اکتوبر کو سسپنس ڈائجسٹ کے درشن ہو گئے تھے مجھے تہوار کی تیاری اور گہما گہمی کی وجہ سے بڑھ نہ پائے۔ 19 اور 20 اکتوبر کو ہمارا دیوالی کا تہوار بہت زبردست اور خوشگوار گزرا (مبارک اہمیت)۔ ہماری اس خوشی میں ہماری کافی مسلم فرینڈز بھی شامل ہو گئیں اور خوشیوں کو دو بالا کیا۔ اس طرح سسپنس ڈائجسٹ کی ٹاسل کرل بھی بہت خوش رنگ کپڑوں میں ہمارے تہوار میں شرکت کرنے آئی تھی۔ تبصرے سب کے بہترین تھے سرسری طور پر پڑھ پائی ہوں تمام تبصرہ نگار شاہیوں کی پرواز پر تھے۔ ویلڈن۔ طاہر جاوید مغل کی نکست کی جگہ، دل کو بہت بھائی۔ عین انور اور ذوالقرنین کی داستان محبت آگے بڑھتا پیش کیا موڑ لے گی۔ انتظار رہے گا۔ رنگ آسمان اسے آرا جنت کی داستان کا نئی اچھی لگ رہی ہے۔ داستان کا ماحول اور ٹیویجی مناظر نگرین ہے۔ رہنا اور شوکت سے شروع یہ کہانی اب کس پر ختم ہوگی۔ دوسری طرف ریحان اور شاہ زین کا ٹولہ بھی اپنے مشن پر پہنچ کر پتا نہیں کیا کارنامہ انجام دے گا۔ رات کو گھر بیڑوں کے خیمے کے باہر گرینڈی (Grizzly) کی موجودگی..... سب خیر ہو۔ دوسری خط کا شدت سے انتظار ہے۔ علی اختر کی کہانی دربان تو اسے ورن بہت ہی دلچسپ اور لا جواب داستان رہی۔ پرتھوی راج میرا نیوٹ کراد ہے۔ کم تو جھکا بھی نہیں تھی اپنے دربان جتنی کے ساتھ تھی تو یہی گئی ان کی لاوازل محبت۔ خالد عباس کی مصوری بھی بیٹ ہے۔ مراسلے سپر ہے۔ اور محفل شہرچن کا تو جواب نہیں ویلڈن اشعار کے سلیکشن کے لیے۔ تینوں اعزازی اشعار کے علاوہ، وزیر محمد خان، ریاض بٹ، محمد قدرت نیازی، ناہید یوسف، سعدیہ ریحان اور اسد خان کے انتخاب بہت اعلیٰ و آفریں تھے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے

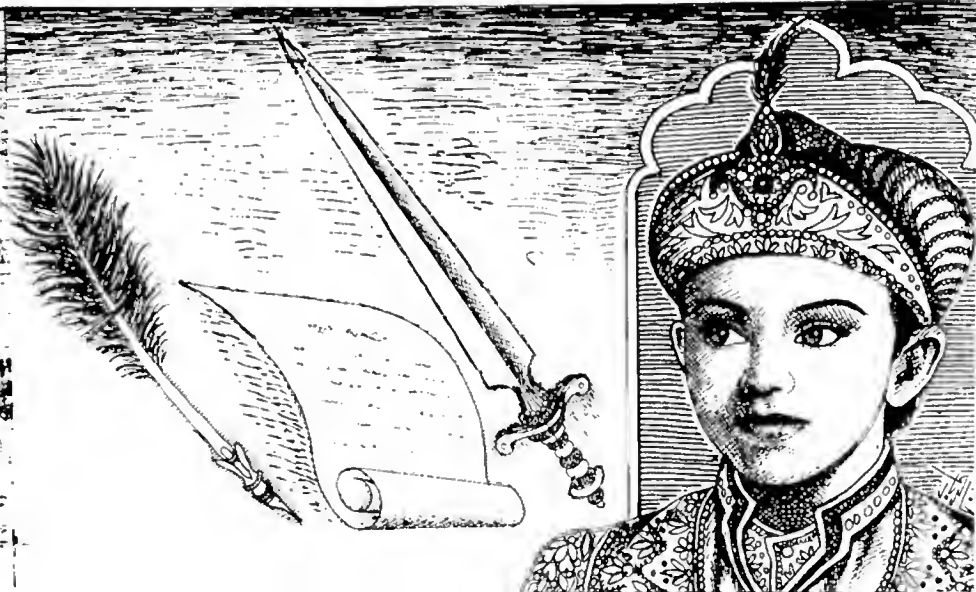
صابحہ، کراچی۔ ویم احمد، ملتان۔ عام خان، کوئٹہ۔ اقبال احمد، کراچی۔ نازنین بشیر، سکھر۔ فرحانہ عام، سرگودھا۔ شاہین عکلی، ٹنڈوالہار۔ ریحانہ کریم، لالہ موٹی۔

نوشت اتحاد

ڈاکٹر ساجد امجد

انفرادی طور پر پرگزرا لمحہ اپنے دامن میں کوئی
نہ کوئی یاد سمیٹ لیتا ہے مگر جب یہ لمحات کچھ
خاص ادوار میں ڈھل جاتے ہیں تو اس پورے عہد کے بے
شمار واقعات کسی داستان کی صورت آنے والی نسلوں
کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ برہان نظام شاہ اور
دیگر اہم کرداروں پر مشتمل زیر نظر تحریر اپنی مکمل
جزیات کے ساتھ کئی رازوں اور گمشدہ گوشوں پر بھرپور
روشنی ڈالتے ہوئے اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جنگی
حالات ہوں یا محلاتی سازشیں صاحب اقتدار کی تدبیروں اور
کاوشوں کا حال اور جستجو کا رنگ ایک جیسا ہے۔ اسے بھی کم
عمری میں جب تخت شاہی ملا تو اس کے مصاحبین کی ہوس اور طمع نے
اپنے پنجے کچھ طرح پھیلائے کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے... کہ یہی انجام
بالآخر پر یاد شاہ اور صاحب اقتدار کا ہوتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



حرم سرا کے کردوں میں لگے قد آدم آئینے منساں پڑے تھے۔ کنگھی، چوٹی، مٹی کچھ بھی تو نہیں تھا۔ نکا، جھومر، ننگن کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیوں۔ تخت نا بالغ تھا۔ سات سال کا بچہ برہان نظام شاہ احمد نگر کے ہر جلوہ گر ہوا تھا۔ وہ کود میں بیٹھنے کے لائق تھا، بٹھا۔ لائق نہ تھا۔ حرم سرا عورتوں سے بھرا ہوا تھا مگر عورتوں کی تعداد برہان نظام شاہ کے باپ کے زمانے میں جمع ہوئی تھی۔ برہان نظام شاہ کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ اس تعداد سے بے خبر رہے۔ حرم سرا میں موجود عورتوں کے لیے یہ صورت حال مایوس کن بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔ مسلسل سکوت تھا جو حرم سرا کی دیواروں پر طاری تھا۔ دل بہلانے کے لیے کچھ نوجوان شوخ عورتوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ تھی جس میں دن گزار رہے تھے۔

اس افسردہ ماحول میں عائشہ تھی جس کے قدم پچھلے دو دنوں سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کے کپڑوں کا صندوق مسلسل کھلا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک جوڑا بدل کر دیکھ رہی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر زادے بدل بدل کر رہی کا زیور ہونٹوں پر سجا رہی تھی۔ یہ احتیاط طبعی کر رہی تھی کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔

آئینے میں دیکھتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو دیکھتے دیکھتے۔ اس کی عزیز ترین سہیلی گناہ اس کی اس تبدیلی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آخر گناہ سے

رہا نہیں گیا۔ عائشہ فوراً کے نزدیک اپنے خیالوں میں گم رہی تھی کہ گناہ بھی وہاں پہنچ گئی۔

”عائشہ..... یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“

”اب کہاں اکیلی ہوں تم جو یہاں بیٹھی ہو۔“

”میں تو اب یہاں آئی ہوں۔ تم تو کئی دن سے مجھ سے کہہ رہی ہو۔“

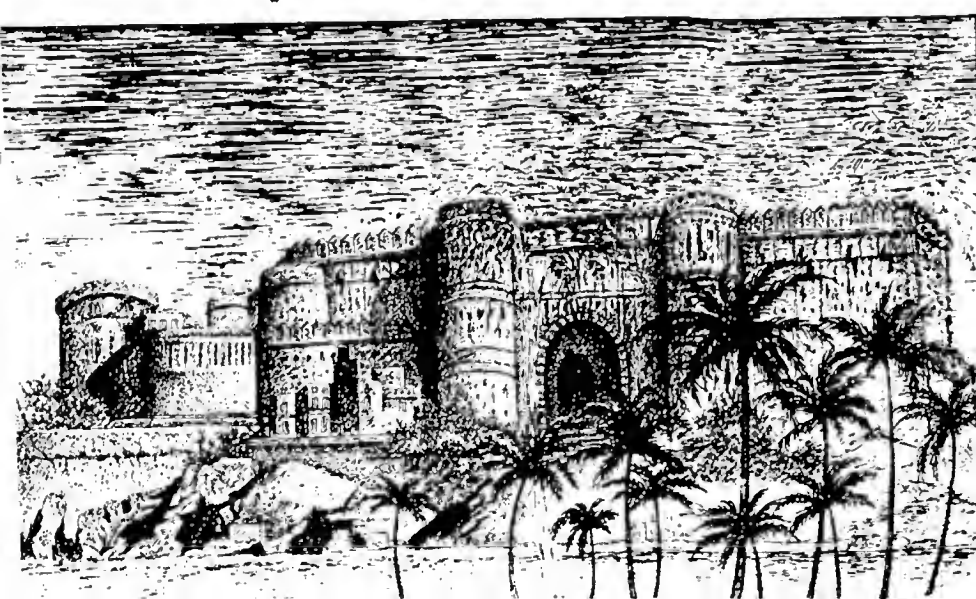
”میں تم سے کیوں کھڑاؤں گی۔ ایک تم ہی تو میری سہیلی ہو۔ وہ تو اس کے سازش ماحول سے تنگ ہی ہوں۔“

”تم کئی دن سے بننے سنورنے میں مشغول ہو۔ خیریت تو ہے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ برہان نظام شاہ وقت سے پہلے نا بالغ ہو گئے ہوں؟“ گناہ نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”گناہ! تو بڑی گراں ہے۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔“

”لو، اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ مجھے تو یہ دکھ ہے کہ ہم بے چارے برہان نظام شاہ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ کیا تجھے افسوس نہیں ہوتا کہ ہم ہجرے میں بند قیدی کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ برہان نظام شاہ آتا بھی ہے تو اپنی ماں سے لگا بیٹھا رہتا ہے۔“

”کیا کیا جائے نظام شاہ۔ سحری کی کوئی جوان اولاد تھی ہی نہیں۔ وراثت کرتا تو کس کے لیے۔ اس نے برہان نظام شاہ کو دلی عہد مقرر کر کے تمام امراء سے اطاعت و فدا داری کے وعدے لیے۔“



نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد عائشہ نے شہزادے کو گود سے پیچھے اتار دیا اور آنے والی رات کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ یہاں سے کیسے نکل سکے گی؟ راجا جیو کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جائے گی؟ بات ایسی بھی نہیں کہ کسی کو ہمارا بنا سکے کسی سے مدد لے سکے پھر ایک حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اپنی جگہ اگر گنار کو ملا جائے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خوش ہوئی لیکن فوراً ہی اپنے خیال کی تردید بھی کر دی۔ گنار یہ ضرور پوچھ گچھی کہ میں کس سے ملنے اور کہاں جا رہی ہوں۔ اگر میں اس وقت چھپا بھی لوں تو کسی وقت سے راز کھل ہی جائے گا۔ میری کمزوری اس کے ہاتھ آ جائے گی۔ وہ اس کمزوری کو کسی وقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔ پھر میں کیا کروں؟ اسے اب ایسی الجھن تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے۔ تبھی ایک لمحے کو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ جانا ہی ملتی کر دے لیکن اس پر لالچ غالب آ گیا۔ پھر میں کیا کروں؟ ایک خیال نے اس کے بدن میں تازہ روح بھونک دی۔ میں بیمار بھی تو ہو سکتی ہوں۔ اس نے اپنا دوپٹا اپنے سر پر باندھ لیا اور لیٹ گئی۔ راجا جیو اس کی اس ہیئت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے؟“

”ہاں۔ شاید آپ کو آج رات اپنی والدہ کے ساتھ

سونا پڑے۔“

”نہیں۔ میں وہاں نہیں سو سکتا۔“

”آپ کو اپنی بوا کی تکلف کا خیال نہیں؟“

”آپ حکیم فتح اللہ خاں کو بلوا کر ان سے دوا کیوں

نہیں لیتیں؟“

”تھوڑی سی تکلیف کے لیے انہیں کیا زحمت دوں۔“

”جب تھوڑی سی تکلیف ہے تو امی حضور کو کیوں

زحمت دے رہی ہیں؟“

”ایک تو آپ باتیں بہت کرتے ہیں۔ جو ہوگا

تھوڑی دیر میں فیصلہ کر دیں گی۔“

”جی بہتر۔“

معصوم راجا جیو کی بات عائشہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے

حکیم فتح اللہ خاں کو بھی گواہ بنالینا چاہیے۔ اس نے اپنی

ملازمہ چچا کلی کو بلا یا۔

”ذرا دوڑ کر حکیم صاحب کو تو بلا کر لے آ۔“

”ان سے کیا کہوں؟“

”کہنا سر میں درد ہے۔ وہ اگر دوادیں تو مت لیتا۔“

”حیرے خیال میں یہ امراء اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ ملکی معاملات سچ طور پر چلا رہے ہیں۔“

”ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار۔ امراء جانیں

اور ان کا کام۔“

”اب اتنی بھولی بھی مت بنو۔ میں نے تو سنا ہے رومی

خاں، کرم خاں وغیرہ اس بندوبست سے خوش نہیں ہیں اور

مکمل خاں دکنی سے حسد رکھتے ہیں جو برہان نظام شاہ کے

نام سے سلطنت چلا رہا ہے اور ملکی و مالی معاملات پر قبضہ کیے

بیٹھا ہے۔“

رومی خاں کا نام آتے ہی عائشہ کا دل حلق میں آ کر

انک گیا۔ وہ بھی راز کھل گیا۔ گنار کو کہیں سے سن گن گئی مل

ہے لیکن اس نے اپنی کسی کمزوری سے اسے تقویت نہیں

دینے دی اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”تو یہ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ مجھے تو چڑھتی ہے

ایسی باتوں سے۔“

”اچھا بیٹھ تو سہی۔ کچھ اور باتیں کر لیتے ہیں۔“

”نہیں، اب میں چلوں گی۔ شہزادہ راجا جیو سو رہا تھا

تو مجھے اتنی فرصت مل گئی۔ اب وہ اٹھ گیا ہو گا ذرا راجا کر اسے

دیکھوں۔“

عائشہ نے زیادہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں

سے اٹھ گئی۔

وہ فوارے کے نزدیک سے اٹھ کر اپنے کمرے

میں آئی تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ شہزادہ راجا جیو

کی والدہ کمرے میں موجود تھیں اور کافی پریشان نظر

آ رہی تھیں۔

”عائشہ! کہاں چلی گئی تھیں۔ شہزادہ سو کر اٹھ گیا

ہے۔ اگر اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچا لیتا تو چانتی ہے کیا

ہو جاتا۔“

”میں ابھی گئی تھی، ابھی آ گئی۔“

”بچی تو پوچھ رہی ہوں گئی کیوں تھی۔ اگر گئی تھی تو

شہزادے کو ساتھ لے کر جاتی۔“

عائشہ کی یہ حیثیت نہیں تھی کہ وہ ہر بات کا جواز پیش

کرتی۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی اور آگے

بڑھ کر راجا جیو کو گود میں اٹھالیا۔

راجا جیو، برہان نظام شاہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر

ابھی صرف چار سال تھی۔ عائشہ شہزادے کی دایہ تھی یعنی

شہزادے کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری تھی۔

”آئندہ مجھے شکایت نہ ملے۔“ راجا جیو کی والدہ

اصل دلیری

ایک بادشاہ نے میدان جنگ میں سپاہی کی دلیری پر خوش ہو کر انعام و اکرام دیا اور پوچھا۔ ”عمر میں سب سے دلیری کی بات تم نے کون سی کی ہے؟“
”عالی جاہ۔“ سپاہی نے دست بستہ عرض کیا۔ ”میں نے بارہ سال اپنی بیوی کے ساتھ گزارہ کیا ہے۔“

انہیں بلا کر لانا اور اگر ہو سکے تو راجا جیو کی والدہ کو بتانی ہوئی حکیم صاحب کی طرف جانا۔“
چچا کئی دوڑتی ہوئی کئی اور تھوڑی دیر میں حکیم فتح اللہ خاں شریف لے آئے۔ عائشہ سر پر ہٹی باندھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب نے بغض و کینہ سے۔
”کیا آپ کے سر میں واقعی درد ہے؟“
”میں آپ سے غلط بیانی کیوں کروں گی۔“

کوئی بات نہیں تھی۔ زرباز خاں اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا۔

”میں نے رومی خاں تک آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اس کے آدمی اب تک اس مقام پر پہنچ گئے ہوں گے جہاں تک آپ کو پہنچا کر میرا کام ختم ہو چکا ہوگا۔ واپسی میں آپ کو خود ہی حرم سران تک پہنچنا ہوگا۔“
”میں خود کیسے آؤں گی؟“

”جس خفیہ راستے سے میں آپ کو لے جاؤں گا، آپ اسی خفیہ راستے سے واپس آ جائیں گی۔“
”میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک چکر اپنے کمرے کا لگا لوں۔ پھر واپس آتی ہوں۔“

عائشہ اپنے کمرے میں آئی۔ کچھ دیر بناؤ سنگھار میں مصروف رہی پھر بستر کو اس حالت میں تبدیل کر دیا جیسے کوئی سو رہا ہے۔ چند منٹ کے رکھ کر اوپر سے ایک موٹی چادر ڈال دی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا کروایا اور باہر نکل آئی۔

زرباز خاں تیار کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دیں اور عائشہ کو لے کر حرم سرا سے باہر جانے کے لیے آگے بڑھا۔ آخری دروازے کے قریب ایک بوڑھی عورت سامنے آ گئی۔ وہ بڑی بے ہودگی سے ہنس رہی تھی۔ عائشہ نے اپنے کپڑوں میں چھپائی ہوئی چاندی کی چندا شرفیاں اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ عورت کی ہنسی ہونٹوں میں رہ گئی اور اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

اس حرکت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس قسم کے واقعات یہاں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ حرم سرا کی عورتیں امراء کے پاس اکثر جاتی رہتی ہیں۔

زرباز خاں عائشہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ یہاں اندھیرا ضرور تھا لیکن ایسا راستہ بھی تھا کہ تیزی سے چلا جا سکتا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک گھنے درخت کے نیچے

”ہاں، یہ بھی ہے۔ بہر حال میں دودا بے رہا ہوں۔ اسے کھالیں، صبح تک درد چلا جائے گا۔“ حکیم فتح اللہ خاں رخصت ہوئے تھے کہ چچا کئی آ گئی۔

”اماں حضور فرما رہی ہیں کہ شہزادہ حضور کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ ان کا آج آپ کے پاس سونا ٹھیک نہیں۔ آپ کی طبیعت تاسا ز ہے۔“

تیر نشانے پر لگا تھا۔ شہزادے کو خود اس کی والدہ نے طلب کر لیا تھا۔ یہی وہ چاہتی بھی تھی۔ اس نے اسی وقت شہزادے کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ اب اسے رات کے وقت یہاں سے نکلنے کا بندوبست کرنا تھا جس کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اسے اسی وقت زرباز خاں سے ملاقات کرنی تھی جو حرم سرا کا انچارج تھا۔ اس سے ملنا مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ بات ہوجاتی تھی۔

بات ہی ایسی تھی کہ وہ زرباز خاں کے سوا کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ زرباز خاں اس کا رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے زرباز خاں کو پوری بات نہیں بتائی تھی۔

اسے چند روز پہلے رومی خاں کا پیغام ملا تھا کہ وہ کسی روز موقع و کھم کر اس سے ملاقات کرے۔ عائشہ نے اس پیغام کا نہ جانے کیا مطلب لیا۔ اس نے اپنی دانست میں یہ سمجھا کہ رومی خاں جیسے دولت مند امیر کی نگاہ التفات اس کی طرف ہو گئی ہے اور اب اس کے دن بھرنے والے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے میں حق ہے۔ جانے بھی کہ جب تخت پر سات سالہ بچہ جلوہ افروز ہو تو حرم سرا کا امراء کی گرفت میں آ جاتا ازا می ہے۔ اس کی مثال گلنار کی شکل میں اس کے سامنے تھی جسے ایک امیر میاں جمال الدین نے اپنی خلوت میں طلب کیا تھا۔ رومی خاں نے اسے طلب کیا تھا اس کے لیے یہی بہت تھا۔ اس نے سر کی پٹی اتاری، حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا ایک کونے میں بچھائی اور زرباز خاں سے ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔

حرم سرا کی خواتین زرباز خاں سے اپنے مسائل کے سلسلے میں اکثر ملاقاتیں کیا کرتی تھیں اس لیے خطرے کی

چند درختوں سے گزرنے کے بعد بالکی پکی سڑک پر آگئی۔ یہ بالکی ایک محل کے صدر دروازے سے گزرنے کے بعد رک گئی۔

بالکی سے اتار کر اسے ایک وسیع کمرے میں بٹھادیا گیا۔ اسے جس عزت کے ساتھ یہاں تک پہنچایا گیا تھا، اس پر اسے اپنی ذات پر فخر ہو رہا تھا، اپنے حسن پر ناز ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رومی خاں جیسے امیر کی نظروں میں میری کتنی وقعت ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رومی خاں ابھی اسے خلوت میں طلب کرے گا اور وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے امیر ترین عائشہ بن کر قلعے میں لوٹے گی۔ اس کے بعد شاید نوکری کی ضرورت بھی نہ رہے۔ وہ نوکری چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر چلی جائے گی اور آرام سے زندگی گزارے گی۔ اس کی سوچیں اس وقت ٹوٹ گئیں جب ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نہایت ادب سے سلام کیا اور اسے ایک دوسرے کمرے تک پہنچا دیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ تصور لے کر آئی تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا رومی خاں سے ہوگا لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے دھچکا سا لگا تھا۔ اس نے کمرے میں رومی خاں، کرم خاں اور امیر خاں کو بیٹھے دیکھا۔ یہ کیسی خلوت ہے؟ یہ تینوں یہاں کیوں موجود ہیں؟

”عائشہ! تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ہم نے تمہیں یہاں کیوں بلا یا ہے۔“

”میں تو کچھ نہیں جانتی۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ نے مجھے بلایا اور میں چلی آئی۔“

”بات یہ ہے کہ ہمیں تم سے ایک اہم کام لینا ہے اور وہ کام تم ہی کر سکتی ہو۔“

”میں کب سے اتنی اہم ہو گئی؟“

”تم اہم اس لیے ہو کہ شہزادہ راجا جیو تمہاری نگرانی میں ہے۔“

”میرے آنے سے راجا جیو کا کیا تعلق؟“

”تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ احمد نگر کی بھلائی کے لیے راجا جیو کی کیا اہمیت ہے۔“

”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھتی۔“

”بات صاف ہے۔ تخت پر برہان نظام شاہ بیٹھا ہے۔ مکمل خاں دکنی اور اس کا بیٹا شہزادے کی کم سن سے فائدہ اٹھا کر خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ایسے کام کر رہا ہے جو احمد نگر کے مستقبل کے لیے قطعی فائدہ مند نہیں، ہم سے

پہنچ گئے۔ یہ درخت یہاں اکیلا کھڑا تھا۔ شاید یہی پہچان تھی کہ منزل آگئی۔ اس درخت سے ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ زرباز خاں نے اندھیرے میں زنجیر ٹٹولی اور اسے کھینچا۔ خود کا نظام حرکت میں آیا اور زمین کا کچھ حصہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ زرباز خاں نے کچھ دیر آنکھوں کو اندھیرے کا عادی کیا اور پھر اس سرنگ میں بنی سیزھی پر قدم رکھ دیا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر مشعل تلاش کی۔ وہ چھماں اپنے ساتھ لایا تھا۔ مشعل روشن کی اور عائشہ کو اندر بلا لیا۔ یہاں بھی ایک زنجیر لگی ہوئی تھی جسے کھینچنے پر زمین اپنی جگہ آگئی۔

”جب تم واپس آؤ تو اس مشعل کو بچھاؤ اور باہر نکل آنا۔ درخت سے بندھی زنجیر کو کھینچنا تو زمین اپنی جگہ آجائے گی۔“

”زرباز خاں! ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“

”حرم سرا سے جتنی عورتیں باہر جاتی ہیں، وہ اسی دقت اور پریشانی اٹھانے کے بعد جاتی ہوں گی۔“

”ضروری تو نہیں لیکن تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔ تم شہزادے کی دایہ ہوا اور پھر تمہیں رات کے وقت لٹکنا تھا اس لیے میں نے یہ احتیاط برتی۔“

”اگر میں دن کے وقت کہیں جانا چاہوں؟“

”دن کے وقت اتنی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ اکثر عورتیں اپنے رشتے داروں سے ملنے قلعے سے باہر چلی جاتی ہیں۔“

اندھیری سرنگ میں قدرتی روشنی ہوئی تو دونوں نے آگے چلنا شروع کیا۔ سرنگ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد سرنگ کا دوسرا کنارہ آگیا۔ یہاں بھی زنجیر بٹائی تو راستہ بن گیا۔ دونوں باہر آ گئے۔

اندھیرے میں کسی کے وجود کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک ایک گھڑ سوار ایک درخت کی اوٹ سے باہر آیا۔

”مجھے رومی خاں نے بھیجا ہے۔“

”کیا سواری لائے ہو؟“

”اس درخت کے پیچھے بالکی تیار کھڑی ہے۔ تشریف رکھیے۔“

بالکی واقعی موجود تھی۔ عائشہ بالکی میں بیٹھ گئی۔ بالکی کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمی آگے بڑھے اور بالکی کو اٹھالیا۔ گھڑ سوار آگے بڑھ گیا اور دو آدمی بالکی اٹھا کر چل دیے۔

درفاندے

مقدمہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو۔ اسی لیے بڑے بڑے مصنف بھاری رقمیں دے کر اپنی کتابوں پر پروفیسروں اور پولیس سے مقدمے لکھواتے اور چلواتے ہیں اور حسب مشاہداتی کے ساتھ بری ہوتے ہیں۔ فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبرانہ فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل و نظائر سے ثابت کر دے کہ اس کتاب مستطاب کے طلوع ہونے سے قبل، ادب کا نقشہ ممدس حالی کے عرب جیسا تھا:

”ادب“ جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

اس میں شک نہیں کہ کوئی کتاب بغیر مقدمہ کے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل نہیں کر سکتی بلکہ بعض معرکتہ آلا کتابیں تو سراسر مقدمے ہی کی جاٹ میں لکھی گئی ہیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے (جو درحقیقت اس کے مقدموں کے خمیے ہیں) اسی ذیل میں آتے ہیں اور دور کیوں جائیں، خود ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جو محض آخر میں دعائے ختم کے لالچ میں نہ صرف یہ کہ پوری نماز پڑھ لیتے ہیں بلکہ عبادت میں خشوع و خضوع اور مکمل میں رندگی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنی مالی مشکلات کو حاضر و ناظر جانتے ہیں لیکن چند کتابیں ایسی بھی ہیں جو مقدمہ کو جنم دے کر خود توڑ دیتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر جاسن کی فکشنری، جس کا صرف مقدمہ باقی رہ گیا ہے اور کچھ ایسے مصنف بھی گزرے ہیں جو مقدمہ لکھ کر قلم توڑ دیتے ہیں اور اصل کتاب کی ہوا تک نہیں دیتے..... جیسے شعر و شاعری پر مولانا حالی کا بھرپور مقدمہ جس کے بعد کسی کو شعر و شاعری کی تاب و تہنای نہ رہی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ، اس کتاب میں سے مقدمہ نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔

تاہم اپنا مقدمہ بنیاد خود لکھنا کارنواب ہے کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ آدمی کتاب پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ ورنہ ہمارے نقاد عام طور سے کسی تحریر کو اس وقت تک غور سے نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرقہ کا شبہ نہ ہو۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس

کوئی مشورہ ہی نہیں لیا جا رہا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹے غرور و تکبر کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ غرور ان کے ساتھ ساتھ احمد نگر کو بھی ڈبو دے گا۔ پڑوس میں اسلعل عادل شاہ بیٹھا ہوا ہے۔ ہماری ذرا سی غفلت ہوئی تو وہ احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ احمد نگر کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ برہان نظام شاہ کو تخت سے اتار کر راجا جیو کو بیٹھا جائے۔“

”میں پھر بھی نہیں سمجھی کہ اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میری کیا حقیقت کہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔“

”تم ہماری مدد اس طرح کر سکتی ہو کہ راجا جیو کو کسی طرح ہم تک پہنچا دو۔“

”یہ کام میرے بس کا نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔“

”احمد نگر کو بچانے کے لیے بھی نہیں؟“

”احمد نگر سے مجھے محبت ہے۔ اسے بچانا بھی چاہتی ہوں لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں۔“

”سوچ لو۔ اس جھوٹے سے کام کے لیے ہم تمہیں اتنی دولت دیں گے کہ تمہاری تسلیں کھائیں گی۔“

”کھائیں گی تو جب، جب میں زندہ رہوں گی۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے زندہ کون چھوڑے گا۔“

”تمہاری جان کی ضمانت ہم لیتے ہیں۔“

”آپ حرم سرا میں آکر مجھے نہیں بچا سکتے اور مجھے تو وہیں رہنا ہے۔“

”تم راجا جیو کو لے کر یہاں آ جاؤ پھر تم یہیں رہو گی یا جہاں جانا چاہو چلی جانا۔“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

اتنی دیر میں دو ملازماں میں دو چھوٹے تھال اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں اور تھال رکھ کر چلی گئیں۔ کرم خاں آگے بڑھے اور دونوں تھالوں کے خوان پوش ہٹا دیے۔ ایک تھال میں زیورات تھے، دوسرے میں سونے جاندی کے سکے۔

”اس کے علاوہ بھی تمہارے لیے بہت کچھ ہے۔“

رومی خاں نے کہا۔

دونوں تھالوں کو دیکھ کر عائشہ کا ایمان ڈگمگا گیا۔ اس کے لہجے میں نرمی آ گئی۔

”راجا جیو کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا؟“

”نہ صرف یہ کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ وہ تخت پر بیٹھے گا اور تم راج کر دو گی۔ اس کے پردے میں تم حکومت

کرو گی اور تمام امراء تمہارے حکم کے پابند ہوں گے۔“

”راجا جیو کہاں پہنچانا ہوگا؟“

”اس وقت تم جہاں بیٹھی ہو..... اس کے بعد تمہارا کام ختم۔“

رات بچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی دن بھی موقع دیکھ کر راجا جیو کو روڈی خاں کے گھر پہنچا دے گی۔

اسے جس پالکی میں لایا گیا تھا اسی پالکی میں سوار کر کے خفیہ سربگ تک پہنچا دیا گیا۔ اس نے زرباز خاں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سربگ میں قدم رکھ دیا اور پھر سربگ سے باہر نکل آئی اور یہ آسانی حرم سرا تک پہنچ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر گہری سانس لی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ وہ رات بھر جاگتی رہی تھی لیکن نیند اب بھی اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے جن حالات سے گزری تھی، اس کا ذہن ان واقعات کو دہرا رہا تھا۔ خطرات اس کے سامنے کھڑے تھے لیکن زیورات سے بھرے قمار اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

نبی خواب دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں نیند بھر گئی۔ صبح سو کر اٹھی تو اس کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔ حکیم صاحب پھر آگئے۔ دو اوپر دے دی گئی۔

دن نکلنے ہی حرم سرا کی رونق پھر لوٹ آئی تھی۔ کہیں کہیں سے تہتہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عائشہ رات کو کہاں گئی تھی اور کیا وعدے کر کے لوٹی ہے۔

اس کا بخار اترتے اترتے شام ہو گئی۔ وہ راجا جیو کی

والدہ کے پاس گئی اور راجا جیو کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اب اسے زیادہ سے زیادہ راجا جیو کے ساتھ رہنا تھا تاکہ جلد از جلد اپنے وعدے کی تکمیل کر سکے۔ وہ راجا جیو کی دیکھ بھال میں مشغول تھی۔ اس کے ساتھ ہی موقع کی تاک میں بھی تھی کہ ایک موقع ملے اور وہ راجا جیو کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔

ایک دن اسے موقع مل گیا۔ اس نے راجا جیو کو لڑکیوں کے کپڑے پہنائے تاکہ کسی کی نظر پڑ بھی جائے تو یہی سمجھ کر کوئی لڑکی ہے جسے وہ اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔ ایک دن پہلے اس نے یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ وہ اپنی بہن سے ملنے اس کے گھر جائے گی۔ حرم سرا کے دروازے پر پالکی آ کر رک گئی۔ کسی نے دیکھا بھی تو یہ دیکھا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ پالکی میں بیٹھی ہے۔

یہ شخص اتفاق تھا کہ اسی وقت برہان نظام شاہ کی والدہ

نے اپنے چھوٹے بیٹے راجا جیو کو یاد کیا۔ حرم سرا میں شہزادے کو ڈھونڈا گیا لیکن وہ ہوتا تو ملتا۔ چاروں طرف ہنگامہ مچا گیا۔ محل کے تمام اندرونی اور بیرونی ملازم ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا ہو سکتا ہے شہزادہ محل کے کسی حوض میں گر پڑا ہو۔ کچھ ملازم حوضوں میں اترنے کی تیاری کر رہے تھے کہ کسی نے عائشہ کو فرار ہونے کی خبری کر دی۔ اسے تلاش کیا گیا۔ وہ حرم سرا میں موجود نہیں تھی۔ برہان نظام شاہ کی والدہ نے ملازموں کو عائشہ کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ کچھ لوگ احتیاط کے طور پر حوضوں میں بھی اتر گئے۔ وہ ابھی روڈی خاں کے گھر تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ ملازموں نے پالکی کو گھیر لیا۔

”یہ کیا بد تیزی ہے۔ میری پالکی کو کیوں روکا گیا ہے؟“

”آپ اپنے ساتھ کسے لے جا رہی ہیں؟“

”میری بھانجی ہے۔ میرے پاس آئی ہوئی تھی۔ میں اسے لے کر کر اپنی بہن کے گھر جا رہی ہوں۔ یقیناً نہیں تو اسے دیکھ لو۔“

اس نے راجا جیو کی ایک جھلک ملازموں کو دکھا دی۔ ملازموں نے واقعی ایک لڑکی کو دیکھا۔ وہ راجا جیو کو پہچان ہی نہ سکے لیکن پھر بھی انہوں نے ضروری سمجھا کہ پالکی کو حرم سرا کی طرف لوٹا دیں۔

عائشہ پہنچی رہ گئی اور پالکی کو حرم سرا پہنچا دیا گیا۔ اس نے راجا جیو کی والدہ سے بھی یہی کہا کہ وہ اپنی بہن کے گھر جا رہی تھی لیکن اس کے پاس اس کے اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ راجا جیو کو نہانا لباس کیوں پہنایا۔

”میں اگر یہ مان بھی لوں کہ تو اسے اپنی بہن کے گھر لے جا رہی تھی تو میں تجھ سے یہ پوچھوں گی کہ نہانا کپڑے پہنانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ بس مجھے شوق ہو رہا تھا۔“

یہ بہانہ قابل قبول نہیں تھا۔ وہ اپنی صفائی پیش نہ کر سکی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس معاملے میں مزید تفتیش کی ضرورت تھی کہ دراصل وہ کہاں جا رہی تھی اور اس کے عزائم کیا تھے۔

یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں تھا۔ حرم سرا میں پالکی پہنچنے کی دیر تھی کہ بات اس حلقے تک پہنچ گئی جو برہان نظام شاہ کے پردے میں احمد نگر کی حکومت چلا رہے تھے۔

مخالفین تک بھی یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ خاص طور پر روڈی خاں یہ خبر سن کر دہل کر رہ گیا۔ اب اسے وہ کرنا تھا

برگرد کے مخصوص حالات اور رومی خاں کی ملاقت سے خوف زدہ بھی تھا البتہ اس کا بیٹا جمال الدین عزیز الملک جو سرنوبی کے عہدے پر فائز تھا، نوجوان ہونے کی وجہ سے زیادہ جذباتی تھا۔ رومی خاں کے کئی لوگوں کو ان کے عہدے سے ہٹا چکا تھا۔ وہ رومی خاں کی طرف سے چونکا ضرور تھا لیکن یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ عائشہ سے اس کا کوئی تعلق ہوگا۔ اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب عائشہ قید خانے میں مردہ پائی گئی۔

مکمل خاں دہلی کو پورا یقین تھا کہ عائشہ کی موت میں رومی خاں کا ہاتھ ہے لیکن ایک اہم گواہ اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اب وہ کس بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ عائشہ سے اس کا تعلق تھا اور راجا جو کو انوار نے اس کا ہاتھ تھا اور اس کی موت کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔

ممکن ہے یہ معاملہ دبا دیا جاتا کہ جلد ہی زرباز خاں نے مکمل خاں دہلی سے ملاقات کی درخواست کر دی۔ یہ درخواست فوراً قبول بھی کر لی گئی۔

عائشہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اب اس پر گزرنے والی داستان کو کسی بھی انداز میں سنایا جاسکتا تھا۔ زرباز خاں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنا دامن بچا کر عائشہ کے اس فرار کی کہانی سنائی جب وہ رومی خاں سے ملنے جا رہی تھی۔

”مجھے یہ شک ہوا تھا کہ وہ رات کے وقت کسی سے ملنے جا رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ اس نے مجھے ہمزبانے کے لیے بھاری رشوت دینے کا وعدہ کر کے بتایا کہ وہ رومی خاں سے ملنے جا رہی ہے۔ میں ڈر گیا اور رشوت لینے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی نہ کسی طرح رومی خاں تک پہنچ گئی تھی۔“

دہ۔۔۔ بیان دیتے ہوئے یہ بھول گیا تھا کہ عائشہ کے فرار کا گواہ ایک اور بھی ہے۔ یہ بھی وہ یوزمی عورت جس کو رشوت دے کر عائشہ حرم سرا سے باہر نکلی تھی۔

وہ یوزمی عورت راجا جیو کی والدہ کے پاس گئی اور اپنا جرم قبول کر لیا۔

”میں تو اس وقت کور دہی ہوں جب عائشہ میرے پاس آئی تھی۔ میں نے لالچ میں آ کر اس کے لیے رات کے وقت دروازہ کھول دیا۔ زرباز خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بھی سفارش کی۔ میں باتوں میں آ گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ رومی کے گھر جا رہی ہے۔“

”تو نے کیا کہا، ذرا پھر سے تو کہہ۔ زرباز خاں

جس کا ارادہ قطعی نہیں تھا۔

مکمل خاں دہلی نے فوراً برہان نظام شاہ سے ملاقات کی۔ فیصلے تو اسی کے چلنے تھے لیکن دوسرے امراء کو یہ کھانا مقصود تھا کہ جو فیصلہ کیا جا رہا ہے، اس میں برہان نظام شاہ کی مرضی شامل ہے۔ وہ ایک تحریر پہلے ہی لکھ کر لایا تھا جس پر برہان نظام شاہ کے دستخط کرانے تھے۔

اس تحریر کے جواب میں عائشہ کو ایک قریبی قلعے کے قید خانے میں قید کر دیا گیا۔

جس وقت عائشہ کو قید خانے میں منتقل کیا جا رہا تھا، اسی وقت رومی خاں کے محل میں کرم خاں اور امیر خاں نہایت فکر مند سی جمع تھے۔

”رومی خاں! اس گرفتاری کے بعد مزید گرفتاریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ اندازہ یہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ تفتیش کس مرحلے پر پہنچ گئی۔ ہمیں مکمل خاں دہلی اور اس کے پیٹے کی طرف سے کسی رعایت کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر کسی نے ہمارا نام نہیں بھی لیا تو مکمل خاں دہلی اسے بہانہ بنا کر ہماری طرف بڑھے گا۔“ کرم خاں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔ میرا لشکر مقابلے کے لیے تیار ہے۔ ہم مکمل خاں دہلی کو یہ اجازت ہرگز نہیں دیں گے کہ وہ برہان نظام شاہ کو یہ غمال بنا کر اپنی مان بانی کر پھرے۔“

”کیا ہم اس کا مقابلہ کر سکیں گے؟“

”فرار کا دوسرا راستہ بھی تو موجود نہیں۔“

”ایک راستہ ہے۔ اگر ہم کسی طرح عائشہ کا منہ بند کر دیں تا کہ وہ راز نہ کھول سکے۔“

”کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟“

”میرے ایسے آدی قلعے میں موجود ہیں جو یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔“

”کیسا اس طرح مکمل خاں کو ہم پر شک نہیں ہوگا؟“

”شک ہو سکتا ہے، ثبوت تو نہیں ہوگا۔ عائشہ زندہ رہی تو انہم گواہ بن جائے گی۔“

یہ باتیں ہوئی رہیں اور یہ مجلس اس فیصلے پر ختم ہوئی کہ عائشہ کو موت سے ہٹکار کر دیا جائے۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کے لیے رومی خاں بھرپور حصہ لے سکتا تھا کیونکہ شاید اسی دن کے لیے اس نے اپنے بہت سے آدی قلعے میں اہم عہدوں پر متعین کیے تھے۔ برہان نظام شاہ کا اتالیق مکمل خاں دہلی اس سے ناواقف نہیں تھا لیکن وہ

عائشہ کو تیرے پاس لے کر آیا تھا؟ وہ اس کے ساتھ تھا؟“
 ”ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہی اسے خفیہ راستے سے حرم سرا سے باہر لے کر گیا تھا۔ آپ مجھ سے قسم لے لو۔“
 ”تو یہ بات مکمل خاں کے سامنے کہہ سکتی ہے؟“
 ”میں سب کے سامنے کہنے کو تیار ہوں۔ بس مجھے

رشوت لینے کے الزام میں سزا دینی دینی ملے گی۔“
 ”میں ضمانت لیتی ہوں کہ تجھے سزا نہیں ملے گی۔“
 برہان شاہ کی والدہ اس بوڑھی عورت کو لے کر مکمل خاں کے پاس چلی گئیں۔ اس نے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ بتا چکی تھی۔ ایک مرتبہ پھر زرباز خاں کو طلب کیا گیا۔ اس مرتبہ وہ باتیں چھپانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ اس نے قبول کیا کہ اس نے عائشہ کو فرار ہونے میں مدد دی تھی البتہ اس نے یہ ضرور بتایا کہ فرار ہونے کے بعد وہ کس سے ملی تھی، اس سے وہ ناواقف ہے۔ مکمل خاں نے بوڑھی عورت کو سرزنش کے بعد چھوڑ دیا لیکن زرباز خاں کو باقی عمر قید خانے میں گزارنی پڑی۔

اب ہر بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ سازش پکڑی گئی تھی۔ روی خاں اور اس کے ساتھی قصور وار پائے گئے تھے۔ الزام یہ تھا کہ انہوں نے عائشہ سے روابط بڑھائے اور راجا جیو کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تا کہ برہان نظام شاہ کی جگہ اسے تخت پر بٹھادیا جائے البتہ عائشہ کی موت کا ذمہ دار زرباز خاں کو قرار دیا گیا تا کہ یہ راز نہ مکمل جائے کہ فرار اس نے کرایا تھا۔ اس لیے اسے ہمیشہ کے لیے قید خانے کے سپرد کر دیا گیا۔

مکمل خاں دشمنی نے اپنے ہم خیال امراء کو جمع کیا اور آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا۔ طے یہ ہوا کہ راجا جیو کو شاہی نگرائی میں لے کر اس کی حفاظت کی جائے اور مخالف امراء کو شاہی فیصلوں سے دور رکھا جائے۔

یہ فیصلے روی خاں کے کانوں تک بھی پہنچے۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ فی الحال یہ معاملہ دب گیا ہے۔ موقع دیکھ کر کوئی سازش پھر تیار کی جائے گی۔

اس واقعے کے بعد مکمل خاں نے برہان نظام شاہ اور راجا جیو کی طرف بہت توجہ کی اور ان کی نگرائی بڑی کڑی نظر سے کرنے لگا۔

برہان نظام شاہ کی تعلیم کا ایسا عمدہ انتظام کیا کہ وہ صرف دس سال کی عمر میں عہدگی سے خط نسخ لکھنے کے قابل ہو گیا اور فارسی کتب نہایت روانی سے پڑھنے لگا۔

وقت کے ساتھ ساتھ روی خاں اور مکمل خاں کے

باہمی اختلاف پہلے سے کہیں زیادہ بڑھتے چلے گئے۔ روی خاں کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح یہ دوری کم ہو جائے۔ اس قربت ہی کی وجہ سے وہ اس قابل ہو سکا تھا کہ کوئی سازش تیار کر سکے لیکن مکمل خاں اب اتنا چوکنا ہو گیا تھا کہ کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا بلکہ روی خاں کے آدمی تو اسے یہ بتا رہے تھے کہ مکمل خاں اسے راستے سے ہٹانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔

روی خاں نے جب یہ دیکھا کہ موافقت کی کوئی صورت نہیں اور وہ اکیلا اس قابل نہیں کہ مکمل خاں کا زور توڑ سکے تو اس نے اپنی مدد کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس کی نظر علاؤ الدین عماد الملک پر گئی جو دکنی علاقے ”کادیل“ پر حکمرانی کر رہا تھا۔ برہان نظام شاہ کے باپ نظام شاہ سے اس کی پرانی دشمنی تھی۔ کئی معرکے ہوئے تھے جن میں عماد الملک کو شکست ہوئی تھی۔ وہ اب بھی احمد نگر کی طرف لاپٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن مکمل خاں دکنی کی طاقت کے سامنے بے بس تھا۔ اب جو روی خاں نے اس سے خط کتابت کی اور اسے یقین دلایا کہ احمد نگر کو فتح کرنے میں وہ اس کی مدد کرے گا تو اس کے خواب تعمیر کی طرف گامزن ہو گئے۔ یہ خط کتابت کئی ماہ تک جاری رہی اور بالآخر اس نے روی خاں کو خط لکھ دیا کہ وہ فرار ہو کر اس کے پاس ”کادیل“ پہنچ جائے۔

روی خاں نے اپنے دو بقیہ ساتھیوں کرم خاں اور امیر خاں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی اس مشورے کو پسند کیا۔ ان کی کوششوں سے پانچ اور امیر بھی اس مشورے میں شامل ہو گئے۔ آٹھ ہزار کا لشکر بھی مرتب ہو گیا اور یہ سب ایک رات احمد نگر سے فرار ہو کر ”کادیل“ پہنچ گئے۔

روی خاں نے عماد الملک سے بالمشافہ گفتگو کی اور اسے باور کرایا کہ احمد نگر کو فتح کرنا اس وقت نہایت آسان ہے۔

”احمد نگر پر اس وقت دس سالہ برہان نظام شاہ حکمرانی کر رہا ہے۔ مکمل خاں دکنی اور اس کا بیٹا سے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ نظام مملکت افراتفری کا شکار ہے۔ احمد نگر کے لوگ حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں۔ سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ اگر ہم اس صورت حال سے بدظن نہ ہوتے تو اپنا وطن کیوں چھوڑتے۔ اس وقت اگر احمد نگر پر حملہ کر دیا جائے اور ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں تو قلعہ بہ آسانی فتح کیا جاسکتا ہے۔ یہ اچھا موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھا لیجیے۔“

عماد الملک، روی خاں کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے

عماد الملک کی یہ حرکت ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جاسکتا۔ مکمل خاں نے پہلے تو عماد الملک کی جانب ایک خط روانہ کیا جس میں اس نے عماد الملک کو اس کے ارادوں سے باز رہنے کی تلقین کی تھی اور جب اس کا جواب نفی میں آ گیا تو اس کے آگے بڑھنے کی اطلاعات برابر آتی رہیں تو مکمل خاں نے بھی لشکر جمع کیا اور حاکم پرندہ خواجہ جہاں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت سے عماد الملک کی سرزنش کے لیے روانہ ہوا۔ دوسری طرف سے عماد الملک نے اپنی فوجوں کو آگے بڑھایا۔ ایک مقام قصبہ رانوری کے قریب دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ فریقین نے اپنی اپنی صفیں درست کیں۔ مکمل خاں نے برہان نظام شاہ کو کمسنی کی وجہ سے قلب لشکر میں رکھا اور ایک ترک غلام آذر خاں کو اس کی حفاظت کے لیے اس کا ردیف مقرر کر کے اس کے ساتھ رکھا۔

محمز دیکھتی تھی کہ مکمل خاں نے اپنے لشکر سے خطاب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ جب صبح کے وقت صفیں درست کر چکو تو پہل کرنے میں دیر نہ کرنا۔ عماد الملک نے بھی غالباً یہی ہدایت کر دی تھی چنانچہ جب صبح ہوئی اور فوجوں نے صفیں درست کر لیں تو دونوں فوجیں ایک ساتھ ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئیں۔ طرفین کے سپاہیوں نے بچنے کے لیے توڑ کووشیں کیں۔ نہایت گھمسان کارن پڑا۔ ابتدا میں عماد الملک کی فوج کا پلڑا بھاری تھا۔ عماد الملک برابر اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ جس طرح بھی ہو برہان نظام شاہ تک پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا جائے یا اسے نقصان پہنچایا جائے لیکن مکمل خاں نے اسے قلب لشکر میں رکھا تھا اور اس کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوبست کیا تھا لہذا عماد الملک اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ الٹا نقصان اٹھایا۔ برہان نظام شاہ کے تعاقب میں وہ اپنی فوج کی طرف سے غافل ہو گیا۔ اچھی خاصی فوج شکست میں بدل گئی۔ برہان نظام شاہ کی فوج غالب آنے لگی۔

آغاز دسمبر کے شمارہ

کا خوب صورت انداز

باطن کی اچھائی اور ظاہر کی برائی میں
لتھڑے کرداروں کے مصائب کی سنسنی خیز
داستان... پروین زبیر کے قلم سے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
ظاہر جاوید مغل کے باوگرا رسلے کی ایک اور کڑی

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پرکار نوجوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلہ دار کہانی

دسمبر کی شاموں میں بھگے
سرورق کہانی کی رعنائی و دلکشی

منظر امام، تنور، ریاض، سلیمہ انور،
امرشد بیک، جمال دوستی، تمکین مرزا
اور عکس فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا سہل

تھی کہ اس کے مخالف امیروں کو عماد الملک نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس نے عماد الملک کو معصوف رکھنے کے لیے اس سے چھینر چھاڑ شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کوئی ایسی وجہ بھی تلاش کرنی شروع کر دی جو کسی بڑے معرکے کا سبب بن سکے۔ جلد ہی ایک سبب اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے برہان نظام شاہ سے ملاقات کی اور اسے قاتل سے آگاہ کیا۔

”کیا آپ جانتے ہیں کہ قصبہ پاتری جو اس وقت عماد الملک کے قبضے میں ہے، آپ کے اجداد کا علاقہ ہے۔“
”وہ کیسے؟“

”ہم نے سنا ہے کہ نظام شاہیوں کے اسلاف میں کلکرنی نام کا ایک شخص تھا جو پرگنہ پاتری کا رہنے والا تھا۔ وہ کسی سبب سے غریب الوطن ہو کر بیجا نگر چلا گیا تھا۔ جب نظام شاہی خاندان کے ہاتھ میں حکومت آئی اور ان کی علیحدہ سلطنت (احمد نگر) قائم ہوئی تو وہ تمام برہمن جو بادشاہ احمد نظام شاہ سے قربت رکھتے تھے، قصبہ پاتری چھوڑ کر احمد نگر آ گئے۔ وہ پاتری سے بہت محبت رکھتے ہیں اور پاتری پر عماد الملک کا قبضہ ہے۔ ہم اس سے تقاضا کر سکتے ہیں کہ وہ پاتری واپس کر دے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میرے والد سے برہمنوں کی قربت داری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ حقیقت آپ پر آشکار ہو لیکن اب بتانا پڑے گا۔ احمد نظام شاہ کے اجداد برہمن تھے۔ ان میں سے ایک احمد شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اس نے مشرف بہ اسلام ہو کر اپنا نام ملک حسن رکھ لیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے شاہی غلاموں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ احمد شاہ بہمنی نے یہ غلام اپنے بیٹے محمد شاہ کو عطا کر دیا۔ سلطان محمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق ملک حسن کو وکیل سلطنت کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اس نے کئی علاقے فتح کر کے اپنے بیٹے ملک احمد کو عطا کیے۔“

”اس نے مرہٹوں کے کئی قلعے فتح کر لیے اور اپنے لیے احمد نظام الملک بجزی کا لقب اختیار کیا۔ دکن میں اس کا نام احمد نظام شاہ مشہور ہو گیا۔ اسی احمد نظام نے احمد نگر کی بنیاد رکھی۔ اس نے اس شہر کی تعمیر میں بہت دلچسپی لی۔ دو تین سال کی مدت میں یہ شہر مصر اور بغداد کی طرح آباد ہو گیا۔ آج اسی احمد نگر کے آپ حکمران ہیں۔“

برہان نظام شاہ نے یہ داستان پوری دلچسپی سے سنی

حالات ایسے بگڑے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔ عماد الملک کی فوج میدان سے بھاگ کھڑی ہوئی اور کاویل تک راستے میں کہیں بٹھہری۔

مکمل خاں نے برہان نظام شاہ کو ساتھ لے کر مفرور و... کا تعاقب کیا۔ عماد الملک کھرا کر برابر میں داخل ہو گیا۔ مکمل خاں نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ عماد الملک نے نہایت ہوشیاری سے اپنی فوج کو پیچھے کیا اور برابر کے علما و مشائخ کو مکمل خاں کے پاس بھیجا۔ ان لوگوں نے فریقین میں اس شرط پر صلح کرادی کہ ہر فریق اپنے اپنے ملک کو واپس چلا جائے۔

مکمل خاں نے بادل ناخواستہ علما کی بات مان لی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ اسماعیل عادل شاہ کہیں احمد نگر کو اکیلا دیکھ کر چڑھ نہ دوڑے۔ وہ تیزی سے سفر کرتا ہوا احمد نگر واپس آ گیا۔

☆☆☆

بے جا پور کے حاکم یوسف عادل کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا اسماعیل عادل شاہ کم سن تھا اس لیے عنوان حکومت اس کے ایک امیر کمال خاں نے سنبھال لی تھی۔ احمد نگر میں بھی یہی ہوا تھا کہ برہان نظام شاہ بوجہ کسی سخت پر بیٹھا ضرور تھا لیکن حکومتی نظام مکمل خاں دکنی اور اس کے بیٹے کے ہاتھ میں تھا۔ وہی سیاہ سفید کے مالک تھے۔ فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ اسماعیل عادل شاہ کی والدہ پوچھی خاتون کی تدبیروں سے کمال خاں کو قتل کر دیا گیا تھا اور نظام حکومت اسماعیل عادل شاہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

اسماعیل عادل شاہ کے کئی سال کمال خاں کے طرف داروں سے لڑائیاں کرتے ہوئے گزر گئے تھے اور اب اس کی نظریں احمد نگر پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ برہان نظام شاہ جوانی کی عمر کو پہنچنے کے باوجود مکمل خاں دکنی کا محتاج تھا یا مکمل خاں نے اسے اپنا محتاج بنایا ہوا تھا۔

مکمل خاں بھی اس کے ان ارادوں سے غافل نہیں تھا اور اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ اسماعیل عادل شاہ کی طاقت بڑھنے سے پہلے ہی اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر لے۔ اسی دوران اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسماعیل عادل شاہ، عماد الملک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے اور اس کے ساتھ مل کر احمد نگر کی طرف بڑھے گا۔ اس نے اس سواری کی ٹانگیں تراشنے کا ارادہ کر لیا جس پر اسماعیل عادل شاہ سواری کرنے کا خواہاں تھا۔ عماد الملک سے کشیدگی برقرار تھی۔ چھوٹی چھوٹی جہز پیش بھی چلتی رہتی تھیں۔ اسے یہ پُر غاش بھی

اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ آپ نے مجھے تو بتا دیا ہے، عماد الملک کو اس کی ہوانہ لگے۔“
”آپ کیا سمجھتے ہیں، عماد الملک کو یہ سب کچھ معلوم نہیں ہوگا؟“

”اسے معلوم ہو لیکن آپ اپنی تحریر میں اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیں۔“

”میں اسے کچھ نہیں لکھوں گا۔ صرف یہ لکھوں گا کہ قصبہ پاتری آپ کے اجداد کا ہے اسے آپ کے حوالے کر دے۔“ برہان نظام شاہ نے منظوری دے دی اور مکمل خاں دکنی نے عماد الملک کے نام خط لکھ دیا۔

”ہمارا قصبہ پاتری سے جو تمہارے ملک میں داخل ہے اور سرحد پر واقع ہے، بہت پرانا تعلق ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان جو صلح ہوئی تھی، اس کا تقاضا ہے کہ تم اس قصبے کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس کے عوض تم ہمارے ملک کا جو قصبہ چاہو ہم سے لے لو۔“

برہان نظام شاہ نے اس خط پر اپنی مہر ثبت کی اور یہ خط عماد الملک کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ عماد الملک نے یہ پیشکش اور مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔

عماد الملک اب چونکا ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ برہان نظام شاہ نچلا بیٹھنے والا نہیں۔ اس مسئلے پر وہ بھی نہ کبھی ایک بڑی جنگ ضرور لڑے گا۔ اس کی تیاری ابھی سے کر لینی چاہیے۔ اس نے اس مقام پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کروانا شروع کر دیا۔

تعمیر نہ تو پوشیدہ رہ سکتی تھی اور نہ عماد الملک نے اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ برہان نظام شاہ نے اس وقت مکمل خاں کو اپنے حضور طلب کیا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دربار کو آراستہ دیکھا۔ اس کا بیٹا جمال الدین بھی وہاں موجود تھا۔ مکمل خاں نے اسے برہان نظام شاہ کی... خود سری سے تعبیر کیا لیکن جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ برہان نظام شاہ کو اطلاع پہنچی تھی اور اس کے ازالے کے لیے اس نے درباریوں کو جمع کیا تھا۔

”میں نے آپ سب لوگوں کو اس لیے زحمت دی کہ عماد الملک نے ایک مرتبہ پھر سراٹھایا ہے۔“

”کیا وہ پچھلی جنگ کا انجام بھول گیا؟“ ایک امیر نے نکوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”پچھلی جنگ کے انجام ہی نے اسے یہ راہ دکھائی ہے۔“
”کیسی راہ؟“

”وہ صوبہ پاتری کے مقام پر قلعے کی تعمیر میں

فرق

ایک شخص سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک آدمی نیچے جھکا ہے، کوئی چیز اٹھا رہا ہے اور سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ وہ اس شخص کے قریب جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سمندر کے کنارے ریت پر بے شمار پھلیاں تڑپ رہی ہیں۔ شاید کسی بڑی موج نے ان کو ساحل سمندر پر پھینک دیا تھا اور وہ شخص ان کو واپس سمندر میں پھینک رہا تھا کہ ان کی جان بچ جائے اسے اس شخص کی بے وفائی پر فہمی آگئی اور وہ کہنے لگا۔ ”ارے بھائی صاحب! اس سے کیا فرق پڑے گا۔ تم کتنی پھلیوں کو بچا لو گے؟“ یہ سن کر وہ شخص مسکرایا۔ اس نے ایک پھلی اٹھا لیا اور سمندر میں پھینک دیا۔ وہ پھلی تیزی سے پانی پر تیرتی ہوئی دور نکل گئی۔ اس پر اس شخص نے دوسرے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے دیکھا اسے فرق پڑا ہے۔“ اور پھر پھلیاں اٹھا کر سمندر میں پھینکتے لگا۔

موازنہ

لھان حکیم کو ان کے آقا نے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کر دو اور اس کے گوشت کے دو بہترین ٹکڑے میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے بکری ذبح کی اور اس کا دل اور زبان لے جا کر آقا کے سامنے رکھ دی۔ پھر آقا نے حکم دیا کہ ایک اور بکری ذبح کر دو اور اس کے گوشت کے دو بدترین ٹکڑے میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے دوسری بکری ذبح کی اور اس کا بھی دل اور زبان آقا کی خدمت میں پیش کر دی۔ مالک بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا۔ ”اے لھان! یہ کیا... تم دو بہترین ٹکڑے دل اور زبان لے کر آئے اور دو بدترین ٹکڑے بھی دل اور زبان ہی لے کر آئے؟“

لھان حکیم نے فرمایا۔ ”اگر دل اور زبان اچھے رہیں تو ان سے بہتر جسم کا کوئی دوسرا حصہ نہیں ہو سکتا اور اگر یہ دونوں بگڑ جائیں تو ان سے بدتر جسم کا کوئی عضو نہیں ہو سکتا۔ یہ بہتر ہیں تو بہترین ہیں اور بگڑ جائیں تو بدترین ہیں۔“

مرسلہ: جادو یا اختر رانا۔ پاکپتن شریف

مکمل خاں کے بہادر سپاہیوں نے کندوں اور زینوں کے ذریعے قلعے کے میناروں پر چڑھ کر حصار کو تغیر کر لیا۔ قصبہ پاتری نظام شاہیوں کے قبضے میں آ گیا۔ برہان نظام شاہ نے اپنے ایک امیر میاں محمد غوری کو مکمل خاں کے خطاب سے نوازا اور قلعے کا حاکم مقرر کر کے واپسی کا بھگ بجا دیا۔

لشکر اور بھاری ساز و سامان پیچھے آتا رہا اور برہان نظام شاہ ہر اول کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔ دولت آباد کے مقام پر ایک گاؤں کے قریب موسیقی کی مضر تانوں نے اس کے قدم روک لیے۔ جوانی کے قدم بے خوفی کے سائے میں پلٹے ہیں۔ اس نے اپنے مختصر لشکر کو باہر پھوڑا اور خود گاؤں میں داخل ہو گیا۔ بڑے بڑے گیس کے ہنڈے جل رہے تھے۔ بہت سے لوگ دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان ایک قتالہ عالم رقاصہ موجود تھی۔ کسی نے توجہ بھی نہیں دی اور وہ ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس کے حسن کا نظارہ کرنے لگا۔

برہان نظام شاہ حکمران تھا۔ دربار میں رقاصوں اور موسیقی دانوں کی کمی نہیں تھی لیکن اس رقاصہ میں کوئی ایسی بات بھی کہ وہ دل ہار بیٹھا۔

”بھائی یہ رقاصہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔“
”تم کیا اس گاؤں کے نہیں ہو یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو؟“ اس آدی نے اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا اور پھر غیر ارادی طور پر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا شامی لباس دیکھ کر جیسے سرے پاؤں تک کانپ گیا۔
”اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھار ہی ہیں تو آپ برہان نظام شاہ ہیں یا کوئی اور حکومتی عہدیدار۔“

”میں کوئی بھی ہوں جو چوہدری ہا ہوں اس کا جواب دو۔“
”اس کا نام بھان متی ہے۔ قصبہ پاتری سے آئی ہے۔ گاؤں کے کھیا کے بیٹے کی شادی ہے۔“ اس آدی نے کہا اور بھاگ کر کھیا کو بلا لایا۔ مجمعے میں مہلبلی جگ مئی۔ کھیا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”حضور! مجھے خدمت کا موقع دیجیے۔“
برہان کو اس کھیا سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن بھان متی کے رقص میں دلچسپی نے اسے وہاں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جانے کہاں سے ایک کرسی منگوائی گئی اور برہان نظام شاہ وہاں بیٹھ گیا۔ اس کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ تارے سے مہتاب بن گئی۔ بھوڑے نے پھول کو دیکھا پھر تو جیسے باغ میں سچھ نہیں تھا۔ ایک بھوڑا اک پھول۔

معصوف ہے۔ اس قلعے کی تعمیر سے اس کے دو مقاصد پورے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ممالک کی حفاظت کر سکے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ یہ وقت ضرورت اسلحہ عادل شاہ کی فوجوں کو وہاں بٹھرا سکتا ہے جو ہمارے لیے ہمیشہ خطرہ بنی رہیں گی۔“

”وہ یہ قلعہ اپنی سرحد میں بنوا رہا ہے۔ ہم اسے کس طرح روک سکتے ہیں؟“ امراء نے یہ ایک آواز کہا۔ مکمل خاں اب تک خاموش بیٹھا تھا لیکن اب وہ خاموش نہ رہ سکا۔
”ہم اسے ٹوک بھی سکتے ہیں اور روک بھی سکتے ہیں۔ ایسا کرنا ہمارے لیے اس لیے ضروری ہے کہ اگر قلعہ تعمیر ہو گیا تو ہم ہمیشہ خوف میں مبتلا رہیں گے۔ کسی سرحدی مقام پر قلعہ تعمیر کرنا تو بھی جتنی قوانین کے خلاف ہے۔“
”پھر جو کرنا ہے آپ ہی کریں۔ ہم تو آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں۔“

مکمل خاں نے اجازت ملے ہی عماد الملک کو لکھا۔
”سرحدی مقام پر تمہیں قلعہ تعمیر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح تمہارے سپاہی ہمیشہ ہم سے جنگ کرتے رہیں گے اور اس طرح ہمیں تکلیف پہنچتی رہے گی۔ بہتر ہے کہ تم قلعے کی تعمیر کا کام فوراً روک دو۔“

عماد الملک تک یہ خط پہنچا ضرور لیکن اس نے اس خط کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ اس کی یہ بے توجہی دیکھ کر مکمل خاں کے سامنے جنگ کے سوا دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس نے یہ مشہور کیا کہ وہ بلا گھاٹ اور دولت آباد کی سیر کے لیے نکلتا جا رہا ہے۔ اس بہانے اس نے فوج جمع کرنا شروع کر دی۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ دولت آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ برہان نظام شاہ اس کے ہمراہ بھی تھا اور حقیقت حال سے واقف بھی۔

عماد الملک اس کا ردوائی سے بے خبر تھا۔ قلعہ تعمیر ہو چکا تھا اور عماد الملک اس کی حفاظت کا انتظام کر کے اپنے ممالک کی طرف لوٹ گیا تھا کہ مکمل خاں بلائے ناگہانی کی طرح قلعے کے سامنے پہنچ گیا اور پاتری پر حملہ کر دیا۔ قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جو اندر تھا وہ اندر رہ گیا۔ قلعہ تو تعمیر شدہ تھا۔ ابھی یہاں اتنا لشکر اور اناج نہیں تھا کہ محصورین زیادہ دن تک محاصرے میں رہ سکتے جبکہ رسد پہنچنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔ مکمل خاں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا اندیشہ تھا کہ عماد الملک اپنے لوگوں کی مدد کو ضرور پہنچے گا اور ممکن ہے اسلحہ عادل شاہ کو بھی مدد کے لیے بلا لے۔

نئی جوانی نے یہ گل کھلائے تھے۔ اب اس کا علاج کوئی نہیں تھا۔

رات بھر پورا لشکر شب خون کے خوف سے جاگتا رہا اور برہان شاہ داد و بخش دیتا رہا۔

صبح ہوئی اور برہان شاہ کے حکم سے لشکر نے کوچ کیا تو مکمل خاں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بھان متی نامی راقصہ برہان شاہ کے ساتھ تھی۔

احمد نگر پہنچتے ہی برہان شاہ نے تو جیسے مکمل خاں کی طرف سے آنکھیں ہی پھیر لیں۔ اس نے کسی بھی امیر کو اپنے پاس طلب کرنا چھوڑ دیا۔ وہ سلطنت کے کاموں سے غافل ہو کر بھان متی کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔

مکمل خاں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ چند دنوں کا نشہ ہے اتر جائے گا لیکن جب اس نے یہ سنا کہ برہان شاہ نے اس بازاری عورت سے شادی کر لی اور حرم کی دوسری عورتوں پر اسے فوقیت دینے لگا ہے تو اسے انجام صاف نظر آنے لگا۔ اس نے اپنا پہلو بچانا ہی مناسب سمجھا۔ ایک روز موقع دیکھ کر برہان شاہ کے حضور پہنچ گیا اور وزارت کی انگوٹھی اتار کر اس کے آگے رکھ دی۔

”حضور! وکالت و وزارت کی انگوٹھی حاضر ہے۔ جب تک آپ کم عمر تھے، میں نے اپنی ضعف العری کے باوجود آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اب جبکہ حضور خود مہمات سلطنت انجام دینے کے قابل ہو گئے ہیں مجھے معاف فرمایا۔“

برہان شاہ تو خود یہی چاہتا تھا کہ اسے کوئی سمجھانے والا نہ رہے۔ اس نے تھوڑی سی بناوٹی حیل و حجت کے بعد درخواست قبول کر لی۔

مکمل خاں نے تمام سیاسی و ملکی معاملات سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے مکان میں خلوت نشیں ہو گیا۔ اس کے بعد اپنے انتقال تک خلوت نشیں ہی رہا۔ کبھی عید بقرعید حاضر دربار ہو جاتا تھا اور بس۔

☆☆☆

اسطیغیل عادل شاہ دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ عماد الملک نے کئی مرتبہ اسے احمد نگر پر حملے کے لیے اکسایا تھا لیکن اسے اپنے علاقے سے نکلنے کی فرمت نہیں مل رہی تھی بلکہ اب تو اسے یہ خوف ہونے لگا تھا کہ برہان شاہ صورت حال سے جنگ آ کر اس کے علاقے کی طرف نہ چڑھ دوڑے۔ اس کے وزیر اسد خاں لاری نے اسے مشورہ دیا کہ برہان نظام شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔

بھونرے نے چاہا پھول کا سارا رس پی جائے لیکن فی الوقت تو صرف اتنا کر سکا کہ گلے میں پڑا ہوا مردارید کا ہارس کی طرف اچھال دیا۔ پھول اپنی شاخ سمیت جھک گیا۔ مسجد سے اذان بلند ہوئی اور محفل برخواست ہوئی۔ بھان متی نے اس کے قدموں میں سجدہ کیا۔

”آج رات گاؤں سے باہر ہمارے خیمے میں آکر ہم سے ملو۔“

”جو حکم سرکار کا۔“

برہان نظام شاہ اس گفتگو کے بعد اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد کھیا آگے بڑھا اور بھان متی سے تحسانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

”تم میرے مینے کی فکر چھوڑ دو اور فوراً برہان نظام شاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم پر کوئی مصیبت ٹوٹے۔“

”آپ سے زیادہ مجھے فکر ہے۔ میرے وطن قعبدہ پاتری پر برہان نظام کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اسے خوش کر کے ہی میں اپنے وطن میں خوش رہ سکتی ہوں۔“

مکمل خاں دکنی رات بھر اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ وہ اپنے خیمے میں پہنچ گیا، اس نے باریابی کی اجازت مانگی اور حضور میں پہنچ گیا۔

”ہو سکتا ہے عماد الملک ہمارے تعاقب میں نکل چکا ہو۔ ہمیں فوراً احمد نگر پہنچنا چاہیے تھا۔ آپ نے ایک رات ضائع کر دی۔ اب بھی وقت ہے، آپ فوراً روائی کا حکم جاری فرمائیے۔“

”ہم آج کی رات بھی یہیں گزاریں گے۔“

”یہاں..... اس دیرانے میں دشمن سے بے خوف ہو کر؟“

”ہمیں کسی کی پروا نہیں۔ ہم نے جو کھدو یا سو کھدو یا۔“

”لیکن معلوم تو ہو، آپ آج کی رات رکنے پر کیوں

بےحد ہیں؟“

”ہم آپ کو کچھ بتانے کے پابند نہیں۔“

اس قطعی جواب کے بعد مکمل خاں کا وہاں بیٹھنا فضول تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ آیا لیکن حیران ضرور تھا کہ برہان شاہ کو ایسا کیا ضروری کام ہے جس کے لیے وہ ہم سب کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ اب ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے فوراً سپہ سالار کو طلب کیا اور اسے مکمل تیار رہنے کا حکم دیا۔

رات ہوتے ہی برہان شاہ نے اپنے آدھی بیچ کر بھان متی کو بلوایا۔ اب مکمل خاں پر عقدہ کھلا کہ وہ رات کو یہاں کیوں رکھا تھا۔ برہان شاہ کو سمجھنا تباہ کار تھا۔ اس کی

”اس کی صورت کیا ہوگی اور ضرورت کیوں ہے؟“
اسٹعلیل عادل شاہ نے کہا۔

”صورت تو یہ ہوگی کہ شادی وغیرہ کا سلسلہ استوار کیا جائے۔ ضرورت اس لیے ہے کہ اس مشترکہ طاقت کے ساتھ اپنے اڑنی دشمن قاسم برید سے باز پرس کی جائے اور اس کو خوب مزہ چکھایا جائے۔ اسی طرح دوسرے حریفوں سے بھی نمٹا جاسکتا ہے۔“

اسٹعلیل عادل شاہ نے اسد لاری کا مشورہ مان لیا اور اس کو شش میں لگ گیا کہ عماد الملک کے علم میں لائے بغیر برہان نظام شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ بہر حال دونوں طرف کے امراء کی کوششوں سے برہان شاہ اور اسٹعلیل عادل شاہ نے قلعہ شولا پور کے نواح میں ملاقات کی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں اسٹعلیل عادل شاہ نے اپنی بہن مریم سلطانہ کی شادی برہان نظام شاہ سے کر دی۔

اسٹعلیل عادل شاہ کے کسی امیر نے برہان نظام شاہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ قلعہ شولا پور بی بی مریم کے جہیز میں دے دیا جائے گا لہذا شادی ہو جانے کے بعد برہان نظام شاہ نے اس قلعے کا مطالبہ کیا۔ اب خدا جانے اسٹعلیل عادل شاہ کے علم میں تھا یا بعد میں اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”میں نے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اگر ملازموں میں سے کسی نے ایسی کوئی بات کی تھی تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ مجھ پر یہ لازم نہیں کہ ان کے کہے ہوئے وعدے کا پابند رہوں۔“

برہان نظام شاہ اس وقت تو خاموش رہا اور احمد نگر واپس آ گیا لیکن واپس آتے ہی قلعہ شولا پور فتح کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس کڑے وقت میں اسے علاء الدین عماد الملک کی یاد آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسٹعلیل عادل شاہ اور عماد الملک کے تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس نے اس کشیدگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک سفارت عماد الملک کی طرف روانہ کی اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ نتیجہ اس کی مرضی کے مطابق نکلا۔ عماد الملک، اسٹعلیل عادل شاہ سے جلا بیٹھا تھا، فوراً اس درخواست کو قبول کر لیا۔

برہان نظام شاہ تیس ہزار سواروں اور ایک بڑے توپ خانے کے ساتھ قلعہ شولا پور کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ عماد الملک کی فوجیں بھی اس کے ساتھ مل گئیں۔

اسٹعلیل عادل شاہ بھی تجربہ کار تیر اندازوں کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلا۔ برہان نظام شاہ کے ساتھ ایک بڑا لشکر تھا لیکن ایک زبردست لڑائی کے بعد نظام شاہیوں کو شکست ہو گئی۔ عماد الملک ”کاوہل“ کی طرف بھاگ گیا اور برہان نظام شاہ احمد نگر واپس آ گیا۔

یہ شکست ایسی تھی کہ برہان نظام شاہ کے ہوش جاتے رہے۔ وہ ایسا مایوس ہوا کہ بھانستی کے تازخے بھی اسے نہیں بہلا سکتے تھے۔ اس وقت اس کی مایوسی میں مزید اضافہ ہو گیا جب اس نے سنا کہ اسٹعلیل عادل شاہ نے قصبہ پاتری پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کا غصہ مایوسی پر غالب آ گیا۔ وہ ایک زبردست لشکر لے کر پاتری کی طرف روانہ ہوا اور دو ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے دوبارہ اپنے قبضے میں لے آیا۔

برہان نظام شاہ اس مقام سے قلعہ ماہور کی طرف روانہ ہوا۔ اس قلعے کو بھی اس نے فتح کر لیا۔ عماد الملک مقابلے کی تاب نہ لا کر پہلے کی طرح برہان پور کی طرف بھاگ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے پہلے کی طرح صلح کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے بلکہ ارد گرد کے کئی حکمرانوں سے مدد لے کر برہان نظام شاہ اور اس کے اتحادی احمد آباد بیدر کے حکمران قاسم برید سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

بدقسمتی سے اس لڑائی میں بھی عماد الملک اور اس کے اتحادیوں کو شکست ہو گئی۔ عماد الملک گھبرا کر برہان پور کی طرف بھاگا۔

اس جنگ میں برہان نظام شاہ کے ہاتھ دشمن کا بہت سامان و اسباب لگا۔

اب عماد الملک کے لیے دکن میں کوئی سہارا نہیں رہ گیا تھا۔ اسٹعلیل عادل شاہ سے اسے امید نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ اس کی بہن برہان نظام شاہ کے گھر میں تھی۔

☆☆☆

دوسرا کاویل اپنی پور سے سحرات جانے والی سڑک پر دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں کام کرنے والے ان سواروں کی برق رفتاری دیکھ کر کسی سوچ میں کم ہو گئے تھے۔

”یہ کوئی عام سوار نہیں ہیں۔ شاہی سوار مظلوم ہوتے ہیں۔ عماد الملک کی طرف سے آرہے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ آتی جلدی میں کہاں جا رہے ہیں؟“
”دیکھتے نہیں، یہ سڑک سحرات کی طرف جاتی ہے۔“

دونوں سوار اس کا پیغام پہنچانے کے لیے عماد الملک کی طرف روانہ ہو گئے۔

دونوں قاصدوں کے روانہ ہوتے ہی سلطان بہادر نے تیاری شروع کر دی اور اپنے لشکر اور خزانے کو لے کر دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔

برہان نظام شاہ کو جب اس تیاری کا علم ہوا تو اس نے اسماعیل عادل شاہ اور قلی قطب شاہ کے نام خطوط روانہ کیے۔ قلی قطب شاہ اس وقت کسی اور مہم میں مصروف تھا اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا البتہ اسماعیل عادل شاہ نے برہان کی مدد کی اور اپنے لشکر سے چند ہزار سوار منتخب کر کے ان کو امیر برید کے ساتھ مع خزانہ و سامان جنگ امیر برید کے ہمراہ روانہ کر دیے۔

سلطان بہادر ماہور اور پاتری کو نظام شاہیوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے برابر میں داخل ہوا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ یہاں مقیم ہو گیا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر عماد الملک کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ اس نے سلطان بہادر کی خدمت میں عرض کیا۔ ”یہ میرا ملک ہے۔ آپ کو چاہیے کہ پیش قدمی کریں۔ برہان نظام شاہ کوتاہ و برباد کر کے اگر آپ اس کے ملک کا کچھ حصہ مجھے بھی عنایت فرمائیں تو میں اپنے بیوی بچوں کو بھیج کر مذکورہ علاقہ سارے کا سارا آپ کی نذر کر دوں گا اور ملازموں کی طرح آپ کے ساتھ رہوں گا۔“

سلطان بہادر نے یہ درخواست قبول کر لی اور نظام شاہی فوج کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جو پہاڑی علاقے میں مقیم تھی۔

پہلے حملے میں اسے شکست ہو گئی لیکن سلطان بہادر نے عماد الملک کی ہنگامی میں بیس ہزار سواروں کا ایک دوسرا لشکر روانہ کیا۔ برہان نظام شاہ اور امیر برید میں اس لشکر سے مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی۔ برہان نظام شاہ خواجہ جہاں کے علاقے ”پرندہ“ کی طرف فرار ہو گیا۔

گجراتیوں نے تعاقب ضرور کیا لیکن برہان نظام شاہ ”پرندہ“ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

برہان نظام شاہ ”پرندہ“ میں تھے۔ وہاں ہی کے دروازے اس پر بند ہو چکے تھے۔ سلطان بہادر بے خوف و خطر احمد نگر پہنچ گیا اور باغ نظام میں قیام پذیر ہوا۔ یہاں ایک وسیع چوڑا تبا ہوا تھا اور دور تک وسیع میدان تھا۔ وہ اس وسیع چوڑے پر پڑھ گیا۔ اہل شہر کو حکم ہوا کہ اس کے

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن کیا گجرات میں بھی جنگ چھڑ گئی؟“

”گجرات کی جنگ سے ہمارا کیا تعلق۔“

”احمد نگر کا بادشاہ مارا مارا رہتا ہوا ہے۔ عماد الملک کمزور پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے عالم گجرات سلطان بہادر گجراتی کو مدد کے لیے نکال رہا ہو۔“

”مشکل ہے مگر کیا خبر۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مدد ہی مانگتی تھی تو اسماعیل عادل شاہ کو بھی پکار سکتا تھا۔“

”اب وہ زمانے گئے۔ اسماعیل عادل شاہ کی بہن برہان نظام شاہ کے گھر میں ہے۔ اب وہ اس کے خلاف نہیں اڑ سکتا۔“

یہ سوار دیہاتیوں کی باتوں کو چھوڑ کر کب کے آگے بڑھ چکے تھے۔ اب وہ کچی سڑک پر رواں دواں تھے۔ دن کی دھوپ ان کے سروں سے گزری اور شام کے اندھیرے پھیلنے لگے۔ وہ شہر میں داخل ہوئے تو دکا نہیں بند ہونے لگی تھیں۔ سلطان بہادر سے ملاقات کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ رات کسی سرائے میں ہی گزاری جا سکتی تھی۔ مسئلہ زبان کا بھی تھا۔ وہ یہاں کی زبان سے ناواقف تھے۔ کسی نہ کسی طرح مقامی افراد سے سرائے کا پتا پوچھ لیا۔

”یاد رکھو، ہمارے پاس بہت سی تحائف ہیں۔ نیا ملک ہے نئے لوگ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ سرائے میں ہم اس مال سے ہی محروم ہو جائیں۔“

”ہاں، ہمیں بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔“ وہ ایک سرائے میں پہنچ گئے۔ مال کی فگر میں نیند کہاں آتی۔ رات باتوں میں کاٹ دی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے سرائے چھوڑی اور قلعے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پہرے داروں کو عماد الملک کی طرف سے دیا ہوا خط دکھایا اور اپنی شناخت کرائی۔

ان پہرے داروں نے انہیں دروازے کے قریب ایک وسیع کمرے میں بٹھا دیا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی۔ پہرے دار تو انہیں بٹھا کر بھول گئے تھے۔ دوپہر کے قریب انہیں سلطان بہادر کے حضور پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے وہ تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے جو عماد الملک نے اس کے لیے بھیجے تھے اور خط اس کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا۔

”عماد الملک سے کہنا وہ تیاری کرے، ہم اس کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ حاکم احمد نگر سے ہمیں بھی بہت سے حساب چکانے ہیں۔“

سلام کو حاضر ہوں۔ وہ چالیس روز تک متواتر اس چبوترے پر بیٹھا رہا۔ ہر خاص و عام کا سلام لیتا۔ ہاتھی، اونٹ اور ہر تن میدان میں چھوڑے جاتے اور بادشاہ ان کی لڑائی کا تماشا دیکھتا۔

وہ ان کھیل تماشوں میں مگن تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے لشکر پر کیا بیت رہی ہے۔ نظام شاہی امراء بڑی چالاکی سے سبھرائیوں کے لشکر کی بے چینی بڑھا رہے تھے۔ یہ لوگ غلہ اور ضرورت کی دوسری چیزوں کو بہ آسانی سبھرائیوں تک نہ پہنچنے دیتے تھے۔ حالت یہ ہوئی کہ سبھرائیوں کے لشکر میں سخت قحط پڑ گیا۔ بے شمار ہاتھی اور گھوڑے ہلاک ہو گئے۔

یہ صورت حال دیکھ کر سبھرائی امیروں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ سب کے سب سلطان بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مشکل سے آگاہ کیا۔

طویل ترین اجلاسوں کے بعد ان امراء نے مشورہ دیا کہ اگر اس ملک کو بچ کرنا ہے تو سب سے پہلے قلعہ دولت آباد کو تسخیر کرنا چاہیے جو کہ سرحد پر واقع ہے۔

سلطان بہادر کو یہ تجویز پسند آئی لیکن احمد نگر کی رونق دیکھ کر اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس چبوترے سے اتر کر کہیں اور جائے۔ وہ یہاں سے کوچ کرنے میں حیلے بہانے کرنے لگا۔ صاف جواب بھی نہیں دیتا تھا اور کوچ بھی نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ اپنے پلنگ پر لیٹا نیند کے مزے لے رہا تھا کہ عفریوں کا ایک گروہ اس کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ یہ عفریت نہایت بھیاں بھیاں شکلوں کے تھے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں آگ تھی اور کسی نے اپنے ہاتھوں میں پہاڑ اٹھایا ہوا تھا۔ قریب تھا کہ وہ یہ سب چیزیں سلطان بہادر پر ڈال دیں کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا لیکن شکر بھیج رہا تھا کہ یہ محض خواب تھا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو خوف اس پر ایک مرتبہ پھر غالب آ گیا۔ یہ خوف بلا وجہ نہیں تھا۔ کوئی طاقت ہے جو اسے یہاں سے بھگانا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے خواب کی تعبیر بتانے والوں کو بلایا۔ کسی نے کچھ تعبیر بتائی کسی نے کچھ۔ ایک بوڑھا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اس نے بتایا۔

”نظام شاہ (برہان نظام شاہ کا باپ) کے زمانے میں اس مقام پر بہت بڑی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد قتل کر دی گئی تھی۔ ان مقتولوں کی روضیں

اسی مقام پر رہنے لگی ہیں اور شیطانوں کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خواب انہی روضوں کے زیر اثر آپ کو نظر آیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے یہ روضیں نہیں چاہتیں کہ میں یہاں رہوں؟“

”مطلب آپ خود اخذ کر سکتے ہیں۔ آپ اگر یہاں قیام کیے رہے تو آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔“ سلطان بہادر پر چپکلی طاری ہو گئی۔ اس نے اسی دن اس مقام سے کوچ کر کے ایک اور مقام پر پڑاؤ ڈالا اور پھر دو دین روز کے بعد وہاں سے بھی روانہ ہو گیا۔ عماد الملک کو بھی طلب کر لیا اور دولت آباد کے مقام پر قیام پذیر ہو گیا تاکہ قلعہ دولت آباد کی تسخیر کے لیے کوشاں ہو۔

برہان شاہ بے گھر ہو کر ابھی تک ”پرندہ“ میں مقیم تھا۔ اسے دولت آباد کی تسخیر کا اندیشہ ہوا تو اس نے گھبرا کر اسماعیل عادل شاہ کو خط لکھا۔

”آپ نے جس برا اور انجبت سے میری مدد کی میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں لیکن جب تک آپ بذاتِ خود اس طرف توجہ نہیں کریں گے مجھے مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔ سلطان بہادر دولت آباد تک آ گیا ہے۔ مجھے اس سے چھٹکارا دلایئے۔“

ایک قاصد بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہوا اور اسی برق رفتاری سے واپس پلٹا۔ اسماعیل عادل شاہ نے پیغام بھیجا تھا۔

”بیجا نگر کے ہندو اس وقت موقع کی تلاش میں ہیں۔ اگر میں بیجا نگر سے نکلوں گا تو یہ لوگ دریائے کرشنا عبور کر کے سارے شہر کو برباد کر دیں گے۔“

برہان نظام شاہ اس جواب سے سخت مایوس ہوا۔ اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ کوئی امیر ساتھ نہ تھا، صرف سپاہی تھے۔ حرم کی کچھ خواتین تھیں۔ ان میں بھان متی بھی تھی۔ یہ بھان متی ہی تھی جس کی وجہ سے اس کا دل لگا ہوا تھا۔ وہ بھی جان چکا تھا کہ بھان متی صرف رقاصہ نہیں بلکہ نہایت عقل مند عورت ہے۔ اس کے مشورے اکثر اوقات اس کے کام آتے رہے تھے۔ اس نے بھان متی کو طلب کیا۔

”خیر تو ہے، کیا آج دن کے وقت مجھے ساقی گری کرنی ہوگی؟ میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ دن کے وقت شراب نہ پیا کریں۔“

”میں نے اس وقت تمہیں کسی اور کام سے بلایا ہے۔“

”بندی حاضر ہے۔“

واپسی کی فکر ہوئی لیکن ان دنوں دریاؤں میں پانی بہت چڑھا ہوا تھا۔ برہان نظام شاہ نے ایک مرتبہ پھر ایک چال چلی۔ اس نے سلطان بہادر کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنے آدمیوں کو تحفوں اور نذرانوں کے ساتھ اس کی خدمت میں بھیجا۔ جب اس نے دیکھا کہ کوئی اس کے مطیع ہو گئے ہیں تو اس نے دکنیوں کی مخالفت ترک کر دی اور گجرات واپس چلا گیا۔

☆☆☆

بھان متی کی کثرت شراب نوشی نے اسے موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ شاہی محکموں کی کوششیں رائیگاں چلی گئی تھیں۔ اس کا آخری وقت تھا۔ برہان نظام شاہ اپنے جھیلیوں میں پڑ کر بھان متی کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو چکا تھا۔ بھان متی نے طبیبوں کی منت سماجت کر کے برہان نظام شاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ کسی طرح اس کا پیغام برہان تک پہنچا یا گیا۔ اسی وقت عماد الملک کی طرف سے آئی ہوئی سفارت رخصت ہوئی تھی۔ برہان کا مزاج خوشگوار تھا۔ وہ ملاقات کے لیے تیار ہو گیا۔ پچھلی یادیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ وہ بھان متی کو دیکھنے اس کے محل میں چلا آیا۔

بھان متی بڈ پوں کا دوا عجمانی بستر پر لیٹی تھی۔ برہان شاہ کو دیکھتے ہی اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ بڑی حسرت سے برہان شاہ کی طرف دیکھا۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ بھان متی نے کمزور آواز میں کہا۔ ”ایک اعتراف ہے جو اس وقت کرتا چاہتی ہوں۔ اس اسید پر کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔“

”کہو بھان متی۔ میں سن رہا ہوں۔“

”میں عماد الملک کے حرم کی ایک معمولی سی کنیز تھی۔ اس نے مجھے دولت آباد کے قریب اس گاؤں میں بھیجا تھا جہاں میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ گاؤں کا چودھری بھی اس سے ملا ہوا تھا۔ مجھے بھیجے کا مقصد یہ تھا کہ میں آپ کو اپنے دام میں پھنسان لوں اور آپ کے خلاف ان سازشوں میں شریک ہو جاؤں جو وہ آپ کے خلاف کر رہا تھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ آپ خود ہی وہاں چلے آئے۔ مجھے اس لیے بھیجا گیا تھا کہ میں آپ کو شراب نوشی کی راہ پر لے آؤں اور پھر شراب میں زہر ملا کر آپ کی ہلاکت کا سامان کروں۔ میں نے آپ کو شراب نوشی کی راہ پر ڈال تو دیا لیکن مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں آپ کو قتل نہ کر سکی۔ ایک مرنے والی کی یہ نصیحت یاد رکھیے گا

برہان شاہ نے اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور اس کا مشورہ چاہا۔

”آپ احمد نگر واپس جائیں، وہاں لشکر جمع کریں اور مردانہ وار دولت آباد روانہ ہوں۔ سلطان بہادر سے مقابلہ کریں۔“

کسی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بھان متی کی بات اس کے دل کو کلی۔ وہ احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے حسب استطاعت لشکر جمع کیا اور پوری تیاری کے ساتھ دولت آباد کی راہ لی جہاں سلطان بہادر کا لشکر ٹھہریں بارہا تھا اس سے چار کوس کے فاصلے پر برہان شاہ نے قیام کیا۔ اس جگہ وہ بڑی احتیاط اور چوکسی کے ساتھ پورے تین مہینے قیام رہا۔ اس عرصے میں اس کا لشکر گجراتیوں سے برابر چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ گجراتیوں کو اتنا تنگ کیا کہ وہ جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔

امیر برید نے برہان نظام شاہ کی اجازت کے بغیر ہی صف آرائی شروع کر دی۔ برہان نظام شاہ امیر برید کی جرات سے واقف تھا۔ اسی وقت میدان میں آیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ طرفین نے خوب خوب داد و بداعت دی۔ آخر کار عادل شاہی لشکر کا پلہ بھاری رہا۔ گجراتیوں کو شکست فاش ہوئی۔

برہان نظام شاہ نے اس فتح کو اتفاقی قرار دیا۔ وہ اپنے آپ میں اتنی شک نہیں سمجھتا تھا کہ بہادر شاہ سے مقابلہ کر سکے۔ اب ایک ہی ترکیب بچی کہ کسی طرح سلطان بہادر اور عماد الملک میں دوری پیدا کر دی جائے۔ اس نے عماد الملک کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور اسے سلطان بہادر کی نیت سے آشنا کیا۔ قاصد بھی ایسا چرب زبان تھا کہ عماد الملک کو شیشے میں اتار لیا۔

”آپ نے سلطان بہادر کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بیش بہا تحائف اس کی نذر کیے۔ وہ تمہاری مدد کے بہانے دکن میں داخل ہوا۔ اس سے مل کر پاتری اور ماہور کے قلعے نظام شاہی قبضے سے نکالے۔ برابر اور احمد نگر میں اس کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ ہر سال اسے ہفتی اور کم یا ب تحفے بھیجے لیکن اب وہ یہاں جم کر بیٹھ گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے سلطان بہادر ہم سے ہمارا ملک چھیننا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے غلط نہیں۔ اس سے دوستی رکھ کر آپ اپنا ملک بھی گواہیں گے۔ یہی وقت ہے کہ دشمنی چھوڑ کر برہان شاہ سے دوستی کا ہاتھ بڑھائیے۔“

سلطان بہادر نے ہوا کار رخ بدلتے دیکھا تو اسے

کہ عماد الملک آپ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اسے دوست نہ سمجھیے گا جیسا کہ آپ ان دنوں کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس سلطان بہادر کی فرماں برداری سے اپنی سلطنت بچا لیجیے ورنہ عماد الملک سلطان بہادر سے مل کر احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔“

وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی زندگی اس سے روٹھ گئی۔ برہان شاہ نے اس کی طرف تاسف سے دیکھا اور اس کے قریب سے اٹھ گیا۔

وہ بھان متی کی باتوں سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ اس کے پاس سے اٹھ کر سیدھا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور حکم دے دیا کہ جب تک وہ باہر نہ آئے، کوئی اس سے ملاقات کی درخواست نہ کرے۔ یہ جسارت صرف اس کی زوجہ مریم بی بی کر سکتی تھی جو اسلعل عادل شاہ کی بہن ہونے کی وجہ سے خاص مرتبہ رکھتی تھی۔ برہان شاہ نے اس سے بھی کہلوادیا کہ وہ بھی ملاقات کی جسارت نہ کرے۔

خواب گاہ کی تنہائی میں وہ چند سال پہلے کے واقعات دہراتا رہا۔ ان شکستوں کے بارے میں سوچتا رہا جو عماد الملک کے ساتھ مل کر لڑائیوں میں اسے ہوئی تھیں۔ اسے ایک جنگ ایسی بھی یاد آئی جب عماد الملک اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ عماد الملک نے اسے سلطان بہادر کے نام کا خطبہ پڑھوانے سے روک دیا تھا۔ اسے بھان متی کی باتوں میں صداقت نظر آنے لگی۔ وہ خلاف توقع خلوت گاہ سے باہر آیا اور فوری اجلاس طلب کیا۔ اس کے وفادار امراء حکم ملتے ہی حاضر ہو گئے۔ اس نے بھان متی کا نام لیے بغیر عماد الملک کی سازشیں ان کے سامنے رکھیں اور عماد الملک کے بجائے سلطان بہادر کی طرف دوتی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے مشورہ طلب کیا۔

”اس طرح تو اسے دکن میں داخل ہونے کا موقع مل جائے گا۔“

”ہم اسے یہ موقع نہیں دیں گے۔ اس کے مطیع ہونے کا دم بھرتے رہیں گے۔ ضروری ہوا تو اسے خراج بھی دیتے رہیں گے۔ وہ ہمارا اتحادی بن گیا تو عماد الملک کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہو سکے گی۔“

ایک طویل بحث کے بعد برہان شاہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ کسی کو سلطان بہادر کے پاس بھیجے اور دوتی کے لیے راہ ہموار کرے۔

برہان شاہ نے اپنے ایک امیر میران شاہ کو اعلیٰ تحفوں اور چند مشہور ہاتھیوں کے ساتھ سلطان بہادر کی خدمت میں سبجرات روانہ کیا۔

میران شاہ وہاں پہنچا ضرور لیکن سلطان بہادر نے اس سے ملنے سے انکار تو نہیں کیا لیکن قدرے تاخیر کرنا رہا۔ کئی دن بعد وہ ملا ضرور لیکن نہایت خفا تھا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ برہان شاہ نے میرے نام کا خطبہ صرف ایک بار پڑھوایا۔ یہ ہے اس کی وفاداری۔“

”برہان شاہ آپ کا مطیع دفرمانبردار ہے۔ اگر اس سے کوئی امر آپ کی مرضی کے خلاف سرزد ہوا ہو تو آپ معاف فرمائیں۔“

میران شاہ نے نہایت خوش اسلوبی سے برہان شاہ کے خلوص و محبت کا یقین دلایا اور کہا۔ ”یہ میری حقیر رائے ہے کہ آپ برہان نظام شاہ پر لطف و کرم کر کے اپنا بی بی خواہ بتائیں۔“

سلطان بہادر شاہ نے اس کی بات مان لی اور اسے احمد نگر کی طرف روانہ کر دیا تاکہ برہان شاہ کو یہاں لایا جائے اور اس کی ملاقات سلطان بہادر سے کرائی جائے۔

برہان نظام شاہ سات ہزار پیادوں اور سواروں کے ساتھ برہان پور روانہ ہو گیا۔

برہان نظام شاہ نے خواجہ ابراہیم کو اپنا قاصد بنا کر اپنی روانگی سے پہلے ہی میران محمد شاہ کے پاس روانہ کر دیا تھا تاکہ ملاقات کے لیے ضروری امور پہلے ہی طے کر لیے جائیں۔

برہان نظام شاہ دریائے تپتی کے کنارے ایک موضع میں جا کر اترا اور خواجہ ابراہیم سے ملاقات کی جسے وہ اپنی روانگی سے قبل روانہ کر چکا تھا۔

خواجہ ابراہیم نے اسے بتایا۔ ”یہ قرار پایا ہے کہ سلطان بہادر تخت پر بیٹھا رہے گا اور برہان شاہ اس سے کھڑے کھڑے ملاقات کرے گا۔“

برہان شاہ یہ سنتے ہی ہنرک اٹھا۔ ”یہ مجھ سے کبھی نہ ہو سکے گا کہ سلطان بہادر تخت پر بیٹھا رہے اور میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہوں۔ اس سے تو بہتر ہے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا جائے اور میں یہیں سے واپس لوٹ جاؤں۔“

”حضور مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس دقت سرنچا کر لیا جائے اور اپنا مطلب نکالا جائے۔“ خواجہ ابراہیم نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

مناسب جگہ پر بٹھادیا اور خود رافا صلے پر بیٹھ گیا۔
 گفتگو شروع ہوئی۔ آغا سلطان بہادر نے کیا۔
 ”موجودہ زمانہ بڑا ہنگامہ خیز ہے۔ چاروں طرف
 شورشیں برپا ہیں۔ بتاؤ تو سہی ایسے عالم میں تم نے کیسے
 زندگی بسر کی؟“

برہان شاہ نے نہایت عالمانہ انداز میں جواب دیا۔
 ”جس پہنچ کا انجام بلندی ہو اور جس بھری انتہا وصل
 ہو، اس کے آخری لطف ہی کو یاد رکھنا چاہیے۔ خداوند تعالیٰ
 کا لاکھ شکر ہے کہ میں نے جس قدر پریشانی اٹھائی، آج
 تھوڑی سی دیر میں آپ سے مل کر اس کی تسلی ہو گئی۔“
 اس جواب میں سلطان بہادر کی تعریف بھی پوشیدہ
 تھی، اس لیے نہایت خوش ہوا اور خواجہ ابراہیم کے سامنے
 اس جواب کو تعریفی انداز میں دہرایا۔

”آپ نے سنا..... کیا فاضلانہ جواب دیا ہے۔“
 ”یہ سب کچھ حضور کی نوازشات کا نتیجہ ہے۔“
 سلطان بہادر اس جواب سے بھی بے حد خوش ہوا،
 اسی وقت اٹھا کر بند، خنجر اور مرصع تلوار جو خود زیب تن کیے
 ہوئے تھا، اپنے جسم سے علیحدہ کیے اور برہان نظام شاہ کی کمر
 میں باندھ دیے۔

کچھ دیر بعد سلطان بہادر نے اپنا خاص گھوڑا منگو کر
 برہان شاہ کے سپرد کیا۔
 ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم فن شہ سواری میں بڑی
 مہارت رکھتے ہو۔ یہ عربی گھوڑا حاضر ہے۔ ذرا سرا پرده
 کے گرد چکر تو لگاؤ۔“

برہان شاہ سوار ہوا اور دکن کے دستور کے مطابق
 گھوڑے پر سوار ہو کر اسے پھرایا۔ اس نے اس خوبصورتی
 سے گھوڑا پھرایا کہ سلطان بہادر تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔
 خوش ہو کر فرمایا۔ ”یہ سواری چتر کے بغیر کچھ اچھی معلوم نہیں
 ہوتی۔ ایک چتر برہان کے سر پر سایہ لگن کی جائے۔“
 برہان نظام شاہ نے فن شہ سواری کا ایسا شاندار
 مظاہرہ کیا کہ سلطان بہادر کا دل جیت لیا۔ اس کی پذیرائی
 میں اس نے دوسرے روز ایک بہت بڑا جشن منعقد کیا۔
 اپنے تخت کے اطراف میں چار طلائی کرسیاں بچھوائیں۔
 برہان شاہ اور اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ ان پر
 بٹھائے گئے۔

سلطان بہادر نے دل کھول کر تواضع کی۔ برہان نظام
 شاہ کو پانچ گھوڑے، دو ہاتھی اور بارہ سوہون عنایت کیے۔
 سلطان بہادر کو معلوم تھا کہ چوگان بازی میں برہان

”میں مصلحت کے لیے بھی یہ ذلت گوارا نہیں
 کر سکتا۔“
 ”اب ایک ہی ترکیب ہے۔ اگر حضور فرمائیں تو
 مرض کروں۔“
 ”مجھے ملاقات پر مزید مجبور نہ کیجیے گا۔“

”میرے پاس قرآن مجید کا ایک نادر نسخہ ہے جو
 حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے مبارک ہاتھ کا
 لکھا ہوا ہے۔ ملاقات کے روز اسے اپنے ساتھ لیتے چلیں
 تاکہ سلطان بہادر اس مصحف مقدس کے استقبال کے لیے
 تخت کے بیچے قدم رکھے۔ اسے تخت سے نیچے اتارنے کا
 نبی ایک طریقہ ہے۔“

برہان شاہ یہ تدبیر سن کر بہت خوش ہوا اور ملاقات
 کے لیے تیار ہو گیا۔ دوسرے دن سورج نکلنے کے بعد برہان
 شاہ، خواجہ ابراہیم کے ساتھ اس مقام کی طرف روانہ ہوا جو
 ملاقات کے لیے مقرر ہوا تھا۔ مقام پر پہنچ کر خواجہ ابراہیم
 نے مصحف مقدس کو اپنے سر پر رکھ لیا۔ جب شاہی پردہ سرا
 کے اندر داخل ہوئے تو سلطان بہادر نے انہیں دیکھ کر اپنے
 ایک مصاحب سے پوچھا۔ ”خواجہ ابراہیم کے سر پر کیا
 ہے؟“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، خواجہ ابراہیم
 نے قریب پہنچ کر کہا۔

”یہ قرآن مجید کا ایک نسخہ ہے جو حضرت علیؑ کے
 دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔“ یہ سنا تھا کہ سلطان بہادر بے
 اختیار اپنے تخت سے نیچے اترا اور استقبال کے لیے آگے
 بڑھا اور مصحف شریف کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں
 سے لگا لیا اور اسی طرح کھڑے کھڑے برہان نظام شاہ سے
 سلام لیا۔ سلطان بہادر نے خیریت پوچھی۔ برہان نظام شاہ
 نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس
 خواجہ ابراہیم سے بیٹھنے کے لیے کہا کیونکہ وہ مصحف
 مقدس اس کے لیے لے کر آیا تھا اور برہان نظام شاہ کو نظر
 انداز کیا۔ خواجہ ابراہیم نے حکم مناسروں لیکن وہ بیٹھا نہیں۔
 سلطان بہادر نے پھر بیٹھنے کو کہا اس نے پھر نظر انداز کر دیا۔
 جب تیسری بار حکم جاری ہوا تو خواجہ ابراہیم نے معذرت
 خواہانہ جواب دیا۔

”حضور کا حکم میرے سر آنکھوں پر لیکن میں تعمیل
 سے مجبور ہوں۔ برہان نظام میرا آقا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے
 کہ وہ کھڑا رہے اور میں بیٹھ جاؤں۔“
 ”وہ بھی بیٹھیں۔ میں نے منع تھوڑی کیا ہے۔“
 سلطان بہادر نے کہا اور برہان شاہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک

جب سلطان بہادر سراپردہ سے باہر آیا تو خواجہ ابراہیم اور برہان کے دیگر امراء باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے بہت سا سامان سلطان بہادر کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا۔

کہتے ہیں طاقت بہت سے غلط راستے دکھا دیتی ہے۔ مصلحت تو کمزور دیکھتے ہیں طاقتور نہیں۔ برہان شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سلطان بہادر سے دوستی کے بعد برہان شاہ کے لیے اسماعیل عادل کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی لہذا جب اسماعیل عادل شاہ نے قلعہ کلیان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو برہان نظام شاہ سے مدد کی درخواست کی۔ برہان شاہ نے نہ صرف مدد کرنے سے معذرت کی بلکہ اسماعیل عادل شاہ کو منع کیا کہ وہ اس قلعہ کو فتح نہ کرے۔

”تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ، بہتری اسی میں ہے ورنہ نتائج کی تمام ذمہ داری تم پر ہوگی۔ میں تنگی کھوار لے کر میدان جنگ میں موجود ہوں۔ ذرا باغ نظام سے باہر نکلو، میرے مقابلے پر آؤ پھر تمہیں عادل شاہ ہی بہادروں کی جرات و جواں مردی سے باخبر کیا جائے۔“

ادھر اسلعلیٰ عادل شاہ بارہ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ
برہان نظام کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔
دیکھتے ہی دیکھتے مضمیں مقرر ہو گئیں۔ اس کے بعد میدان
جنگ فریقین کی آزمائش گاہ بن گیا۔

اس جنگ کا انجام نظام شاہیوں کے حق میں برا ہوا۔ انہیں شکست ہوئی۔ برہان شاہ کے وفاداروں نے برہان نظام کو صحیح سلامت میدان جنگ سے نکال لیا۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح احمد نگر واپس آیا۔ اس روز وہ بھان متی کی کچی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔

یہ صورت حال صرف اس کے لیے تکلیف دہ نہیں تھی بلکہ دونوں جانب کے امراء اسے تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح یہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے۔ دونوں طرف کے امیروں نے پے در پے کئی ملاقاتیں کیں اور دونوں بادشاہوں کو ملاقات پر آمادہ کر لیا۔ دونوں بادشاہ سرحد پر آپس میں بغل گیر ہوئے۔ بات چیت کے دوران یہ طے کیا کہ برہان نظام شاہ براہ کو فتح کرے اور اسماعیل عادل تلنگانہ کو اور پھر ملک دکن کو آپس میں مساوی تقسیم کر لیں۔

دسمبر 2017ء

ملوخواں کی دادی اس صورت حال سے سخت نالاں تھی۔ آخر چہ ماہ بعد ہی چند امیروں کی مدد سے اسے گرفتار کر لیا گیا اور شہزادہ ابراہیم کو تخت پر بٹھادیا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا تو برہان نظام شاہ ایک مرتبہ پھر پرامید ہو گیا کہ اسماعیل عادل شاہ سے جو شرائط طے ہوئی تھیں، وہ ضرور پوری ہوں گی۔ اس نے اس سلسلے میں کئی سفارشاتیں ابراہیم کی طرف روانہ کیں لیکن وہ نال منول سے کام لیتا رہا۔ اس کے خوشامدی امیروں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ دکن کے علاقوں کی مساوی تقسیم فضول سی بات ہے بلکہ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ خود برہان نظام کے علاقے بھی فتح کر لیے جائیں۔ لطف تو یہ ہوا کہ اسماعیل عادل شاہ کا اتحادی اسد خاں لاری بھی اپنے وعدے سے پھر گیا اور ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ مل کر برہان نظام شاہ اور اس کے ہمدرد امیر قاسم برید پر چڑھائی کر دی۔ ان دونوں نے عادل شاہی لشکر سے جان بچا کر ایک قصبے میں پناہ لی۔ ابراہیم عادل شاہ کو اس سے نہیں اس کے علاقوں سے غرض تھی لہذا بالاکھاٹ دولت آباد کا رخ کیا اور اس علاقے کو ہر طرح سے تباہ و برباد کیا۔

یہ وقت برہان نظام کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ قصبہ شیر میں تھا اور امیر برید سخت بیمار تھا۔ یہ مشکل اس وقت اور کڑی ہو گئی جب اسی بیماری کے عالم میں امیر برید کا انتقال ہو گیا۔ برہان نظام کا ایک بازو کٹ گیا۔

اب برہان نظام کے لیے صلح کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے دکن کی معزز ہستیوں کو درمیان میں ڈالا۔ ان معزز لوگوں نے دونوں خاندانوں کے درمیان مشروط طور پر صلح کروادی۔ شرط یہ تھی کہ ابراہیم عادل شاہ کوشلا پور کے پانچ پرگنوں پر گئے واپس ملیں گے اور مستقبل میں آپس میں کوئی جنگ نہ ہوگی۔

اس فتح کے بعد دونوں فریقوں نے اپنے اپنے ملکوں کی راہ لی۔

اس صلح کو ایک سال گزر گیا۔ یہ تمام عرصہ برہان نظام نے کانٹوں کی بیج پر گزارا۔ اسے شولا پور کے پانچ پرگنوں کے نکل جانے کا بے حد دکھ تھا۔ وہ ہر حال میں ان پرگنوں کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی کمزوری سے خوفزدہ بھی تھا۔ اپنی کمزوری کو طاقت میں بدلنے کا موقع جلد ہی مل گیا۔ ابراہیم عادل شاہ اور علاء الدین عمالک گمے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ یہی موقع تھا جب برہان نظام شاہ کو

شاہ کی حراست میں آیا۔ ادھر سلطان قلی قطب شاہ نے نزاکت وقت کے پیش نظر گولکنڈہ کو نہیں چھوڑا۔ وہ اگرچہ جنگ کے میدان میں نہیں آیا لیکن قلعہ کے لوگوں کی حفاظت اور ان کی مدد کے لیے سواروں اور پیادوں کی ایک اچھی تعداد روانہ کر دی۔

اسماعیل عادل شاہ قلعے کے محافظوں سے جنگ کرتا رہا۔ ممکن تھا کہ یہ جنگ نتیجہ خیز ثابت ہوتی مگر حکم الہی سے اسماعیل عادل شاہ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس نے اپنے امیر اسد خاں لاری کو طلب کیا اور حکم دیا۔

”مجھے یہاں کی آب و ہوا اس نہیں آ رہی ہے۔ تم تلنگانہ کی جنگ جاری رکھو اور مجھے حسن آباد گلبرگہ روانہ کر دو۔ طبیعت ٹھیک ہوتے ہی میں تم سے آ ملوں گا۔“

ابھی اسے گلبرگہ بھیجنے کی تیاری کی جا رہی تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑائی کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

اسماعیل عادل شاہ کے انتقال کی خبر اسد خاں لاری نے کسی کو نہ ہونے دی۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کی موت کو مصیبت راز میں رکھا جائے۔ بادشاہ کے مردہ جسم کو پاکلی میں رکھ کر اس پر نقاب ڈال دی۔ جب دن کا اجالہ ختم ہوا اور چاروں طرف تاریکی چھا گئی تو اسد خاں لاری نے اس کی لاش کو قصبہ کو کی بھیج دیا جہاں وہ اپنے والد مرحوم کی قبر کے برابر جگہ پاسکا۔

اس کی موت کے ساتھ ہی وہ تمام شرائط دم توڑ گئیں جو دونوں بادشاہوں کے درمیان طے پائی تھیں۔ اسماعیل عادل شاہ کو تلنگانہ کی طرف جانا تھا اور برہان نظام کو برار کی جانب۔

اسماعیل عادل شاہ کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے ملوخواں کو تخت نشین کر دیا گیا۔

برہان نظام شاہ اب اس خاندان کا ایک فرد بن چکا تھا۔ ملوخواں سے اسے بڑی امیدیں تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسماعیل عادل شاہ کے عزائم کو پورا کرے گا۔ تلنگانہ فتح ہوگا اور پھر برادر اور پھر دکن کو آپس میں مساوی تقسیم کر لیا جائے گا۔

اس کی ان امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب ملوخواں نے تخت نشین ہوتے ہی پیش پرتی کا راستہ اختیار کیا اور خود کوے نوشی اور رقص کی محفلوں میں گم کر لیا۔ رنگ رلیوں میں ایسا بھوکا ہوا کہ پھر بھی نہ ابھرا۔

ابراہیم عادل شاہ کے حریفوں کو اس نے کسانے کا موقع مل گیا۔ اس نے جیشد قلعہ شاہ اور بیجا نگر کے سکران رام راج کو اپنا رازدار بنایا۔ حاکم پرندہ خواجہ جہاں دکنی کی حمایت بھی حاصل کر لی اور سب سے مل کر ابراہیم عادل شاہ کے علاقے پر چڑھائی کرنے کے خیال سے روانہ ہوا۔

برہان نظام شاہ قلعہ شولا پور کی طرف بڑھا اور اسے حراست میں لے لیا۔ اس نے وہ پانچ پرگنوں میں لیے جو اس کے ہاتھ سے چلے گئے تھے۔ سرحدی علاقوں کو جی بھر کے لوٹا۔ ابراہیم عادل شاہ کی فوج نے مقابلہ کیا لیکن شکست پر شکست کھائی۔ ادھر قلعہ شاہ بیجا پور پر چڑھ آیا اور گلبرگہ پر قابض ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ برہان نظام شاہ کے اشارے پر رام راج بھی آگے بڑھا اور قلعہ بنگر کو گھیر لیا۔

برہان نظام شاہ کی ترکیب کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے اس کے اس نے پر ابراہیم عادل شاہ کے حریفوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ اس خطرناک صورت حال سے سخت متشکر تھا۔ اس نے گھبرا کر اسد خاں لاری کو طلب کیا۔ اسد خاں لاری بھی مطمئن کم اور متشکر زیادہ تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے تمام حالات اس کے سامنے رکھ کر اس سے مشورے کا طالب ہوا۔

”تمام حالات جہارے سامنے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تمام سکران ہمارے خلاف ہو گئے ہیں۔ ہم بے یک وقت تمام لوگوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اب تلواریں زیادہ تدبیر کی ضرورت ہے۔ میں نے تمہیں اسی مشورے کے لیے طلب کیا ہے۔“

”تدبیر کا تقاضا تو یہی ہے کہ جس طرح برہان نظام نے ہمیں اکیلا کیا ہے، اسی طرح ہم اسے اکیلا کر دیں۔“

”یہ کس طرح ہوگا؟“

”بادشاہ مبارک! کوئی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ یہ سب کچھ برہان نظام کے اشارے پر ہو رہا ہے۔ دراصل عادل شاہی خاندان کا سب سے بڑا حریف رہی ہے۔ بقیہ امراء تو اس کے اشارے پر ناپتے ہیں۔ ان کی علیحدہ کوئی حیثیت نہیں۔ اگر برہان نظام کا خاتمہ کر دیا جائے تو تمام ذیلی امراء سے چمکا کر مل جائے گا۔“

”کیا ہم برہان نظام شاہ کا کام تمام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟“

”اس کے لیے جنگ کی ضرورت نہیں۔“

”پھر کیا ہو سکتا ہے؟“

”اس کے لیے ضروری ہے کہ شولا پور کے ان پانچ پرگنوں کو نظام شاہ کے حوالے کر دیا جائے جن کی وجہ سے لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ بعد ازاں رام راج کو ایک ہمدردی بھرا خط تحریر کیا جائے۔ اس کے علاوہ قرب و جوار کے راجاؤں کو شاہانہ تحائف پیش کیے جائیں۔ رام راج نہایت بااثر ہے۔ وہ اگر مٹھی میں آگیا تو دوسرے راجا بھڑکی سی پیشکش پر عادل شاہی حکومت کے طرف دار ہو جائیں گے۔ ان لوگوں سے اطمینان ہو جائے پر جیشد قلعہ شاہ سے نمٹنا آسان ہے۔“

ابراہیم عادل شاہ نے اس کی باتوں سے اتفاق کیا اور رام راج کی خدمت میں خط روانہ کرنے کے بعد قریبی راجاؤں کو قیمتی تحائف بھیجنے شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی اسد خاں لاری کے سپرد ایک جاننا لنگر کیا اور حکم دیا کہ قلعہ شاہ پر حملہ کر دے۔ اسد خاں لاری نے قلعہ کا کافی گھیر لیا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کی مدد کو کوئی نہیں آیا۔ قلعہ کے محافظین نے رولتختی بھادری کا مظاہرہ کیا اور کئی ماہ کی کوشش کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک اور مقام انکر کی طرف بڑھا۔ قلعہ شاہ شکست کے خوف سے تنگنا گتہ کی طرف بھاگ گیا۔ اسد خاں نے اس کے پیچھے گھوڑے دوڑائے۔ قلعہ شاہ نے قلعہ کو لکڑی کے قریب و جوار میں پہنچ کر اپنی فوج کی ترتیب و تنظیم کی۔ اسد خاں بھی پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں میں مذہبیٹھ ہوئی۔ بد قسمتی سے قلعہ شاہیوں کو شکست ہو گئی۔

یہ اتنی بڑی فتح تھی کہ ابراہیم عادل شاہ مطمئن ہو گیا اور خود کو محفوظ پاکر امراء کو ان کی جاندا دی دیکھ بھال کے لیے واپس کر دیا۔

برہان نظام شاہ تمام حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ابراہیم عادل شاہ کو اکیلا دیکھ کر حسن آباد گلبرگہ پر حملہ کر دیا۔ شہر کے حصار کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابراہیم بھی اپنی فوج کے ہمراہ جوابی کارروائی کے لیے بیورہ نہر کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ دریا کے دوسرے کنارے کا علاقہ برہان نظام کے قبضے میں تھا۔ نہر پار کرنا ابراہیم عادل شاہ کے لیے ناممکن ہو رہا تھا۔ اس کے سپاہی جب آگے بڑھتے تیروں کی بو پھانڈ ان کا راستہ روک لیتی اور وہ واپس لوٹ آتے۔ اس کوشش میں دو تین ماہ لگ گئے۔ بالآخر سیکڑوں سپاہیوں کی قربانی کے بعد ابراہیم عادل شاہ نے دریا پار کر لیا۔

دونوں طرف کے سپاہیوں کی ترتیب و تنظیم ہونے لگی۔ پہنچے دریا تھا، سامنے نظام شاہی فوج۔ لڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے پہل کی۔ قطب شاہی بھی آگے بڑھے۔ نہایت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ چند گھنٹوں کی لڑائی نے فیصلہ ابراہیم عادل شاہ کے حق میں کر دیا۔

اس فتح نے ابراہیم عادل شاہ کو غرور میں مبتلا کر دیا۔ اس کا سر آسمان کو چھو رہا تھا، قدم زمین پر نہیں تھے۔ اس نے لوگوں سے بدسلوکی شروع کر دی۔ خلق خدا اس کے مظالم سے تنگ آ گئی۔ لوگوں نے تنگ آ کر اس کے برادر شہزادہ عبداللہ کو بادشاہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ سازش بڑی رازداری سے تیار کی گئی لیکن کسی طرح یہ راز ابراہیم عادل شاہ پر فاش ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے مظالم کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ شہزادہ عبداللہ جان بچا کر بیجا پور سے فرار ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ کے خوشامدیوں نے اسے باور کرایا کہ اس سازش میں اسد خاں لاری کا ہاتھ ہے۔ بادشاہ اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا۔ اس نے اسد خاں سے خط کتابت بند کر دی اور جو موسیٰ پھل اور تحائف وغیرہ بھیجا کرتا تھا، وہ بھی بند کر دیے۔ اسد خاں جو اپنی جاگیر ”ملکوان“ میں تھا بڑی کوشش کی کسی طرح وہ اپنی نیک نیتی اور نمک خواری ثابت کر سکے۔ پھر اس نے ایک وضاحتی خط بڑی تفصیل سے لکھا۔

”چند مکار، عیار اور فریب خوردہ اور خود غرض لوگوں نے میری جانب سے جو حضور کو بدگمان کیا ہے، اس سلسلے میں عرض ہے یہ ہے کہ اگر ان کی خطائیں شمار میں لائی جائیں تو کئی گنا ہوں گی مگر جو قصور مجھ سے وابستہ کیے گئے ہیں، وہ قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ان سے میرا دور کا بھی تعلق نہیں۔ ملکوان میں کافی عرصہ قیام کرنے اور حضور کی ریاست میں قدم نہ رکھنے کا مقصد حریفوں، مکاروں اور خود غرض انسانوں کی پورش سے بچنا تھا۔ میرا یہ اقدام عیاروں کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے اس کو طرح طرح کے مٹنی پہنائے اور میری دوراندیشی کو نمک حرامی کے مترادف ٹھہرایا۔ اگر حضور کی رضا ہو تو ابھی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤں۔“

ابراہیم عادل شاہ کے دل کا کاٹنا نہ نکل سکا۔

برہان نظام شاہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ موقع اچھا ہے اگر اسد خاں لاری ساتھ دے تو ابراہیم عادل شاہ کو ہٹا کر شہزادہ عبداللہ کو تخت نشین کرایا جاسکتا ہے۔ اس نے

اپنے قاصدوں کو ننگوان روانہ کیا تاکہ وہ اسد خاں لاری کو اس کے ارادے سے آگاہ کریں۔

جب یہ قاصد ننگوان پہنچے تو اسد خاں نے اس خیال سے ان کا پر تپاک استقبال کیا کہ وہ صلح کا پیغام لے کر آئے ہوں گے لیکن جب انہوں نے آنے کا مقصد بیان کیا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ قاصد بیان کر رہے تھے۔

”شہزادہ عبداللہ اپنے بھائی کے عتاب سے خوفزدہ ہو کر ”بندر کوہ“ پہنچ گیا ہے وہاں کے عیسائی اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اس نے برہان نظام اور قطب شاہ سے مدد چاہی ہے۔ آپ کو بھی ابراہیم عادل شاہ کی معزولی اور شہزادہ عبداللہ کی تخت نشینی سے اتفاق کرنا چاہیے۔ اس صورت میں آپ کو نئے بادشاہ کا اہلیق مقرر کر دیا جائے گا۔“

اسد خاں قاصدوں کی زبانی حالات سے آگاہ ہوا تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے ان قاصدوں کی خلاف توقع سخت توہین کی۔

”اگر بادشاہوں کی شریعت میں قاصدوں کا قتل جائز ہوتا تو میں آپ لوگوں کی گردن اڑا دیتا۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ لوگ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں اور اپنے آقا سے جا کر کہو کہ اسد خاں ابھی تک اپنے آقا کا نمک خوار ہے۔“

یہ دو ٹوک جواب سن کر برہان نظام نے اپنے دشمنوں میں ایک اور دشمن کا اضافہ کر لیا۔ اس کا نام تھا اسد خاں لاری۔ دشمن سے کیا امید۔ اس نے یہ امید چھوڑی اور قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا کر عادل شاہی سلطنت کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

کئی ماہ کی تیاری کے بعد اسے خبر ملی کہ اسد خاں شدید علیل ہے۔ یہ اور بھی اچھا تھا۔ اب وہ ابراہیم عادل شاہ کی مدد کو نہیں آ سکتا تھا۔ وہ موقع غنیمت دیکھ کر عادل شاہی سلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ اسد خاں کی بیماری نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اسی دوران یہ اطلاع آ گئی کہ اسد خاں کا انتقال ہو گیا۔ برہان نظام نے یہ اطلاع ملتے ہی اصل مقصد کو پس پشت ڈالا اور پہلے قلعہ ملکوان کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ملکوان پر ابراہیم عادل نے قبضہ کر لیا۔

برہان شاہ احمد نگر واپس آ گیا۔

غصہ نہیں نہ نہیں تو اترتا تھا۔ اس نے سفر کی منزلیں طے کیں اور قلعہ کلیان پر حملہ کر دیا۔ ابراہیم عادل شاہ بھی

”تدبیر تو اچھی ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ شاید یہ خبر
چھپی نہ رہ سکے اور حریف تک پہنچ جائے۔“
”ہم اس خبر کو خفیہ رکھیں گے۔“
”کیا لشکر والوں کو نہیں بتایا جائے گا کہ ہم کیا کرنے
جارہے ہیں؟“

”یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اس بابت بھی میں
نے سوچ رکھا ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے خزانچی کو
یہ حکم فرمادیں کہ میں اس سے جتنی رقم طلب کروں، وہ بغیر کسی
تسل و جھجک کے میرے حوالے کر دے اور بالکل پس و پیش
نہ کرے۔“

”میں ابھی تمہارے سامنے حکم نامہ تحریر کیے دیتا ہوں۔“
برہان نظام شاہ نے اسی وقت یہ حکم نامہ تحریر کر دیا۔
”عین الملک تم سے جس وقت جو کچھ مانگے، فوراً اس
کو دے دو اور اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرو۔“ عین
الملک نے اس حکم نامے کے مطابق شاہی خزانے سے ایک
لاکھ ہون لکھوا لیے۔ خزانچی سے یہ بھی کہہ دیا کہ مزید رقم
درکار ہوگی تو وہ بھی طلب کی جائے گی۔

عید میں ابھی چند روز باقی تھے اس لیے اس کی
ترکیب آسانی سے کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی تھی۔ وہ ایک
ایک کر کے تمام عسکری سرداروں کے پاس گیا اور انہیں اپنے
منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے اس رقم کو لشکریوں میں
تقسیم کرنے کے لیے کہا۔
”یہ رقم سپاہیوں میں تقسیم کرو اور یہ ظاہر کرو کہ یہ رقم
عید کے اخراجات کے لیے ہے۔“

عسکری سرداروں نے یہ رقم سپاہیوں میں تقسیم
کر دی۔

جب عید میں ایک دن باقی رہ گیا تو عین الملک نے
ان سرداروں سے کہا کہ وہ عید کی صبح سپاہیوں کو سسل ہونے کا
حکم دیں اور خود بادشاہ کی خدمت میں سلام و مبارک کے
لیے حاضر ہوں۔

عید کی صبح تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ سپاہیوں کی
سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ انہیں سسل ہونے کا حکم
کیوں دیا گیا ہے لیکن وہ حکم کی تعمیل کے لیے مجبور تھے۔
خاصی رئیس مل چکی تھیں اس لیے خوش بھی تھے۔

عین الملک نے لشکر گاہ کے گرد بھینٹی ہوئی دیوار کو
ایک جگہ سے توڑنے کا حکم دیا اور سپاہیوں کو لے کر دشمن
کی طرف بڑھا۔

نظام شاہی ہاتھیوں کے ذریعے عادل شاہی لشکر

طر کی منزلیں طے کرتا ہوا قلعہ کلیان کے قریب آ گیا اور
برہان نظام شاہ کے لشکر کے پاس ہی قیام پذیر ہوا۔ وقت
گزر رہا تھا ابھی تک کہ رمضان کا مہینا آ گیا۔ غلہ اور دیگر
سامان ضرورت نہ پہنچنے کی وجہ سے نظام شاہی امراء کی
حالت خراب ہو گئی۔ وہ دو دو تین تین دن کا فاقہ کر کے
روزے رکھنے لگے۔ ان تمام واقعات نے برہان نظام کو
حواس بانتہ کر دیا۔ اس نے تمام امراء کا اجلاس طلب کیا اور
ان سے مشورہ چاہا۔ جتنے منافی باتیں۔
”اب اسی میں عافیت ہے کہ ہم واپس چلے
جائیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دیوار کے اندر
سے داخل ہو کر دشمن سے لڑا جائے۔“
”اگر ہمیں فتح حاصل ہو تو ہم دوبارہ قلعے کا محاصرہ
کر لیں اور اگر شکست ہو تو واپس احمد نگر چلے جائیں۔“

برہان نظام شاہ نے یہ سب باتیں سن کر اپنی رائے
دی۔ ”ہمارے گھوڑوں کی حالت اس وقت خراب ہو گئی
ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہے کہ جنگ میں حصہ لے سکیں۔
بہتر یہی ہے کہ ہم جنگ کے ارادے کو ملتوی کر کے احمد نگر کا
راستہ لیں۔ آئندہ پھر کبھی موقع ملے تو خوب اچھی طرح
تیاری کر کے اس طرف آنا چاہیے۔“

برہان نظام شاہ سب باتیں سن کر خاموش ہو گیا۔ اٹھا
اور اکیلا ہی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے سب سے بڑے امیر
عین الملک کے پاس پہنچا۔

”عین الملک! تمام حالات سے تم بخوبی آگاہ ہو۔
اگر ہم نے دشمن سے لڑائی کیے بغیر محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے
ملک کو واپس چلے گئے تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ جنگ کی
جاتی ہے تو اس کا انجام بھی بہت برا ہوگا کیونکہ ہماری فوج کی
حالت بری ہے۔“

”ہم لوگ تو تلوار کے دھنی ہیں، تلوار ہی سے فیصلہ کرتے
ہیں۔“ عین الملک نے کہا۔ ”آگے آپ کی مرضی۔“

”جنگ کے حق میں تو میں بھی ہوں لیکن فوج کی
حالت بہت بری ہے۔ اسی مشورے کے لیے تمہارے پاس
آ یا ہوں کہ جنگ کی جانے تو کس طرح؟“

”اس کی ایک ہی صورت ہے۔“ عین الملک نے
کہا۔ ”عید کی صبح ہم دشمن پر حملہ کر دیں۔ اس وقت حریف
کے لشکر کا ہر سپاہی عید کی تیاریوں میں مشغول ہوگا۔ اس
وقت کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ ہم حملہ
کریں گے۔ ہمیں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

کے حصار کو توڑ دیا گیا۔ عین الملک اسی راستے لشکر سمیت اندر داخل ہو گیا۔ عادل شاہی لشکر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ہو جائے گا۔ سب کے سب غیر مسلح تھے۔ اس حملے نے ان کے حوصلے پست کر دیے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ بادشاہ عید کا غسل کر رہا تھا۔ اسے جسے کی اطلاع ملی تو وہ سراپردہ سے باہر آیا اور ایک گوشے میں چھپ گیا۔

اسی روز برہان نظام نے سپاہیوں کی ترتیب و تنظیم کی اور کلیان کے حصار کی جانب بڑھا۔ اس مرتبہ اس نے مہم ارادہ کیا کہ اگر حصار والوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کیا تو یہ تمام لوگوں کو قتل کر دے گا۔ قلعے کے لوگ پہلے ہی سے ابراہیم عادل شاہ کی شکست سے دل شکست ہو گئے تھے۔ انہوں نے قلعے کو نظام شاہ کے حوالے کر دیا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اس وقت مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ قلعہ کلیان کو جانے دیا اور خود برہان نظام کو یہاں مصروف دیکھ کر باقی ماندہ فوج کے ہمراہ نظام شاہی ممالک کی طرف چل پڑا۔ برہان نظام نے کئی پرگنوں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد قلعہ پرندہ پر حملہ کر دیا۔ اہل قلعہ بالکل غافل تھے۔ قلعے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ عادل شاہ کے لشکر بلا روک ٹوک تلواریں ہاتھ میں لیے قلعے میں داخل ہو گئے۔ چند سپاہی ہمت کر کے سامنے آئے اور قتل ہو گئے، باقی فرار ہو گئے۔ قلعے پر عادل شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ قلعہ کلیان کے ہاتھ سے جانے کا دکھ کسی قدر کم ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اس قلعے کو ایک وکئی امیر کے حوالے کیا اور خود بیجا پور آ گیا۔

حاکم پرندہ خواجہ جہاں وکئی کو جس وقت اس واقعے کا علم ہوا وہ برہان نظام شاہ کے ساتھ قلعہ کلیان میں تھا۔ اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی پھر قلعہ پرندہ کے مفرد سپاہی بھی اپنی شکست کی داستان لے کر اس کے پاس حاضر ہو گئے۔ اس نے برہان نظام سے اس کا ذکر کیا۔ خواجہ جہاں نے چونکہ برہان نظام کی مدد کی تھی، لہذا اب برہان نظام کا بھی فرض تھا کہ وہ اس کی مدد کرے۔

برہان نظام اور خواجہ جہاں وکئی ایک بھاری لشکر لے کر قلعہ پرندہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انہی یہ قلعہ بیس کوس دور تھا کہ عادل شاہ کا مقرر کردہ وکئی امیر اتنا خوفزدہ ہوا کہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا اور سیدھا بیجا پور پہنچا۔ بیس کوس کا فاصلہ دو دن میں طے کرنے کے بعد جب

برہان نظام شاہ قلعہ پرندہ پہنچا تو قلعے کو بالکل خالی پایا۔ اس نے قلعہ خواجہ جہاں وکئی کے حوالے کیا اور خود احمد نگر چلا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ ابھی قلعہ کلیان کی فتح کا جشن پوری طرح منانے لگی نہ پایا تھا کہ قلعہ کلیان کا وکئی محافظ حاضر دربار ہو گیا اور یہ بدخبر سنانی کہ قلعہ دوبارہ نظام شاہی دسترس میں چلا گیا۔

”دکھن ابھی بیس کوس کے فاصلے پر تھا اور تو نے قلعہ خالی کر دیا؟“ ابراہیم عادل شاہ نے استفسار کیا۔

”حضور! میں سو یا ہوا تھا کہ چھمروں کی آواز کو نفیری کی آواز سمجھا۔ میں سمجھا دشمن سر پر آ گیا ہے۔ اس وقت مقابلہ بے سود ہے۔ میں نے فرار میں عافیت جانی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دشمن فاصلے پر ہے۔ یہ بھی اس وقت معلوم ہوا جب بیجا پور کی طرف آتے ہوئے نظام شاہی لشکر کو راستے میں دیکھا۔ اس وقت میرے ساتھ ایک سپاہی بھی نہیں تھا۔ سب حواس باختہ ہو کر بھاگ چکے تھے۔ میرے پاس اب ایک ہی راستہ تھا کہ میں حضور کو اطلاع دوں۔“

”بدبخت! میں نے تیری بہادری کو مد نظر رکھتے ہوئے تجھے محافظ قلعہ بنایا تھا اور تو چھمروں کی آواز کو نفیری کی آواز سمجھ کر قلعہ دشمن کے حوالے کر آیا۔ کیا اب بھی تجھے جینے کا حق ہے؟“

”حضور! مجھ پر رحم فرمائیں۔“ وہ چیخا رہ گیا اور بادشاہ نے اسے موت کے گھاٹ اتروا دیا۔

عادل شاہ کے سامنے اب ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح قلعہ پرندہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا جائے۔

برہان نظام شاہ کا تجربہ کار ذہن اچھی طرح سوچ سکتا تھا کہ ابراہیم عادل شاہ کی سوچ رہا ہوگا۔ بعض ذرائع سے یہ بات اسے معلوم بھی ہوئی تھی کہ ابراہیم عادل شاہ قلعہ پرندہ پر دوبارہ تسلط کے لیے تدبیریں کر رہا ہے۔ اس نے ضروری سمجھا کہ رام راج حکمران بیجا نگر کو اس راز سے آگاہ کر دے۔ اس نے اپنے ایک وفادار امیر کا انتخاب کیا اور اسے رام راج کے پاس بھیج دیا۔

دونوں میں بات چیت کے بعد طے ہوا کہ برہان نظام شاہ ضلع رانچور میں آ کر اس سے ملے تاکہ آئندہ فتوحات کی منصوبہ سازی کی جائے۔

نظام شاہ اپنے سپاہیوں، بیجا خواہوں اور مال و اسباب کے ساتھ رانچور پہنچ گیا۔ رام راج بھی بہادر

سایہوں کا ایک گروہ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ مدگل اور رانچور کو فتح کر کے شولا پور کو حراست میں لے لیا جائے۔

رام راج اور نظام شاہ دونوں نے قلعہ رانچور کے اطراف گھیرا ڈال دیا اور بڑی آسانی سے قبضہ کر لیا۔ مدگل کے لوگوں نے خوفزدہ ہو کر چابی رام راج کے حوالے کر دی۔ بعد ازاں اس قلعے کو رام راج نے چند مستند اشخاص کے حوالے کیا اور اپنے بھائی کو سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد دے کر حکم دیا کہ وہ برہان نظام شاہ کا ہاتھ قلعہ شولا پور کی فتح میں بنائے اور خود اپنے علاقے کی سمت روانہ ہو گیا۔

برہان نظام شاہ نے رام راج کے سپاہیوں کی معاونت سے قلعے کو گھیرے میں لے لیا۔ چند روز کے محاصرے کے بعد اس کی بے صبری نے کام دکھایا۔ اس نے جنگی توپوں کے وہانے کھول دیے اور قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دوبارہ قلعے کی چار دیواری کھنچوئی اور ضروری مرمت کر کے اسے مستند امیر کے تصرف میں دے کر خود احمد نگر چلا گیا۔

برہان نظام اس کے بعد گلبرگہ جانے کا ارادہ کر رہا تھا تا کہ وہاں کا قلعہ بھی فتح کر لے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ رام راج رانچور اور مدگل کے قلعوں کو فتح کر کے بیجا نگر واپس آ گیا ہے تو اس سال گلبرگہ کے قلعے کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ مزید ایک سال تک بیچ و تاب کھاتا رہا اور بالآخر دوبارہ عادل شاہی ممالک کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر رام راج سے ملاقات کی اور یہ معاہدہ کیا کہ رام راج قلعہ ساغر اور آہنگر کو فتح کرے اور بیجا پور اور گلبرگہ پر نظام کا قبضہ ہو۔

برہان نظام نے اپنے اتحادی رام راج کو ساتھ لیا اور بیجا پور کی طرف روانہ ہوا۔ عادل شاہ برہان نظام کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور ایک مقام ”پنالہ“ چلا گیا۔ برہان نظام نے بیجا پور کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ وہ اس قلعے کو فتح کر لیتا مگر قسمت کوئی دوسری ہی چال چلنے کے انتظار میں تھی۔ نظام شاہ پر بیماری کا حملہ ہوا اور اسے محاصرہ اٹھا کر احمد نگر واپس آنا پڑا۔ اس کی بے بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ بہت علاج معالجہ کیا لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس نے سفر آخرت اختیار کیا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا حسین نظام تخت نشین ہوا۔ اس کے بھائی شہزادہ عبدالقادر نے حسین نظام کی بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا اور تخت نشینی کے روز اپنے

بھائیوں کو ساتھ لے کر قلعے سے باہر نکل آیا۔ امراء بھی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ خون خرابا ہوتا، حسین نظام شاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ ان سب امیروں کو خرید لیا جو شہزادہ عبدالقادر کے ساتھ تھے۔ عبدالقادر مایوس ہو کر ملک برار چلا گیا۔ اس کے دیگر بھائی بھی ادھر ادھر فرار ہو گئے۔ حسین نظام شاہ کے وہ تمام رقیب جو سلطنت کے دعویدار ہو سکتے تھے ایک ایک کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔ یہاں تک کہ عین الملک جو برہان نظام کا اہم ترین امیر تھا، حسین نظام سے خوفزدہ ہو کر برار کی طرف بھاگا اور پھر بیجا پور پہنچ کر ابراہیم عادل شاہ کے دائرہ ملازمت میں چلا گیا۔ حسین نظام شاہ کے دیگر بھائی بھی اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بیجا پور چلے گئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر ابراہیم عادل شاہ کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ حسین نظام شاہ کو تخت سے اتار کر اپنے کسی بھائی سمیت تخت پر بٹھادے۔ اس نے اپنے پھوپھی زاد بھائی میراں شاہ علی کو چتر و آفتاب گیر سے مرفراز کیا اور یہ طے کیا کہ ان تمام لوگوں کو جو حسین نظام کے ظلم و ستم سے پریشان ہیں، میراں شاہ علی کے گرد جمع کرے اور پھر شاہ علی کو احمد نگر کے تخت پر بٹھائے۔

حسین نظام بھی ان کا دروائیوں سے بے خبر نہیں تھا لیکن اکیلے مقابلہ کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اس نے عماد الملک کو اپنا ہماز بنانے کی کوشش کی اور ایک قائد عماد الملک کے پاس بھیجا تا کہ دونوں فرماں روا باہمی اتحاد سے ابراہیم عادل شاہ پر حملہ کریں۔ عماد الملک نے اس کی درخواست قبول کی اور سات ہزار سوار روانہ کیے۔

عماد الملک کے سواروں کو ہمارا لے کر حسین نظام شاہ قلعہ شولا پور کی طرف روانہ ہوا جس کا محاصرہ ابراہیم عادل شاہ نے کیا ہوا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ بھی اس کا منتظر تھا تا کہ اس کا مقابلہ کر کے گزشتہ شکست کا بدلہ لے سکے۔

دونوں طرف سے لشکر آراستہ ہوئے اور ایک دوسرے کے مقابلے پر آ گئے۔ فریقین میں زبردست خون ریزی ہوئی۔ اس معرکے میں عین الملک نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور نظام شاہی لشکر کے چٹکے چھڑا دیے۔ نظام شاہی لشکر نے بھی زبردست دافع کا مظاہرہ کیا۔ عین الملک نے جب دیکھا کہ نظام شاہی لشکر کسی صورت پسپا ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے تو عین الملک گھوڑے سے اتر پڑا اور اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے لگا۔ اس کی مستعدی سے اس کے لشکر میں بھی نئی جان پڑ گئی۔ اس زور کا حملہ کیا کہ

تھا تو صرف یہ کہ اس نے میدان جنگ میں عادل شاہی فوج کی کمان سنبھالی اور آخر دم تک وفادار رہا۔ اس کی بہادری نے جنگ کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور فتح کے قریب لے آیا مگر بادشاہ کی بزدلی نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ جرم وہ نہیں بادشاہ تھا اور اب اس کو بے عزت کیا جا رہا تھا۔

اس نے قاصد کو دوبارہ بھیجا اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر بادشاہ نے ملاقات کا موقع نہیں دیا تو وہ کسی اور کے دامن دولت سے وابستہ ہو جائے گا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اسے بھی عین الملک کی کوئی چال قرار دیا اور قاصد کو بے عزت کر کے نکال دیا۔ اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ عین الملک عادل شاہی حدود سے باہر نکل گیا۔ ایک ہی منزل اس کے سامنے تھی۔ وہ نظام شاہی حدود میں آ پہنچا۔

حسین نظام شاہ اس سے خوش نہیں تھا لیکن اس وقت مصلحت کا تقاضا تھا کہ اسے خوش آمدید کہا جائے کیونکہ اس طرح ابراہیم عادل شاہ کا کمزور ہو جانا لازمی تھا۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا اور کھلو بھیجا۔

”یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عین الملک دوبارہ ہمارے پاس آ گیا۔“

حسین نظام شاہ نے امیر قاسم بیگ کو اس کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور اس مضمون کا ایک خط اس کے نام تحریر کیا۔

”ایک مدت سے میں اس امر کا خواہاں تھا کہ تم یہاں آؤ۔ خدا کا شکر ہے میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ تم کچھ عرصے کے لیے ہماری ملازمت سے محروم رہے ہو، یہ محض ایک اتفاقی امر ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں کسی قسم کا غم یا خوف نہ ہونا چاہیے۔ میری توجہ تم پر پہلے سے دس گنا زیادہ رہے گی۔ تم بالکل بے فکر ہو کر میرے حضور آ جاؤ۔“

حکیم قاسم بیگ اس خط کو لے کر عین الملک سے ملا اور اسے بادشاہ کا خط دیا۔

”میری دو شرطیں مان لی جا میں تو مجھے انکار نہیں ہے۔“ عین الملک نے کہا۔ ”اول یہ کہ حسین نظام خود میرے استقبال کے لیے آئے اور دوسرے یہ کہ جب میں بادشاہ سے ملنے جاؤں تو میری واپسی تک قاسم بیگ میرے لشکر میں رہے۔“

”اب تم مجھے جانے دو۔“ قاسم بیگ نے کہا۔ ”اور تم مجھے اجازت دو تاکہ میں بادشاہ کے پاس جاؤں اور

نظام شاہی لشکر حواس باختہ ہو کر میدان سے بھاگ نکلا۔ نظام شاہی سپاہیوں کے فرار کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے ”علم“ کے پاس صرف ایک ہزار سوار اور ایک سو باغی رہ گئے۔ قریب تھا کہ شکست مکمل ہو جاتی۔ نظام شاہیوں کا پوری طرح صفایا ہو جاتا کہ ایک جھوٹی خبر نے ابراہیم عادل شاہ کو بدگمان کر دیا۔ کسی بدخواہ نے یہ خبر اڑادی کہ عین الملک یونہی اپنے گھوڑے سے نہیں اترا بلکہ اس میں ایک چال ہے۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر دشمن کے ہاتھ سے پان کھایا اور دشمن سے وعدہ کیا کہ ابراہیم عادل شاہ کو قید کر کے اس کے حوالے کر دے گا۔

عین الملک چونکہ نظام شاہیوں کا پرانا نمک خوار تھا اس لیے اسے یقین آ گیا کہ خبر سچی ہے۔ اس نے کسی تعدد بق کی ضرورت محسوس نہیں کی اور میدان جنگ چھوڑ کر بیجا پور کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

عین الملک تہا دشمن کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ قریب تھا کہ فتح حاصل کر لیتا کہ اسے ابراہیم عادل شاہ کے فرار کی اطلاع ملی۔ وہ کیا کرتا اس نے بھی میدان جنگ کو یونہی چھوڑ دیا اور ابراہیم عادل شاہ کو روکنے کے لیے اس کا تعاقب کرنے لگا۔ ابراہیم عادل شاہ کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا، اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عین الملک اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے یہی سوچا کہ عین الملک اسے قید کرنے کے لیے تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار مزید بڑھا دی اور بیجا پور پہنچ کر دم لیا۔ اس کے پیچھے پیچھے عین الملک بھی شہر میں داخل ہو گیا۔

اب عین الملک کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ بادشاہ اس کی طرف سے بدگمان ہے مگر کیوں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کی کوشش کی لیکن اسے ملنے نہیں دیا گیا۔ اس ناکامی کے بعد اس نے ایک معتد شخص کو اپنا قاصد بنا کر ابراہیم عادل شاہ کے پاس بھیجا اور اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے بادشاہ کی برہمی کا سبب پوچھا۔

قاصد لوٹ کر آیا اور جس جواب کے ساتھ آیا، اس نے عین الملک کو حیرت زدہ کر دیا۔

بادشاہ نے جواب دیا تھا کہ مجھے عین الملک جیسے ناکارہ ملازم کی ضرورت نہیں۔ وہ کہیں اور چلا جائے۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتا۔

عین الملک اس جواب پر حیران تھا۔ اس کا جرم اگر

ہاتھیوں کی قطاریں ہیں۔ ان قطاروں کی وجہ سے وہ مقام جہاں حسین نظام گھڑا تھا ایک پتلی گلی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جب حسین نظام کے مصاحبوں نے عین الملک کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ آگے بڑھے اور اس کے گھوڑے کو اس گلی یعنی ہاتھیوں کی قطاروں کی طرف لے آئے اور اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا۔ عین الملک چاہتا تو یہی تھا کہ جس طرح حسین نظام گھوڑے پر سوار ہے وہ بھی سواری کے ساتھ ملاقات کرے لیکن مصاحبوں کے اصرار پر مجبوراً اسے گھوڑے سے اترنا پڑا۔ ابھی اس کے قدم زمین پر پڑے ہی تھے کہ حسین نظام نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور اسے گرفتار کر کے ہاتھی پر بٹھا دیا گیا۔

عین الملک کی بہادری ضرب المثل تھی لیکن اس وقت وہ غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ حسین نظام اسے گرفتار کرنے کے بعد اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں اس قبل بان کو جس کے ہاتھی پر عین الملک سوار تھا نہ جانے کیا سوچی کہ اس نے کسی حکم کے بغیر اپنا فیصلہ کیا اور عین الملک کا گلا گھونٹ دیا اور اس کے مردہ جسم کو زمین پر پھینک دیا۔ حسین نظام کو اطلاع دی گئی کہ عین الملک خوف کی وجہ سے مر گیا۔

قبول خاں کو وہاں پہنچتے ہی عین الملک کی گرفتاری کا علم ہو گیا تھا۔ اس کا اندیشہ درست نکلا تھا۔ وہ ابھی گوگموں کے عالم میں تھا کہ حسین نظام کا حکم نامہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”عین الملک کی عورتیں اور اس کا سامان شاہی بارگاہ میں ملا خطے کے لیے پیش کیا جائے۔“

قبول خاں نے اسی وقت ان عورتوں کو سوار کرایا اور تقریباً پانچ سو افراد کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ کے علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔ حسین نظام شاہ کے آدمیوں نے قبول خاں کا تعاقب کیا۔ راستے میں کی جگہ معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ قبول خاں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا قصبہ اندور کے قریب پہنچا۔ یہاں نظام شاہی امراء موجود تھے جنہیں قبول خاں کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لیکن اس کی بہادری سے خائف بھی تھے۔ سامنے آ کر لڑنے کی ہمت نہیں تھی حالانکہ قبول خاں کے ساتھ پانچ سو سے زیادہ آدمی نہیں تھے۔ یہ ان کا خوف ہی تھا جس نے دن کے وقت انہیں سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ ان پانچ سو آدمیوں

ان شرائط کو ان کے سامنے رکھوں اور واپس آ کر اس وقت تک تمہارے لشکر میں رہوں جب تک تم بادشاہ سے مل کر واپس نہ آ جاؤ۔“

عین الملک نے اجازت دے دی اور وہ وہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ کے پاس چلا آیا۔ حکیم قاسم بیگ وہاں سے تو چلا آیا لیکن پیغام دینے کے بعد اپنے گھر گیا اور بیماری کا بہانہ کر کے صاحب فراش ہو گیا۔

حسین نظام نے اپنے مصاحبین کی ایک جماعت کو اعلیٰ درجے کے کھانے اور شربت دے کر عین الملک کے پاس بھیجا اور اسے کہلوا یا کہ تم فلاں وقت فلاں مقام پر مجھ سے ملاقات کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ قاسم بیگ بیمار ہو گیا ہے اس لیے وہ تمہارے پاس آنے سے قاصر ہے۔ تم اپنی جگہ سے چل پڑو۔ میں تمہارے استقبال کو روانہ ہو رہا ہوں۔ عین الملک کو پیغام مل چکا تھا کہ بادشاہ اس کے استقبال کے لیے روانہ ہو چکا ہے اس لیے وہ مجبوراً ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ بادشاہ سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔ عین الملک کے غلام قبول خاں نے رواگلی کی مخالفت کی اور کہا کہ قاسم بیگ کی بیماری خود ساختہ اور مکاری ہے۔ اس میں ضرور کوئی چال ہے لیکن عین الملک نے اس کی بات نہ مانی اور اپنے ارادے پر قائم رہا۔

قبول خاں نے عین الملک کو چھوڑا اور بھاگ بھاگ لشکر میں پہنچا۔ اس نے لشکریوں سے کہا سب لوگ شہر میں چلے جائیں اور جس جگہ بادشاہ نے ملاقات کا کہا ہے، وہاں جا کر قیام کریں۔

”کیوں؟ یہ حکم نامہ کس کا ہے؟“ ایک سردار نے پوچھا۔ ”آقا کی جان خطرے میں ہے۔ قاسم بیگ جان بوجھ کر بیمار پڑ گیا ہے اور بادشاہ نے میرے اور تمہارے آقا کو دھوکے سے بلایا ہے۔ یہ میرا ہم بھی ہو سکتا ہے اور حقیقت بھی۔ میں نے آقا کے سامنے اس کا اظہار کیا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ اپنے آقا کی جان کی حفاظت کے لیے یہاں سے کوچ کریں۔“

عین الملک بہت جلدی میں تھا۔ دھڑلے میں نکل پڑا۔ جب تک لشکر آبادہ ہوتا عین الملک ”نبہ پور“ پہنچا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں حسین نظام شاہ نے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

عین الملک نے دیکھا کہ حسین نظام ایک میدان میں گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے سامنے دونوں اطراف

دینے کا عہد کیا اور پھر اسے گرفتار کر کے ہلاک کرادیا۔ وہ آپ کے ساتھ بھی چال چل سکتا ہے۔“

ابراہیم قطب شاہ کو قبول خاں یاد آگیا جو حسین نظام کے خوف سے اس کی پناہ میں آگیا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی دھوکے میں نہ آئے۔ اس نے اپنا تمام سامان وہیں چھوڑا اور خود آدھی رات کے وقت اپنے ملک کی طرف چلا گیا اور اہل قلعہ کو یہ کہہ گیا کہ وہ نظام شاہیوں کی بھرپور مدد غلط کریں اور کسی صورت قلعہ حوالے نہ کریں۔

ابراہیم قطب شاہ نے حسین نظام کا ساتھ چھوڑا اور علی عادل جانشین ابراہیم عادل شاہ سے آ ملا۔

جب صبح ہوئی تو حسین نظام کو اپنے لشکر میں نہ پا کر پریشان ہوا۔ اب اس نے اس مقام پر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور جلد از جلد اپنے وطن احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی عادل شاہ کے لیے یہ موقع غنیمت تھا جبکہ قطب شاہ بھی اس سے آ ملا تھا۔ اس نے بھانگر کے راجا رام راج سے تعلقات استوار کیے اور اسے اپنے ساتھ ملا کر احمد نگر کی طرف روانہ ہوا۔

حسین نظام نے یہ اطلاع ملتے ہی اپنے امیروں سے مشورہ کیا۔ ان سب نے ایک ہی مشورہ دیا کہ ہم میں اتنی قوت نہیں کہ ان تین بادشاہوں سے مقابلہ کریں۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم کلیان کا قلعہ علی عادل شاہ کے حوالے کر کے اس سے صلح کر لیں۔

حسین نظام اس مشورے پر بھڑک اٹھا۔

”جس قلعے کو میرے باپ نے اتنی محنت سے فتح کیا ہے، اسے کسی مدخلت کے بغیر دشمن کے حوالے کر دوں۔ یہ میری غیرت کے منافی ہے۔“

”ہر زمانے کے تقاضے جدا جدا ہوتے ہیں۔“ امراء نے کہا۔ ”آپ کے والد کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ قلعہ کلیان پر قبضہ کرتے اور آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ دست بردار ہو جائیں۔ یہ قلعہ کسی مناسب وقت پر دوبارہ فتح کیا جاسکتا ہے۔“

”جو کچھ تم لوگ کہتے ہو، مجھ سے یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ حسین نظام نے امیروں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اپنی بات پر اڑا رہا۔ اسی اثنا میں علی عادل ایک لاکھ سواروں اور دو لاکھ پیادوں کا لشکر لے کر احمد نگر کے نواح میں پہنچ گیا۔

حسین نظام شاہ نے فوراً احمد نگر کے کچے قلعے میں

کے ساتھ ساتھ ریگتے رہے اور جب ایک جگہ رات کے اندھیرے نے راستوں کو چھپا دیا، ان امیروں کے آدمی شب خون کے انداز میں ان پر ٹوٹ پڑے۔ اندھیرے کی چادر میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ دشمن کون ہے دوست کون۔ ایسے میں کوئی اور ہوتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن یہ قبول خاں تھا۔ اس کے آقا کی عزتیں اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ڈنار ہاواران امراء کو بھاگنے پر مجبور کر دیا لیکن اس کوشش میں اس کی آدمی نفری کٹ چکی تھی۔ اس نے وفاداروں کی لاشیں میدان میں چھوڑیں اور عورتوں کو لے کر ابراہیم قطب شاہ کے علاقے کی طرف چلا گیا۔

ابراہیم قطب شاہ نے قبول خاں کو خوش آمدید کہا۔ اس نے جس طرح اپنے مالک عین الملک سے وفاداری کی تھی اور اس کے داروں کی حفاظت کی تھی، قطب شاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور قبول خاں کو انعام میں جاگیر عطا کی۔

☆☆☆

ابھی ابراہیم عادل شاہ کو نیا گل کھلنے نہیں پایا تھا کہ اسے مختلف بیماریوں نے گھیر لیا۔ حسین نظام نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حسن آباد گلبرگہ کو فتح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے امیر قاسم بیگ کو گولکنڈہ بھیج کر ابراہیم قطب شاہ کو پیغام بھیجا۔

”اب حالات ہمارے موافق ہیں۔ ہمیں اس وقت سے فائدہ اٹھا کر قلعہ گلبرگہ پر قبضہ کر لیتا چاہیے۔“ ابراہیم قطب شاہ نے موقع غنیمت جان کر اپنا مطالبہ بھی درمیان میں ڈال دیا۔

”میں قلعہ گلبرگہ کی فتح میں آپ کی مدد کروں گا لیکن اس شرط پر کہ قلعہ آجنگر پر آپ میرے ساتھ مل کر حملہ کریں گے اور اس قلعے کو میرے حوالے کر دیں گے۔“

حسین نظام نے اس کی یہ شرط منظور کر لی اور دونوں گلبرگہ پہنچ گئے۔

دونوں لشکروں نے مل کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ توپوں کے وہانے کھلے تو برجوں کی بنیادیں مل کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ قلعہ فتح ہوتا.... قطب شاہ کے امراء کبار میں سے کسی نے اپنے بادشاہ کے کان بھرے۔

”حسین نظام شاہ وعدے کا کچا ہے۔ وہ قلعہ گلبرگہ پر قابض ہو جائے گا لیکن آپ کو قلعہ آجنگر پر قبضہ نہ کرنے دے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اس کی مدد نہ کریں۔“

”بادشاہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔“

”یہی وہ بادشاہ ہے جس نے امیر عین الملک کو پناہ

غلطی

مالک نوکر سے۔ ”اس قدر مہنگائی میں پرائے میں اس قدر مہی..... کیا ہو گیا ہے تمہیں غفلو۔“
نوکر۔ ”جنا ب معاف کر دیں۔ دراصل میرا دالا پراٹھا آپ کی طرف چلا گیا ہے۔“

جواب حاضر ہے

ایک شاعر کی شادی ہوئی، دوسرے دن بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”مادر کیے گا مجھے کھانا پکانا نہیں آتا۔“
شاعر بولا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ یہاں پکانے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں۔“

سورویہ کانوت

ایک آدی مشہور شاعر احمد فراز کے مجموعہ کلام کی کتاب خرید رہا تھا۔ دکاندار نے پوچھا۔ ”فراز آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں۔“
وہ شخص بولا۔ ”میں تو ان کی کتابیں اس لیے خریدتا ہوں کہ ایک دفعہ ان کی کتاب سے مجھے سو کا نوٹ ملتا تھا۔“

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

یقین

یقین جانو تمام انسان آزاد اور با اختیار پیدا ہوتے ہیں۔

مگر..... ان میں سے کچھ شادی کر لیتے ہیں اور پھر بے چارے بے اختیار ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

جادوگر نی

بیوی۔ ”آپ کو چکن بنا دوں؟“

شوہر۔ ”نہیں..... میں انسان ہی ٹھیک ہوں..... وڈی آئی جادوگر نی۔“

☆☆☆

ایک سکھ کا سر پھٹ گیا۔

ڈاکٹر۔ ”سردار جی کیا ہوا؟“

سردار۔ ”میں چپل سے دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا

کہ ایک آدی بولا..... سردار جی کھوپڑی استعمال کرو۔“

مرسلہ: محمد جاوید خان۔ تحصیل علی پور

جس کے سامنے خندق بھی نہ تھی، سامان جنگ غلہ اور دیگر اشیاء جمع کیں اور قلعے کو چند قابل اعتماد امیروں کے سپرد کر کے اپنے بال بچوں اور خزانوں کے ساتھ احمد نگر سے کھل کر اپنے علاقے ”جیر“ کی طرف چلا گیا۔ یہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ امیر برید اور عماد الملک کو اپنے ساتھ ملائے اور پھر دشمن کے ساتھ جنگ کرے لیکن امیر برید کے بھائی خان جہاں نے یہ منصوبہ پورا نہیں ہونے دیا۔ خان جہاں عماد الملک کا مدار الہام تھا۔ اس نے جب سنا کہ احمد نگر خالی ہو گیا ہے اور حسین نظام عماد الملک سے ساز باز کرنے کے لیے جیر میں ہے تو اس نے عماد الملک کو درغلا یا کہ اس وقت احمد نگر پر حملہ کر دیا جائے۔ اس سے پہلے کہ حسین نظام، عماد الملک کی طرف قاصدوں کو دوڑاتا، خان جہاں لشکر لے کر احمد نگر پہنچ گیا۔ حسین نظام شاہ نے ایک سردار کی سربراہی میں خان جہاں کی گوشائی کے لیے تین ہزار سوار بھیج دیے۔ اس لشکر نے پہلے ہی حملے میں خان جہاں کو شکست دے دی۔ اس قصبے سے نجات ملی لیکن ایک اور مصیبت سامنے کھڑی تھی۔ علی عادل شاہ اپنے دو اتحادیوں رام راج اور قطب شاہ کے ہمراہ احمد نگر میں داخل ہو گیا۔ رام راج کے ساتھ آئے ہوئے ہندوؤں نے ظلم کی انتہا کر دی۔ آبادی کو قتل کیا، عمارتوں کو آگ لگائی۔ مسجدوں کی بے حرمتی کی اور انہیں اسطبلوں میں تبدیل کر دیا اور پھر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کی وجہ سے اہل قلعہ کو بے حد تکلیف ہوئی۔

..... قطب شاہ علی عادل کے ساتھ آیا تھا۔ اس کا حلیف تھا لیکن اس کی خواہش بھی تھی کہ کسی طرح بھی عادل شاہ کو حسین نظام پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اس نے قلعے کے ایک طرف کا راستہ چھوڑ دیا اور خود مقیم تھا، اہل قلعہ کے لیے کھول دیا۔ قلعے والے بے خوف و خطر آنے جانے لگے اور ضرورت کی تمام اشیاء ان تک پہنچنے لگیں۔

یہ راز زیادہ دنوں تک راز نہ رہ سکا۔ عادل شاہ اور رام راج کو جب قطب شاہ کے اقدام کی خبر ہوئی تو وہ اس سے ناراض ہو گئے اور اسے دبانے کی کوشش کرنے لگے۔ قطب شاہ اس صورت حال کو زیادہ زیر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک رات تمام سامان وہیں چھوڑا اور گولکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

عماد الملک نے اس عرصے میں حسین نظام کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور جہانگیر خاں دکنی کو پیشوا مقرر کر کے اسے ایک معقول لشکر کے ساتھ نظام شاہ کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

کو واسطہ بنا کر معاملے کو رفع و رفع کرایا اور صلح کی کوشش کرنے لگے۔

اس گفت و شنید کے نتیجے میں رام راج اپنی جگہ سے اٹھا اور حسین نظام کے استقبال کی تجدید کی۔ پھر اپنی نشست کے برابر بیٹھایا۔

حسین نظام نے قلعہ کلیان کی چابی رام راج کے سپرد کی۔ رام راج نے یہ چابی اسی وقت علی عادل کے پاس بھیجوا دی۔

حسین نظام نے یہ سمجھا تھا کہ رام راج کے غرور کا سبب علی عادل ہے۔ اسی کے کہنے پر اس نے یہ ناشائستہ حرکت کی تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا تھا لہذا اس نے علی عادل سے ملاقات نہیں کی اور اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ بعد ازاں وہ احمد نگر روانہ ہو گیا۔

وہ رام راج سے تو صلح کر چکا تھا لیکن علی عادل کی طرف سے اب بھی کھٹکا تھا۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے لیے خفائی بند دوست کر لے۔ اس نے احمد نگر کے قلعے کی ازبیر کو تعمیر شروع کروائی اور اس کی وسعت میں اضافہ کیا۔ قلعے کے گرد اس نے ایک چوڑی اور گہری خندق کھدوائی۔

انہی دنوں عماد الملک کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا برہان عماد الملک تخت نشین ہوا۔

حسین نظام شاہ قطب شاہ سے دوستانہ مراسم پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ قلعہ احمد نگر کے محاصرے کے ایام میں قطب شاہ نے اس سے بہت اچھا برتاؤ کیا تھا۔

حسین نظام کے مقرب خاص ملاعنایت نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ایک قاصد قطب شاہ کے پاس بھیجے۔

ملاعنایت کی کوششوں سے حسین نظام اور قطب شاہ میں اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ ان دونوں نے یہ بھی طے کیا کہ قلعہ کلیان کو فتح کیا جائے۔ مزید طے ہوا کہ اگر رام راج اور علی عادل مزاحمت کریں تو حسین نظام رام راج سے لڑائی کرے اور قطب شاہ علی عادل کو سمجھے۔

اس معاہدے کے بعد حسین نظام اور قطب شاہ نے قلعہ کلیان کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ اہل قلعہ پہلے کی طرح عاجز آ کر حسین نظام سے امان کے طالب ہوتے کہ اچانک یہ اطلاع ملی کہ رام راج اور علی عادل ایک زبردست لشکر لے کر اس طرف آ رہے ہیں۔

برہان عماد الملک ابھی جہانگیر خاں دکنی کے قتل کا واقعہ بھولا نہیں تھا۔ اس نے بھی حسین نظام سے بدلہ لینے کا

جہانگیر خاں دکنی نے عادل شاہی سرحد پر قیام کیا اور دشمن کی نقل و حرکت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کا ردوائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رام راج اور عادل شاہی لشکر میں غلے کی رسد بند ہو گئی اور جلد ہی قلعے سے آٹا پیدا ہونے لگے۔

جب صورت حال دگرگوں ہو گئی تو رام راج اور عادل شاہ نے پڑاؤ ختم کیا اور آشتی نامی قصبے میں آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک فوج قلعہ پر بندہ حملہ کرنے کے لیے بھیجی جائے اور واپس آ کر احمد نگر کو حسین نظام کے قبضے سے نکالا جائے۔

جب اس منصوبے کی اطلاع حسین نظام کو ہوئی تو اس کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ اس نے قاسم بیگ کو رام راج کے پاس بھیجا کہ وہ اسے صلح اور دوستانہ مراسم کے لیے آمادہ کرے۔ قاسم بیگ کی کوششوں سے صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔

رام راج نے صلح کے لیے تین شرطیں پیش کیں۔ کلیان کا قلعہ علی عادل کے سپرد کر دیا جائے۔ جہانگیر خاں دکنی کو قتل کر دیا جائے کیونکہ اس نے ہماری رسد بن کر دی تھی۔ حسین نظام ہمارے پاس آئے۔

یہ تینوں شرائط نہایت کڑی تھیں، خاص طور پر جہانگیر خاں دکنی کے قتل کی شرط لیکن اس نے اپنی اور اپنے ملک کی خیر ای میں دیکھی کہ انہیں مان لیا جائے۔ اس نے اپنے چند خاص آدمیوں کو جہانگیر خاں دکنی کے گھر روانہ کیا۔ یہ بھی خیال نہ کیا کہ وہ مہمان ہے اور مدد کو آیا ہے۔ ایک کافر کے کہنے پر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ رام راج سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔

ملاقات کے وقت رام راج کا غرور دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور بیٹھے بیٹھے حسین نظام کی دست بوسی کی۔ حسین نظام سمجھ رہا تھا کہ وہ شرط پوری کرنے پر مبارک باد دے گا لیکن یہاں تو معاملہ بالکل الٹ تھا۔ رام راج استقبال کے لیے کھڑا تک نہیں ہوا۔ حسین نظام کو یہ ناشائستہ حرکت نہایت ناگوار گزری۔ اس نے اسی وقت بھری محفل میں پانی منگوایا اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ رام راج سمجھ گیا کہ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔ جواب میں اس نے بھی پانی منگوایا اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ ”اگر یہ شخص میرا مہمان نہ ہوتا تو ابھی تلوار سے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔“

بد مزحی ایسی ہو گئی تھی کہ حسین نظام کو واپس لا راستہ دیکھنا چاہیے تھا لیکن رام راج کے بھائیوں نے قاسم بیگ

حسین نظام اکیلا اسنے حکمرانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لشکر کو غلے اور آتش بازی کے آلات سے مضبوط کیا اور خود ”جبر“ کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی عادل اور رام راج احمد نگر پہنچے۔ رام راج کے ساتھ آئے ہوئے ہندوؤں نے مسجدوں اور مکانوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔ علی عادل کے لیے مسجدوں کی بے حرمتی تکلیف دہ بھی لیکن وہ منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بس یہی کر سکتا تھا کہ رام راج کو یہاں سے نکال لے جائے۔ اس نے رام راج کو مشورہ دیا۔

”یہاں کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ حسین نظام شاہ کا تعاقب کریں۔“

رام راج کو یہ مشورہ پسند آیا اور وہ علی عادل کو لے کر حسین نظام شاہ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

حسین نظام کو جب خبر ہوئی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے تو اس نے ”جبر“ سے کوچ کیا اور قریبی کوہستانی علاقے میں چلا گیا۔

علی عادل کے ہاتھ سے شکار نکل گیا تھا۔ حسین نظام اب جبر میں نہیں کوہستانی علاقے میں تھا۔ رام راج اور علی عادل دونوں واپس ہوئے اور احمد نگر پہنچ گئے۔ رام راج نے نہر سین کے کنارے اپنے خیمے لگائے اور علی عادل اس سے کچھ فاصلے پر قیام پزیر ہوا۔

اسی دوران شدید بارشیں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک روز رات کے وقت نہر سین میں زبردست سیلاب آ گیا۔ اس سیلاب کی وجہ سے رام راج کے لشکر میں بڑی تباہی آئی۔ اس کے بیس امیر، بارہ ہزار سوار اور سیکڑوں ہاتھی اس سیلاب کی نذر ہو گئے۔

یہ نقصان اپنی جگہ لیکن رام راج نے اسے اپنے حق میں بدشگونی سمجھا اور کسی کو کچھ بتانے بغیر اپنے ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ قطب شاہی سرحد کے قریب واقع قصبہ برکی تک پہنچا تھا کہ اس کی ہوس نے پاؤں پھیلانے۔ اس نے قطب شاہی اور عادل شاہی علاقوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ دونوں حکمران اپنے اپنے پایہ تخت سے دور ہیں۔

برسات کا بہانہ کر کے برکی میں قیام کیا اور چند پرگنوں پر قبضہ کر کے بیجا نگر روانہ ہو گیا۔

علی عادل نے جب رام راج کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی واپسی کے لیے کمر باندھ دیا اور جاتے جاتے نلدرک کا علاقہ اپنے ایک امیر مرتضیٰ خاں انجو کے

بہری موقع دیکھ کر علی عادل شاہ سے اتحاد کر لیا۔ حسین نظام اتنی طاقتوں کا ایک ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تھک ہار کر قلعہ کلیان کے محاصرے سے دستبردار ہو گیا۔ اپنے بال بچوں کو قلعہ اوسا کی طرف روانہ کر دیا اور خود قطب شاہ کے ہمراہ دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہوا اور دشمن سے چھ کوس کے فاصلے پر مقیم ہوا۔ دوسرے روز دونوں نے لشکر مرتب کیے اور دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔

یہ دونوں دشمن کے بہت قریب پہنچ چکے تھے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی حالانکہ یہ بارش کا موسم نہیں تھا۔ بارش اتنی خوفناک تھی کہ میدان میں کیچڑ اور دلدل کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس کا توپ خانہ نہ صرف بے کار ہو کر رہ گیا بلکہ دشمن کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں اور اس سے کہا جائے تلوار چلاؤ۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جنگ سے ہاتھ اٹھالیا جائے۔

”میں ان توپ خانوں کی وجہ سے رام راج سے جنگ کرنا چاہتا تھا، اب صورت حال بدل گئی ہے۔ توپ خانے دشمن کے ہاتھ میں آ گئے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں دشمن سے جنگ کرنا مناسب ہے؟“

مشیروں نے بھی یہی مشورہ دیا۔

”موجودہ حالت میں دشمن سے معرکہ آرا ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اگر اس وقت لڑائی کی گئی تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ فی الحال آپ لڑائی کا ارادہ ترک فرمائیں اور اپنے ملک کو واپس چلیں۔ آئندہ کبھی موقع ملے تو دشمن سے سمجھ لیا جائے گا۔“

حسین نظام اس مشورے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دشمن نے ان دونوں کا تعاقب کیا۔ روانہ ہوتے ہوئے نظام شاہی لشکر میں سخت انتشار پھیل گیا۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا ہماگ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حسین نظام کے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ سوار نہ رہے۔ اس کے باوجود حسین نظام سفر کی منزلیں طے کرتا رہا۔ دشمن کے پانچ چھ ہزار سواروں نے اسے گھیر رکھا تھا لیکن کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ حسین نظام شاہ کی طرف آکھ اٹھا کر دیکھتا بالآخر تعاقب کرنے والے واپس ہو گئے۔

حسین نظام احمد نگر پہنچا ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ رام راج، علی عادل، علی برید اور برہان عماد الملک احمد نگر پہنچنے والے ہیں۔ اس وقت قطب شاہ بھی واپس چاچکا تھا۔

حوالے کر گیا۔ یہ علاقہ شولا پور کے نزدیک تھا۔

مرقتلی خاں شولا پور میں بیٹھنے والا نہیں تھا۔ گاہے بگاہے شولا پور کی طرف جاتا اور تباہی و بربادی پھیلنا کر لوٹ آتا۔ یہ قلعہ چونکہ حسین نظام کے قبضے میں تھا، اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ اس نے غلے کی بارہ ہزار بوریاں قلعہ شولا پور میں بھیجیں کہ اگر کسی وقت مرقتلی خاں قلعے کا محاصرہ کر لے تو اہل قلعہ کو غذائی قلت کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ مرقتلی خاں کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے حملہ کر دیا۔ نظام شاہی امراء اس حملے کی تاب نہ لائے اور میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ مرقتلی خاں نے غلے کی بہت سی بوریاں کو آگ لگا دی اور سیکڑوں بوریاں ہاتھیوں پر لاد کر بیجا پور بھیج دیں۔ یہ بھی بھی وہ تھے جو نظام شاہی امراء میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

جب وقت نظام شاہی امراء میدان سے بھاگے تھے، امیر شاہ محمد کا ایک غلام مرقتلی خاں کے ہاتھ لگ گیا تھا جسے کچھ دیر بعد مرقتلی خاں نے بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ وہ اپنے مالک کے پاس پہنچا اور اسے خبر دی۔

”عادل شاہی امراء اس وقت لوٹ مار میں مصروف ہیں اور مرقتلی خاں کچھ فاصلے پر ایک مقام پر ٹھہرا ہوا ہے جو مجھے معلوم ہے۔ اس وقت اسے بد آسانی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔“

ان امراء نے اسی وقت دو تین ہزار سپاہیوں کو ساتھ لیا اور اس مقام پر پہنچ گئے جہاں مرقتلی خاں ٹھہرا ہوا تھا۔ مرقتلی خاں کو پہنچنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔

یہ امراء اسے لے کر احمد نگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ عادل شاہ کا امیر مرقتلی خاں گرفتار ہو چکا تھا۔ دوسری جانب سے نظام شاہی امیر شاہ علی عادل شاہ کے ہاتھ لگ گیا تھا لہذا دونوں جانب سے کوشش کی گئی کہ قیدیوں کا تبادلہ ہو۔ فریقین بیچ میں پڑے۔ شاہ قلی احمد نگر آ گیا اور مرقتلی خاں کو بیجا پور بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

پہلی مرتبہ جب علی عادل شاہ، حسین نظام شاہ کی ہنگامہ آرائیوں سے پریشان ہوا تھا تو اس نے رام راج سے مدد طلب کی تھی اور یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ بیجا نگر کے ہندو مسلمانوں کو محض اس لیے نقصان نہیں پہنچائیں گے کہ ایک فریق ہندو ہے دوسرا مسلمان۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مسلمانوں کے جان و مال

اور عزت و آبرو پر ہندو دوست درازی نہیں کریں گے لیکن رام راج نے اس وعدے کو فراموش کر کے احمد نگر میں مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ نفل سے اپنے ہاتھ روکنے نہ مسجدوں کی بے حرمتی سے۔ علی عادل یہ سب دیکھ بھی رہا تھا اور بن بھی رہا تھا لیکن وہ اس وقت کچھ نہ بولا کہ مصلحت یہی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا افسوس اور دکھ بڑھتا گیا۔ انہی دنوں اس نے خواب دیکھا۔ کوئی اس سے کہہ رہا تھا، تم کیسے مسلمان ہو۔ اپنے سامنے مسجدوں کو جلنے ہوئے دیکھتے رہے اور خاموش رہے۔ مسلمانوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتے رہے اور کسی کا ہاتھ نہ پکڑ سکے۔ روزِ محشر خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ وہ ہندوؤں سے جنگ کرے گا اور مسلمانوں کے قتل کا بدلہ لے گا۔ شاید اس طرح اس کی بخشش ہو جائے۔ اس نے امراء اور اراکین سلطنت کو مشورے کے لیے بلا یا اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ ان امراء نے تمام باتیں غور سے سنیں۔ ان میں محمد کشور خاں بھی تھا جو نہایت صاحب فہم اور بادشاہ کا راز دار تھا۔ اس نے نہایت ادب سے عرض کیا۔

”حضور کی رائے نہایت غصوں اور جامع ہے۔ اس پر مزید غور و فکر کی گنجائش نہیں تاہم چونکہ آپ نے ہمیں اظہارِ خیال کا حکم صادر کیا ہے اس لیے بعد ادب گزارش ہے کہ اس قدم کے اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام مسلمان فرماں روا باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لیں کیونکہ یہ معاملہ کشور کشائی کا نہیں تمام مسلمانوں کی غیرت کا ہے۔ رام راج کے لشکر کی کثرت اور اس کی روز افزوں قوت روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس کا ملک چھ بندر گاہوں، ان گنت قلعوں اور شہروں پر مشتمل ہے۔ اس کا محصول بارہ کروڑ ہوں ہے۔ اس کے جاہ و جلال کا سکہ ہر دل پر لکھا ہوا ہے۔ اس سے تنہا جنگ کرنا مناسب نہیں۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ ہماری رائے میں اس وقت حضور کو حسین نظام سے دوستانہ مراسم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔“

علی عادل نے کشور خاں کے اس مشورے کو پسند کیا اور اسے اس معاملے میں مختار کل بنا دیا۔

”آپ اس معاملے میں مختار کل ہیں جو قدم اٹھانا چاہیں اٹھائیں، آپ کو میری منظوری کی ضرورت نہیں۔ فیصلہ بھی آپ کریں گے، عمل بھی آپ کریں گے۔“

کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے، اس کے بعد یہ تینوں حکمران آپس میں مل کر رام راج پر حملہ کریں۔ اسی طرح شولا پور کا قضیہ بھی منٹ جائے گا جو ہر مرتبہ جھگڑے کی بنیاد بنتا ہے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ایک ہی دن دونوں طرف شادی کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ چاندنی بی بیچا پور آگئی اور ہدیہ سلطان بیاہ کرا احمد نگر آگئی۔

یہ شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ طرفین نے جی کھول کر جشنِ مسرت منعقد کیے۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ اب اس مقولے پر عمل کرنے کا وقت تھا۔

شادی کے امور سے فراغت کے بعد علی عادل شاہ نے حسین نظام شاہ، ابراہیم قطب شاہ اور علی برید کے ہمراہ رام راج کو تباہ و برباد کرنے کا معمم ارادہ کر لیا۔ یہ چاروں فرماں روا بیچا پور کے قریب ایک جگہ جمع ہوئے اور پوری تیاری سے لشکرِ عظیم کو لے کر بیچا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ سفر کی منزلیں طے ہوتی رہیں یہاں تک کہ دریائے کرشنا کا کنارہ آ گیا۔ یہ علاقہ علی عادل شاہ کے قبضے میں تھا۔

”دریا کے تمام گھاٹ بند کر دو۔“ رام راج اس زور سے چیخا کہ دربار کے درویدوار اہل گئے۔

اس نے اپنے بھائی تمران کو بیس ہزار سواروں، پانچ سو ہاتھیوں اور ایک لاکھ پیادوں کے لشکرِ جبار کے ساتھ وریا کے تمام گھاٹوں کو بند کرنے کے لیے روانہ کیا۔

اس لشکر کی روانگی کے بعد رام راج نے اپنے بھیلے بھائی ننگناواری کو مال و اسباب کے ساتھ روانہ کیا۔ ان لوگوں نے گھاٹ بند کر دیے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا دریا کے پار اترنا مشکل ہو گیا۔

یہ انتظامات ہو گئے تو رام راج خود بھی آس پاس کے راجاؤں اور ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

مسلمان باوشاہوں نے ایک جماعت کو وریا کی گہرائی کا اندازہ کرنے کے لیے پانی میں اتارا۔ ان لوگوں نے بیس چالیس کوس تک وریا میں چلنے کے بعد دو تین راستے ایسے دریافت کیے جہاں دریا کم گہرا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ جہاں پانی کم ہے اس کے بالکل سامنے دوسرے کنارے پر ہندوؤں کی فوج کھڑی ہوئی ہے۔

آخر ایک طویل مشورے کے بعد یہ جبراً اڑی کہ ہم نے ایک اور انوکھا اور نیا گھاٹ دریافت کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لشکر کے سپاہی گروہ و گروہ اس طرف جانے

کشور خاں نے اختیار ملتے ہی ایک قاصد ابراہیم قطب شاہ کے پاس بھیجا۔ ابراہیم قطب شاہ پہلے ہی رام راج سے نالاں تھا۔ رام راج نے اس کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے مدعا سنتے ہی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کشور خاں نے یہ ذمہ داری ابراہیم قطب شاہ کے سپرد کی کہ وہ حسین نظام کو اس معاملے میں قائل کرے۔

ابراہیم قطب شاہ نے مصطفیٰ خاں اردستانی جو صحیح النسب سید اور ایک عظیم المرتبت فرد تھا، احمد نگر بھیجا۔ اس نے حسین نظام سے ملاقات کی اور تاریخی حوالوں سے وقت کی ضرورت کو بیان کیا۔

”سلاطین، بہمنیہ کے عہد حکومت میں جبکہ تمام ملک وکن پران کی حکومت بھی، بھی مسلمان فتح حاصل کرتے تھے، کبھی بیچا نگر کے ہندو مسلمانوں پر غالب آتے تھے۔ بہمنی سلاطین عام طور پر بغیر کسی نتیجے کے ہی جنگ موقوف کر دیتے تھے اور بیچا نگر کے ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ اب کی بات دوسری ہے۔ اب ملک دکن کسی ایک حکمران کے تابع نہیں۔ کئی حکمرانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ تمام مسلمان فرماں روا ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں، باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لیں تاکہ زبردست دشمن سے نجات پا سکیں۔ ہمارا الیہ یہ ہے کہ ہندو متحد ہیں اور مسلمان حکمران ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ رام راج کی روز افزوں قوت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کرناٹک کے تمام فرماں روا اس کے تابعدار ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمان فرماں رواؤں کا ایک دوسرے سے کشیدہ رہنا بالکل بے جا ہے۔“

حسین نظام شاہ نے مصطفیٰ خاں کی تعریف کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس رائے نظام شاہی سے ملاقات کر کے صلح کے معاملات طے کرے۔

مصطفیٰ خاں نے حسین نظام کے چند اہم امراء سے تنہائی میں ملاقات کی اور قربت کے لیے نئے نئے راستے تلاش کیے گئے۔ ان ملاقاتوں میں عادل شاہی امراء بھی شریک ہوئے۔ فریقین نے طے کیا کہ حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاندنی بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کروے اور اپنی بیٹی کو جین میں شولا پور کا قلعہ دے دے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اپنی بہن ہدیہ سلطان کو حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے شہزادہ مرتضیٰ سے بیاہ دے اس طرح دونوں فرماں رواؤں

گئے۔ دوسری طرف کھڑا دشمن ان حرکات و سکنات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ صحیح نتیجے پر پہنچا۔ اس نے اصل گھاٹ کو خالی کر دیا اور اس طرف کوچ کر گیا جس طرف عادل شاہی سپاہی گئے تھے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مسلمانوں کے مقابل چلنے لگے۔ ہندوؤں سے غلطی یہ ہوئی کہ اپنی فوج کا کوئی حصہ اصل گھاٹ پر مسلمانوں کو روکنے کے لیے نہیں چھوڑا۔ مسلمانوں نے اپنی تجویز کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھا تو اصل گزرگاہ کا رخ کیا اور دو تین روز کے راستے کو صرف بارہ گھنٹے میں طے کر کے اصل گھاٹ پر پہنچ گئے۔ دشمن کی فوج ابھی تک نہ پہنچی تھی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت بڑے سکون کے ساتھ گھاٹ سے اتری۔ اس کے بعد مسلمانوں کا سارا لشکر گھاٹ عبور کر کے میدان میں آ گیا۔ صبح ہوتے ہی یہ لشکر رام راج کی فوج کی طرف روانہ ہوا۔ رام راج کی فوج یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر مقیم تھی۔

مسلمان فرماں رواؤں نے اپنے لشکر کو منظم و مرتب کیا۔ تمام توپیں بارود اور گولوں سے بھری گئیں۔ حسین نظام کے تیر اندازوں نے رام راج کی فوج کو توپ خانے کے سامنے دھکیل دیا اور پھر توپوں کے دہانے محل گئے۔ رام راج کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔

رام راج اب تک کسی غلط فہمی میں تھا۔ اس تباہی کے بعد اس کی آنکھیں کھلیں۔ وہ فوراً اپنے سنگھاسن سے نیچے اتر پڑا۔ زربلغت کا شامیانہ نصب کیا گیا۔ وہ اسی شامیانے میں ایک جڑاؤ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے حکم کے مطابق اس کے چاروں طرف روپے، اشرفیوں اور موتیوں کے انبار لگا دیے گئے۔ دولت کے یہ ڈھیر اس نے بغیر کسی حساب کے اپنے لشکریوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ انعام کے لالچ میں اس کے سپاہی پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش سے لڑنے لگے۔ اس زور کے حملے ہوئے کہ مسلمانوں میں پریشانی پھیل گئی۔

یہ کیفیت دیکھ کر مسلمان بادشاہوں پر مایوسی نے غلبہ کر لیا مگر حسین نظام شاہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اس کے چاروں طرف ہزاروں بان اور لنگ جھوٹ رہے تھے لیکن وہ آگے بڑھا تا کہ دشمن پر حملہ کرے۔ مسلمانوں کی کیفیت دیکھ کر مسلمان بادشاہوں پر مایوسی نے غلبہ کر لیا مگر حسین نظام شاہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اس کے چاروں طرف ہزاروں بان اور لنگ جھوٹ رہے تھے لیکن وہ آگے بڑھا تا کہ دشمن پر حملہ کرے۔ مسلمانوں کی

یہ سب نتیجہ تھا اتحاد و اتفاق کا کیونکہ..... اتحاد میں بڑی برکت ہے۔

ماخذات:

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، طبقات ناصری، منہاج سراج الدین، تاج البائتر، حسن بن احمد نظامی، منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی۔

محمد یاسر اعوان



ماحول پر سردی طاری تھی۔ اپنے گھر میں بوزمی کلیر آئندہ ان کے سامنے بیٹھی اپنی باتوں کی کسر پر محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ”ہیلو“ کلیر نے ریسورسٹا کر کہا..... جواب میں دوسری طرف سے ایک نرم اور خوبصورت نسوانی آواز سنائی دی۔

”میں نے اخبار میں آپ کا نمبر ذاتی کالم میں دیکھا تھا۔“ کلیر کو اس قسم کے ٹیلی فون آنے کی امید تھی۔ کیونکہ رات کے گیارہ بجے کوئی بھی اسے ٹیلی فون

نے کہا۔ ”آپ مجھے اچھی خاتون معلوم ہوتی ہیں، آپ کون ہیں؟“

کلیرا کو اس سوال کا تقریباً ہر مرتبہ سامنا کرنا پڑتا تھا۔ رضا کاروں کو سختی سے ہدایت تھی کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا نام ہرگز نہ بتائیں جو خودکشی کا ارادہ رکھتے ہوں کیونکہ ایسے لوگ ذہنی اعتبار سے صحت مند نہیں ہوتے۔ نام معلوم کرنے کے بعد وہ لوگ ملاقات کرنے پر اتر آتے ہیں

اور جن کا ذہنی توازن درست نہ ہو اور جو بے حد جذباتی ہوں، ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب کیا کر گزریں..... پھر کلیرا تو پچاس سالہ بوڑھی عورت تھی، کمزور اور بے بس، جو اپنی بیٹی کے ساتھ تہا رہتی تھی.....

”میں ان بے شمار رضا کاروں میں سے ایک ہوں..... اس خدمت کے لیے اپنا وقت استعمال کرتے ہیں۔ میں اپنا نام پتا نہیں بتا سکتی۔“

”لیکن تمہارا نام بہت اہم ہے خاتون.....“ وہ عورت بولی..... ”کیاں آپ کا کوئی نام نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں، میرا نام کلیرا ہے۔“
انہیں نام مکمل نام بتانے کی تو اجازت تھی مگر گھر کا پتا اور مکمل نام بتانے کی سخت ممانعت تھی۔

”میرا نام کیرولین ہے۔“ دوسری جانب سے بولنے والی عورت نے کہا۔ کلیرا نے کوشش کی کہ وہ عورت اپنا مکمل نام بتادے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

”کیرولین! تم آواز سے بہت کم عمر معلوم ہوتی ہو، کیا تمہاری عمر بیس سال کے قریب ہے.....؟“
”نہیں، میں بیس سال کی ہوں۔“

”پھر بھی تم میرے مقابلے میں بہت کم عمر ہو، کیا تم شادی شدہ ہو؟“ کلیرا نے پوچھا۔

”ہاں تقریباً دس سال سے۔“ اس نے جواب دیا۔
”کیا تمہارا شوہر اس وقت گھر پر ہے؟“

”نہیں وہ رہنمائی کی رات کو کھانا باہر کھاتا ہے اور رات گئے گھر واپس آتا ہے۔“

”کیا تمہارا کوئی بچہ بھی ہے؟“ کلیرا نے پھر پوچھا۔

”نہیں، البتہ کئی مرتبہ اسقاط ہو چکا ہے۔“
کیرولین نے کہا۔ اس کی آواز میں تاسف نہ تھا۔

”تو تم اس وقت تنہا ہو؟“
”ہاں۔“ کیرولین نے جواب دیا۔

کر سکتا تھا۔ نسوانی آواز نے جس اشتہار کا ذکر کیا، وہ صبح ہی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ”خودکشی کی روک تھام کے لیے چوبیس گھنٹے مفت خدمات۔“
بچہ کلیرا کا ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔ وہ نمبر کلیرا کا ذاتی نہیں تھا بلکہ ایکسچینج کا نمبر تھا جہاں سے ٹیلی فون کال خود بخود اس رضا کار کے گھر منتقل ہو جاتی تھی جو اس وقت ڈیوٹی پر ہوتا.....

کلیرا نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ نے ٹھیک جگہ فون کیا ہے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

دوسری جانب کچھ دیر خاموشی رہی، پھر عورت نے جواب دیا۔ ”میں ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میں نے آپ کو کیوں فون کیا ہے، دراصل میں بالکل تنہا ہوں اور کسی سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

یقیناً یہ خاتون ان میں سے تھی جو خودکشی کے ارادے کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا پسند کرتے ہیں اور اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ کلیرا نے سوچا۔ اس خاتون کا فون کرنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خودکشی کے بارے میں شکیبہ ہے۔

”میرا یہی کام ہے خاتون کہ دوسروں سے باتیں کر دوں مگر آپ اتنی رنجیدہ کیوں ہیں؟“ کلیرا نے پوچھا۔
”اوہ! اس کی کئی وجوہات ہیں۔“ نامعلوم عورت نے کہا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ ”کہیں آپ لوگ اس قسم کے فون کرنے والوں کا پتہ لگانے کی کوشش تو نہیں کرتے.....؟“

”ہرگز نہیں۔“ کلیرا نے اسے یقین دلایا۔ ”اگر ہم ایسا کریں گے تو لوگ ہمیں فون کرنا بند کر دیں گے۔ ہم یہ جاننا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارا مخاطب کون ہے مگر اس کے لیے بھی اسرار نہیں کرتے۔ اگر آپ اپنی شخصیت پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں اور اگر اپنا نام بتانا پسند کریں تو اسے مکمل راز میں رکھا جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں۔ میں ایسی دیسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔ مثلاً یہ کہ پولیس کو آپ کے مکان پر بھیجنا تاکہ وہ آپ کو ہسپتال میں داخل کرادیں۔ میری یہاں موجودگی کا مقصد آپ کی مدد کرنا ہے آپ کے لیے پریشانیوں پیدا کرنا نہیں۔“

دوسری جانب خاموشی طاری رہی پھر اس عورت

پھر اداس ہو؟“

”بہت زیادہ۔“ دوسری جانب سے سکیوں کی آواز آئی۔ ”میں نے..... میں نے منگل کو تم سے جھوٹ بولا تھا کلیرا۔“

”اوہ! لیکن کس سلسلے میں؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں خودکشی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا، میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔“

”تمہارا شوہر کہاں ہے، کیرویلین؟“

”وہ شہر سے باہر نیشنل ڈین..... جملہ ادھورا ہ گیا..... کلیرا کو ایسا لگا جیسے کیرویلین بے خیالی میں کوئی بات کہنے والی تھی لیکن اپنی حاضرت کا احساس ہوتے ہی خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں بعد ریسیور پر اس کی آواز ابھری۔ ”میں گھر پر تھا ہوں کلیرا۔“

”کیا تمہارے گھر کے قریب کوئی تمہاری سہیلی ہے جو تھوڑی دیر تمہارے ساتھ رہ سکے؟“ کلیرا نے نیشنل ڈین کا لفظ ڈین نیشن کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! میں اپنی کسی سہیلی کو نہیں بلا سکتی۔ میں کسی کو بھی اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کر سکتی۔“

”تمہیں کیا پریشانی ہے کیرویلین؟“ کلیرا نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا..... دوسری جانب کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر کیرویلین کی سرگوشی نما آواز آئی۔

”میں نے کسی کو نہیں بتایا کلیرا، صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں پاگل ہونے والی ہوں۔“

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا کیرویلین؟“

”یہ خیال ہی نہیں حقیقت ہے اور ایک ایسی حقیقت ہے جس کا علم صرف مجھے ہے۔ میں اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی ہوں لیکن کبھی کبھی میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھرتی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں..... ابھی پچھلے اتوار کو اس خواہش نے مجھ پر اتنا غلبہ پالیا کہ میں بستر سے نکل کر کچن..... میں گئی اور وہاں سے چھری اٹھا لائی۔ جب میں چھری ہاتھ میں لیے اپنے شوہر کو قتل کرنے خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی تو یکایک مجھے ہوش آ گیا۔ اس سے پہلے میری حالت ایسی نہیں ہوئی تھی..... اس لیے میں نے منگل کی شب تمہیں ٹیلی فون کیا تھا۔“

یہ سن کر کلیرا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیرویلین کوئی عام قسم کی جذباتی عورت نہیں جو جذبات کی رو میں بہتے کر خودکشی کر سکتی ہیں بلکہ خطرناک قسم کی نفسیاتی مریضہ بھی تھی..... ایسے لوگوں سے گفتگو بہت احتیاط سے کرنی چاہیے..... کلیرا کو نفسیات کی تھوڑی بہت شدید بھی، اگرچہ اس طرح وہ..... اس عورت کا علاج تو نہیں کر سکتی تھی لیکن اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ ایسے لوگوں کو محض دلائل کے ذریعے خودکشی سے روکا بھی نہیں جاسکتا۔ ایسے لوگوں سے نشنہ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں فوراً نفسیاتی علاج کرانے پر آمادہ کیا جائے۔

”تم نے کسی اور کو اس بارے میں نہیں بتایا.....؟“ کلیرا نے پوچھا۔

”نہیں، تمہارے علاوہ کسی کو نہیں۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”تمہاںے شوہر کو تمہارے ان خیالات کا علم ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ کیرویلین نے بے بسی سے کہا.....

”انہیں یقین ہے کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ اسی لیے بعض اوقات مجھے اپنے خیالات سے نفرت ہونے لگتی ہے..... میں سوچتی ہوں کہ اس سے قتل کے میں اپنے شوہر کو کی روڈ ٹریفک کر دوں، کیوں نا خود ہی مر جاؤں۔“

”نہیں، تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ کلیرا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”تم نے مجھ سے مشورہ لینے کے لیے فون کیا ہے۔ کیا تم میرا مشورہ قبول کرنے کو تیار ہو.....؟“

”کون سا مشورہ؟“ عورت نے سرگوشی میں پوچھا۔

”تمہیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ تم ذہنی طور پر بیمار ہو۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونا ہی بیماری سے چھٹکارا پانے کی جانب پہلا قدم ہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ جو ذہنی طور پر بیمار ہونے کے باوجود خود کو بیمار نہیں سمجھتے، ماہرین نفسیات کے لیے بہت سی دشواریاں پیدا کر دیتے ہیں۔“

”مجھے یہ مت کہنا کہ میں اپنے خاندانی ڈاکٹر سے مشورہ کر دوں اور اپنا معائنہ کراؤں کیونکہ خاندانی ڈاکٹر میرا دیور ہے جسے میں اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کر سکتی۔“

”نہیں، یہ ضروری نہیں کہ تمہاری پریشانی سے تمہارا شوہر یا تمہارا خاندانی ڈاکٹر آگاہ ہو۔ شہر میں بے شمار ماہر

نفیات موجود ہیں تم ان کے پتے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھ سکتی ہو۔ اگر چاہو تو میں دو چار نام بتا سکتی ہوں۔“ دوسری جانب سے طویل خاموشی کے بعد اس عورت نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”وہ ڈاکٹر میرے شوہر کو تو کچھ نہیں بتائے گا؟“

”تمہیں معلوم ہوتا چاہیے کیرولین کہ ڈاکٹر لوں کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں جو کچھ انہیں اپنے مریضوں سے معلوم ہو، وہ سختی سے اپنے تک ہی محدود رکھتے ہیں اور کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔“

”آپ جس ڈاکٹر کا نام مجھے بتانا چاہتی ہیں آپ کے خیال میں وہ قابلِ اعتماد ہے؟“ اب اس عورت کی آواز پُر امید مچی۔

”ہاں، تم سے فکر رہو۔ اس کا نام ڈاکٹر رابرٹ ہے۔ اس کا دفتر میڈیکل ایسوسی ایٹس بلڈنگ میں ہے۔۔۔۔۔ بہتر ہوگا اگر تم یہ نام کسی کاغذ پر لکھ لو۔۔۔۔۔“

”نہیں، مجھے یاد ہے گا۔“ وہ بولی۔۔۔۔۔

”پھر مجھ سے وعدہ کر دو کہ مجھ سے پہلے تم ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں۔ بہت بہت شکریہ، کلیر۔“

”تمہارا شوہر کب گھر واپس آئے گا؟“ کلیر انے پوچھا لیکن سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ تیسری بار کلیر کو کیرولین کا فون منگل کے روز ملا۔۔۔۔۔ فون بجنے سے چند منٹ پہلے۔۔۔۔۔ کلیر اپنے نوکیرویلین کی آواز نہیں پہچان سکی کیونکہ آواز بہت مدھم سی تھی لیکن پھر مخصوص اندازِ گفتگو سے اس نے فوراً پہچان لیا۔

”بہت دیر ہوئی، بہت دیر، کل کا انتظار۔۔۔۔۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”کیرولین!“ کلیر اتنے لہجے میں بولی۔

”ہوں۔“ آواز نے بجکے بجکے انداز میں کہا۔

”ہیلو کلیر۔“

”کیا تم نے کچھ کھالیا ہے کیرولین؟“

”دیر ہوئی، بہت دیر ہوئی، میں کل کا انتظار نہیں کر سکتی۔“

”کل کا انتظار کس لیے کیرولین؟“ کلیر استعجاب سے۔

”ڈاکٹر سے ملاقات، ڈاکٹر رابرٹ، شاید میں آج

اسے قتل کر دوں۔۔۔۔۔ جب وہ گھر آئے، کھانے پر، یہ بہتر ہے۔“ کیرولین نے کہا۔

بجٹ

ہماری تجویز ہے کہ آئندہ بجٹ بابوؤں کی بجائے ایسے لوگوں سے تیار کروایا جائے جو بابو نہ ہوں۔ مثلاً چند معمار حضرات کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ اس کی تعمیر صحیح طور پر کر سکیں۔ کہیں بجی نہ رہنے پائے۔ کیونکہ

فحشت اول چوں نہد معمار کج

تاثری می رود دیوار کج

چند بار معمار کو بھی بجٹ کی تیاری میں شریک کیا جائے۔ وہ بجٹ کو مضبوط سے مضبوط بنیادوں پر تیار کرنے میں مدد کریں گے اور اپنی بجٹ میں خامیوں کے لیے لپک نہیں رہے گی۔

کچھ بڑھی کا کام کرنے والے بھی شامل کیے جائیں جو بجٹ کی چوبیس درست طور پر بٹھا سکیں۔ چوبیس درست ہوں گی تو بجٹ کا ڈھانچا بھی درست ہوگا۔

کچھ ایسے لوگ بھی بلائے جائیں جن کا تعلق طباعت کے فن سے ہو۔ وہ یہ بتا سکیں گے کہ بجٹ کے کونے جسے سنہری حروف میں چھاپے جائیں اور کونسے عام سیاہی سے طبع ہوں؟

چند ایک جلد سازوں کی بھی ضرورت پڑے گی جو بجٹ کی مضبوط اور دلفریب جلد بندی کا اہتمام کریں اور اس طرح بجٹ ہر شخص کو خوبصورت دکھائی دے گا۔

ان میں دیگر پیشوں کے باہر مند بھی شامل کیے جاسکتے ہیں مگر یہ بات ہم وزیر خزانہ پر چھوڑ دیتے ہیں وہ جس کو چاہیں شامل کر لیں۔ صرف ہمارا نام چھوڑ دیں کیونکہ ہم پہلے ہی ہر ماہ اپنے گھر کا بجٹ تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں اس لیے ہمیں ان کی مدد کرنے کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ اگر

ہماری ان تجاویز پر توجہ دی گئی تو کسی کو یہ اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا کہ بجٹ بابوؤں کا تیار کردہ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہنرمندوں کی شرکت سے واقعی بجٹ خالص عوامی ہوگا۔ اس طرح متوازن اور غیر متوازن کا چکر بھی ختم ہو جائے گا کیونکہ اس میں

کس سے تو توازن ہی نہیں رہے گا۔

شعبہ تعلیم کی کتاب ”سرخ سفید سیاہ“ سے اقتباس

”کیرویلین!“ کلیرا نے زور سے کہا۔ ”تم نے کیا کھایا ہے؟“

”کریسٹ سے کہہ دینا، یہ میں نے اس کے لیے کیا ہے۔“ آواز بھاری اور مدہم ہوئی جا رہی تھی۔ ”بگڑ چکی ہیں اس سے محبت کرتی ہوں۔“

”لیگل لیف بتا دینا اسے..... محبت!“ آواز مدہم ہوتی ہوئی خاموش ہو گئی..... اچانک کلیرا نے کوکو کی آواز سنی اور پھر گھڑی نے نو بجنے کا اعلان کیا..... اس کے بعد دو مرتبہ کوکو کی آواز آئی۔

”کیرویلین!“ کلیرا نے آواز دی مگر دوسری طرف خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ کلیرا نے کئی مرتبہ آوازیں دیں مگر دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی..... کلیرا کے پاس کئی معلومات تھیں۔ سب سے اہم یہ کہ کیرویلین کا شوہر لیگل لیف نامی کلب میں کھانا کھا رہا ہوگا۔ اس کے شوہر کا مکمل نام کریسٹ ہے اور شوہر کا بھائی ڈاکٹر ہے۔ کلیرا نے ڈائریکٹری میں لیگل لیف کلب کا نمبر دیکھا اور ٹیلی فون کرنے کے لیے ڈائل گھمایا۔

دوسری جانب سے کسی مرد نے ریسیور اٹھالیا۔ ”میں کسی ایسے آدمی سے بات کرنا چاہتی ہوں جو کلب لیگل لیف کے تمام ارکان کے ناموں سے واقف ہو.....“ کلیرا نے۔

”بہت بہتر، ذرا توقف کیجیے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور خاموشی طاری ہو گئی پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک مرد کی آواز سنی۔ ”میں خود کشی کی روک تھام کے ادارے کی رضا کار بول رہی ہوں، آپ کے ایک رکن سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ مجھے اس کا مکمل نام معلوم نہیں، مختصر طور پر اسے کریسٹ کہتے ہیں۔“

”کریسٹ!“ دوسری جانب سے آواز آئی۔ ”ظہر ہے اس وقت میرے ذہن میں تین کریسٹ آ رہے ہیں۔“

”ان کی بیوی کا نام کیرویلین ہے اور ان کا ایک بھائی ڈاکٹر ہے۔ کیا آپ نے پہچان لیا؟“

”بے شک، آپ ڈاکٹر کریسٹ مارشل کی بات کر رہی ہیں۔ وہ دہاتوں کے ڈاکٹر ہیں۔“

”آپ ذرا فوراً انہیں ٹیلیفون پر بلا دیں۔“ کلیرا نے درخواست کی۔

”بہتر، آپ انتظار کریں۔“

ٹھیک ہے، کیرویلین کا شوہر دندان ساز ہی ہوگا۔ تبھی ایک روز کیرویلین نے نیشٹل ڈین کا نام لیا تھا۔ وہ غالباً نیشٹل ڈین سرجن ایسوسی ایشن کہنا چاہتی تھی لیکن درمیان ہی میں رک گئی۔ کلیرا نے سوچا۔

”ہیلو کیرویلین! کیا بات ہے؟“ اچانک ریسیور میں مردانہ آواز ابھری۔

”ڈاکٹر کریسٹ! میں کلیرا بول رہی ہوں۔ خود کشی کی روک تھام کے ادارے، یہں نے کہا۔“ ابھی دس پندرہ منٹ پہلے مجھے آپ کی بیوی کیرویلین کا ٹیلی فون ملا ہے۔ اس نے شاید کسی قسم کی گولیاں کھالی ہیں۔ وہ فون پر گفتگو کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی تھی۔“

”کیا!“ ڈاکٹر کریسٹ کی آواز میں خوف اور استغاب نمایاں تھا۔ ”میری بیوی نے گولیاں کھالی ہیں! کس قسم کی گولیاں؟“

”مجھے نہیں معلوم ڈاکٹر، آپ فوراً گھر پہنچیں۔ اگر آپ کا گھر کلب سے کافی فاصلے پر ہے تو بہتر ہے کہ آپ پہلے ایسیوبینس کے لیے فون کر دیں اور پھر یہاں سے روانہ ہوں۔“

”بہت اچھا میڈم۔“ ڈاکٹر کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”آپ نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟“

”کلیرا ڈیول، آپ میرا فون نمبر نوٹ کر لیں اور بعد میں مجھے اپنی بیوی کی حالت سے آگاہ کرنا نہ بھولیں۔“

کلیرا نے اپنا نمبر نوٹ کرانے کے بعد فون بند کر دیا..... دو گھنٹے اس نے بے چینی کے عالم میں گزارے، تب ہی اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو میں کلیرا بول... رہی ہوں۔“

”میں لیفٹیننٹ جیکسن بول رہا ہوں۔ محکمہ پولیس کے دفتر سے۔“ دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز نے کہا۔

”ڈاکٹر کریسٹ مارشل نے مجھے آپ کا نمبر دیا ہے کیونکہ ان کی حالت ایسی نہیں کہ وہ کسی سے بات کر سکیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا تعلق خود کشی کی روک تھام کے ادارے سے ہے اور آپ ہی نے ڈاکٹر کریسٹ کو ان کے کلب فون کر کے بتایا تھا کہ ان کی بیوی نے زہریلی

گولیاں کھائی ہیں؟“
 ”جی ہاں، درست ہے، اب کیرولین کسی ہے؟“
 ”وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔“ لیفٹیننٹ

نے بتایا۔
 ”اوہ مجھے بے حد افسوس ہوا لیفٹیننٹ!“
 ”صحیح رپورٹ تو پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوگی
 لیکن کریسٹ کے مطابق خواب آور گولیوں کی وہ شیشی
 بالکل خالی ہے جس میں پوری دو درجن گولیاں موجود
 تھیں۔“
 ”میرے خدا! ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی..... بتیں
 سال۔“

”کیا آپ مرحومہ سے ذاتی طور پر واقف تھیں؟
 میرا خیال تھا کہ آپ لوگ کسی کو بھی اپنا نام نہیں بتاتے۔“
 ”درست لیکن ہم دونوں کافی بے تکلف ہو گئے
 تھے اور اس سے مجھے کافی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔
 آج رات سے قبل بھی ہمارے درمیان دوسرے گفتگو ہو چکی
 ہے۔“

”اوہ! اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے بھی دوسرے
 خودکشی کی کوشش کر چکی ہے۔“
 ”یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اس کا ارادہ ضرور تھا۔

میں اس کے شوہر سے پہلے ہی رابطہ کر لی تھی لیکن کیرولین
 نے مجھے بھی اپنا مکمل نام نہیں بتایا، آج رات بھی نہیں،
 بہر حال تین مرتبہ گفتگو کے بعد چند ایسی باتیں ضرور معلوم
 ہوئیں، جن کی وجہ سے میں آج ڈاکٹر کریسٹ مارشل سے
 رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔“

”ہمیں آپ کے بیان کی ضرورت پڑے گی۔
 آپ کس وقت پولیس صدر دفتر تشریف لاسکتی ہیں؟“
 ”جب آپ کہیں۔“ کلیرا نے وقت مقرر کر کے
 فون بند کر دیا۔ دوسرے روز اخباروں میں خودکشی کی ایک
 مختصر خبر شائع ہوئی..... جب کلیرا پولیس صدر دفتر پہنچی تو
 وہاں کیرولین کا شوہر کریسٹ بھی موجود تھا۔ کریسٹ
 لائے قد اور دبلے پٹے جسم کا خوبصورت آدمی تھا۔ اس
 کے بال ہلکے رنگ کے اور دانت بے حد چمکدار تھے.....
 ڈاکٹر کریسٹ سے چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد کلیرا کو
 احساس ہوا کہ ڈاکٹر نہ صرف خوب صورت بلکہ خوش مزاج
 اور مہذب بھی ہے۔ اسے یہ سن کر شدید ذہنی صدمہ پہنچا
 کہ اس کی بیوی کا کافی عرصے سے خودکشی کرنے کے بارے

میں غور کر رہی تھی اور شاید اس نے پہلے بھی کوشش کی تھی،
 یا کی ہو۔
 کلیرا نے ایک ٹیپ پر اپنا بیان ریکارڈ کرایا
 اور اپنے اور کیرولین کے درمیان ہونے والی گفتگو
 کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ لیفٹیننٹ نے اس کا
 بیان ٹیپ کر دیا اور اس کے دستخط لیے۔ صرف آدھ
 گھنٹے میں کلیرا کو چھٹی مل گئی۔ لیفٹیننٹ نے نفیسات
 کے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر کے اس بات کی تصدیق کی کہ
 واقعی کیرولین نے اس سے نفسیاتی علاج کے لیے
 رابطہ قائم کیا تھا۔ یہ تمام معلومات ڈاکٹر کی استقبالیہ
 کلرک سے ملیں۔
 واپسی کا سفر کلیرا نے ڈاکٹر کریسٹ کے ساتھ کیا۔
 سفر کے دوران ان کے درمیان بہت کم گفتگو ہوئی۔ کلیرا
 نے سوچا چونکہ اس کا اپنا دانتوں کا ڈاکٹر باہر گیا ہوا ہے اس
 لیے وہ آئندہ کچھ عرصہ اپنے دانتوں کا معائنہ ڈاکٹر کریسٹ
 سے کرائے گی.....
 تین ماہ بعد اس نے ڈاکٹر کریسٹ کو اس کے دفتر
 میں فون کیا تاکہ اپنا دانت نکلوانے کے لیے وقت لے
 سکے۔ استقبالیہ لڑکی نے اسے اتوار کی شام چار بجے کا
 وقت دیا.....
 ڈاکٹر کریسٹ کا دفتر مگنجان آبادی والے علاقے
 میں ایک عمارت کی پہلی منزل پر واقع تھا۔ اسے وہاں
 پہنچنے میں پانچ منٹ تاخیر ہو گئی۔ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی
 نے معذرتی مسکراہٹ کے ساتھ کلیرا کو اطلاع دی۔
 ”ڈاکٹر صاحب ایک مریض کے ساتھ مصروف ہونے کی
 وجہ سے اسے پانچ بجے سے پہلے نہیں دیکھ سکتے۔ جب
 پانچ بجے آپ ان سے ملاقات کریں گی تو ممکن ہے میں
 یہاں سے چلی جاؤں کیونکہ میں چھٹیوں میں شہر سے باہر
 جاری ہوں اور مجھے چھ بجے کی بس پکڑنی ہے۔ اگر میں
 چلی گئی تو میں آپ کا چارٹ دے جاؤں گی، آپ ڈاکٹر
 صاحب کو دے دیجیے گا۔“ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے
 معذرتی انداز میں کہا۔
 ”کوئی بات نہیں۔“ کلیرا نے جواب دیا۔
 کلیرا انتظار گاہ میں بیٹھ کر رسالے وغیرہ پڑھنے
 لگی۔ دس منٹ بعد کلیرا نے کوکو کی آواز سنی پھر رن کی ایک
 آواز نے پونے پانچ بجنے کا اعلان کیا۔
 اس کے بعد پھر کوکو کی آواز سنائی دی۔ کلیرا نے نظر

اٹھا کر دیوار پر لگے قدیم طرز کے کنڈی سے بنے ہوئے گھڑیاں کو دیکھا..... دیکھتے ہی دیکھتے گھڑیاں کی کنڈی بند ہو گئی اور چھوٹی سی چڑیا اندر چلی گئی۔

یہ غالباً وہی گھڑی ہے جس کی آواز میں نے مرحومہ کیرو لین سے گفتگو کرتے ہوئے فون پر سنی تھی۔ اس وقت کو کوئی آواز دوسری آئی تھی، شاید اس لیے کہ ان اوقات میں ہر مرتبہ وقت مکمل ہوتا ہے یعنی ایک مرتبہ گیارہ بجے تھے دوسری مرتبہ بارہ اور تیسری مرتبہ نو۔ غالباً یہ گھڑیاں ہر پندرہ منٹ بعد وقت کا اعلان ایک مرتبہ کو کوئی آواز نکال کر کرتا ہے۔ کلیر انے سوچا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ گھڑیاں پہلے ڈاکٹر کے گھر پر تھا اور کیرو لین کی خوشی کے بعد ڈاکٹر نے اسے اپنے دفتر منتقل کر دیا۔“

کلیر نے کھٹکھٹا کر گھاسا فاف کیا اور بولی۔ ”حترمہ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر پر بھی ایک ایسی ہی گھڑی ہے جیسی یہاں موجود ہے؟“ کلیر انے استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی سے دریافت کیا۔

”مجھے معلوم نہیں خاتون، مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے دو تین ہفتے ہی ہوئے ہیں۔“

”اوہ!“ کلیر خاموش ہو گئی..... چند منٹ بعد لڑکی نے کام ختم کر کے رجسٹر ایک طرف رکھتے ہوئے کلیر کو مخاطب کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی ہی گھڑی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر بھی ہو سگی ان لوگوں نے اس گھڑی کو یہاں لگا دیا ہے۔ اس گھڑی نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ہر پندرہ منٹ بعد مجھے اس منحوس کی آواز سننی پڑتی ہے۔“

”ان لوگوں نے..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ کلیر انے ابھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میرا مطلب ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی سے ہے۔ ان کی شادی کے بعد ہی یہ گھڑیاں یہاں لگایا گیا ہے۔“

”لیکن ان کی شادی ہوئے تو دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔“ کلیر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”اوہ! میں پہلی شادی کی بات نہیں کر رہی، خاتون۔“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ڈاکٹر صاحب کی دوسری شادی کی بات کر رہی ہوں۔ وہ ابھی چند ہفتے قبل ہوئی ہے اور اسی

وجہ سے مجھے یہ ملازمت ملی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی موجودہ بیوی میری جگہ کام کرتی تھی، شادی کے بعد یہ جگہ خالی ہو گئی اور ڈاکٹر کریسٹ نے ملازمت کے لیے میرا انتخاب کر لیا۔“

کلیر کو بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ شکل سے تو ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ ”ابھی اس کی بیوی کو مرے ہوئے تین ماہ پورے نہیں ہوئے اور اس نے چند ہفتے قبل دوسری شادی کر لی حالانکہ اس روز پولیس صدر دفتر میں وہ کس قدر غمگین اور رنجیدہ نظر آ رہا تھا جیسے اب بھی شادی ہی نہیں کرے گا۔“

”یہ گھڑیاں سیسل کے مکان پر تھا میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب کی موجودہ بیوی سیسل کے گھر میں..... شادی کے بعد سیسل ڈاکٹر صاحب کے ہاں منتقل ہو گئی۔ اس نے اپنا بیشتر فریج فریج روخت کر دیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے مکان میں اسے رکھنے کی جگہ نہیں تھی لیکن وہ اپنی چند اشیاء یہاں لے آئی۔ ان ہی میں سے ایک یہ گھڑیاں بھی ہے جسے آپ یہاں دیکھ رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی اور حیرت زدہ کلیر امنہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب سوالات جنم لے رہے تھے۔

”اگر یہ گھڑیاں ڈاکٹر کریسٹ کے مکان پر نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے ٹیلی فون کرنے والی ڈاکٹر کی پہلی بیوی کیرو لین نہیں۔ موجودہ بیوی سیسل تھی..... اور وہ تمام ٹیلی فون اس نے اپنے گھر سے کیے تھے۔ اگر اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد ڈاکٹر نے اتنی جلد اس لڑکی سے شادی کر لی جو اس کے دفتر میں استقبالیہ کلرک تھی تو تصویر کا بالکل مختلف رخ سامنے آتا ہے۔“

وہ اپنے خیالوں سے اس وقت چونکی جب گھڑیاں نے پانچ بجنے کا اعلان کیا۔ گھڑیاں کی کنڈی مٹی اور چڑیا نے باہر نکل کر دوسری مرتبہ کو کوئی آواز نکالی اور واپس اندر چلی گئی اس کے ساتھ ہی کلیر کے ذہن سے تمام شکوک دور ہو گئے۔ یقیناً یہ وہی گھڑیاں تھا جس کی آواز اس نے ٹیلی فون پر سنی تھی.....

اسی وقت دفتر کا اندرونی دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کریسٹ ایک مریض کے ساتھ باہر نکلا۔ اس نے استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سسر مریگ

آج کی بات

جتنا تم کسی کو پرکھو گے اتنا ہی ٹوٹنے جاؤ گے
اس لیے لوگوں سے صرف پیار کرو، انہیں آزمائے
اور پرکھنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی اچھائی اور دوسروں
کی برائی بھولتے چلے جاؤ۔

☆☆☆

خالق سے اچھا تعلق اور مخلوق سے اچھا
برتاؤ مومن کی نشانی ہے۔ کھانا پینا، سونا، سانس
لینا کام کرنا ہی زندگی نہیں..... دوسروں کے دلوں
میں..... اور ان کی وعادوں میں زندہ رہنا
اصل زندگی ہے۔

☆☆☆

صبح کی حقیقی خوشی اس شخص کو نصیب ہوتی
ہے..... جو صبح کا استقبال نماز، تلاوت اور ذکر سے
کرتا ہے..... اللہ پاک ہم سب کو نماز، تلاوت اور
ذکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔
مرسلہ: شفیق حسین۔ نیکو رکابی، سندھی ہوٹل

ہماری ملاقات اس سے پہلے بھی کہیں ہو چکی ہے!، سیسل
نے کہا۔

اس کے انداز سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا لیکن وہ
اپنی اداکاری سے کلیرا کو بے وقوف نہ بنا سکی۔ وہ سیسل کا
چہرہ دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ وہ اسے پہچان گئی ہے، بالکل اسی
طرح جس طرح کلیرا نے اس کی آواز پہچان لی تھی.....

”بے شک“، کلیرا نے سر دلچے میں کہا۔ ”لیکن
ٹیلی فون پر ایک غیر متعلق آدمی کی مدد سے تم دونوں نے واقعی
قتل کا عمدہ منصوبہ بنایا اور کیرولین کو بالکل اور نفسیاتی مریفہ
ثابت کروا۔ ایسی مریفہ جس نے خودکشی کرنی جبکہ وہ عورت
کیرولین بالکل عام سی اور سادہ عورت تھی اور اسے اس تمام
ڈرامے کا قطعی علم نہیں تھا۔“ کلیرا نے ڈاکٹر کریسٹ کی
طرف دیکھ کر کہا۔ ”لیکن ڈاکٹر! تم نے اسے خواب آور
گولیاں کھانے پر کس طرح مجبور کیا؟ شاید کھلب جانے سے
پہلے چائے یا کافی میں حل کر کے دیں؟“
..... اچانک کلیرا کو احساس ہوا کہ اس سے بہت بڑی

اگدہ ہفتے پھر آئیں گے، ان کا وقت نوٹ کر لو۔ اس کے
بعد تم جا سکتی ہو کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہیں چھٹی منانے کے
لیے جو بیچے والی بس سے جانا ہے۔“ اس کے بعد ڈاکٹر کی
نظر کلیرا پر پڑی اور ایک لمحے کے لیے وہ حیران رہ گیا۔
لہنگا۔

”ارے آپ! مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری آج کی
آفری مریفہ آپ ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا
اظہار کرنا پڑا.....“ استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے حیرت
بھری نظروں سے کلیرا کو دیکھا اور کہا۔

”یہ ان کا چارٹ ہے ڈاکٹر۔“ اس نے ڈاکٹر کو ایک
لہاسا کاغذ دیتے ہوئے کہا۔

”آئیے، اندر تشریف لائیے۔“ ڈاکٹر کریسٹ نے کہا
اور کلیرا اس کے پیچھے دفتر میں داخل ہو کر دندان سازی
مخصوص کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے گلے میں ایک
لپز باندھا اور پھر اس سے منہ کھولنے کو کہا۔ کلیرا نے منہ
کھول دیا۔ ڈاکٹر خاموشی سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ پندرہ
منٹ گزر گئے۔ کلیرا کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا اگر
گھڑیاں نے اپنی مخصوص آواز میں پندرہ منٹ گزرنے کا
اطلاع نہ کیا ہوتا۔ اس کی آواز اندر بھی آ رہی تھی۔

”اوہ! معاف کرنا ڈارلنگ! میرا خیال تھا کہ تم
اپنے مریفوں سے فارغ ہو چکے ہو۔“

لڑکی نے نرم اور پلکدار آواز میں کہا اور دروازہ بند
کر کے واپس جانے لگی۔

اسی وقت کلیرا نے بلند آواز میں کہا۔ ”آپ یقیناً
سیسل ہیں؟“

اس عورت نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کریسٹ کو
دیکھا۔ ڈاکٹر کے چہرے سے اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا
تھا جیسے یہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ دونوں عورتوں کا ایک
دوسرے سے تعارف کرایا جائے یا نہیں.....

”مجھے کلیرا کہتے ہیں سیسل، تم مجھے بھولی نہیں
ہو گی؟“ کلیرا نے بے دھڑک اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ
سیسل کی آواز پہچان گئی تھی۔ ٹیلی فون پر کیرولین کے نام
سے بات کرنے والی عورت یہی تھی.....

ڈاکٹر کریسٹ اور سیسل دونوں کے چہرے زرد
پڑ گئے۔ سیسل خاموشی سے اندر داخل ہوئی اور اس نے
دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ اس کی نظریں کلیرا پر جمی ہوئی
تھیں..... ”خاتون! آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے جیسے

پکڑا اور دوسرے سے گیس ماسک چہرے پر چڑھائی دیا.....

جونہی کلیئر نے ماس کے اندر گیس کی موجودگی محسوس کی اور گیس کی وجہ سے اس کے رخسار سرد ہونے لگے اس نے اپنا سانس روک لیا لیکن کب تک.....؟ کلیئر نے بہت ضبط کیا لیکن سانس روکنے کی وجہ سے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پیچھے پھڑپھڑنے والے ہیں۔ بے بسی کے عالم میں اس نے جدوجہد ختم کرنے اور خود کو موت کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچا..... بس ایک گہرا سانس اور..... اس کے بعد موت آہستہ آہستہ اپنا عمل شروع کر دے گی..... مگر ٹھیک اسی وقت کسی نے ڈاکٹر کریسٹ کے اندرونی دفتر کا دروازہ کھولا اور کلیئر کو استقبال پر پیشگی ہوئی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

”بس میں کا ٹنک ورازی میں بھول گئی تھی ڈاکٹر! بڑی مشکل.....“

لڑکی کی آواز رک گئی۔ ”یہ کیا.....!“ لڑکی کے اچانک اندر داخل ہونے سے ڈاکٹر کریسٹ پر شاید رد عمل ہوا۔ اس کی گرفت کلیئر پر ڈھیلی پڑ گئی اور وہ استقبال پر لڑکی کو دیکھنے لگا جو آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ کلیئر نے اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری قوت سے دونوں گھٹنے ڈاکٹر کے پیٹ میں مارے اور دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی سیمیل کا منہ بوجھ لیا..... ڈاکٹر پیٹ دباتے ہوئے دہرا ہو گیا اور سیمیل تکلیف سے کراچے ہوئے اپنا چہرہ رگڑنے لگی..... کلیئر نے بھرتی سے گیس ماسک اپنے چہرے سے اتار پھینکا اور اچھل کر کھڑی ہو گئی..... ڈاکٹر تیزی سے اسے پکڑنے کے لیے لپکا لیکن..... کلیئر استقبال پر لڑکی کو دھکا دے کر باہر نکل چکی تھی.....

باہر نکل کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی..... سڑک پر نکل کر وہ پوری قوت سے اپنی کار کی طرف دوڑ پڑی..... راہ گیر رک کر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے..... گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا، ڈاکٹر بے بسی کے عالم میں عمارت کے دروازے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ راہ گیروں کی موجودگی میں وہ کبھی کیا سکتا تھا؟ کلیئر نے بیٹھتے ہی گاڑی چلا دی اور اس کا رخ پولیس صدر دفتر کی جانب تھا.....

غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ اسے تنہائی میں دو قاتلوں کے سامنے اپنی زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی گمروں سے بندھا کپڑا کھولا اور جوتے پہن کر کھڑی ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے۔“ وہ اس وقت کچھ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ سیمیل بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، دروازے سے پھٹنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے سر دلچسپی میں اپنے شوہر سے کہا۔ ”ڈاکٹر کریسٹ! ڈاکٹر کبھی کبھی غلطی سے اپنے مریضوں کو کسی خطرناک دوا کی زیادہ مقدار بھی کھلا دیتے ہیں۔ ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہی حادثہ آج بھی ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس طرح تم کم از کم قتل کے مقدمے میں پھاسی چڑھنے سے بچ جاؤ گے۔“

کلیئر نے دہشت زدہ نظروں سے سیمیل کو دیکھا جو دروازے پر جمی کھڑی تھی۔ ”بہت جاؤ میرے راستے سے، مجھے جانے دو۔“ اس نے ہنسنی ہنسنی آواز میں کہا۔ ڈاکٹر کریسٹ اپنی بیوی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو، سیمیل نے پھر کہا۔ ”تمہارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کریسٹ۔ ایسے حادثات اکثر ہوتے رہتے ہیں اور میں نے آج تک نہیں سنا کہ ایسے حادثے کے نتیجے میں کسی ڈاکٹر کو سزا دی گئی ہو۔“

کلیئر کی توجہ اس وقت سیمیل کی جانب تھی..... اچانک..... اسے اپنے کندھوں پر فولا دی بیجنوں کی مضبوط گرفت کا احساس ہوا..... دوسرے لمحے ڈاکٹر اسے دھکا دے کر ڈنٹیل چیئر پر گرچکا تھا..... کلیئر کی عمارت پر پچاس سال سے اوپر تھی لیکن وہ صحت مند تھی۔ اس نے بے تحاشا لاتیں اور گھونٹے چلانا شروع کر دیے لیکن بہر حال وہ ایک کمزور عورت تھی اور اس کا مقابلہ دو جوان و تندرست دشمنوں سے تھا..... بہت جلد ڈاکٹر نے اسے بے بس کر دیا۔ ”سیمیل! تمہیں معلوم ہے کہ گیس کس طرح استعمال کی جاتی ہے؟“ ڈاکٹر نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”تم گیس ماسک اس بڑھیا کے چہرے پر لگا دو، میں اسے مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہوں۔“

سیمیل اس کے چہرے پر گیس ماسک باندھنے لگی۔ کلیئر نے سخت جدوجہد کی، وہ بار بار اپنا سر جھٹک رہی تھی تاکہ گیس ماسک کی نٹکیاں اس کے ناک اور منہ میں نہ لگیں۔ سیمیل نے پوری قوت سے ایک ہاتھ سے اس کا منہ



مات

ناہید سلطانہ اختر

رشتوں کی خوشبو سے معمور ایک ناکام عاشق کی زندہ دلی

کہتے ہیں کہ جیت اور ہار تو زندگی کا حصہ ہے مگر اسے مکمل زندگی سمجھنے والے... اپنی زندگی مکمل ہونے سے پہلے ہی شاید مرجاتے ہیں کیونکہ حوصلہ اور امنگ ہی تو زندہ دلی کا نام ہے... البتہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ زندگی کے اس کمزور موڑ پر اس کا سہارا اور پیارا دوست کوئی اور نہیں بلکہ اس کا باپ تھا بس اسی ایک احساس نے اس کے حوصلوں کو مات نہیں ہونے دیا۔

”مبارک ہو۔“ میں نے بیوی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔
 ”عید نہ بقر عید..... کس بات کی مبارک؟“ بیوی نے
 ”نمبرون کو عشق ہو گیا ہے۔“ اپنے پانچ بیٹوں کو ہم نے ان کی ترتیب پیدائش کے لحاظ سے نمبرون، نوٹھری، نور اور فانیہ کے تک نیم دے رکھے تھے۔
 ”کس سے؟“ بیوی جس کا نام تو نور جہاں تھا مگر میں حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

اسے پیار سے ملکہ کہا کرتا تھا چوکی۔

”ظاہر ہے لڑکی سے۔“ میں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔
”ظاہر ہے لڑکی ہی ہوگی..... شکر ہے خبیث معاشرہ کی طرح ہمارے ہاں لڑکوں کی لڑکوں سے شادی کا رواج نہیں ہے۔“

”جو حالات جارہے ہیں اللہ ہی بجائے۔“

”ہاں اللہ ہی بجائے والا ہے۔“ ملکہ نے کہا پھر اسی تجسس کے ساتھ گویا ہوگی۔ ”بتائیں نا کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟“

”نمبرون کی کلاس فیلو ہے..... کلاس فیلو ہے تو ظاہر ہے پڑھتی ہی ہوگی، یہیں ہمارے علاقے میں ہی رہتی ہے۔“

”باپ کیا کرتا ہے؟“

”ابھی یہاں تک نہیں پہنچا ہوں میں۔“

”تو جہاں تک پہنچے ہیں، وہاں تک کیسے پہنچے؟“
بیوی نے مجھے ترچھی لگا ہوں سے دیکھا۔ ”ڈائریکٹ؟“
بیوی کا لہجہ بیک وقت سوالیہ بھی تھا جوابیہ بھی۔
”ظاہر ہے۔“

اپنے پانچوں بیٹوں کو ہم میاں بیوی نے ایسا اعتماد دے رکھا تھا کہ وہ اپنی ہر اچھی بری بات ہم سے بلا جھجک شیئر کرتے تھے نمبر فور اور نمبر فائیو تو ابھی چھوٹے تھے۔ تین بڑے بچوں کی ملکیت میں ہر شے تک ہم میاں بیوی کی بھرپور رسائی تھی۔ اپنے زیر استعمال سیل فونز پر ان میں سے کسی نے بیکوئی لاک نہیں لگا رکھا تھا۔ ان کی ای میلز مکمل رہتیں۔ ان کی الماریاں غیر مقفل ہوتیں۔ اپنے دل کی ہر بات وہ بے دھڑک ہم میاں بیوی کو بتا دیتے۔ ان کی کوئی بات ہم سے راز نہ تھی۔ تین بڑوں کی دیکھا دیکھی دونوں چھوٹے بھی ہم میاں بیوی کو اپنا دوست اور ہمراز سمجھتے تھے۔ دونوں ہی اسکول سے گھر واپسی پر دروازے سے اندر بعد میں داخل ہوتے، اسکول میں گزارے دن کی روداد پہلے سنا شروع کر دیتے۔

پانچوں بچے اور ہم میاں بیوی قطعاً دوستانہ ماحول میں رہتے۔ ایک دوسرے کو ”یار“ کہہ کر مخاطب کرتے۔ بچے مجھے ”یارا“ کہہ کر بات کرتے، اپنی ماں کو ”یارا“ بکارتے۔ ہم ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بات کرتے۔ ایک دوسرے کے گلے میں بانٹیں حاصل کر کے چلتے۔ غلط یا صحیح، روائی ناروا بہر حال تھا ایسا ہی جس پر ہم دونوں میاں بیوی کو اپنے اپنے خاندانوں اور احباب میں

اکثر تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

”نور جہاں تم نے اپنے بچوں کو بہت ہی سڑ چڑھا رکھا ہے۔“ میری خوش دامن بیٹی سے کہتیں۔
”دیس تم تو کہیں سے اپنے بچوں کے باپ نہیں دکھائی دیتے، لنگو نیایا رہتے ہوں ان کے۔“ میرے والد محترم خاصی ناگواری سے کہتے۔

”ابجی یہ دور ایسا جا رہا ہے کہ اس میں والدین کو بچوں کا دوست بن کر رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں اپنی دانش بگھارتا۔

”بکواس!“ والد محترم میری دانش کو بیک جنبش بکواس قرار دیتے اور فرماتے۔ ”والدین اور اولاد کے درمیان ایک حد فاصل رہنی چاہیے۔“

میں بحث میں نہ پڑتا، اپنے حال میں مست ہو جاتا۔ بچوں کے ساتھ خفی مذاق کرتا، ددڑیں لگاتا، کرکٹ، ہاکی اور بیڈمنٹن کھیلتا، فون پر ان کی اور ان کے دوستوں کی گپ شب میں شریک ہوتا..... ان کے دوستوں میں لڑکے بھی تھے، لڑکیاں بھی۔ میں نے ان سے بے تکلفی سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی ان میں سے کسی کو کوئی لڑکی پسند آ جائے سب سے پہلے مجھے بتائیں، سو نمبر دن نے گزشتہ رات مجھ سے کہا تھا۔ ”اُنا ایک لڑکی پسند آ گئی ہے مجھے۔“
”چھ!“ میں ہنس تن تجسس ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ملڈ نیوز!“

میں نے کہا۔ ”کون ہے؟“

”میری کلاس فیلو۔“

نمبرون ان دنوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں چھ مسٹر کا طالب علم تھا اور چونکہ میری اس کے اکثر کلاس فیلوز سے گپ شب رہتی تھی سو میں نے اس سے پوچھا۔ ”میں جانتا ہوں اسے؟“

”نہیں۔“ نمبرون نے جواب دیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے یار! میں تو تمہارے ہر اس کلاس فیلو سے واقف ہوں جس سے تمہاری دوستی ہے۔“

”یارا! اس سے دوستی نہیں تھی۔“

”دوستی نہیں تھی تو پھر کیسے پسند آ گئی!“ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

”بالکل الگ تھلک رہتی تھی..... نہ کبھی اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی، نہ میں نے اسے لفٹ کرائی مگر آج اچانک ہی وہ مجھے اچھی لگنے لگی۔“
”وہ کیسے بھلا!“

”ابھی کہاں..... ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے ابا۔“
نمبرون نے کہا۔
”ایٹنٹ ڈالو..... بات آگے بڑھاؤ..... باقی دی
وے آج کیا بات ہوئی؟“
”کچھ بھی نہیں..... بس وہ مجھے اچھی لگی..... میں
دوسری ٹیبل پر بیٹھ گیا اور چائے منگو کر چائے پینے لگا۔“
”اجن؟“

”کیوں؟“
”ایٹنٹ کیڑی کہہ کر اسی کے ساتھ بیٹھنا تھا بلکہ اس
سے پوچھتا چائے پینے کی۔“
”وہ آل ریڈی لپی رہی تھی۔“
”بندہ تلفظاً تو پوچھتا ہی ہے اور یونہی کہانی شروع
ہوتی ہے۔“

”اب پوچھ لوں گا۔“ نمبرون نے کہا بھر سرگوشی میں
بولاً۔ ”ابا میرا خیال ہے مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے۔“
”واقعی!“ میں چونکا۔
اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
”آل دی بیٹھ۔“
”تحقیق یو۔“

☆☆☆

دو دن بعد نمبرون نے مجھے قدرے دل گرفتگی سے
بتایا۔ ”ابا میں نے اسے چائے آفر کی مگر اس نے نوٹھینکس
کہہ کر منج کر دیا۔“
”شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے یار۔“ میں نے کہا۔
”مغرو رہے ابا۔“
”دکس بات پر؟“

”اپنے باپ کی امیری پر..... ڈینٹس میں رہتی ہے
ابا..... سٹی کے نئے ماڈل میں یونیورسٹی آتی ہے۔“
”آنے دو یار تمہاری طرح جینٹس تھوڑی ہوگی۔“
میں نے نمبرون کو پُر غور دیکھا ہوں سے دیکھا۔ میں امیر باپ
تھانیں مجھے اپنے بچوں کی ذہانت و لیاقت پر ناز تھا۔
”کیا فرق پڑتا ہے ابا۔“ نمبرون کے لہجے میں دل
مگرتگی تھی۔

”کیوں فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے کہا۔
”آپ میں بک پر اس کے گھر کا صرف فرنٹ دیو ہی
دیکھیں نا تو.....“ نمبرون نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
”بے ہوش ہو جاؤں!“ میں نے اس کا مکمل جملہ
کھل کیا۔

”سر دی تھی..... میں چائے پینے یونیورسٹی کیفے ٹیریا
میں گیا تو وہ وہاں بیٹھی تھی..... بیڑ کے بالکل نزدیک.....
اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے..... میں اسے دیکھتا ہی
رہ گیا ابا..... اس کا چہرہ ایک دم گلابی ہو رہا تھا..... اور پہلی
بار مجھے چٹا کر وہ تو میری کالج کیا یونیورسٹی کی حسین ترین
لڑکی تھی جی انڈیوٹ ابا..... آپ اسے دیکھیں گے تو کہیں
گے واقعی خوب صورت ہے۔“

”خوب صورتی کسی کے چہرے میں نہیں دیکھنے
والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔“ میں نے فراست جھاڑی۔
”اور لڑکی یونہی اچانک اچھی لگتی ہے..... تمہاری ماں بھی
مجھے اسی طرح اچانک اچھی لگی تھی۔“

”اچانک کیوں! اماں تو آپ کی کزن تھیں اور آپ
لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔
آپ تو انہیں دن میں دس بیس مرتبہ دیکھتے ہی ہوں گے۔“
”گھاڑو! وہ بھی تو پچھلے تین برس سے تیری کلاس فیلو
ہے..... تو بھی تو اسے صبح سے دوپہر تک دیکھتا رہتا ہوگا.....
آج سے پہلے تجھے وہ اچھی کیوں نہ لگی؟“

”آج سر دی بہت جی ابا اور میرا چائے پینے کا موڈ تھا۔“
”اس روز آسمان ابرا آلود تھا۔ صبح سے بادل چھائے
ہوئے تھے مگر برس نہیں رہے تھے۔ شام دل میں کھب سی
رہی تھی۔ ماں جی، ابا، چاچا، چچی سب صحن میں بیٹھے تھے۔
تمہاری ماں اچانک کمرے سے صحن میں نکل آئی۔ اس نے
شرقی رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا اور اس کے لائے سیاہ بال
شرقی رنگ کے ساتھ غیر معمولی جو بن دکھا رہے تھے۔ میں
نے اسے دیکھا اور آنکھوں کے راستے وہ میرے دل میں
اتر گئی۔“

”پھر؟“ نمبرون کے لہجے میں تجسس تھا۔
”پھر کیا..... میں نے تیرے لایا اسی سے شادی کرنی ہے۔“
”میں نے بھی تیرے لایا ہے ابا۔“
”اس سے پوچھا؟“
”آپ نے پوچھا تھا؟“

”ضرورت ہی نہیں پڑی..... ادھر میں لو کری سے لگا
دھر ماں جی نے کہہ دیا دسیم میں تیرے چاچا چاچا سے نور
جہاں کے لیے بات کرنے لگی ہوں۔“

”اور آپ یہ بات کب کہیں گے؟“
”وہ گھر کی بات تھی..... لڑکی کے ماں باپ سے بات
کرنے سے پہلے تجھے لڑکی سے بات کرنی ہوگی..... اسے
مادہ کرنا ہوگا..... کی تو نے اس سے بات؟“

نمبرون کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”تو پھر کیا مطلب تھا؟“

”وہ بہت امیر ہے ابا۔“

”اس کا امیر یا غریب ہونا ہمارا مسئلہ نہیں ہے یار۔“

”مگر یہ تو ہمارا مسئلہ ہے تاکہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔۔۔۔۔“

آئی کو ہر ابا۔ ”نمبرون رو ہانا ہو گیا۔“

”نگہ نہ ہوا اللہ شفا دے گا۔“

”یار ابا کیسے ہو گی شفا، وہ تو لفٹ ہی نہیں کراتی۔“

”اگر تمہارا عشق چاہے تو ایک دن ضرور کرائے گی۔“

☆☆☆

کچھ ہی دن گزرے کہ ایک روز نمبرون نے یونیورسٹی

سے مجھے فون کیا۔ ”مبارک ہو ابا۔“

میں سمجھا اس کے سیمسٹر کا نتیجہ آ گیا۔ ”کیا جی پی اے

رہا؟“ میں نے پوچھا۔

”ابا آج اس نے مجھ سے بات بھی کی مجھے چائے بھی

پلائی۔“ نمبرون کے لہجے میں انوکھی سرخوشی تھی۔

”مبارک ا!“

”تھینک یو۔“

سمبر واپسی پر نمبرون نے مجھے بتایا کہ لڑکی نے

نمبرون کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر ایڈ بھی کر لیا تھا۔

”ابا اس نے کہا ہے مجھے اپنی اچھی اچھی تصویریں بھیجو۔“

”بیچ دو یار۔“

”آپ بتائے گا کون کون سی بھیجوں۔“

”بتا دوں گا بلکہ ایک دو میری بھی بیچ دو کہ یہ لڑکے کا

ابا ہے۔“

”آپ کو تو میں ڈائریکٹ ملوا دوں گا۔“ نمبرون نے

حاکم طایانہ انداز میں کہا۔

”رات کو فون بھی کرنے کو کہا ہے اس نے۔“ نمبرون

نے آہستہ سے بتایا۔

”گڈ! وہ کرے گی یا تم کرو گے اسے؟“

”وہ کہہ رہی تھی میں خود کروں گی۔۔۔۔۔ اچھا ہی ہے نا

ابا، وہ تو بیچ کر سکتی ہے میرے پاس تو بیلنس ہی نہیں ہوتا۔“

”یار بیلنس تو میرے پاس بھی نہیں ہوتا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ اسٹریڈ مکمل ہونے کے بعد

جواب تلے ہی پہلا کام بھی کروں گا۔“

”کون سا کام؟“ میں چونکا۔

”بیلنس والا۔۔۔۔۔ پہلی تنخواہ تلے ہی آپ کے موبائل

میں بھی بیلنس ڈالواؤں گا اور اپنے میں بھی۔“

”اور اپنی ماں کے؟“

”ان کے بھی۔۔۔۔۔ ایک ایک سے پوچھتی رہتی ہیں

بیلنس ہے تمہارے پاس۔“ نمبرون کے لہجے میں ہلکی سا

دل گرفتاری تھی۔

”تمہاری نا اور خالوں کو جو فون کرنا ہوتا ہے اسے۔“

”ویسے ابا اگر وہ مجھے فون کرنے کو کہہ دیتی تو گڑب

ہو جاتی میرے پاس تو بیلنس ہی نہیں ہوتا۔“ نمبرون نے

مصرعہ ادا پھر دہرایا۔

نمبرون نے ٹیکری کو ملی اور ہم نے باہم مشورے

سے نمبرون کی چھ آٹھ اچھی اچھی تصویریں منتخب کر کے نیلوفر

کو بھیج دیں۔ اس کا نام نیلوفر مجھے اچھا لگا تھا۔

رات کو اس نے نمبرون کو فون کیا اور اس نے جو کچھ کہا

نمبرون نے وہ سب کچھ من دہن مجھے بتا دیا۔ اس نے

نمبرون کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں اچھے اچھے فیس بک

کو کہا تھا۔

”کیا کمٹ کروں ابا؟“

”یار وہی جڑ لگائیں سننا چاہتی ہیں۔“

”کیا سننا چاہتی ہیں۔“

”گھماڑو۔۔۔۔۔ عشق کرنے چلے ہو اور یہ نہیں پتا کہ

لڑکیاں کیا سننا چاہتی ہیں۔“

”آپ بتائیں نا کیا سننا چاہتی ہیں۔“

”اپنی تعریف اور کیا۔“

”یو آر سو بونی فل؟“ نمبرون نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”صرف اتنا سا جھوٹ نہیں یار۔۔۔۔۔ اور بھی بہت کچھ۔“

”سمجھ گیا۔۔۔۔۔ سمجھ گیا۔“ نمبرون مجھے معنی خیز نظروں

سے دیکھتے ہوئے ہنس دیا پھر بولا۔ ”یار ابا لڑکیاں جھوٹ

کیوں سننا چاہتی ہیں!“

”پاگل جو ہوتی ہیں یار۔۔۔۔۔ ایسے ہی تو انہیں ناقص

العقل نہیں کہہ دیا گیا۔۔۔۔۔ ایسی کی تو گواہی بھی معترف نہیں

دو ہوتی چاہئیں۔“

”اسی لیے ایک مرد کو چار کی اجازت ہے۔“

”یار انی الحال تم صرف ایک پروفیسر کرو۔“

”او کے۔“

☆☆☆

نیلوفر نے نمبرون کا عشق پورے طعشق سے شرور

ہو گیا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد نمبرون کا زیادہ وقت

موبائل پر گزرنے لگا۔ اس کے اور نیلوفر کے درمیان ٹیکسٹ

میسج کا تبادلہ ہوتا۔ ایک دوسرے کو وائس کالز کی باتیں

”تمہارے علاوہ بھی کوئی دوست ہے اس کا!“ میں چونکا۔
 ”مجھ سے پہلے سے ابا۔“ نمبرون جیسے صدمے میں تھا۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”اس نے مجھے دھمکی دی ہے ابا۔“
 ”کیسی دھمکی؟“
 ”کہ اگر میں نے نیلوفر سے اپنی دوستی ختم نہ کی تو وہ
 مجھے شوٹ کر دے گا۔“
 ”ابو میں شوٹ کر دے گا۔۔۔۔۔ شوٹ کرنا اتنا آسان
 ہوتا ہے کیا۔“
 ”اس کے لیے آسان ہی ہوگا ابا۔۔۔۔۔ وڈیرے کا بیٹا
 ہے۔۔۔۔۔ ہارس رائیڈنگ کرتا ہے۔۔۔۔۔ بونگ پر جاتا ہے۔۔۔۔۔

”بس ایک پر تصویریں بھیجی جاتیں۔ عزت کا معاملہ تھا سو میں
 ان کے سوبائل میں بیٹنس ڈلوانے میں اعانت کرتا۔
 ان مجھے نیلوفر کے ٹیکسٹ میسر اور فیس بک پر اس کی
 اس براہ راست دکھانے میں تامل نہ کرتا۔ نمبرون نے
 ماڈل انگریزی گانے سننا شروع کر دیے تھے۔ اپنے واٹس
 اپ ایپلیکس پر نمبرون نے ایک مشہور انگریزی گانے کے
 لہجہ نہایت دلکش اسٹوری ڈال دی تھی۔ اسٹوری شروع
 ہونے پر نمبرون ایک درہتے سے باہر دیکھتا نظر آتا پھر کسی
 دھڑکے سے انداز میں مڑتا اور دھیرے دھیرے روم
 الٹ کر جاتا۔

دو تین ہفتے نیلوفر اور نمبرون کے معاملات دھواں
 حار اوپر ہی اوپر گئے اور نمبرون کی رنج و دھج بروز بڑھتی
 چلی گئی۔ اسے اپنے کپڑوں، جوتوں اور ہیز اسٹائل کا خاص
 مال رہنے لگا۔ وہ جو اپنے گیٹ اپ کے سلسلے میں نہایت
 بہادر اور ہا کر تھا خوشبو میں بس کرویوینورسٹی جانے لگا۔
 اچھے دیکھ کر مجھے اپنا زمانہ یاد آ جاتا۔ جب اس کی ماں مجھے
 اگلی کتنے کی تھی، تب میں بھی تو یوں ہی اپنا خیال رکھنے لگا
 تھا۔ باجی کی پرفیوم جو انہیں چھوٹی خالانے دہی سے لا کر دی
 کی چڑا کر لگا کرتا اور یہ نہ سوچتا کہ باجی کی پرفیوم قطعاً
 مانہ خوشبو تھی جو مجھے لگا تا زیب نہ دیتی تھی۔ نہ مجھے ان دنوں
 مانہ اور مردانہ خوشبودوں کی شخصیات کا علم تھا، نہ ہی اسے جس
 لہجے میں خوشبو لگا کر جاتا تھا!

تیسرے ہفتے ایک روز نمبرون نہایت پریشان سا
 رات گیارہ بجے میرے پاس آیا۔ میں سونے کی تیاری
 کر رہا تھا، اس کی ماں دو چھوٹوں کی پونیفارمز پریس کر رہی
 تھی۔ بڑے تین اس معاملے میں خود لگیل تھے۔
 ”ابا ذرا باہر آئیں گے۔“ نمبرون نے آہستہ سے مجھ
 سے کہا۔

”کیوں؟“

”آئیں تو؟“

”خیریت؟“

”یار آپ آئیں تو۔۔۔۔۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ”ہاں کیا ہوا؟“

”ابا ابھی ایک فون آیا مجھے اُبی کے سامنے اس لیے

نہیں بتا یا کہ وہ پریشان ہو جائیں۔“

”بس کا فون تھا، اس کا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ اس کے کسی بوائے فرینڈ کا۔“

کراچی

پاکستان

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک
 نیا اور منفرد سلسلہ باتیں تمہارے خزانے کی۔۔۔۔۔
 پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر
 قاری بہن دے گئے سوالوں کے
 جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی
 ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات
 ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
 ماہنامہ پاکیزہ
 اپنے باکرے بک کروالیں

شکار کے لیے جنگل جاتا ہے۔ اس کے پاس ریوا لور بھی ہے بڑی بندوق بھی۔
 ”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“
 ”اس نے اپنا نام بتایا۔ میں نے سرچ کیا۔“
 فیس بک پر اس کی ایک دوئیں بے شمار تصویریں ہیں۔
 ”دکھاؤں آپ کو؟“
 ”دکھاؤ۔“

نمبرون نے اپنے اسارٹ فون پر فیس بک سائٹ ان کی اور سچ اسکرین پر اپنی انگلی کو دھیرے دھیرے حرکت دیتے ہوئے اپنے رقیب روسیاء کا فیس بک اکاؤنٹ کھول کر میرے سامنے کر دیا۔

وہ واقعی ویسا ہی تھا جیسے ٹی وی ڈراموں میں ڈویروں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ ہر تصویر میں نیا لباس، ہر انداز میں ہانگن، ہر پس منظر امارت کا منظر، ہر پیش منظر میں حکمت..... کہیں گھوڑے پر سوار، کہیں کہیں بندوق سے نشانہ لیتے ہوئے، کہیں شکار کو قدموں میں ڈھیر کیے، کہیں آباد اجداد کی تصویروں کے ساتھ، کہیں یار دوستوں کے جھگڑے میں، کسی تصویر میں حویلی کے درپچوں سے جھانکتے ہوئے تو کہیں بیش قیمت گٹھڑی کا ڈی سے اترتے ہوئے۔ اس حویلی کی تصویریں بھی لگ رہی تھیں اس نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر جہاں وہ رہتا تھا اور ان مربعوں کے سرسبز و شاداب مناظر بھی جو اس کے باپ واد کی جاگیر تھے۔ خدمتگاروں کی تصویریں بھی تھیں اس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے۔ مزارعین بھی موجود تھے اس کے سامنے ہاتھ باندھے موڈ کھڑے ہوئے۔

میں نے نمبرون کا فون خاموشی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

”ہے امیر۔“ نمبرون نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں یار لگتا تو ہے۔“

”اب بولیں۔“

”کیا بولوں؟“

”کیا کروں؟“

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”میں اسے نہیں چھوڑ سکتا یار۔“

”کسے؟“ میں نے پوچھا۔

”نیلوفر کو۔“

”کون کہتا ہے چھوڑ دو۔“

”یہی..... کتا..... کینے..... کہتا ہے اس کا بچپنا چھوڑا تو شوٹ کر دوں گا۔“
 ”اسے پتا کیسے چلا؟“
 ”کس بات کا؟“
 ”تمہاری اور اس کی دوستی کا۔“
 ”نیلوفر کے فیس بک اکاؤنٹ میں تصویریں اور..... دونوں کی کنوریشن دیکھ کر۔“

”پاس درؤ معلوم ہوئے بغیر کیسے دیکھ سکتا ہے نیلوفر کے اکاؤنٹ میں تمہاری تصویریں اور تم دونوں کی کنوریشن۔“

”معلوم ہو گا تاہم۔“

”کیسے؟“

”مجھے بتایا۔“ نمبرون نے شانے اچکائے۔

”پتا کرو یار۔ نیلوفر سے پوچھو..... کسی کو بتا کر ہے اس نے اپنا پاس ورڈ؟“

”پوچھوں گا اس سے۔“

”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے نمبرون کے شانے پر ہاتھ دھر کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور مزید کہا۔ ”چل کر سو۔“ صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے تمہیں..... دیکھ لیں گے وہ کتنے بڑے ڈیرے کا بیٹا ہے۔“ باپ ہونے کے ناتے میں نمبرون کا مورال ہائی رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اگلے یونیورسٹی سے آنے کے بعد نمبرون نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی میں اس کی نیلوفر سے بات ہوئی تھی اور اس نے اقرار کیا تھا کہ نمبرون سے دوستی ہونے سے قبل اس کی ڈیرے کے بیٹے سے دوستی رہی تھی۔ پھر کسی بات پر دونوں میں ان بن ہوئی تھی اور ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ نیلوفر بے بری طرح اینٹھ گیا تھا۔ اس نے سوشل میڈیا پر بھی نیلوفر کو آن فرینڈ تو نہ کیا تھا مگر نیلوفر کے بار بار رابطہ کرنے کے باوجود اسے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی سے تنگ آ کر نیلوفر نے اسے جلانے کو نمبرون سے دوستی کر لی تھی۔ نیلوفر کا حربہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے فیس بک اکاؤنٹ میں نمبرون کی پوسٹس دیکھ کر وہ چراغ یا ہو گیا تھا۔ اس نے نیلوفر کو بھی سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی اور نمبرون کو بھی دھمکا تھا۔

”ابا نیلوفر نے مجھے چیٹ کیا ہے۔“ نمبرون نہایت دل شکستہ ہو رہا تھا۔

”وہ کیا کر دیا۔“ میں نے نمبرون کا دل رکھنے کی

اصل کی۔

”نہیں بابا۔“ وہ ہونٹ نکال کر رونی صورت بناتے
 ”اے گویا ہوا۔“ میں تو سیریس تھا۔“
 ”چھوڑو یار..... ایسی لڑکی کے لیے سیریس ہونے
 کا لاکھ؟“

”آپ خود ہی تو کہتے ہیں محبت اور عشق میں فائدہ
 نقصان نہیں دیکھا جاتا ہے۔“ نمبرون نے مجھے قائل کرنا
 چاہا۔

مگر میں اس کا باپ تھا۔ اسے دل شکستہ اور ٹوٹا ہوا
 دیکھنا میرے لیے نہایت دل شکن احساس تھا سو میں نے
 اس پر اپنی اصل ٹپسی کیفیت ظاہر کیے بغیر نہایت اعتما و سے
 لہا۔ ”ہاں..... بشرطیکہ جس لڑکی سے آپ محبت یا عشق
 کر رہے ہوں وہ تمہاری ماں کی طرح مطلق ہو۔“
 نمبرون نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تمہاری ماں سے میری لائن ملنے اور مجھے ملازمت
 ملنے کے درمیانی وقفے میں تمہاری ماں کے لیے براوری کے
 الہ بڑے گھر سے..... رشتہ آ گیا تھا۔ ماں جی مجھ
 سے بولیں تو نوکری پہ ہوتا تو میں نے تیرے بچا چا، چاچا سے
 میرے لیے نور جہاں کے رشتے کی بات کر لیتی تھی اب کس
 نام سے کروں۔ جو رشتہ آیا ہے اونچے گھر کا ہے تیرے
 چاچا، چاچا کی یا اس رشتے سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا مگر
 نام کیا ہوا۔“

”کیا؟“ نمبرون نہایت تجسس سے بولا۔
 ”تمہاری ماں ڈٹ گئی..... اس نے انکار کر دیا۔“
 ”کیوں انکار کر دیا؟“
 ”ابے یار وہ مجھ سے جو محبت کرتی تھی۔“
 ”آپ کے زمانے میں بھی ہوتی تھی؟“
 ”کیا؟“

”محبت۔“
 ”الو کی دم! محبت تو آدم، حوا کے زمانے سے ہو رہی
 ہے۔ کہتے ہیں جب شیطان کے بہکائے میں آ کر دونوں
 منت سے نکالے گئے اور انہیں زمین پر بھیجا گیا تو ایک
 دوسرے کے فراق میں زار و قطار روتے تھے اور اللہ سے
 اپنی گلطی کی معافی طلب کرتے تھے۔“
 ”میں کیا کروں بابا؟“ نمبرون نے پھر رونی صورت
 بنالی۔

”کیا مطلب؟“
 ”آئی کوہر۔“

”نیلوفر؟“

”ظاہر ہے اسی سے۔“

”ڈونٹ۔“

”کیا مطلب! وہ چونکا۔“

میرے تصور میں ڈیرے کے بیٹے کی تصویریں
 گلدھڑ ہونے لگیں۔ گھوڑے پر سوار، ہندوئی سے نشانہ لیتے
 ہوئے، شکار کو قدموں میں ڈھیر کیے اسے فتح مندانہ نگاہوں
 سے دیکھتے ہوئے، خدمتگاروں سے پاؤں دہواتے ہوئے،
 مزارعین کو مالکانہ تفاخر سے دیکھتے ہوئے! نہ جانے کیسے اس
 کے قدموں میں ڈھیر شکاری جگہ نمبرون نے لے لی تھی!
 ”یار دفع کرو نیلوفر کو..... دو حرف بھیج دو اس پر.....“
 میں نے نمبرون کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ”وہ تمہارے
 لائق تھی ہی نہیں یار۔“

نمبرون کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر میں
 نے اسے پداری شفقت سے معذور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے
 کہا۔ ”یار تم تو لاکھوں میں ایک ہو..... تمہارے لیے تو کوہ
 قاف سے پری اترے گی۔“ میں نمبرون کو ڈیرے کا باپ
 کی طرح گھر مزاری، کشتی رانی، تیراندازی، ہندوئی زنی،
 خدمتگاروں اور مزارعین کا رعب داب نہیں دے سکتا تھا تو
 کیا اسے ایچھے توں کے خواب تو دکھا سکتا تھا۔

نمبرون ٹپکی پٹپٹہ کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں
 میں یاس تھی، حسرت تھی، بے بسی تھی، شرمندگی تھی۔ وقعتاً
 اس کی آنکھوں میں آنسو بہکھڑے لینے لگے۔
 ”کیا ہوا یار؟“ میں نے اس کا شانہ تپتہ چاہا۔
 ”سوری بابا۔“ وہ دل شکستہ لہجے میں بولا۔
 ”فاروہاٹ! میں چونکا۔“

”اپنی حماقت میں..... میں نے آپ کا ٹائم بھی
 ضائع کیا۔“

نوجوان بیٹے کو ناکامی عشق پر ٹوٹے ہوئے دیکھنا مجھ
 سے معمولی حیثیت باپ کے لیے نہایت دل شکن تجربہ حیات
 تھا۔ اس کی روشن اور توانا آنکھوں کو گہرے پانیوں میں
 ڈوبتے دیکھنا جاں نسل تھا سو اسے دلاسا دینے کو اس کا شانہ
 تپتہ تپتا ہونے میں نے اسے گلے لگانے کے بہانے اپنا
 چہرہ اس کے کندھے کے دوسری جانب کر لیا کہ مجھے اپنی
 آنکھوں میں درآئی نمی کو بھی نمبرون سے چھپانا تھا۔

ہم غریبوں کے بچے عشق میں بھی امیروں سے مات
 کھا جاتے ہیں!



رنگ آسمان

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات، شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قرار یوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتر آئے کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبات کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیرلوں کے عبرت
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان





گریزی (Grizzly) کا پہاڑ سا جسم، ہلکے بھورے رنگ کے گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بڑا سا تھوٹنا سیاحی مائل تھا جہاں سے دو لمبے ٹیکیلے اور شکاری دانت جھانک رہے تھے۔ وہ کسی دیوزاد بن کی طرح اپنے پھیلے دونوں پیروں پر اٹھ کھڑا تھا اور تاریک آسمان کی طرف تھوٹتا کیے ہوئے عجیب ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ شوکت نے اپنی شکاری مہمات کے دوران اتنا بڑا اور غیر معمولی طور پر عظیم درندہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اس کا قد چوٹ کے قریب تھا اور لمبائی سو سینٹی میٹر سے کم نہ تھی جبکہ اس کا ڈیڑھ دو سینٹی میٹر کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔

اس عظیم الجثہ درندے کے سامنے شوکت کے ہاتھ میں تھمی ہوئی قردی، لیکن میں رکھی سبزی کاٹنے والی ایک چھری سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

یہ درندہ اگر غضب ناک ہو جاتا تو یہاں ایک خون ریز قیامت مچا سکتا تھا۔ شوکت اسے یہ غور دیکھنے لگا۔ وہ اس کے انداز و اطوار سے یہ خوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

شوکت اسے مخصوص انداز میں پیکار کرنے لگا۔ گریزی (ریچھ) اسے بھوکا لگ رہا تھا۔ شوکت کا تجربہ بتاتا تھا کہ ریچھ جب بھوکا ہوتا ہے تو وہ خیموں یا انسانی آبادی کا رخ کرتا ہے۔ اسے کھانے کی خوشبو آ جاتی ہے۔ یہ سوچ کر شوکت جلدی سے اپنے خیمے سے رات کے بچنے ہوئے ایک گوشت کا بچا کھیا پارچہ اٹھا لیا اور اس کے آگے پیچھا کیا۔ گریزی نے بچہ جھک گیا۔ اب وہ اپنی چاروں ٹانگوں پر آ گیا تھا۔ وہ بڑی رغبت کے ساتھ پارچہ چبانے لگا اور شوکت نے بے اختیار سکون کی سانس لی مگر یہ سکون زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا تھا اور اچانک رات کے اس پُر ہول سانے میں کوئی چلنے کا دھماکا ابھرا۔۔۔۔۔ پارچہ چباتے ہوئے گریزی نے اپنا تھوٹنا فضا میں اٹھا کر ایک دل دہلا دینے والی چٹکھڑائی۔۔۔۔۔ دوسرا فائر ہوا اور گریزی جیسے غلط و غضب سے پاگل ہو گیا۔ شوکت نے لرزتی نظروں سے دیکھا۔ رابرٹ ہاتھ میں لمبی نال والا پستول پکڑے اپنے خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے پستول کی نال سے تینگوں دھوکوں کی لکیریں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ گریزی پر تیسرا فائر جمعولے کی تیاری کر رہا تھا کہ شوکت چلا کر بولا۔

”اے! اے! رکو۔۔۔۔۔ رکو۔۔۔۔۔ پوئل! فائر مت کرو۔۔۔“

اس کی فائر کی ہوئی دونوں گولیاں گریزی کے وجود میں گم ہو کر رہ گئیں اور شوکت کو معلوم تھا کہ وہ دو گولیاں اس دیوبیکل گریزی کے لیے ”جنوں“ سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتی تھیں البتہ اسے غضب ناک ضرور ہلاکتی تھیں اور وہی ہوا تھا۔

کولیوں اور گریزی کی چٹکھاؤں کی آواز پر اور لوگ بھی جاگ گئے۔ گریزی غضب ناک انداز میں پلٹا اور رابرٹ کی طرف لپکا۔ خواتین نے خچیں مارنا شروع کر دیں اور دونوں فوجیوں نے اپنی گن سے اس پر فائر کھول دیا لیکن گریزی رکا نہیں۔

شوکت جانتا تھا کہ جب تک گریزی کے کسی نازک مقام پر گولی نہیں لگے گی، وہ کرنے والا نہیں تھا اور یہ کام صرف ایک ماہر شکاری ہی کر سکتا تھا، جبکہ وہاں کوئی ماہر شکاری تو نہ تھا مگر شوکت کو چونکہ شکاری مہمات کا تجربہ تھا اس لیے وہ اپنے طور پر گریزی جیسے درندے کی ٹھوک پچھتا تھا اور اپنے مطابق اسے ہشکارے دے کر ”پراس“ طریقے سے چلتا کر دینا چاہتا تھا مگر رابرٹ نے عین وقت پر گولی چلانے کی بے وقوفی کر کے معاملہ بگاڑ دیا تھا اور گریزی جیسے درندے کو براہِ فرختہ کر ڈالا تھا۔

”پلیز! شوکی! رابرٹ کو بچاؤ۔۔۔۔۔“ دفعتاً ہی ہک بک کھڑے شوکت کے کانوں میں ریٹا کی چیخ گونجی اور شوکت گریزی کی طرف لپکا۔ گریزی رابرٹ کے سر پر پہنچ چکا تھا اور رابرٹ مارے دہشت و خوف کے چند قدم پیچھے پلٹا تو اپنے ہی خیمے کے ساتھ الجھ کر گر پڑا۔ شوکت نے ایک چیخ مار کر گریزی پر چلاٹک لگا دی اور اس کی پیٹھ پر گردن کے قریب جالپنا۔

قردی اس کے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھمی ہوئی تھمی اور اس نے وہی گریزی کے تھوٹنے پر آزما ڈالی۔ دیو قامت گریزی کے تھوٹنے پر بڑا گہرا چکا لگا تھا اور اس نے دل دہلا دینے والی چٹکھاؤں کے ساتھ پلٹا کھایا اور ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ کا پتھر اپنی گردن کے قریب سوار شوکت پر مارا۔ پتھر شوکت کے بائیں شانے پر لگا اور وہ نیچے گر پڑا۔۔۔۔۔

گریزی کا خون آلود تھوٹنا اور وہاں سے جھانکتے ہوئے شکاری دانت اسے مزید خوفناک بنا رہے تھے۔ گریزی زخمی ہونے کے بعد مزید بدحشت ناک ہو گیا تھا اور اس نے رابرٹ کو چھوڑ کر پتھر کی زمین پر گرے پڑے شوکت کی طرف قدم بڑھائے۔ ادھر رابرٹ، شوکت کی بروقت مداخلت کے بعد اپنی جان بچا کے بھاگا۔ ایک فوجی کو احساس ہوا اور اس نے گریزی کے خون آلود تھوٹنے کا نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ گریزی کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ چٹکھاؤ مار کر اپنے چاروں پیروں پر آیا اور ایک طرف کو بھاگ گیا۔

اس مختصر سے پڑاؤ میں اچھی خاصی جھگڑا ہو گیا۔ پروفیسر ہنری، ریٹا اور گارشا۔۔۔۔۔ زخمی شوکت کی طرف لپکے۔ ہنری نے شوکت کے بائیں شانے کے زخم کا جائزہ لیا۔ وہاں

سے شرت بھٹ کر خون آلود ہو رہی تھی۔

شوکت اپنے خیمے میں آیا۔ وہ تنہا تھا۔ نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا باہر تھے۔ شوکی کا موڈ بڑی طرح خراب تھا، اس نے لیپ کی روشنی تھوڑی تیز کر دی تھی۔ اسی وقت کوئی اندر داخل ہوا۔ اس نے آہٹ پر اپنا سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے گارشیا کھڑی تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ گارشیا کی جگہ وہ ریتا کے آنے کی توقع کیے بیٹھا تھا۔

”آئی تو..... برا درواریت تمہیں بہت ہرٹ کرتا ہے.....“ گارشیا نے آہٹ کی سے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ غلطی اسی کی ہوتی ہے مگر تم نے پھر بھی اس کی دو تین بار مدد کی ہے۔“

”مجھے کیا فائدہ ہوتا ہے اس کی مدد کر کے..... میں تو صرف.....“ وہ غصے کی تیزی اور درواری میں آگے بھی کچھ ایسا کہہ ڈالنا چاہتا تھا کہ ایک دم خاموش ہو گیا، لیکن گارشیا نے گویا اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

”ریتا کی خاطر کرتا ہوں..... یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟“ شوکی کا چہرہ بے بات ٹھہرا۔ اس نے کہا: ”ہاں.....“ ”تم ریتا سے محبت کرتے ہو.....؟“ گارشیا نے شاکی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو شوکی اس بار قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”مہ..... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا..... مس ریتا میرے مالکوں سے تعلق رکھتی ہے اور میں ان کا احترام کرتا ہوں۔“ اس کی بات پر گارشیا کے ہونٹوں پر طنز یہی مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”چھا..... تمہارے مالکوں سے تو ہم بھی تعلق رکھتے ہیں۔“

”تو کیا مس گارشیا! میں آپ لوگوں کا احترام نہیں کرتا.....؟“ شوکت نے لیپ کی تیز روشنی میں اس کے دکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ گارشیا نے کچھ کہنے کے لیے لب دایکے ہی تھے کہ چانک شوکی نے دیکھا گارشیا کچھ کہتے کہتے رہ گئی اور خیمے کے نکاسی والے راستے کی طرف باہر دیکھنے لگی، تب ہی دو گوں بعد گارشیا کو بخانے کیا ہوا کہ وہ اپنے لبوں پر عجب بھری مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی اس کے قریب ہوئی اس قدر..... کہ اس کا جذبات سے سلگتا ہوا چہرہ شوکی کے بالکل کاندموں سے آن لگا اور وہ اتنی مخمور انداز میں بولی۔

”تم ہمارا بھی احترام کرتے ہو..... اس میں کیا شک ہے بھلا.....“ یہی وہ وقت تھا جب کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک گارشیا شوکی کے بالکل قریب آ چکی تھی۔ آنے والی ریتا تھی..... جسے دیکھتے ہی شوکی بول بدکا جیسے گھوڑا بدکتا ہے۔ اس نے گارشیا کو خود سے پرے دھکیل دیا، وہ بوھلا سا گیا تھا

”ہینکس گاڈ! زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اسے میرے ٹیپے میں لے آؤ۔“ پروفیسر ہنری بولا۔ ”وہاں فرسٹ ایڈ ہاں موجود ہے۔“

شوکت کے مضروب شانے کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ اس کے بعد اس نے سب کو اپنی عقل مند اور رابرٹ کی بے وقوفی کے بارے میں بتایا۔

”ریش!“ رابرٹ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ غصے سے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تو اس کی جان بچانے کی خاطر گریزی پر فائز کیا تھا۔ اب یہ مجھ پر ہی الزام مہوپ رہا ہے۔“

”سب سے پہلے میں نے ہی گریزی کو دیکھا تھا۔“ شوکت نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے رابرٹ کی ڈھٹائی اور جھوٹ پر غصہ آ گیا تھا۔ ”مجھے شکاری مہمات کا تجربہ ہے۔ میں جانتا تھا کہ گریزی جیسا درندہ امن پسند ہوتا ہے، جب تک کہ اسے چیمڑا نہ جائے۔ فقط بھوک اور شکار نہ ملنے کی صورت میں یہ انسانی آبادی اور خیمہ پڑاؤ کا رخ کرتا ہے۔ میں تو اس کے سامنے آ کر اسے ہشکارنے اور پلٹ کر جانے پر مجبور کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا کہ رابرٹ نے اس درندے پر بلاوجہ فائر کر دیا اور یوں وہ پھیر گیا۔“

شوکت کی بات کو کوئی رد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ سب نے اس کے ہاتھ میں پہلے ہی سے قردی تھا۔ ہوئے دیکھ ہی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اس نے بڑی بہادری سے رابرٹ کی جان بھی بچائی تھی اور گریزی کو زخمی بھی کیا تھا، جبکہ خود رابرٹ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ رابرٹ نے دوبارہ ڈھٹائی دکھانے کی کوشش میں اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ پروفیسر ہنری جو ساری بات سمجھ چکا تھا، رابرٹ سے نہایت سنجیدگی سے بولا۔

”میرا خیال ہے تمہیں اب ایٹمی سکوپ زکری لینا چاہیے اور میں امید کروں گا کہ آئندہ تم ایسی بے وقوفی کا..... مظاہرہ نہیں کرو گے۔ اس مہم کو کامیابی سے سر کرنے کے لیے مسٹر شوکی کو میں تمام صوابدیدی اختیارات دے چکا ہوں۔“

ایک نوکر کے مقابلے میں رابرٹ کو اس سرزنش پر بری طرح اپنی تکی کا احساس ہوا اور وہ اندر سے جل بھن گیا۔

اس کے بعد خیمہ درست کیا جانے لگا اور شوکی نے دیکھا کہ ریتا، رابرٹ کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور پلٹ کر اپنے خیمے کی طرف چلا۔ گارشیا ایک طرف کھڑی بڑی گہری نگاہوں سے مسلسل اس کی طرف نگے جاری تھی۔

مگر رینا یہ سب دیکھ چکی تھی۔ ایک طنزیہ سی مسکان اس کے عنابی لبوں پر اٹھی اور جلد ہی معدوم بھی ہو گئی۔

”ہم..... مس رینا! آ..... آپ.....“
 ”سوری.....! میں شاید آپ دونوں کی تنہائی میں خل ہو گئی.....“ وہ بولی۔ شوکی کو اس کے ٹھکنے لہجے سے طنزیہ کاٹ نمایاں ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

”سن..... نہیں تو..... جب..... بالکل بھی نہیں.....“
 شوکی گھبرا کر بولا۔ وہ ہنوز اپنی بوکھلاہٹ پر قابو نہ پاسکا تھا جبکہ گارشیا کے چہرے پر بدستور لطیف جذبوں سے لبریز مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس بار وہ رینا سے معنی خیز انداز میں بولی۔

”نوڈاؤٹ..... نخل تو ہوئی ہو تم..... خیر، آجاؤ.....“
 خیریت تو ہے نا..... رابرٹ کیسا ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اسی کے پاس سے آ رہی ہوں.....“ رینا نے جیسے بے تاثر ٹی مسکراہٹ تلے جواب دیا۔ شوکی کو یوں لگا جیسے اس نے یہ بات اسے جلانے کے لیے کہی ہو۔ شوکی جانتا تھا کہ یہ فرنگ عورتیں جیلسی کے معاملے میں بڑی متعصب ہوتی ہیں۔ ڈپرٹ ہونے میں ذرا دیر نہیں لگاتیں اور فوراً اس کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتی ہیں۔ گارشیا کی موجودگی میں رینا نے دانستہ رابرٹ کا ذکر کیا تھا۔

”میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی..... مسٹر شوکی کہ تم نے رابرٹ کی دوسری بار جان بچائی..... ٹس امین ٹھینکس.....“ وہ کہہ کر واپس لوٹ گئی اور شوکی اس سے کچھ کہتا ہی رہ گیا۔

”رینا، رابرٹ سے کافی کلوز ہے.....“ رینا کے خیمے سے ٹھٹکتے ہی گارشیا نے گویا جی جلانے کی خاطر شوکی سے مسکرا کے کہا۔ ”میں جانتی ہوں..... ایسا اب سے نہیں بچپن سے ہے۔ رینا، میں اور برادر رابرٹ..... ہم جب بھی تینوں مل کر کھیلا کرتے تھے تو رابرٹ ہمیشہ رینا کی ہی سائنڈ لیتا تھا اور مجھے بالکل نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔“

شوکی کو لگا، جیسے گارشیا دانستہ اس موضوع کو طول دینا چاہ رہی ہو..... اسے گارشیا کی اس حرکت پر غصہ بھی آتا تھا۔ اسے صاف لگا تھا کہ گارشیا نے رینا کو خیمے کے پاس آتے دیکھ کر رینا کو اس سے بدل کرنے کے لیے دانستہ طور پر یہ حرکت کی تھی۔

”آپ یہاں سے جاسکتی ہیں مس گارشیا.....“
 دوسرے ہی لمحے شوکی نے کھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔

”میں تو چلی جاتی ہوں..... مگر تمہیں ایک دوستانہ مشورہ دیے جاتی ہوں.....“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”رینا کا خیال بھی اپنے دل سے نکال بھیجیو..... وہ برادر رابرٹ کے ساتھ انوالو ہو چکی ہے جبکہ رابرٹ کو تو تم جاننے ہی ہو.....“

زہر میں بجھے ہوئے یہ الفاظ ادا کر کے گارشیا بھی خیمے سے نکل گئی۔ شوکی بری طرح جھٹایا ہوا تھا۔ اسے گارشیا پر بری طرح طیش آ رہا تھا۔ وہ اب سمجھ چکا تھا کہ گارشیا ایک مکار اور سازشی ذہن کی عورت تھی اور اس سے دور رہنا ہی اس کے لیے بہتر تھا مگر وہ رینا کی اس غلط فہمی کی وجہ سے پریشان تھا۔ نجانے وہ گارشیا کی اس حرکت پر کیا سمجھ بیٹھی ہو؟..... لیکن ساتھ ہی گارشیا کے یہ الفاظ بھی زہر میں بجھے تیر کی طرح اس کے وجود کو چھلنی کیے دے رہے تھے کہ رینا اس کے بھائی رابرٹ کے ساتھ ”انوالو“ ہو چکی تھی۔

”کیا گارشیا نے ایسا رقابت کے جذبے تلے کہا تھا؟ یا اس میں واقعی حقیقت بھی تھی؟“

اس نے سوچا۔ وہ دل مسوں کر رہ گیا۔ اس کے دل میں ایک بے چینی کی گھر کرنے لگی۔ وہ رینا سے بے محبت کرنے لگا تھا۔ رینا کا زندگی سے معمور دلکش چہرہ، اس کے عنابی لبوں کا گداز اور مخموری دل موہ لینے والی نیلی آنکھیں..... ہر نکتہ اس کے تصور کا حصہ بلکہ مدار بن کر رہ گئی تھیں۔ رینا کا حسین اور دلکش سراپا..... اس کے لیے ایک مدار کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جس کے طلسمی حصار میں وہ خود کو گردش میں محسوس کرتا رہتا۔ وہ جب بھی رینا کو اپنے آس پاس دیکھتا، اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں، پھر بس وہ ہوتا اور رینا ہوتی۔ رینا کی محبت کا ایک طوفان سا اپنے اندر چھلکتا محسوس کرتا، جو اسے کسی لمبی چین نہیں لینے دیتا تھا مگر آج والے واقعے نے اس کی بے چینی اور فرزانگی جیسے فردوس ترکڑالی تھی۔ نیندا اب اس کی آنکھوں سے، کائنات میں گردش کرتے سیاروں سے نجی کوسوں دور ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خیمے سے باہر آ گیا۔

رات اپنے آخری پہرے کے اختتامی سفر میں تھی۔ دور سنگلاخ افق کے پار سیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ بائیں جانب ڈھلوان میں ہر دوار کا جنگل بھی بھانت بھانت کے چرند پرند سے جاگنے لگا تھا گریز لی شاید ادھر ہی سے یہاں آن بھٹکا تھا اور اب زخمی ہونے کے بعد اس نے وہیں کی راہ لی تھی۔ ان کا پڑاؤ جنگل کی شمال مشرقی سمت پر تقریباً پانچ سو فٹ کی بلندی پر دوسرے بنگلے پہاڑیوں کے دامن میں ایک

قدرے سطح قطعہ اراضی پر قائم تھا۔ فضا میں سر دی گھلی ہوئی قہقہے لیکن اس میں ایک عجیب طرح کی خوشگوار کا احساس پناہ تھا۔

اس ناخوشگوار واقعے کے بعد کوئی بھی نہ سوسکا تھا۔ وہ سب فولڈنگ چیز زائرین لیں چھا کر اس پر براجمان، آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ پروفیسر ہنری ایک کرسی پر بیٹھا، میز پر کوئی فائل کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک قلم تھا۔ آنکھوں میں نفیس فریم کی عینک تھی۔

لسانیات اور مختلف قبائل کی زندگیوں اور ان کے رہن سہن پر مشتمل دو مونی کتابیں بھی دھری پڑی تھیں، جسے وہ کبھی کبھی کھول کر دیکھ لیتے تھے اور پھر فائل پر کچھ لکھنے کے لیے جھک جاتے تھے۔ اس کے برابر والی کرسی پر گارشا بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کئی بیک تھا جس میں سے وہ وغیرہ نکال کر چبانے میں مصروف تھی۔ وہ حسب سابق مختصر اور چست لباس میں تھی، جو محض ایک ٹائٹ سی "شارٹ" (ٹیکر) اور بغیر آستین والی پنک کمر کی شرٹ پر مشتمل تھا جو ناف سے ذرا ہی نیچے بھی جیکہ رہتا اور رابرٹ بھی وہیں ساتھ ساتھ براجمان تھے۔ رینا البتہ فرنگ ہونے کے باوجود ذرا ڈھنگ کا لباس ہی پہنا کرتی تھی۔ وہ حسب سابق فل اسکرٹ ڈریس میں تھی اور شو کی کو ہمیشہ سے اس کا ایسا لباس ہی اچھا لگتا تھا جس میں کسی بھی قسم کی عربیائی کا شائبہ نیک نہ ہوتا تھا۔ وہ اس میں اسے ہمیشہ... پاکیزہ لگتی تھی۔ ورنہ تو اس نے گارشا کو نیم عربی لباس میں بھی دیکھا تھا۔ رابرٹ البتہ حسب سابق اپنے مخصوص "میٹ آپ" میں تھا۔ اس نے وہی کاؤبائے طرز کی ٹائٹ براؤن پتلون اور شوخ کمر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بیروں میں لائٹ بوٹ تھے اور دونوں ہولسٹرز میں بھرے ہوئے لمبی تال والے پستول اڑسے ہوئے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں جیس کے لفافے تھے۔ نندو بابا اور شانتا الاؤدہ کائے اس پر کان کا برتن رکھے بیٹھے تھے۔ دونوں فوجی پراڈ کی مخالف سمتوں میں چوکس کھڑے دوسری جانب دیکھنے میں مگن تھے۔

کئی بات پراچانک رینا مترنم آواز میں نہی اور رابرٹ کا ہتھ بھی گونجا تھا۔ شو کی نے جلتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا جبکہ گارشا نے اس کی طرف دیکھ کر اپنا ایک ہاتھ ہلا دیا تھا۔ رینا اور رابرٹ نے البتہ ایک چھپھکتی سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

شو کی اپنے دل کو ہی نہیں بلکہ لقمہ وجود کو سنبھالتا ہوا،

قریب ایک پہاڑی پتھر پر جا بیٹھا۔
 "اے.....! ادھر آؤ....." معا رابرٹ نے اس کی طرف دیکھ کر آواز لگائی، جسے شو کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوسری جانب دیکھنے لگا۔

"میرے ہو گئے ہو کیا.....؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں....."
 رابرٹ چلایا۔

"واٹ نان سنس.....! آہستہ بولو، رابرٹ بڈی.....!" قریب بیٹھے پروفیسر ہنری نے اسے ٹوکا تو رابرٹ پھرے ہوئے لچھے میں اس سے بولا۔

"انگل ہنری! آپ دیکھ رہے ہوں اس دو ٹکے کے ملازم کی حرکت..... آواز دے رہا ہوں پر نہیں سن رہا۔"
 "ہے بڈی! بی یو ریلف!" پروفیسر ہنری نے اسے پھر ٹوکا۔ "ملازموں کی تبدیلی نہیں کیا کرتے۔ یہ ہم پر جان دیتے ہیں....."

"ہونہ..... جان دیتے ہیں..... میں اس راسکل کو....."

"رابرٹ....." دفعتاً ہی پروفیسر نے سخت لچھے میں اس کی بات کاٹ دی۔ اسے بھی اپنے نتیجے پر غم آ گیا تھا۔

"میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں..... یہ ملازم صرف میرے کہنے پر ہیں اور میری ہی خاطر سفر کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ آئندہ تم ان پر کسی قسم کا حکم چلانے کی کوشش نہیں کرو گے کلیئر.....؟"

رابرٹ کو بری طرح اپنی سبکی کا احساس ہوا..... ایک نوکر کے سامنے اس کی یہ تذلیل کم نہ تھی۔

"اوکے، فائن.....!" وہ پروفیسر ہنری کی طرف دیکھ کر تیز لچھے میں بولا۔ اسی وقت گارشا نے تھوڑا سا جھک کر رابرٹ کے کان میں کچھ کہا تھا۔ شو کی اب انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد رابرٹ رینا سے مخاطب ہوا۔

"کم آن رینا..... یہاں بہت خشکی ہے۔ اس طرف چلتے ہیں....." میرے کہتے ہوئے رابرٹ نے کرسی چھوڑ دی تو رینا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پروفیسر ہنری نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر جھک کر دوبارہ فائل اور کتابوں پر جھکا دیا۔ گارشا نے سامنے پتھر پر ٹکے بیٹھے شو کی کی طرف دیکھ کر ایک معنی خیز اشارہ کیا اور آٹھ ماری اس کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شوکت کے قریب آئی اور اس سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ مع خیر کے لیے نہیں چلو گے.....؟"
 "میرا موڈ نہیں ہو رہا۔" شوکت نے رکھائی سے جواب دیا۔

"فائن! میں اکیلی جاسکتی ہوں....." یہ کہہ کر اس نے

ڈالی۔ ”مشن کے دوسرے آخری مرحلے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ یہ بات ہمیں مد نظر رکھتے ہوئے از حد احتیاط رکھنا ہوگی۔“

”بالکل۔“ علی رحمان نے کہا۔ وہ اپنے دل کی اڑجن بتا کر کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

ذرا دراستانے کے بعد یہ لوگ آگے روانہ ہو گئے۔ شائل نے انہیں اپنی رہائش گاہ کا پتا بتا رکھا تھا۔ وہاں وہ تین دو سوچے کے بیوپاری کی حیثیت سے رہتا تھا۔ دونوں رات کی تاریکی کا حصہ بنے تیز تیز قدموں سے چلتے رہے۔ آدای کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ ریاست کی رعایا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ لیکن یہ دونوں جانتے تھے کہ بہت جلد گلی تھارچی پھیلا دیے جائیں گے کہ دو خطرناک جاسوس ریاست میں در آئے ہیں لہذا کسی بھی مشکوک یا نئے آدمی کو دیکھتے ہی ریاست کے ذمے داران کو اس کی اطلاع کریں۔ اس کے بدلے عزت مآب مہاراجا (چندر گپتا.....) بذات خود، جاسوسوں کی اطلاع دینے والے کو انعام و اکرام سے بھی نوازیں گے۔

دونوں تھوڑی دیر میں ایک اندھیری گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں بھی سناٹا طاری تھا۔ وہ اطراف میں محتاط سی نگاہ ڈالتے ہوئے گلی کے آخری سرے کے دو گھر پہلے والے ایک گھر کے دروازے کے قریب جا پہنچے۔

”مشن..... دستک مت دینا.....“ علی رحمان نے جب شاہ زمان کا ہاتھ دروازے پر اٹھتے دیکھا تو ہلکی سی سرکشی میں اس سے کہا۔ ”قریب کسی گھر میں کوئی جاگ رہا ہوگا تو اسے ہینک پڑ جائے گی کہ رات کے اس سے فلاں مکان میں دستک کی آواز سنائی گئی تھی۔“

”تو پھر جو طریقہ کرنا ہے، جلدی کرو۔ ہم یہی نہیں بلکہ شائل بھی اس وقت خطرے میں ہے۔“ شاہ زمان بولا۔ ”ہم تا دیر یہاں نہیں کھڑے رہ سکتے۔“

شاہ زمان نے کہا اور پھر گلی نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بتا کر اپنے منہ سے لگا یا اور دو تین بار لوکی آواز نکالی..... کچھ نہیں ہوا۔ اندر اسی طرح سناٹا کسی لاش کی طرح پڑا رہا۔

”کیا وہ سو گیا ہے؟ اسے تو ہمارے انتظار میں.....“ شاہ زمان کا جملہ حلق میں ہی انک گیا۔ کیونکہ اسی وقت بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھلا تھا، مگر اپنے سامنے دروازے کی چوکھٹ پر خلاف توقع شائل کے بجائے ایک خوب روی خاتون کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے عنائی رنگ کا جبہ سا پہن رکھا تھا۔

وہیں کھڑے کھڑے منہ پھیرا اور پروفیسر ہنری سے بولی۔

”انکل! میں ذرا سیر کو اس طرف جا رہی ہوں اکیلی.....“ گارشیا نے لفظ ”اکیلی“ کو ذرا کھل کر بلند آواز میں ادا کیا تھا جس... پروفیسر ہنری... کا جھکا ہوا سر ایک دم اونچا ہوا اور وہ اپنی نینک کو تھوڑا اونچے کر کے بولے۔

”اکیلی مت جاؤ.....“ یہ کہہ کر اس نے شوکی سے کہا۔ ”ہے بڈی! تم ذرا بے بی کے ساتھ چلے جاؤ..... اور دیکھو..... زیادہ آگے مت چلے جانا.....“

شوکی کو گارشیا کی چالاکی کا اندازہ ہوا۔ وہ پروفیسر ہنری کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ تا چار اسے گارشیا کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

دونوں کافی دیر تک دوڑتے رہے تھے۔ بارش اب رک چکی تھی۔ آسمان دھلا کھڑا اور شفاف نظر آتا تھا۔ ورا ایک اندھیری سی چٹائی افق سے پورے چاند کا سنہرا آئینہ، چوٹی پر سونے کی گیندی طرح لٹکا ہوا مسوس ہوتا تھا جیسے اب تب میں لڑھک کر نیچے وادی میں جا پڑے گا۔ تارے بھی کھکشاں بنائے صوفیاں تھے۔ وہ دونوں ایک پتھر پلے پتھر کے نیچے آن کھڑے ہوئے جہاں سے بارش کا جمع شدہ آب استادہ بلوریں قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔ سردی بڑھنے لگی تھی۔ دونوں کے جسم گرم تھے۔ وہ چٹائی دیوار سے پشت لٹائے دم بہ خود سے بیٹھے تھے۔

چہار اطراف گہرے سناٹے کا راج تھا۔ ہینکی ہینکی سی رات بھیدوں بھری آہٹوں کے ساتھ دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ماسوائے چٹائی جیسے کی گھر سے ٹپکنے والے قطروں کی آواز کے اور کوئی آواز ساعتوں میں نہیں پڑتی تھی۔

”ہیں صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے شائل کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔“ شاہ زمان نے علی رحمان سے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو..... کہ ہم مشن کے پہلے مرحلے میں کامیاب ہو چکے ہیں؟“ نجانے کس خیال کے تحت علی رحمان نے ایسا کہا تھا جس پر شاہ زمان کو اچنبھا سا ہوا۔ وہ بولا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”ہمیں بڑی خاموشی سے ناگہر ریاست میں داخل ہونا تھا مگر اب دیکھتا ہوں کہ ہمارے اس طرح ریاست میں داخلے کا راز اب راز نہیں رہا۔ پوری ریاست میں ہماری ڈھنڈیا پڑی رہے گی اور ہم شاید اپنا کام اس طریقے سے سمجھ طور پر انجام نہ دے پائیں۔“

”سمجھ گیا.....“ شاہ زمان نے گردو پیش پر ایک نگاہ

[illegible]

(5): ”ہنستا کھیتا عدنان“ (قیمت) 1,000

● قلم چہرے (صحافیوں کے تذکرے) ● نور جہاں اور دلیپ کمار

0300-0515101/0333-4393422/03008422518/0321-4552371
qalamfoundation3@gmail.com

ایجنسی بولڈرز۔

- خزانہ علم و ادب، اردو بازار لاہور 042-37314169
- بک کارز جہلم 0321-5440882
- مسٹر نکس سپر مارکیٹ اسلام آباد 051-2278845
- سعید بک بینک، جناح سپر مارکیٹ، اسلام آباد 051-2651656
- ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی 021-32633151
- گوشہ و ادب سرگرم روڈ، کوئٹہ 081-2843229
- ہمدرد بک ڈپو B.C.G. پوک، ملتان 0303-9773018
- کتاب گھر حسن آرکیڈ، ملتان 0321-4510444
- ایس کتاب گھر میرپور، لاہور 0300-9545906
- محمد حسن بک سٹور ایف 10، چمنی، بنوں، پوک، جنگ صدر 047-7626420

بارے میں بڑی صراحت سے بتا دیا جسے سن کر شکیل کے چہرے پر ایک دم شبیدگی کھنڈ آئی۔ علی اور شاہ زمان کی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کی آواز کھردری تھی۔ چند ثانیے متوقف رہنے کے بعد وہ بولا۔

”یہ کچھ اچھا تو نہیں ہوا..... لیکن خیر، فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں..... کام میں کچھ تاخیر تو ہو جائے گی۔۔۔ یہ صورت دیگر، ہم کل ہی اپنے مشن کی ابتدا کر سکتے تھے۔“

”ہم کل ہی ابتدا کر دیں گے۔“ شاہ زمان نے فوراً کہا۔
 ”نہیں۔“ شکیل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی صبح صادق کی روشنی پھیلنے ہی لگیوں میں نقتارے کو گنجا شروع ہو جائیں گے۔ کوئی بعید نہیں کہ گھر گھر تلاشی بھی لی جائے۔ ابھی اپنے مشن کو اس طرف رکھ کے ایک مصیبت سے چھٹکارا پانے کی... کوشش کرنا ہوگی۔“

”لیکن..... ہم تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“ لفٹیننٹ کمانڈر مائیکل شاپن نے نائب کپتی افسر جان پال کو دو ایک روز میں ایک خصوصی نشست کے لیے یہاں روانہ کرنے والا ہے۔ ہم نے اسی نشست کو سبوتاژ کر کے فوراً سے پیشتر واپس لوٹ جانا ہے۔ اگر نشست کامیابی سے طے پاگئی جس کی سب کو امید واثق بھی ہے تو سمجھو ہمارا مشن بری طرح ناکامی سے دوچار ہو جائے گا۔“ علی ریحان نے اپنے اس اہم مشن سے متعلق غایت درجے کی مجبوری اور اہمیت شکیل کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے کمرے میں وہی خوب روخاتون داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں گول تھالی تھی۔ اس پر چار چھوٹی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کسی اور نے تو شاید نہیں، البتہ شاہ زمان نے چار پیالیوں کو دیکھ کر فوری طور پر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ یہ خاتون بھی ان کی اس اہم گفتگو میں شامل ہونے والی تھی اور..... دوسری اہم بات جو سب کے لیے نوٹ کرنے والی تھی، وہ تھا اس کا لباس..... جو تبدیل ہو چکا تھا۔ یعنی اب وہ لمبے بے کے بجائے کاسٹی رنگ کی خوب کسی ہوئی ساڑی میں ملبوس تھی۔ جس میں اس کا بھرا بھرا شباب انداز پر تاحسوس ہوتا تھا۔ شاہ زمان کو اس کا روپ سنگھار جیسا بدن کسی سانچے میں ڈھلا ہوا دکھتا تھا۔ رنگت اس کی شہابی تھی۔ کجکاری کشادہ آنکھیں جن پر گھٹناؤں جیسی پلکوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ گتے ربشی بال بڑے سلیقے سے کھول کر اس نے اپنے شانوں پر پھیلا رکھے تھے۔ اس کے تو پے کلن بدن سے عجیب سی مسکوکہ دینے والی کیفیت اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔

شاہ زمان کو اب بھی حیرت ہو رہی تھی کہ شکیل جیسے

عمر ستائیس اٹھائیس کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ وہ خاصی دراز قامت اور صحت مند جسم کی خاتون تھی۔ اس کے ہونٹوں کا گداز تھرکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تاہم اس خاتون کو دیکھ کر دونوں ہی کچھ محضے کا شکار ہو گئے تھے، کیونکہ ان کی معلومات کے مطابق شکیل اکیلا اپنی رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ اگرچہ وہ شادی شدہ تھا مگر اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا لیکن اب تک اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

”اندر آجائیں..... جلدی۔“ خاتون نے ان کی حیرت اور شش و پنج کی پروا کے بغیر ہولے سے کہا اور ان دونوں نے اندر قدم رکھ دیا۔ اندر کوئی روشنی نہیں کی گئی تھی۔ صحن پر ادھری منزل کے کسی کمرے کی چھت ہونے کے باعث فقط کچھ ہی حصہ کھلا ہوا تھا جہاں سے مقدور بھرا آسان، قدرے روشن روشن سا نظر آ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ ادھر خاتون نے دروازہ بند کیا اور ان کے عقب میں ہی کھڑے ہو کر بولی۔
 ”تمہارے دائیں ہاتھ پر ایک زینہ اوپر کو جاتا ہے۔ شائل وہاں تم دونوں کا منتظر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو تارکی میں نجانے کہاں غائب ہو گئی۔ دونوں کا دل دھڑکا تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ دائیں ہاتھ کی جانب مڑ گئے۔ آسان سے آتی ہوئی تھوڑی بہت روشنی میں انہیں پختہ اینٹوں کا بنا زینہ دکھائی دے گیا تھا۔

دونوں بغیر آواز پیدا کیے، اسے طے کرنے لگے۔ زینہ زیادہ طویل نہ تھا۔ جلد ہی دونوں اوپر پہنچ گئے تو اگلے ہاتھ پر ایک کمرے سے ہلکی روشنی آتی دکھائی دی۔ دونوں اسی طرف کو بڑھ گئے۔ دروازے کو ہولے سے اندر دھکیلا تو دونوں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئے۔

سامنے ایک فضیلی جسامت شخص کھڑا تھا۔ وہ عمر میں ان سے بڑا تھا۔ قد مختصنا، رنگ سانولا اور سر گنجا۔ شائل کو اگرچہ علی ریحان اور شاہ زمان پہلی بار دیکھ رہے تھے، تاہم اس کا ناک نقشہ سمجھا دیا گیا تھا جو خاصا نمایاں تھا۔ اسی سبب وہ اسے جلد پہچان گئے۔ شائل جیسے عام شکل و صورت ادھیڑ عمر آدمی کے ہاں اس دراز قامت حسین خاتون کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی، تاہم انہیں بھلا اس معاملے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

شائل نے پہلے مسکرا کر ان سے اپنا تعارف کروا دیا اور پھر انہیں لیے پٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بتی جلادی تھی۔ شائل ایک خوش باش اور پر غلوص شخص ثابت ہوا تھا۔

”سب کچھ ٹھیک تو رہا ہے نا.....؟ میرا مطلب ہے کوئی مگڑب.....؟“ اس نے دونوں کے چہروں پر باری باری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا اور علی ریحان نے اسے ”مگڑب“ کے

بھی کیا سوچنے لگا۔“

”تمہاری بات غور طلب اور اہم ہے..... لیکن ابھی چند گھنٹوں بعد کی صورت حال دیکھ لیتے ہیں.....“ شائل نے علی ریحان کی بات کے جواب میں کہا۔ ”تم دونوں بھی ابھی جھٹکے ہوئے ہو گے۔ کچھ کھانسی کر آرام کرو..... میرے گھر کا یہ اوپری حصہ گودام کے لیے مخصوص ہے۔ فقط یہ کمرائیں نے کل ہی تم دونوں کے لیے صاف کر دیا تھا..... اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو تم دونوں کو جگا دوں گا۔“

شائل کی بات پر علی اور زمان نے کچھ خاص طمانیت کا اظہار نہیں کیا تو ایسے میں اریہ ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالتے ہوئے شائل کی طرف دیکھ کر بولی۔

”میرا خیال ہے انہیں اب اس کمرے کے بجائے..... نیچے تہ خانے میں ٹھہرا دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

اریہ کو بھی اس دوران شائل نے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ باقی وہ سب پہلے ہی سے جانتی تھی۔ ”یہاں تہ خانے تو گھر گھر بنے ہوئے ہیں..... سب سے پہلے اسی کی تلاش لی جائے گی۔“ شائل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”علاشی گودام کمرے کی بھی ہو سکتی ہے مگر اس کی باری بعد میں آئے گی تب تک حالات اور موقع مناسبت سے ہمیں بچاؤ کے لیے مہلت مل جائے گی۔“

اس کی بات پر اریہ نے اپنے سر کو تھپی جنبش دی تھی۔ علی ریحان اور شاہ زمان کو بھی اس تنہید کے بعد، جو کم از کم کسی تادیل کے زمرے میں نہیں آتی تھی، کہیں جا کر تسلی ہوئی تھی۔ تب ہی اریہ کی مترنم سی آواز ابھری۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر یہ سب اگلے چند گھنٹوں میں ظاہر ہو جائے گا اور ہمیں ابھی سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”یقیناً۔“ شائل نے اپنا سر ہلایا۔

”ہم بھی زیادہ دیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہ سکتے۔“ علی ریحان بولا۔ ”کیونکہ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمیں مقررہ وقت پر اپنا مشن بر صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ لہذا اس کے لیے ہم چند گھنٹے آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پر شدید ٹھکن اور نیند کا غلبہ طاری ہے۔“

شائل اور اریہ اس کی بات سمجھ چکے تھے۔ دونوں کو آرام کرنے کا موقع دیا گیا جبکہ شائل اور اریہ نے نیچے آگئے۔ شائل کچھ فکر مند نظر آنے لگا تو اریہ نے قدرے ملامت سے پوچھا۔ ”تم کچھ پریشان دکھائی دینے لگے ہو؟“

”آں..... ہاں! کچھ خاص تو نہیں بس یہی سوچ

اور جھرمبرے رنگ روپ آدمی کے پاس یہ اپسر مثل کا کیا کام تھا؟ کیا یہ اس کی دوسری بیوی تھی؟ یا مہاراجا کے کسی اعلیٰ افسر نے کسی بات پر خوش ہو کر شائل کو یہ پری دیش کنیز کے طور پر ”دان“ کر دی تھی۔

وہ بڑے سلیقے سے ان کے سامنے اور شائل کے ساتھ ہائیکس سیٹ کر بیٹھ گئی تو شاہ زمان اس کے گدرائے ہوئے سکوڑے سے وجود میں جیسے کھوسا گیا۔ عورت نے بھی شاہ زمان کی نظروں کی دلچسپی کو شاید بھانپ لیا تھا، اسی سبب وہ بھی یہ ظاہر ایک نظر پر غائر اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی تھی۔

”یہ اریہ ہے.....“

معا شاہ زمان کو شائل کی آواز نے چونکا دیا اور اسے اپنے اس قدر کھوجانے پر خیالت کا احساس ہوا تھا۔

”یہ میرے ساتھ رہتی ہے، میری بہترین مددگار اور ساتھی ہے.....“ شائل نے اس کا مختصر اور قدرے ادھورا ادھورا سا تعارف کرایا۔ شاید وہ اس سے آگے کچھ بتانے سے محذور رہا تھا، اسی سبب اس نے قہالی ان کے قریب ہر کا دی۔ ”لو..... قبوہ قبوہ۔ اریہ قبوہ بہت اچھا اور خوش ذائقہ بناتی ہے۔“

علی ریحان اور شاہ زمان نے پیالیوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ سب سے آخر میں شائل اور پھر اریہ نے پیالی اٹھالی۔

”کیا ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں.....؟“ علی نے ایک نظر اریہ پر ڈالتے ہوئے شائل کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس کر بولا۔

”میں نے بتایا..... اریہ میری بہترین ساتھی اور مددگار ہے۔ قابلِ بھروسہ تو یہ ہے ہی..... مگر ذہن بھی بہت ہے۔ میں اکثر بعض اہم مسائل میں اس سے مشورے کرتا ہوں اور مجھے کبھی بھی اس کے مشوروں نے نقصان نہیں پہنچایا ہے، بلکہ فائدہ ہی ہوا ہے۔“

”اچھی بات ہے.....“ علی ریحان نے اختصار سے کہا۔ زمان پیالی منہ سے لگائے اریہ کے چہرے کو تنکے جا رہا تھا۔ اریہ نے ایک نگاہ پھر اس پر ڈالی تھی۔ دونوں کی بھری تال میل نے..... جیسے خانہ دل کے کسی چور گوشوں میں امیدوں کے تنکے بجا ڈالے.....

”میرے ساتھ رہتی ہے..... بہترین ساتھی..... مددگار..... کیا مطلب ہوا اس کا.....؟“ شاہ زمان نے شائل کے الفاظ پر غور کیا۔ ”کیا یہ اس کی رکھیل ہے.....؟ اف! میں

کر لیں گے۔“ اس کی بات سن کر ہشام کا چہرہ اچانک کھل اٹھا۔ جیسے اس کے اندر کی کوئی ابھرنی دھڑکتی ہوئی ہو۔ دور ہونے لگی ہو، تاہم اس کے بولنے سے پہلے ہی جیسے ارہبہ نے کسی اچانک خیال کے تحت اس سے کہا۔

رہا ہوں کہ اگر ان کا ریاست میں داخلہ راز میں رہتا تو باقی کا کام ہمارے لیے بھی آسان رہتا۔ لیکن ان کی بد قسمتی کہ یہ دونوں پوری بنالین کو اپنے پیچھے لگا آئے ہیں، اس طرح اب ہم بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“.....

تھی۔ شامل اس وقت اپنی گاڑی میں تیندو پتوں کے گھنٹھڑا دے پاس کے کسی علاقے میں فروخت کرنے جا رہا تھا اور راستے میں اریہ اسے بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی، جو کسی طرح سے راہزنوں کے چنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور پیدل گرتی پڑتی ایک جگہ بے دم ہو کر گر پڑی تھی۔

شامل اسے اٹھالایا تھا۔ اس کی اپنی بیوی کا بھی انہی دنوں انتقال ہوا تھا۔ شامل پہلے تو اس کے پاس ایک کنیز کی حیثیت سے رہنے لگی، اس کے بعد داشتہ بن گئی۔ تاہم اریہ کا خیال تھا کہ وہ اس سے شادی کر لے گا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ شامل کو اپنی ”حقیقت“ بتانے کے بعد وہ اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔ اسے جلد ہی اس کڑوی حقیقت کا ادراک ہو چلا تھا کہ شامل محض اپنی دل بستی اور تنہائیاں دور کرنے کی خاطر ہی اسے اٹھالایا تھا۔ سو وہ بھی کہاں جانی، اس کے ساتھ وقت کاٹنے لگی اور وہ اسے شادی کے لیے بہلاتا رہا۔

اسی اثنا میں اریہ چائے لے آئی۔ ایک پیالہ اس نے اپنے سامنے رکھا اور دوسرا شامل کے سامنے سرکا دیا۔
”تو تم بالآخر ان دنوں کو پکڑ دانے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہو.....؟“ اریہ نے چائے کا گھونٹ بھر کر اس سے کہا۔
”اب بھلا اس میں شک کی کیا گنجائش رہ گئی ہے کہ تم پہلے ہی میرے چہرے سے میرے اندر کا احوال پڑھ چکی تھیں۔“ شامل نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے بھی چائے کا ایک گھونٹ بھر۔ تب اچانک ہی شامل نے اریہ کے چہرے پر ہنس، آنکھوں سے بھی ایک عجیب سا تاثر محسوس کیا۔ وہ پیالے سے چائے کی ہلکی چسکیاں بھرتے ہوئے شامل کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ادھر اوپری منزل کے گودام والے کمرے میں علی ریحان تو بے چارہ زمین پر پڑتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا تھا مگر شاہ زمان کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اس کی وجہ اریہ تھی۔ اس کا حسین و پرکشش چہرہ اس کی چشم تصور میں ہی نہیں بلکہ داغ میں بھی گھر گھر گیا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر اریہ کون تھی؟ اس کی حقیقت کیا تھی اور وہ شامل جیسے ادھیر عمر آدمی کے پاس کیوں اور کس حیثیت سے رہ رہی تھی؟ جبکہ شامل نے اس کے متعلق زیادہ تفصیل بتانے سے بھی گریز کیا تھا۔ کیا وجہ تھی اس کی؟ محض سامعہ کہا تھا اریہ کو اپنا..... پھر کچھ دیر بعد اسے بھی نیند نے آلیا۔ آنکھ کھلنے

مجھے نہیں لگتا کہ ہم اس مشکل صورت حال سے پھر بھی نکل پائیں گے اور اس طرح تمہارا جو بھی بچا کچھا کاروبار ہے وہ تو ملیامیٹ ہو گا ہی، ساتھ میں ہم بھی بے موت مارے جائیں گے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ان دونوں کی خبری کرتے ہوئے مہاراجا سے ہماری انعام وصول کر لیا جائے۔“

اریہ کی اس بات پر شامل نے چونکنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ کمرے کی دھبی روشنی میں اریہ کا حسین چہرہ کسی ناگہن کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ تب ہی شامل کے چہرے پر بھی کمرہ کی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ایسے میں دونوں ہی کے چہرے بھی ایک منظر پیش کرنے لگے۔

”اریہ! سچ پوچھو تو تم نے جیسے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے۔ میں تو اسی وقت سے یہی سوچنے لگا تھا جب ان دنوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ریاست کے اندران دنوں جاسوس کو پکڑوانے والے کے لیے مہاراجا چند گپتاتے ہماری انعام رکھا ہے۔“

”میں چائے بنا کر بھی آتی ہوں.....“ اریہ نے اچانک کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ شامل سہانے خوابوں میں کھویا رہا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر کیا تھا کہ اریہ سے زیادہ بحث نہیں کرنی پڑی تھی۔ بلکہ اس نے خود ہی کہہ ڈالا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح سوچ رہی ہے۔ ورنہ اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے اس کی بات بری نہ لگے۔ بری لگتی بھی تو، اس کا دل بھی شامل پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ وہ اسے ٹھکانے لگانے پر تنبیہ کی سے غور کرنے کا بھی ارادہ کر چکا تھا۔ اب وہ شکر کر رہا تھا کہ جلد ہی بھی اچھا ہی ہوا کہ اریہ پہلے ہی اس کی ہم خیال رہی تھی اور وہ اریہ جیسی حسین عورت کو دل کر کے اس سے محروم ہونے سے بچ گیا تھا۔ وہ عرصے سے اس کی دل بستی کا سامان پیدا کیے ہوئے تھی۔

درحقیقت اریہ اسے ایک تباہ حال اور لٹے پٹے قافلے سے ملی تھی۔ وہ ایک ہمالیائی ریاست رتی گڑھ کی رہنے والی تھی۔ وہاں ہیضہ پھیل گیا تھا جو آن کی آن میں ایک وبائی مرض کی طرح عفریت کی صورت اختیار کر گیا تھا اور اس نے تیزی سے رتی گڑھ کے باشندوں کو لگنا شروع کر دیا تھا اور لوگ اس علاقے سے کوچ کرنے لگے۔ راستے میں انہیں راہزنوں نے گھیر لیا۔ چند ہی لوگوں نے ادھر ادھر بھاگ کر اپنی جانیں بچائی تھیں، ان میں اریہ بھی تھی مگر اس کی اپنی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ راہزنوں کے سردار اور اس کے چند قریبی ساتھیوں نے جہاں قافلے کی دیگر عورتوں کو اپنی شیطانی بربریت اور ہوس کا نشانہ بنایا تھا، وہاں اریہ بھی نہیں بچ سکی

بھرتے ہوئے دکھائی دیے۔

یہ سارا منظر آنکھوں کو بہت بھلا محسوس ہوتا تھا لیکن شوکی کے لیے ان دلفریب مناظر میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ ریٹا کا اس کے ساتھ بدستور رویہ ایسا ہی تھا جیسے کسی مصور نے اس حسین منظر سے درخت، پرندے، آبشار، نوک قلم سے مٹا ڈالے ہوں اور صرف خشک اور بنجر پہاڑیوں کا ردھکا پھیکا لیڈ اسکپ باقی رہ گیا ہو۔۔۔

”تم ایک بہادر انسان ہو۔۔۔ لیکن مجھے برادر ابرٹ کا تم سے ناز بیارویہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ گارشیا سامنے اپنی نگاہیں گاڑتے ہوئے بولی، جہاں آبشار کی موٹی دھار بلندی سے گرنے کے سبب منقسم ہو کے شادری کی طرح ٹھہرے ہوئے۔۔۔ تالاب کے صاف و شفاف پانی کی سطح پر عجیب سا جلیز تک بجائی ہوئی گری رہی تھی۔

شوکی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ آگے بولی۔ ”حالانکہ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر تم اپنی جان خطرے میں ڈال کر گریزیل پر حملہ آور نہ ہوتے تو وہ بھائی کی بے وفائی کے باعث ہم سب کے لیے مصیبت بن جاتا۔“

”آپ لوگوں کی حفاظت اور تحفظ کرنا میرا فرض ہے۔“ شوکی نے اس بار مختصر جواب دیا۔

”میرا تو اس تالاب میں نہانے کو دل کر رہا ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ چانک جیسے گارشیا نے روئے سخن موڑا تو شوکی نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میرا تو ایسا کوئی موڑ نہیں ہو رہا ہے لیکن مس گارشیا! میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ تالاب کی گہرائی کا اندازہ کے بغیر آپ کو اس میں نہانا نہیں چاہیے۔“

”آئی ڈنٹ کئیر۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تیرا آتا ہے۔

یونیورسٹی میں پہرا کی کے مقابلوں میں اگر پہلے نہیں تو دوسرے تیسرے نمبر پر تو ضرور آتی تھی۔ کیا تم شادری سے نابلد ہو؟“

”آئی ہے مجھے بھی۔۔۔۔۔“ شوکی نے مختصر جواب دیا۔

گارشیا اپنی شرٹ کی ”گائڈ“ کھولنے لگی۔ شوکی منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا اور بخجید کی سے بولا۔

”آپ نہا کر جب فارغ ہو جائیں تو مجھے آواز دے دیجیے گا مگر پلیز! دیر مت لگائیے گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کو بڑھ گیا۔ اسے عقب سے گارشیا کی ٹھکتی ہوئی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔

ایسے ہی وقت میں جب شوکی ایک گوشے کی جانب بڑھ رہا تھا، اسے اپنے عقب میں زوردار پھپکا کے کی آواز سنائی دی۔ وہ غیر ارادی طور پر رک کر پلٹا تو اسے گارشیا تالاب کے

سے پہلے وہ بھی دعا مانگ رہا تھا کہ انہیں چند گھنٹے ہی سہی کچھ نیند لینے کا موقع مل جائے تاکہ اپنے اصل مشن کی انجام دہی کے لیے وہ نئے سرے سے خود کو تازہ دم محسوس کر سکیں۔ کیونکہ موجودہ حالات میں اس امر کا احتمال تھا کہ تلاشی کے سلسلے میں انہیں دوبارہ اور کہیں جلد نہ جاگنا پڑ جائے۔

چانک اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ کھڑکی سے روشنی اندر آرہی تھی۔ اس نے گردن کھما کر اپنے ساتھی ہلی ریحان کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ شاہ زمان کو چانک کسی اور کی موجودگی کا بھی احساس ہوا اور تب ہی اس کی نظر دروازے پر پڑی اور وہ چونک گیا۔

☆☆☆

گارشیا اس کے آگے چل رہی تھی اور شوکی اس کے عقب میں چند قدموں کے فاصلے پر بے دلی سے چلا آ رہا تھا۔ جلد ہی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی دور جانے لگی تھی۔ اس نے فوراً آواز دی۔

”مس گارشیا! زیادہ آگے مت جائیں۔۔۔۔۔“ وہ رک گئی اور اس کی جانب پلٹی۔ تب تک شوکی بھی اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ بھی رک گیا۔ گارشیا اس کی طرف مسکرا کے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوکے۔۔۔۔۔! تمہارا حکم ماننی ہوں لیکن پلیز۔۔۔۔۔ تھوڑا سا اور آگے تک چلو نا۔۔۔۔۔ اس طرف میں نے ایک بہت خوبصورت پہاڑی جھرنادیکھا تھا۔ اس سے آگے نہیں جاؤں گی پروس۔۔۔۔۔“ مجبوراً شوکی ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

گارشیا اسے گہری گہری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی پلٹی اور قدم بڑھا دیے۔ ایک چٹائی گھرے سے وہ نیچے اترنے لگی۔ شوکی نے اس کا سر میں سباز دھماک لیا تو گارشیا حلان اترنے کے بہانے اس کے ساتھ لگ گئی۔ شوکی نے اسے دھیرے سے پرے کیا اور وہ نیچے اتر آئے۔ وہ اس سے

الگ ہو گیا۔ اب ان کے سروں پر گرگڑھی اور سامنے ایک قدرتی آبشار چھاڑی نالے سے بہتی ہوئی نیچے برساتی تالاب پر گر رہی تھی۔ دونوں تالاب کے کنارے پر تھے۔ ان کے

چہرہ اطراف سریشک چوٹیاں تھیں جہاں سفید بادلوں کی غلوٹیاں اٹکی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اوپر کھلا آسمان صبح کی زورور روشنی سے صاف اور نہر نظر آتا تھا۔ وادی میں مختلف انواع پرندے اپنے خوش رنگ پنک پھیلانے کو پرواز

تھے۔ بارانی تالاب کے دوسرے کنارے پر چھتار سے درخت، ڈھلان پر عمودی سمت چلے گئے تھے۔ جہاں مخنی جھاڑیوں کی بہتات نظر آتی تھی، وہاں انہیں، ہرن فلاںچیں

”بب..... بجاؤ..... بجاؤ.....“ مگر مجھ.....
شوکی ایک دم گھبرا گیا اور اٹھ کر تالاب کی طرف
دوڑا کیا دیکھتا ہے گارشا زوردار چھپا کے مار رہی تھی، کبھی
اٹ رہی تھی اور کبھی پلٹ رہی تھی۔ بادی انظر میں یہی معلوم
ہوتا تھا جیسے پانی کے اندر بچھی کسی شے سے نبرد آزما ہونے کی
کوشش میں ہو۔ شوکی نے یک دم اپنی داہنی ٹانگ کی پنڈلی
سے بندھی میاں سے قرو لی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی اور پکڑوں
سمیت تالاب میں جا کودا۔ وہ تیزی سے تیرتا ہوا، تڑپتی بلکتی
گارشا کے سر پر جا پہنچا تو گارشا اپنا ترپنا چھوڑ کر اس کے ساتھ
پلٹ گئی..... اس کی اس حرکت پر پہلے تو شوکی
گھبرا سا مگر اس کا ڈراما سمجھتے ہی وہ اس سے جان چھڑانے
کی کوشش کرنے لگا۔

”مت کرو ایسا..... پلیز.....! فارمائی سیک..... کیوں
دور بھاگتے ہو مجھ سے.....“ گارشا حلاوت بھرے جذبات
سے بھرپور لہجہ میں بولی۔ شدت جذبات سے اس کی
آواز بھی حلق سے الگ الگ کر برآمد ہو رہی تھی۔ گارشا کا نیم
عریاں سیم تن وجود اس کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ اس نے شوکی کے
گلے کے گرد داہنی برہنہ سر میں ہاتھوں کا ہارسا پھنکا رکھا تھا۔ وہ
اپنے سلگتے، لب اس کے گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر ثبت
کر دینا چاہتی تھی۔

”میں..... میں کیا رہتا ہے کم حسین ہوں.....“ وہ
جذبات کی شدت تلے نہ بے جا رہی تھی، کہے جا رہی تھی۔
”مجھے ذرا ایک نظر بھر کے دیکھو تو..... بہت آتش
مزاج ہوں میں..... بھڑکانے کی ماہر اور..... اس سنہری
موقتے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے بے وقوف.....! میں تم
سے بہت محبت کرتی ہوں..... رہتا میرے مقابلے میں
کیا ہے بھلا.....“

جب اس کی لن ترانیاں اور دست درازیاں حد سے
تجاوڑ کرنے لگیں تو شوکی کو مجبوراً اسے ہوش دلانے کے لیے اس
کے منہ پر اپنے ایک ہاتھ پکڑ کر ناپڑا اگروہ ہوس زادی
پھر بھی باز نہ آئی، بیکے بیکے بخور سے لہجہ میں بولی۔

”آہ..... بیٹھ سی..... بیٹھ سی..... اور..... مارو
مجھے..... عشق میں ایسی اذیت میرے جذبات کو مزید دواستھ
کر دیتی ہے۔“

اب تو شوکت بری طرح شیشا مارا اور اسے لپٹائے
ہوئے ہی تیرتا ہوا کنارے پر آگیا اور باہر نکل آیا۔ گارشا بھی
پانی سے نکل آئی تھی۔ اس کا تو یہ شکن نیم عریاں بدن پانی کے
بلوریں قطرے سے شرابور بری طرح بھیگ رہا تھا۔ شوکی رہی

کھلے پانیوں میں گردن تک ڈوبی اکھیلیاں کرتی نظر آئی۔
کنارے پر اس کا لباس بکھرا پڑا تھا۔ اسی وقت گارشیانے
ایک چلبلی سی چیخ بلند کی، جو اس پٹائی وادی کی سنگناخ بلند یوں
میں ”اکیساؤنڈ“ پیدا کرتی دیر تک گونجتی ہوئی عجیب
ساتاثر پیش کرتی رہی۔

”تم آن شوکی! تم بھی آجاؤ..... بہت مزہ آ رہا
ہے.....“ کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ بھی اس کی طرف
دیکھتے ہوئے بلا دیا۔ شوکی نے سر جھٹک دیا اور پلٹا۔

”دیکھو..... دیکھو..... زیادہ دور مت جانا.....“ یہ کہتے
ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ شوکی فحالت سی محسوس کرنے
لگا اور ایک قریبی ابھرے ہوئے پتھر پر نکلنے کے انداز
میں بیٹھ گیا۔ گارشا کی شوخ و شنگ ہیرا کی جاری تھی۔ وہ کسی
جل پری کی طرح تیرتی ہوئی اور پہاڑی تالے سے
آبشار کی صورت کرنے والے پانی کے نیچے آگئی اور
گویا ”شادو“ لینے لگی۔

شوکی اس کی طرف گامے بہ گامے ایک اچھتی سی
نگاہ ڈال لیتا تھا اور پھر رہینا کے خیالوں میں
کھوکھو جاتا۔ ایسے میں اسے گارشا کے زہر میں بچھے ہوئے
الفاظ بھی یاد آنے لگے تھے۔

”رہنا کا خیال بھی اپنے دل سے نکال پھینکو..... وہ
برادر رابرٹ کے ساتھ انوالو ہو چکی ہے جبکہ رابرٹ کو تو تم
جانتے ہی ہو۔“

گارشیانے اپنے بھائی رابرٹ اور رہینا کے حوالے سے
یہ بھی بتایا تھا کہ وہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے
کو پسند کرتے چلے آ رہے تھے۔

”یہ نہیں ہو سکتا.....“ دفعتاً ہی جانے کس رقیبانہ جذبے
تلے اس کے دل کی بات لبوں پر آگئی۔ وہ گارشا کی اس بات
کی نفی کرتے ہوئے بولا۔

”گارشیانے ضرور مجھ سے ایسا جموٹ کہا ہے۔ وہ
رہینا سے جیلنس ہو رہی ہے اور میرا اس سے دل خراب
کرنے کے لیے ایسی بکواس کر رہی ہے۔ رہینا اور رابرٹ
قریبی رشتے دار ہیں اور بس.....“ اس نے اپنے دل بے
قرار کو مل دینی چاہی۔

ادھر آبشار تلے نہاتی ہوئی گارشیانے اس کی طرف
دیکھا، کچھ سوچتی رہی۔ اس کے بعد وہ کسی جل پری کی طرح
تیرتی ہوئی تالاب کے قدرے کنارے آگئی اور پھر نہانے
اسے کیا ہوا کہ وہ ایک دم چیخنے چلانے لگی۔ شوکی خیالات سے
چونک پڑا۔

کر ہوئے سے کھٹا کر اسے کسی قسم کی بد مزگی نہ پھیلانے کی وارننگ دی تھی، اس کا جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی درمیان میں بول پڑے۔

”رابرٹ! مائنڈ پور لیگو توج..... دیش انف ناؤ..... اب میں تمہیں باقاعدہ وارن کرتا ہوں کہ تم قطعاً کسی سے نہیں الجھو گے۔“ انہیں بھی غصہ آ گیا تھا۔ ”جب شوکی نے میرے سامنے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ گارشا کو میں نے ہی اس کے ساتھ بھیجا تھا تو بات ختم ہو جاتی ہے۔“

”انکل! گارشا یہی ہے، وہ شوکی کو نہیں جانتی.....“

رابرٹ سے شوکی کے خلاف زہرا رکھتے نہیں بن رہی تھی۔

”تم کیا جانتے ہو شوکی کو.....“ پروفیسر ہنری اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولے۔ انہیں بھی شاید رابرٹ کی ڈھٹائی اور شوکی سے بلا وجہ کی جلن اور کج روی پر غصہ آ گیا تھا، اسی سبب جیسے وہ خود اس کی وکالت کرنے کی ٹھان چکے تھے۔

”یہی جانتے ہوتا تم اس کے بارے میں کہ..... اس نے ایک بار رینا کی جان بچائی، دوسری بار تمہاری اپنی ضد نے تمہیں اس پاگل گھوڑی (مارگریت) کے ہتھے چڑھا دیا اور تب بھی مسٹر شوکی آگے آئے اور اب یہاں گزشتہ شب کو جو تمہاری اپنی یہ دقونی ہے، ہم سب ایک خوفناک حادثے کا شکار ہوتے ہوئے بچے تھے، وہاں بھی یہی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس خطرناک اور دیوانہ دندنے پر کود پڑا تھا۔ بولو..... کیا یہی جانتے ہوتا..... تم..... یا اور کچھ جانتے ہو تو آج ہمیں وہ بھی بتا دو.....“

پروفیسر ہنری برنارڈ طباً ایک سلبے ہوئے اور با اصول انسان تھے۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھنے کے عادی تھے اور کسی کے معاملے میں ناگ ایڑانا پسند نہیں کرتے تھے نہ ہی اپنے کسی معاملے میں کسی کی دخل اندازی انہیں پسند تھی۔ ان کی نظروں میں سچ ہمیشہ سچ ہی ہوتا تھا اور جھوٹ صرف جھوٹ، چاہے سامنے والا کسی بھی ملک یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو..... وہ اگر کسی غلطی پر ہوتا تو وہ اسے بری طرح ٹوک دیا کرتے تھے حلیم طبع تو وہ تھے ہی مگر اس سے زیادہ وہ قدر شناس بھی تھے۔ اگر اس وقت ان کے سامنے رابرٹ کی جگہ ان کا اپنا افسردہ دوست جنرل مائیکل شا بھی ہوتا تب بھی پروفیسر ہنری اس پر شوکی کی سچائی کو ہی ترجیح دیتے، یہ تو پھر رابرٹ تھا۔

بہر کیف..... رابرٹ کو ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی تھی۔ شوکی کے لیے اپنے باپ کریم بخش کی تربیت کام آ رہی

سے بولا۔

”اٹا لباس پہن لو اور جلد نکل چلو..... ورنہ میں تمہارے انکل ہنری برنارڈ سے شکایت کر دوں گا.....“

شوکی اس سے یہ کہتا ہوا..... اس کی طرف سے منہ پھیر کر چند قدم دور جا کے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد گارشا بھی لباس پہنے اس کے سامنے آ گئی۔

”سوری.....! میں شاید تمہاری محبت میں زیادہ بہک گئی تھی..... سو سوری.....“ وہ اس سے ندامت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

”ٹھیک ہے..... اب واپس چلو.....“

دووں پتھر لیے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چٹائی دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے پڑاؤ کی جانب بڑھنے لگے۔

جب پڑاؤ پر پہنچے تو شوکی کی جتنی نظروں نے دیکھا کہ رابرٹ اور رینا بھی ہتھ پتھیں کرتے ہوئے ایک طرف سے چلے آ رہے تھے۔ رابرٹ کا ایک ہاتھ رینا کی شانگل گل جیسی کمرے کے دروازے کے آگے اور رینا انکل اس کے ساتھ لگی چلی آ رہی تھی۔ ایسے میں رینا اور شوکی کی نظریں ایک لمحے کو چار ہوئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی رینا کے ہلکے کھلاتے چہرے پر ایک دم سنجیدگی طاری ہو گئی تھی جبکہ رابرٹ کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ رینا کو جھوڑ کر اس کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھا۔ اسی وقت پروفیسر ہنری کے ہوئے سے کھٹکارنے کی آواز ابھری۔ رابرٹ اس ”کاشن“ کو سمجھ کر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے ایک غصیلی نظر شوکی پر ڈالتے ہوئے اپنی بہن گارشا سے بولا۔

”تم اس کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟“

”اٹ اٹان آف پور بڑس برادر.....!“ گارشا نے بڑی رکھائی سے بھائی کو جواب دیا تھا۔ ”آئی ایم ہینین ابو (میں اٹھارہ سے اوپر کی ہوں) تم مجھ پر کوئی حکم نہیں چلا سکتے۔“

اس کی بات پر رابرٹ دانت نہیں کر رہا تھا لیکن شوکی نے کچھ سوچ کر رابرٹ سے کہا۔

”مس گارشا کا صبح کی سیر کرنے کا جی چاہ رہا تھا۔ یہ اکیلی ہی جاری تھیں لیکن انکل ہنری نے مجھے بھی ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔“

”یو شٹ اپ.....! میں نے تم سے بات نہیں کی ہے۔“ رابرٹ کو جیسے شوکی پر بولنے کا موقع ملا..... ”تم.....“ وہ غصے سے پھر کر شوکی سے اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پروفیسر ہنری جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے ہی رابرٹ کے تئوڑ کچھ

بہترین تحریریں، لا جواب رد وادار
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ
کراچی

شمارہ دسمبر 2017ء
کی جھلکیاں

عمر خیام

خیاتنیم بگرامی کے قلم سے اس شخصیت کا
احوال جسے سائنسی علوم پر دسترس تھا لیکن
دنیا والے اسے شاعر سمجھتے رہے

مصنفہ

تنویر ریاض لائے ایک معروف قلم کار کا زندگی نامہ

جنرل کا فرار

سیلاحتشاک کی تلاش، ایک ایسے جنرل کا احوال
جسے دشمنوں نے محاذ جنگ سے گرفتار کیا تھا

رسم سال نو

وسیم بن اشرف کی دلچسپ تحریر، دنیا بھر
میں سال نو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے

محبت گزیدہ

زیو ابا جاز کی ایک دلچسپ مگر انوکھی سچ بیانی
جس میں انتہائی انوکھی سزا تجویز ہوئی تھی

رنگ آسمان

بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ
سچے تھے اور تاریخی واقعات

فی۔ اس کا باپ ہمیشہ اسے یہی نصیحت کرتا تھا کہ اگر اس کے
من میں کوئی دوسرا بول رہا ہو تو اسے اپنی زبان بندی رہتی
ہا ہے۔ وہ یہی کہے ہوئے تھا۔ ادھر رابرٹ بری طرح زچ
ہو کر واپس اپنے خیمے کی جانب پلٹنے لگا تو پروفیسر ہنری نے
اسے پکارا۔

”ہے بڑی! ٹھہر جاؤ۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا اور اس کی جانب
مڑا۔ پروفیسر ہنری بھی جیسے آج معاملہ صاف ہی کرنے کے
میں موڈ میں نظر آتا تھا۔ اس سے متانت سے بولا۔

”اب یہ سب ختم ہو جانا چاہیے۔ میں آئندہ تمہیں شوکی
سے تو کیا کسی سے بھی لکھتا ہوں نہ دیکھوں۔۔۔۔۔ بصورت
دیکھ میں تمہیں واپس لوٹ جانے کا پروانہ جاری کر دوں
گا۔ اس کا رداں کا اس وقت میں سالار ہوں اور تم اس وقت
جنرل مائیکل شا کے بھتیجے نہیں بلکہ میرے قافلے کے ایک رکن
ہو۔۔۔۔۔ اسے اب آخری وارنگ سمجھنا۔“

رابرٹ کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ جس شخص
کو وہ دو ٹوکے کا نوکر کہہ کر پکارتا تھا، آج اسی کے سامنے اس کی
عزت و کوڑی کی کردی گئی تھی۔ بلا وجہ کی مخالفت اور حسد نے
بالآخر رابرٹ کو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں رسوا کر ڈالا تھا۔

”اوکے۔۔۔۔۔ فی!“ رابرٹ چڑے ہوئے منہ سے بولا۔
پروفیسر ہنری بھی آج سارا ادھارا تار نے کی تیاری میں تھے،
فوراً سنجیدگی سے بہ دستور اس کی طرف سخت نظروں سے
گھورتے ہوئے بولے۔

”نوا، از ناٹ فی۔۔۔۔۔ ایڈنا نارینی فینینی، جسٹ
رسپانسیبلٹی۔۔۔۔۔“

رابرٹ نے اپنے سر پر آڑے انداز میں جے ہوئے
بیٹ کو چھو اور پلٹ گیا۔ ریٹا وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے
چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات ہو رہے تھے۔ شوکی نے اس
کی طرف ایک وز دیدہ سی نظر ڈالی۔ ریٹا بھی اپنا بچلا ہونٹ
دانتوں کی اوپر کی قنارے تلے دبائے اس کی جانب تلے جارہی
تھی اور پھر اس سے ایک دم ہی نگاہیں پھیر کر پلٹ گئی۔ وہ
رابرٹ کے پیچھے جارہی تھی۔

پروفیسر ہنری نے کوچ کے احکامات صادر کر دیے۔
موسم خاصا خوشگوار ہو چلا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی اور
اس میں ایک خوشگواریت کا احساس تھا۔ بچے اور درور۔۔۔۔۔ ان
دادیوں کی بلندیوں اور ترائیوں میں قدرتی صفا کی کے
شاہکار وجود میں آنے لگے تھے۔ چمن پرند سب ہی اپنی اپنی
مستیوں میں بچو خرام پر داز تھے۔ ان کی گونج وادی میں عجیب
سا تاثر ابھارتی محسوس ہوتی تھی۔

پروفیسر ہنری برنارڈ کے ”اعلانے“ کے مطابق اب شوکی کی حیثیت اس مہمانی ٹیم کے نائب سالار کی تھی۔

ڈارنور امجد خان سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایک بھاری جسم کا ٹھٹھا سا پیش کھ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھدری سی ڈاڑھی تھی اور عریس کے قریبی بھی۔ اس نے گھٹنے تک شارٹس اور اوپر ٹیکس والی شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ پیردوں میں مضبوط سول کے جوتے پہنے ہوتے تھے۔ پڑاؤ سمیٹنے کی تیاری یہ چاروں کر رہے تھے۔ نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا سامان وغیرہ سمیٹ رہے تھے۔ بانی لوگ بھی اپنا اپنا ضروری سامان ایڈوجرکٹس میں منتقل کرنے میں مصروف تھے۔

”اس کا ڈوبوائے کی اولاد رابرٹ سے محتاط رہنا شوکی!“

خیسے اکھاڑنے کے دوران ڈارنور امجد خان نے پنچی آواز میں شوکی کو متنبہ کیا۔ ”میں اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے عناد اور بغض دیکھ رہا ہوں۔“

”تم نے یہ آج دیکھا ہے، میں یہ سب روائی سے بہت پہلے دیکھ چکا ہوں۔“ شوکی نے پتھر کی زمین سے ایک بڑے زہور کے ذریعے میخ اکھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ..... تو اس کا مطلب ہے معاملہ پرانا ہے۔“ امجد خان نے بھوئیں کیٹھ لیں۔

”ویسے میں نے روائی کے وقت سے ہی یہ بات محسوس تو کر لی تھی بلکہ مجھے یہ فرنگی زادہ ابتداء سے ہی ایک متعصب اور مغرور شخص لگا تھا کیونکہ میرے اور نندو بابا، اس کی بیوی شانتا کے ساتھ بھی اس کا رویہ متعصبانہ تھا مگر تمہارے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی.....“ وہ اکھڑے ہوئے خیسے کو لپیٹتے ہوئے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ”ویسے تم نے اس مغرور فرنگی زادے کو اچھا سبق سکھایا۔ بڑی سکی محسوس کر رہا تھا یہ اپنی، جب پروفیسر صاحب اسے ڈانٹ پلا رہے تھے۔“

”ذلت و رسوائی ایسوں کا مقدر ہوتی ہے دوست!“ شوکی نے کہا۔ ”یہ سب کٹس میں لپیٹ لو، میں ڈرانندو بابا اور شانتا کی مدد کو جاتا ہوں۔“

”ایک بات سنو.....“ امجد خان نے اس سے کہا۔ وہ رک گیا۔ ”تمہیں کچھ معلوم ہے یہ یہ پاگل سکی پروفیسر آخراں پر خطرہ مہم پر کس مقصد کے لیے نکلا ہے؟“

”کیا تمہیں نہیں معلوم.....؟“ شوکی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بھوئیں اچکا کیں۔

”ہمیں تو یہی پتا ہے کہ یہ کوو شمائیہ کے اطراف میں بسنے والے بعض قبائل پر ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔“

”مجھے بھی یہی پتا ہے۔“ شوکی نے جواب دیا۔ ”لیکن نندو بابا اور شانتا کا خیال اس بارے میں کچھ اور ہے۔“ یہ بتاتے ہوئے امجد خان نے اپنی آواز بھی کر لی تھی۔ ”اچھا ایک ایسی پراسرار سا ہو گیا تھا۔ شوکی بہ تاثر سے لہجے میں بولا۔

”کیا کہتے ہیں دونوں.....؟“

”تمہیں شاید اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو رہنے دو، کیا بتاؤں.....“ امجد بولا۔ شوکی بھی خاموش رہا۔

ایک گھنٹے بعد یہ لوگ اپنی مکمل تیاری کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ پروفیسر ہنری نے ان سب سے خطاب ہو کر کہا۔

”پہلے میرا ارادہ تھا کہ تاگرہ تک ریل کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ میں نے یہاں قیام کے دوران دیکھا ہے کہ پورے دن میں ایک بار سانسے والی ریلوے لائن سے دد ریل کاریں گزرتی ہیں، ایک آنے والی اور دوسری جانے والی۔“

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس ریلوے لائن کی طرف اشارہ کیا جو سیدھے ہاتھ کی طرف والی پہاڑی سرنگ سے نکل کر قوس کی صورت میں تاگرہ کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں انہوں نے دھانی انجن والی ایک ریل کار کو بھی گزرتے دیکھا تھا۔

”اگرچہ اس ریل کی آمد کا وقت ہوا چاہتا ہے، لیکن اس علاقے کا نقشہ دیکھنے کے بعد میں نے اپنا ریل کاریں روائی کا ارادہ بدل ڈالا ہے۔ کیونکہ نقشے کے مطابق تاگرہ، جو ہماری منزل ہے اس سے لمحوہ دیگر دور یا تیس پانچ پور اور تربال کے جنوب مشرق والے چوہدہ کی جانب، لگ بھگ پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قبیلہ راکاشی ہے۔ لہذا اب ہم باقی کا پیدل سفر اسی سمت جاری رکھیں گے۔“

”گفتا شک..... یہی بہتر رہے گا ہنری انکل!“ گاراشیا نے کلکاری مارتے ہوئے کہا۔

”میں بھی پاپا کے اس خیال سے متفق ہوں.....“

پروفیسر ہنری کی لاڈلی بیٹی رینا نے بھی اپنی کزن گاراشیا کی تائید میں خوش ہو کر کہا۔ ”اس طرح ہمیں مشرق کی اس پراسرار زمین کے نیپرل حسن کو قریب سے دیکھنے اور اس سے لطف اندوز ہوتے رہنے کا بھی موقع ملتا رہے گا۔“

”بالکل ٹھیک..... ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں ہنری

”تم مجھے اس کی فتوریت سے آگاہ کرنا چاہ رہی تھیں۔“ شاہ زمان نے اس کی دکھ بھری داستان میں دلچسپی لیے بغیر کہا تو وہ ایک گہرا سانس کھینچ کر بولی۔

”یہ آدی تمہیں انعام کے لالچ میں پکڑوانا چاہتا تھا کیونکہ تم دونوں اس کے لیے درہم برہم چلے تھے۔ میں اس کی نیت بھانپ چکی تھی۔ اسے مزید بھولنے کے لیے میں نے اسے اپنی نیت ظاہر کرنے کا موقع دیا اور یوں وہ مجھے بھی اپنا ہم خیال سمجھ بیٹھا اور اپنا راز دل مجھ پر عیاں کر دیا۔“

”پھر تم نے اسے جانے میں زبردستی کر مار ڈالا؟“ شاہ زمان نے اس کے دلکش مگر مغموں سے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشکیک کے سائے ہلکے لہرے لہرے تھے۔

”ہاں!“

”تمہیں ہم سے بھلا کس جذبے کے تحت ہمدردی ہو گئی تھی؟“ زمان کی بات پر اریبہ کے لبوں کی گدازیت پر بھیدوں بھرا ارتعاش سا تھا۔ کیا۔ کونوں سے کھینچی ہوئی کشادہ اور گھمیری پلکوں کے مہین سائے تلے اس کی چشم آہوں میں تو سقز جیسے رنگے لیے خستہ و ناخستہ جذبات کی شمع طلب فردزاں ہوئی۔ وہ انہی نگاہوں سے چند ثانیوں تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ہولے ہولے بولی۔

”مجھے واقعی تم دونوں کے مقاصد یا مشن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن جہاں معاملہ داری اور وعدے و وعید طے پا جائیں تو اس کے خلاف کسی بھی بات پر میرا ضمیر مجھے جھنجھوٹا۔ ڈالتا ہے۔ دھوکا، بکرا دفریب سے مجھے سخت نفرت ہے۔ جب شائل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی ذاتی جذبے کے بغیر محض دولت کے لالچ میں تم لوگوں کے لیے خبری کر رہا ہے اور اب اسی طمع کی خاطر وہ تمہیں دھوکے سے مروانا چاہتا ہے تو میرے ضمیر نے مجھے اسے ایسا کرنے سے روکنے پر مجبور کر ڈالا۔“

”تم اسے سمجھا بھی تو سکتی تھیں؟“ زمان شاید ابھی تک اس پر بھروسہ کرنے سے اجتناب برتتے ہوئے تھا۔

”میں ایسا کرتی تو وہ مجھے بھی پیسوں کے لالچ میں تمہارا ساتھی بنا کر بھروسہ کراتا تھا۔“

تب ہی اچانک شاہ زمان کسی شکاری بازی کی طرح قریب کھڑی نازک اندام اریبہ پر جھپٹ پڑا اور اس کے گھنے بالوں کو اپنی ٹٹھی میں جکڑ لیا۔ اریبہ کے لبوں سے ہلکی سی سسکاری خارج ہو گئی لیکن اس میں کسی درد اور تکلیف کا ذرا بھی شائبہ معلوم نہیں ہوتا تھا نہ ہی شاہ زمان کے اس

اکھل! رابرٹ نے اپنے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھتے اور ٹانگیں پھیلاتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔
”ویل! تو چلو پھرا بجائے۔۔۔۔۔ کرو۔۔۔۔۔“ پروفیسر ہنری برنارڈ سکرا کے بولا اور پھر یہ لوگ روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

جھپٹ کے ایک کونے پر بننے ایک چھوٹے سے سلاخ دار روشن دان سے روشنی اندر آرہی تھی۔ اسی روشنی میں شاہ زمان نے دروازے پر اریبہ کو کھڑے دیکھا تھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ شاہ زمان کو اس کے یوں خاموش خاموش سا دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہونا بہت عجیب سا لگا تھا۔ اسی سبب اس کے دھڑکتے دل کی رفتار ایک کی تیز ہو گئی تھی۔

”ت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ خیریت تو ہے نا۔۔۔۔۔؟“ اس نے اٹکتے لہجے میں، بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔ اس کے برابر میں فرش پر بستر پر علی ریحان ہنوز بے سدھ سو رہا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔۔“ اریبہ نے سیاٹ لہجے میں اس سے کہا۔ زمان اٹھ کر اسی طرح ایک تک اس کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے قریب پہنچا تو وہ پٹلی اور زینے اترنے لگی۔ زمان بھی حیران پریشان سا اس کے پیچھے چل پڑا۔

نیچے کمرے میں پہنچا تو اسے ایک حیرت آمیز تشویش کا زبردست جھکا لگا۔ سامنے قائلین پر دو دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک تو سیدھا پڑا تھا، جبکہ دوسرا الٹا دھرا تھا۔ اس کے پاس ہی اس نے شائل کو بے ڈھنگے انداز میں بے سدھ پڑے پایا۔ اس طرح کہ اس کی سیاہ رو باجھوں سے خون کی ایک سرخ لکیر، قطروں کی صورت بہہ کر قائلین میں جذب ہو رہی تھی۔ یہ عجیب اور دہشت ناک منظر دیکھ کر شاہ زمان جیسا آدی بھی ہر تپا خوف سے جھرجھرا گیا۔

”کی۔۔۔۔۔ یہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ کس نے ہلاک کیا اسے؟“
”میں نے۔۔۔۔۔“ اریبہ نے قریب کھڑے زمان سے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں نے اسے چائے میں زہر دیا تھا۔“
”مگر کیوں۔۔۔۔۔؟“

”میں اس کی فتوریت سے آگاہ ہو چکی تھی۔“ وہ بولی۔ ”یہ ذیل شخص نے ظاہر تو لوگوں کی نظر میں میرا محسن کہلاتا تھا لیکن درحقیقت یہ بدطینت شخص میری مجبوریوں اور مجھ سے۔۔۔۔۔ کھلتا رہا۔ شادی کے جھانے میں مجھے گناہ کی پوٹ بنانا پڑا اور اپنی نوکرائی۔“

”اتنی دیر گزر جانے کے باوجود تم نے شامل کی لاش کو ادھر ہی پڑے رہنے دیا یا تک..... جبکہ تم کہتی ہو کہ سیاسی بھی یہاں تلاشی لینے آئے تھے..... کیا لاش دیکھ کر وہ چونکے نہیں؟ جبکہ اوپر ہم بھی بے خبر سو رہے تھے۔ ایسا کیسے ممکن ہو گیا کہ یہ لاش اور ہم ان کی نظروں سے بچ رہے؟“

”اسی لاش نے تو تمہیں بچایا ہے،“ اریہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”جیسے ہی ڈونڈی پٹی گئی اور تمام لوگوں کو اپنے اپنے گھروں میں محبوس رہنے کا حکم دیا گیا تو میں اپنے بال کھولے بین کرتی ہوئی باہر گئی میں آگئی اور ان سے کہا کہ میرے گھر میں ٹوکنی ہوگئی ہے تو مجھے ڈرا دھماکا کر داپس بھیج دیا گیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا مگر میں پھر بھی گھر کی چوکت پر بیٹھی بین کرتی رہی اور جب اس گھر کی تلاشی کی باری آئی تو شخص ایک شخص کو اندر بھیجا گیا جو شامل کی لاش کو دیکھ کر ہی واپس پلٹ گیا تھا۔ میں دہائیاں دینے لگی تو..... باہر موجود سپاہی بیزار ہو کے مجھ سے جان پھڑا کے چلتے بنے۔“

”اسے چھوڑ دو شاہ زمان.....! یہ سچ بول رہی ہے.....“ فقط باہر زینے کی طرف جانے والے دروازے کی تاریکی سی چوکت سے علی ریحان کی آواز ابھری۔ دن کی روشنی وہاں مقدور بھر رہی تھی وہاں سے علی ریحان نمودار ہوا۔ اس کی بھی آنکھ زمان کے جاگنے کے ٹھوڑی دیر بعد ہی کھل گئی تھی اور وہ کب سے تاریکی سی چوکت پر کھڑا ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے قریب آگیا تھا۔

”میں نے خود اوپر سے نیچے جھانک کر دیکھا ہے، باہر گئی میں..... مہاراجا کے سپاہی گردش کر رہے ہیں.....“

زمان نے ایک گہری ہکاری خارج کرتے ہوئے اریہ کو چھوڑ دیا۔ اس کی مٹی سے اریہ کے گھنے ریشمی بال نکلے اور اریہ کی سبک کندنی پشت پر بکھر گئے۔ اس نے سر کھما کر مضبوط اور کسرتی جسم کے حامل زمان کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھا تھا اس کے چہرے پر ناراضگی یا برہمی کے ذرا بھی آثار نہ تھے۔

”اریہ بہن! اگر تمہاری بات سچ ہے تو یقین کر دو ہم تمہارا یہ احسان ساری زندگی فراموش نہیں کریں گے۔“ علی ریحان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے ملاعت بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب ان خندود حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم ہماری کیا مدد کر سکتی ہو؟“

علی ریحان کے منہ سے ”بہن“ کا لفظ سن کر اریہ ایک

طرح اچانک جھپٹ پڑنے پر اریہ کے حسن چہرے پر کسی قسم کے خوف کی پرچھائیں تک کے آثار ابھرتے نظر آئے تھے۔ وہ سرتاپا خود پھر دکی کی تفسیر بنی ہوئی تھی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گا..... سچ بتاؤ..... کون ہوتا اور ہمارے ساتھ کیا چکر چلا رہی ہو.....؟“ شاہ زمان نے شیرجی غراہٹ سے کہا۔

”تمہارے پیچھے اور کون کون لوگ ہیں؟“

دوسرا لمحہ شاہ زمان کے لیے حیرت کا سبب بنا جب اس کے جواب میں اریہ نے ایک ٹھنکتی ہنسی اپنے حلق سے خارج کی تھی۔ اس ہنسی میں لاچارگی اور مایوسی کا عنصر غالب تھا۔ اس نے زمان کی آہنی گرفت سے خود کو چھڑانے کے لیے ذرا بھی حرکت نہ کی تھی، انداز خود پھر دکی جوں کا توں برقرار رہا تھا۔ بلکہ اریہ زمان کے تقریباً ساتھ ہی لگ چکی تھی۔ شاہ زمان کو اس کے بھرے بھرے بدن کی گدازیت صاف محسوس ہو رہی تھی۔

”میرے سوال کا جواب دو..... تم نے شامل کی قاتل کس مقصد کے لیے کیا؟ وہ ہمارا قاتل ہے بھروسہ مآثر تھا۔“

”قاتل بھروسہ..... ہونہ.....“ جواب میں اریہ نے زہریلے طنز سے کہا۔ ”جس کو تم قاتل بھروسہ کہہ رہے ہو وہ تم دونوں کی موت کا سامان کرنے والا تھا۔ حیرت ہے..... تم جیسے لوگ بھی یہ نہیں جان سکتے کہ دولت کے لالچ میں غبری کرنے والا تمہارے ساتھ کس قدر سچا ہو سکتا ہے؟“ اس کی بات نے شاہ زمان کو واقعی لا جواب سا کر دیا۔ تاہم بولا۔

”اسی دولت کے لالچ میں تم بھی تو ہمیں مہاراجا کے سپاہیوں کے حوالے کر سکتی ہو۔“

”اگر ایسا ہوتا تو اب تک تم دونوں کی لاشیں سچ چور ہے پر جمو لٹی ہوئی نظر آ رہی ہوتیں..... کیونکہ جس وقت تم دونوں نے خیرا در بے سدھ سو رہے تھے، مہاراجا کے سپاہی اور فرنگی فوجی گھر گھر کی تلاشی لیتے ہوئے یہاں تک بھی آن پہنچے تھے..... لیکن میں نے بڑی صفائی سے تمہیں بچا لیا تھا۔“

”کیا ثبوت ہے اس بات کا.....؟“

”وہ سانسے دیکھو، کھڑکی کے پار..... چپکتی دھوپ دیکھو..... سورج نکلا ہوا ہے، کوئی دم کو سہ پہر ہونے والی ہے..... اور تم دونوں صبح سوئے تھے۔ جبکہ یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ سویرا ہونے سے پہلے ہی تم لوگوں کی ڈھنڈا چہاروا تک پڑ چکی تھی۔“ اریہ کی اس دوسری دلیل نے بھی شاہ زمان کو لا جواب کر دیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں بڑی سرعت کے ساتھ ایک خیال چکا۔

وم آبدیدہ سی ہو گئی۔

”اور اگر اس نے ہمیں دولت کے لالچ میں گرفتار کرنا ہوتا تو اب تک ہم مہاراجا کے شاہی قید خانے میں ہوتے۔“ علی نے کہا۔

”یہی ٹھوس دلیل مجھے الجھائے ہوئے ہے۔“ کہتے ہوئے زمان نے اپنے ہونٹ میسج لیے تھے، علی نے اس کے کاندر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

”جو ہوگا دیکھا جائے گا..... آؤ اوپر چلتے ہیں۔ اپنے ہتھیار سنبھالیں، ہمیں چوکس رہنے کی ضرورت ہے بس۔“
دوؤں دوست زینے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ سب پیدل ناگرہ کی جانب گامزن تھے۔ گاڑیوں اور خچروں سے محرومی کے بعد اب انہیں سفر کی تکنیک کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ بالخصوص ”صاحب“ لوگوں کو..... نوکر تو بے چارے یوں بھی پیدل ہی تھے جو خچروں کی رسی تھامے ہوئے تھے مگر اب ان سے محرومی کے بعد تو ”صاحب لوگ“ بھی پیدل سفر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نوکروں کا خیال تھا کہ اب بس پروفیسر، ہنری بھی اس دھوار گزار سفر کے سامنے ہتھیار ڈال کر وہاں ہی کاہل بجاویں گے، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ ان سب سے زیادہ چاق و چوبند وہی تھے۔ انہوں نے خاکی رنگ کی پیٹن شرٹ پہن رکھی تھی سر پر ہیٹ تھا۔ اپنی شرٹ پر انہوں نے بھی کیلیس لگا رکھے تھے۔ بائپ مشین میں دیا ہوا تھا اور وہ کسی دفاعی انجن کی طرح جیسے تھکے مارے ڈبوں کو کھینچ رہے تھے۔

ان کے ساتھ گرم جوشی میں فقط دو ہی افراد حصہ دار بنے ہوئے تھے۔ ایک شوکت اور دوسری گارشیا۔ اگرچہ رینا اور رابرٹ بھی کم جوش کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے، مگر اب ان اونچے اونچے پتھریلے راستوں پر توان وولوں کی بھی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ یوں بھی پیدل سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹا بیت چکا تھا۔

”انگل ہنری! میرا خیال ہے آپ کاریل کار کو چھوڑ کر پیدل سفر کرنے کا فیصلہ درست نہ تھا۔“

بالآخر ایک جگہ بے دم ہو کر بیٹھ جانے والے رابرٹ نے کہا۔ اس کی دیکھا دیکھی سب ٹھہر گئے تھے۔ بلکہ جسے جہاں جگہ ملی وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔ ناچار پروفیسر ہنری کو بھی رکنہڑا۔

”ہمیں راکشی کی طرف پیدل نکلنے کے بجائے ریل میں ناگہر پہنچنا چاہیے تھا۔ پھر وہاں سے نخجروں اور گھوڑوں کا بندوبست کرنے کے بعد راکشی عازم

”کیا ہوا بہن! کیا سیری کوئی بات بری لگی تھیں؟“
 ”نہیں بھائی!“ اریہہ اپنی اڈھھی کے ایک کونے سے
 اپنی ستارہ آنکھوں کے غمناک گوشے پونچھتے ہوئے بولی۔
 ”آپ کے بہن کہنے پر مجھے اپنا بھائی کیویا اڈھ کیا تھا۔ وہ بے
 چارہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“ اور جب ہی اریہہ نے اپنی دکھ
 بھری کٹھا بھی ستاڑ لی۔ اس کے بعد بولی۔

”آپ دونوں آرام سے بیٹھ جائیں..... اور مجھے
تھوڑا وقت دیں.....“ اریبہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”خطرہ اب
بھی پوری طرح سے ٹلا نہیں ہے..... باہر کی گلی اور چوراہوں
پر مہاراجا اور انگریز سرکار کے سپاہی گشت کر رہے ہیں اور مجھے
معلوم ہے کہ وہ دوبارہ بھی کسی مشتبہ نظر آنے والے مکان میں
جا سکتے ہیں۔ میں سودا سلف کے بہانے ذرا باہر نکل کر حال
معلوم کر کے آتی ہوں.....“

علی ریحان نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلادیا۔ قائلین پر دھری پڑی شمل کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اریبہ بولی۔

”اس لاش کا ابھی اصرہ ہی پڑے رہنا مناسب ہو گا۔
کرنی کی کیفیت ختم ہونے والی ہے۔ لوگ میرے سحر کا رخ
کریں گے اور ازارائے ہمدردی میری مدد کرنا چاہیں گے۔
میں چاہتی ہوں یہ ڈراما ای طرح اپنے انجام کو پہنچ جائے۔“
”تم باہر جا کر کیا دیکھنا چاہتی ہو.....؟“ زمان نے
سوال کیا۔ اریہ نے دلفریب سی مسکراہٹ اس کے چہرے
پر ڈالی اور بولی۔

”وہی کچھ جوا بھی بتا چکی ہوں.....“

وہ چلی گئی اور باہر سے مکان کو تالا لگا گئی۔

”اس کے آنے سے پہلے پہلے ہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے..... ورنہ ہم جو بے دان میں پھنس جائیں گے۔“

اریبہ کے جاتے ہی زمان نے علی سے کہا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں شاید ابھی اس بے چاری پر اعتبار نہیں آتا۔۔۔۔۔“

”دولت کی چمک اچھے بھلوں کو اندھا کر دیتی ہے۔“ زمان گہری متانت سے بولا۔

”جو عورت ایک جیتے جاتے شخص کو اس طرح ہلاک کر سکتی ہے اور پھر بڑی چالاکی سے باقی معاملات پر قابو پانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، وہ کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی علی!“ اس نے کچھ دیر تو وقف پھر کیا۔

سفر ہونا چاہیے تھا۔“

بد ظاہر رابرٹ کی بات سب کو مقتول لگی تھی۔ اس میں شوکی بھی شامل تھا مگر وہ کچھ بولائیں تھا البتہ اس کی تائید میں مگارشیا اور دنیا پیش پیش تھیں۔

”ہاں! یہ خیال میرے دل میں بھی آیا تھا۔“
 پروفیسر ہنری نے رک کر ان کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن..... میں بتا چکا ہوں کہ نقشوں کا جائزہ لینے کے دوران مجھے ایک قریبی قبیلہ راکاشی کا انکشاف ہوا۔ یہ بے حد عجیب و غریب قبیلہ ہے۔ اس کے رہن کو قریب سے دیکھنے کا موقع بہت کم مہم جوؤں کو ملا ہے۔ میرے ایک غائر جائزے کے مطابق ہم اس قبیلہ کا ”دوڑت“ کرنے والے دوسرے یا تیسرے مہم جو ہوں گے۔“

”ان کے رہن بہن میں ایسا کیا ہے پاپا تھوڑی تفصیل بتائیں گے ان کے بارے میں.....؟“ زینا نے پروفیسر ہنری کی طرف دیکھا۔ اس کی بلوریں سی نیلی آنکھوں میں تجسس ہو رہا تھا۔

”سچ پوچھو تو مجھے اسی قبیلے کی تلاش تھی۔“ پروفیسر ہنری گویا اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید بولے۔ شوکی نے دیکھا وہ خامسے پر جوش نظر آرہے تھے۔

”میں اس قبیلے کے نام سے تو واقف نہ تھا تاہم میری ریسرچ کے مطابق انہی پر اسرار اوصاف کا حامل ایک قبیلہ یہاں کو شمالیہ کے اطراف میں مذکورہ تینوں ریاستوں کے چودہ کے شمال مشرق میں موجود ہے۔ اب خدا کرے کہ یہی وہ قبیلہ ہو جس کا نام مجھے راکاشی معلوم ہوا ہے۔“

”پراسرار قبیلے سے آپ کی کیا مراد ہے بالکل ہنری؟“
 مگارشیا نے سوال کیا۔ وہ اپنی پشت سے موٹی سی ایڈوینچر کٹ اتار کر اسی پر تک کر بیٹھ گئی تھی۔

پروفیسر ہنری نے پاپا کا کش لگایا اور بولے۔
 ”پراسراریت مشرق کا حسن ہے۔ اسے کسی اور معنی میں نہ لیا جائے۔“

”کیا اس قبیلے تک کاراستہ ہمیں معلوم ہے اور یہ کتنی دور ہے؟“ مگارشیا نے سوال کیا۔

”چند سو کوس کی مسافت مزید طے کرنے کے بعد ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔“ پروفیسر ہنری بولے۔ ”ناگرہ جانے سے ہمارا بہت سادقت برباد ہو جاتا۔ اگرچہ ہمارا نہیں کیس ناگرہ ہی ہے۔ راکاشی کے بعد ہی ہم ناگرہ کا رخ کریں گے۔“
 شوکی کو اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے زینا کو دیکھتا جاتا جو رابرٹ کے قریب ایک پہاڑی

پتھر پر بیٹھی تھی۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد یہ لوگ پھر روانہ ہو گئے۔ سہ پہر تک یہ لوگ ایک چٹانی دڑے سے گزر کر پیالہ نما وادی میں پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر ہو چلی تھی۔ سورج کوہ شمالیہ کی مغربی چوٹیوں کی طرف جھٹکتے لگا تھا۔ وہاں انہیں ترانیوں میں ایک آبادی کے آثار نظر آئے، بے ترتیب قطاروں میں بسنے کھیریل کی مخروطی چھتوں والے جمونہڑے کچھ دیگر اشیا کے بھراؤ کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب لوگ رک کر پہنچ دیکھنے لگے۔ پروفیسر ہنری کے چہرے پر پہلے تو چند ثانیے جوش کے تاثرات اٹھتے دکھائی دیے تھے اس کے بعد وہ کسی الجھن میں مبتلا نظر آنے لگے۔ زینا نے پوچھا۔

”پاپا! ہم شاید اپنی منزل تک پہنچ چکے ہیں۔“
 ”نیں مائی بے بی! آج آدھ سب لوگ..... لیکن ذرا دھیان سے اترنا۔“ پروفیسر ہنری نے کہا اور یہ سب لوگ پروفیسر ہنری کی ہدایت کے مطابق ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک چھن کی صورت ڈھلان طے کرنے لگے اور بالآخر آبادی میں داخل ہو گئے۔

وہ لوگ ایک جگہ رک گئے۔ سب نے اپنا اپنا مختصر سامان پشت سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور حیرت و عجیب نظروں سے سامنے کھیریل کی مخروطی چھتوں والے جمونہڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔ پروفیسر ہنری کی آنکھوں میں الجھن نمایاں تھی۔

”انکل! یہاں تو کوئی نظر نہیں آرہا.....؟“ مگارشیا نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ہو سکتا ہے یہ لوگ سو رہے ہوں۔“ رابرٹ نے کہا۔
 ”قبائلی لوگ سرشام ہی سو جایا کرتے ہیں۔“

”گڈ، بڈی! اتم نے بالکل ٹھیک کہا۔“ پروفیسر ہنری مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”لیکن ہمیں آگے بڑھ کر دیکھنا پڑے گا۔ قدم بڑھاؤ میرے ساتھ..... اور سامان ادھر ہی رہنے دو۔“

یہ لوگ اور آگے بڑھے۔ ہر کوئی ایک جمونہڑے کی طرف بڑھا مگر حقیقت یہی تھی جو تقریباً سب نے ہی محسوس کی تھی کہ یہاں آبادی کے آثار تو نظر آتے تھے لیکن انسانوں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

”یہ تو کوئی ویران بستی ہے۔ کوئی ذی نفس تک موجود نہیں۔ نہ انسان نہ کوئی جانور.....“ رابرٹ حیرت سے بولا تھا۔

چالاک نوکر

مالک نے مزاح کے طور پر نوکر کی ڈبوٹی لگائی کہ وہ ساری رات گھوڑے کی مالش کرے۔ نوکر نے گھوڑا فروخت کر دیا اور اس کی جگہ ایک خرگوش باندھ دیا۔ صبح مالک آیا تو گھوڑا غائب تھا۔ مالک نے غصے سے پوچھا: ”گھوڑا کہاں ہے؟“ نوکر نے خرگوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہ بندھا ہوا ہے۔ دراصل میں ساری رات گھوڑے کی مالش کرتا رہا۔ اب یہ گھس گھس کر اتنا ہی رہ گیا ہے۔“ مالک اس سے بھی کایاں تھا بولا: ”چلو۔ چھوڑو جو وہاں ہوا ہے آج پوری رات تم میری کاری مالش کرو گے۔“

کاش

ایڈیٹر، افسانہ نگار نے: ”آپ بہت خوبصورت کہانیاں لکھتے ہیں۔“ افسانہ نگار: ”کاش اسی قسم کا کوئی تعریفی جملہ میں بھی آپ کے بارے میں کہہ سکتا۔“ ایڈیٹر: ”ضرور کہہ سکتے ہیں بشرطیکہ آپ بھی میری طرح جھوٹ بولنے کے عادی ہوں۔“

عملی مظاہرہ

ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدوار کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا: ”آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا کام جانتے ہیں؟“ امیدوار: ”تفادق کرنا۔“ انٹرویو کرنے والے نے پوچھا: ”کیا آپ اس کا عملی مظاہرہ کرنا پسند کریں گے؟“ امیدوار نے: ”کیوں نہیں؟“ امیدوار نے کہا اور دفتر سے باہر آکر لائن لگا کر بیٹھنے والے دیگر امیدواروں سے کہا: ”آپ سب حضرات جاسکتے ہیں کیونکہ میرا انتخاب کر لیا گیا ہے۔“

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

انہیں سارے جھونپڑے خالی ملے تھے۔ اندر سامان بکھرا پڑا تھا۔ ایک عجیب اور پراسراری ویرانی بکھری ہوئی تھی چہارسو.....!

”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ راتوں میں کام سے نکلتے ہوں.....“ گارشیا نے خیال ظاہر کیا تو رابرٹ بولا۔

”ڈیم اس.....! کیا فضول بکواس ہے سسٹر! کیا تم نے غور نہیں کیا؟ ان جھونپڑوں اور اس بستی کی حالت زار بتا رہی ہے کہ یہاں اب کوئی نہیں رہتا۔“

گارشیا نے بھائی کی بات پر منہ سنا لیا اور اسی لمحے میں بولی: ”تمہارا کیا خیال ہے ان کے جھونپڑوں میں انٹر کنڈیشنز ہوگا، دیکھتے ہوں گے؟ باہر گاڑیاں پارک ہوں گی اور اندر ریشم و کم خواب کے بستر لگے ہوں گے؟“

گارشیا کی بات پر سبس دیے تھے۔ ”یہ قبائلی لوگ اسی طرح رہتے ہیں۔ جیسے یہاں ہل ہر کے مہمان ہوں۔“

”تم نے ٹھیک کہا نیو ڈارنگ! لیکن یہاں آثار کچھ ایسا بتا رہے ہیں کہ یہ لوگ بستی چھوڑ کر چاہتے ہیں۔“ پروفیسر ہنری بولے۔

”کیا ہم راکاش قبیلے میں موجود ہیں پاپا؟“ رینا نے باپ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں! میرا خیال ہے ہم اپنی پہلی منزل پر کھڑے ہیں..... یہاں ہمیں ایک آدھ دن خیمہ زن ہونا پڑے گا۔“ ہنری بولا۔ ”تاگرہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ سامنے والی پہاڑی کے پیچھے تاگرہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ دوسری منزل ہماری وہیں ہوگی جدرہم کچھ دن آرام سے قیام کریں گے اور سونری ٹھکانا اتاریں گے۔ اس کے بعد اگلی منزل کی طرف روانگی ممکن ہوگی جبکہ یہاں میں اپنا تحقیقی کام آج ہی سے شروع کر دیتا ہوں۔ کچھ کھانا لیا جائے، اس کے بعد بستی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔“

خیمے گاڑے جانے لگے۔ شوکی سمیت سارے ملازم بڑی تندی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس ویران بستی کے وسط میں انہوں نے رہائش اختیار کر لی تھی۔

زوارہ جو بھی تھا، وہ آج رات کا ہی بیجا تھا یا تھوڑا بہت تک مچ کام آجاتا۔ الاؤ روشن کدیا گیا تھا کیونکہ اسی دوران سورج چٹائی افق پر سرخیاں پھیلاتا ہوا دوسری جانب لڑھک چکا تھا۔ اب دور سنگلاخ افق پر سناٹے دار تاریکیاں اترنے لگی تھیں۔ فضا کی رکی سی محسوس ہوتی تھی۔ ٹھنڈ بڑھنے لگی تھی۔ اوپر کھلے آسمان پر تارے چمکنے لگے تھے اور چاند دور

اجداد اور شوکی ہنوز جاگ رہے تھے اور الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔
”یہ خبیثی پروفیسر کم سب کو کسی مصیبت میں ڈال کر ہی دم لے گا۔“ حسب سابق امجد نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

”اچھا! وہ کیسے؟“ شوکی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
”تو اور کیا..... اب دیکھو بھلا..... اس ڈراؤنی اور ویران بستی میں خیمہ زن ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ چند سوکوس کے فاصلے پر ہی تو ناگرہ تھا، وہیں چل کر قیام کر لیا جاتا۔ اب ساری رات ڈرڈر کر گزرے گی، نیند کیا خاک آئے گی۔“
ایک ذرا توقف کے بعد وہ ہراس پھیلانے والی عورتوں کی طرح دوبارہ بولا۔

”مجھے تو لگتا ہے اس بستی میں کوئی خوفناک عفریت آتا ہے، جس نے بستی کے سارے لوگوں کو ہڑپ کر ڈالا ہے۔ اب رات کے کسی سے وہ ہمیں بھی نہیں چھوڑے گا۔“
شوکی اس کی بات پر ہنسا اور بولا۔
”ہمارے پاس ہتھیار ہیں۔ کوئی عفریت آیا تو ہم اسے گولی بار دیں گے۔“

”سچ کہوں تو یہاں کسی آسیب کا بئیرا ہے۔ کسی بدروح کا آسیب.....“ وہ پھر ہوا دینے والے لہجے میں بولا۔
”تم جا کر سو جاؤ..... ورنہ ڈراؤنے خواب آئیں گے جنہیں.....“ شوکی نے اسے شورہ دیا۔

”نیند تو آ رہی ہے مجھے..... پر یہ بتاؤ کہ تم جاگ رہے ہو نا.....؟ کسی ایک کو تو جاگتے رہنا چاہیے۔“ وہ بولا۔

”ہاں! میں جاگ رہا ہوں..... تم جا کر سو جاؤ۔“
شوکی بولا۔ اس کی نظریں سامنے والے خیمے کی جانب اٹھ گئیں۔ وہاں سے رینا، گارشا اور رابرٹ کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ امجد تو اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا جبکہ شوکی وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا دل جانے کیوں نامعلوم سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ پروفیسر ہنری کے خیمے کی جتنی بھی جھجک تھی۔ سردی بڑھنے لگی تو شوکی بھی اپنے خیمے کی طرف سونے کی غرض سے اٹھا مگر دوسرے ہی لمحے اچانک ٹھنک کر رکا۔ اس نے دیکھا خیمے سے رابرٹ اور رینا ہنستے ہوئے نمودار ہوئے تھے۔ وہ دونوں خالی اور ویران جھوپڑوں سے آگے تارکی میں کہیں جا رہے تھے۔ شوکی نے انہیں آواز دی۔ وہ دونوں رک گئے۔

شوکی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ رابرٹ اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
”آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے ان

کہیں جھکا ہوا تھا مگر اس کی ضوٹشانیوں کے آثار دھیرے دھیرے نمودار ہونے لگے تھے۔ موسم کی مناسبت سے انہوں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان میں موٹی شالیں اور جیکٹوں کے علاوہ ادنی ٹوپیاں بھی تھیں۔ رینا، گارشا اور رابرٹ نے گرم جریاں پہن لی تھیں۔ سلپنگ بیگ تیار کر لیے گئے تھے۔ نندو بابا اور شانتا اپنے بارہنوں کے فرائض میں مشغول ہو چکے تھے اور ذرا دیر بعد ہلکے ہلکے طعام کا دور چلنے والا تھا۔ خوراک کے خشک ڈبے، دودھ اور شکار کیے ہوئے چھوٹے موٹے پہاڑی جانوروں کا گوشت باقی بچا ہوا تھا۔ اسے ہی آگ پر بھوننا جارہا تھا۔ مڑا آلود چاول بتائے گئے تھے۔

کھانے سے یہ لوگ فارغ ہوئے تو پروفیسر ہنری کے پاس جا پہنچے۔ شوکی اور امجد بھی ساتھ تھے۔ جبکہ نندو بابا اور شانتا الاؤ پر اب کافی بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ لوگ سب الاؤ کے گرد آ بیٹھے۔ چہار سو کا عالم تھا۔ ویران بستی خالی بن کر عجیب اور ہراساں منظر پیش کر رہی تھی۔ ہر دور کا گھٹا جنگل پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا اور وہاں سے اب کسی جانور وغیرہ کے بولنے کی آوازیں آنا تقریباً مفقود ہو چکی تھیں۔

ذرا دیر میں نندو اور شانتا نے الاؤ کے گرد بیٹھے افراد کے ہاتھوں میں کافی کے گم تھا دیے۔ مگر اگر مڑا دھواں اڑاتی کافی کے گم تھماتے ہی انہیں ایک عجیب سی خوشگواریت کا احساس ہوا۔ سب آپس میں باتیں کرتے ہوئے، مزے لے لے کر اس کی چسکیاں بھرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد ہر کسی نے اپنے خیموں کا رخ کیا۔ شوکی کی نظریں رینا اور رابرٹ پر لگی ہوئی تھیں۔

طباقت جاندا بھر کر آکاش پر کسی مادہ نواری کے تلک کی طرح پوری تب و تاب کے ساتھ دھکنے لگا تھا۔ بستی پر ویرانی مسلط تھی۔ بغیر کینڈوں کے اس بستی کا خالی پن دلوں میں انجانے سے خوف کا تاثر بھی پیش کر رہا تھا۔ تاہم یہ لوگ یہاں ایک عجیب طرح کا سکون بھی محسوس کر رہے تھے۔ پروفیسر ہنری نے صبح ہوتے ہی ناگرہ کوچ کرنے کا پروگرام محفوظ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے خیمے میں آکر چھوٹی سی فولڈنگ ٹیبل اور کرسی پر بیٹھ کچھ کھینے پڑھنے میں محو ہو گئے تھے۔ تاہم انہوں نے ہر کسی کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کوئی بھی کیمپ سے دور جانے کی کوشش نہ کرے۔ نندو اور شانتا خیموں میں جاتے ہی سو گئے تھے۔ دونوں فوجی بھی تھکے ہوئے تھے اور لیتے ہی نیند کی وادیوں میں چلے گئے تھے۔ رینا، گارشا اور رابرٹ اپنے خیمے میں کھے بیٹھے باتوں میں معروف تھے جبکہ ذرا نیور

ہندوؤں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”شوکت میاں! رینا کا خیال اپنے دل سے نکال دو..... بھلا ایک غلام اور ملک کا کراچی؟..... ہمارے بھائی رینا کو تم

”کس ریتا! آپ کے پاپا نے یہاں سے دور کہیں
ہانے کے لیے سختی سے منع کر رکھا ہے۔“ اس کے لہجے میں
مددہارانسی خنیدگی تھی۔ وہ ان کے سامنے اپنے دونوں پاؤں
کھیلانے پورے قدم سے کھڑا تھا۔

”تم کون ہوتے ہو ہمیں کہیں آنے جانے سے روکنے والے.....“ زابرٹ ہنکارا تو ریتانے رابرٹ کو ٹوک دیا۔
 ”رابرٹ! بلیئر، تم خاموش رہو.....“ پھر وہ شوکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے..... وہ دیکھ رہے ہو.....“ اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سمت انگلی سے اشارہ کیا۔ ”وہ جگہ بڑی دفریب چاندنی میں نہاکی ہوئی ہے۔ بس تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد لوٹ آئیں گے..... پلیز مسٹر شوکی!“

ریتا کے کہنے کے انداز نے شوکی کو ڈھاسا دیا۔ ابھی وہ کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ گارشیا اندر سے نمودار ہوئی تو ریتا حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ارے! تم جاگ رہی ہو؟ تو سمجھے تھے کہ تم سو گئی ہو۔“
”مجھے معلوم تھا کہ تم دوپہوں میرے سونے کا انتظار کر رہے ہو..... اس لیے سوئی بن گئی تھی۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی تو ریتانے بھی اس سے جھپٹی جھپٹی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”تم ایسا کرو مگر شوکی کے ساتھ دل بہلاؤ.....“
 ”جیسے شیک رہے گا..... اب تم جا سکتے ہو.....“ گارشا
 نے جیسے انہیں اجازت دی۔
 ”سوری! میں کوئی کمپنی نہیں دے سکتا۔ میں خود
 سونے کے لیے جا رہا ہوں۔“ شوکی نے فوراً گہری متانت
 سے کہا۔ ”لیکن..... پلےز، مں ریتا! آپ دونوں زیادہ دور
 مت جائیے گا اور جلد اپنے خیمے کا رخ کیجیے گا۔“ یہ کہتے
 ہوئے شوکی گارشا کی طرف دیکھے بغیر واپس اپنے خیمے کی
 طرف پلٹ گیا۔

وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں سونے کے بجائے اس کے اوپر ہی موٹی شال اوڑھے لیٹ گیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ریٹائرس کے تصور میں بار بار آکر مسکرا رہی تھی۔ اس کارابٹر کے اس قدر قریب ہونا اسے سخت بے چین کے

زمان کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔
”تمہیں ابھی تک اریہ پر شبہ ہے۔“

”ہاں!“ زمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اتنی جلدی کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

”لیکن..... میرا خیال ہے کہ اریہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔“ علی نے کہا تو زمان اس کی بات پر چونکا۔

”یہ تم نے بھلا کس طرح اندازہ لگایا؟“ زمان کی آواز پھنسی چھنسی کی تھی۔

”جب میں نے یہ اندازہ لگایا ہے تو کیا تم نے نہیں لگایا ہوگا دوست!“ علی مسکراتا تو زمان بے اختیار جھینپ سا گیا۔ بولا۔

”باوجود اس کے میں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ چلو اب باتیں چھوڑ دو اور یونی سنبھالو۔ ہم سب اس وقت خطرے میں ہیں۔“

دونوں باری باری چند منٹوں کے لیے درے بجے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ ہندو قین ان کے ہاتھوں میں تھمی ہوئی تھیں۔ اس وقت زمان کھڑی پر کھڑا تھا۔

وہ نیچے کھلی میں دیکھ کر چونکا اور علی کو آواز دی۔ وہ فوراً بڑھا۔ اریہ نیچے کھڑی تھی۔ کچھ اریہ قریب کے لوگ باگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں اور مرد بھی تھے۔ ان کا لعلق قریبی گھروں سے تھا۔ وہ سب اریہ کے ساتھ مکان میں داخل ہو رہے تھے۔

شاید..... شامل کی تجویز و تحفین کی جانے والی تھی۔ نیچے شور مچنے لگا۔ دونوں اوپر ہی دیکے بیٹھے رہے۔ توڑی دیر بعد کسی بہانے سے اریہ اوپر آئی اور ان سے سرگوشی میں بولی۔

”تم لوگ ابھی اوپر ہی رہو اور کسی قسم کی کوئی آواز مت نکالنا۔ نیچے سب کو معلوم ہے کہ اب اس مکان میں میرے سوا اور کوئی نہیں رہا۔ شامل کے کفن دفن کے بعد ہی ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔“

اریہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔ اگلے ایک دو گھنٹوں بعد سارا معاملہ منٹ گیا۔ شامل کی میت دفنانے کے لیے لے جانی گئی اور اب مکان میں صرف عورتیں رہ گئیں۔ توڑی دیر بعد وہ بھی ایک ایک کر کے اریہ کو تسلیاں دیتی ہوئی اپنے اپنے گھر وں کو چل دیں۔

اب مکان میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اریہ اوپر آگئی۔

”میں باہر کی صورت حال کی خبر لے آئی ہوں.....“ اس نے کہنا شروع کیا۔ علی اور زمان بڑے غور سے اس کی

قدموں سے اس طرف کو چلا جھرینا نے اشارہ کرتے ہوئے اس طرف جانے کی اس سے اجازت لی تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو مزید پریشان اور فکر مند ہو گیا۔ وہ دونوں وہاں بھی نہیں تھے۔ اچانک اسے اپنے دائیں جانب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ تیزی سے گھوما..... گارشا کے خیمے سے اس نے کسی کا سایہ دیکھا..... اس سائے کی ساخت عجیب وضع کی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے کوئی کبڑا انسان دو ٹانگوں کے بجائے ہاتھوں بیروں کی مدد سے چل رہا ہو..... عجیب انسان نما حیوانی سایہ تھا وہ..... شو کی ٹھنکا اور اسی جانب بڑھا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے یہ سب اپنا وہم سمجھنے کی کوشش کی مگر جھٹلا نہ سکا لیکن ایسے ہی ایک دوسرے عجیب انسان نما حیوان کا سایہ وہ ابھی نہیں دیکھ سکا تھا جو ایک اور قریبی چٹانی اوٹ میں دیکھا ہو اس کی جانب مگھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گول سی تھیں۔ اس کے عقب سے ایسے ہی عجیب وضع کے دو تین اور سائے نمودار ہوئے اور تیزی کے ساتھ کراٹنگ کرتے ہوئے پروفیسر ہنری اور گارشا کے خیموں کی طرف لپکے اور ان کی آڑ میں چھپ کر دبک گئے۔

”کدھر چلے گئے یہ دونوں؟“ ادھر شو کی نے رینا اور رابرٹ کے متعلق خود سے سوال کیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک چیخ ابھری.....

☆☆☆

مکان کی اوپری منزل کے ایک چھوٹے سے چوراہے سے انہوں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ کھلی میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں کچھ شاہی سطح سپاہیوں کے علاوہ سرخ وردی پوش فرنگی بھی چوکس انداز میں گشت کرتے نظر آئے۔ یہی نہیں وہ لوگ کسی بھی آنے جانے والے پر اچانک شبہ کرتے ہوئے اس سے کھڑے کھڑے پوچھ کچھ شروع کر دیتے تھے اور جامہ تلاشی بھی لے ڈالتے۔

”پہرا واقعی سخت ہے دوست!“ شاہ زمان نے علی ریمان کے کان میں سرگوشی کی۔ ”ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”ہوں.....“ علی نے ہنکاری بھری۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہی دونوں اندر کرے میں آ گئے۔

”جب تک اریہ واپس نہیں لوٹ آتی..... ہمیں کسی ایک کھڑکی پر کھڑے رہتے ہوئے نیچے دروازے پر مستقل نظر رکھنا ہوگی۔“ زمان نے کہا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں دوست!“ علی نے

ظلم دیکھ رہے تھے۔

ہنوز اس طرف سے نامعلوم سی بے چینی کا شکار تھا۔ حالانکہ اب تک اریہ نے ان دونوں کے ساتھ ایسی کوئی مشکوک حرکت نہیں کی تھی جو کسی قسم کے شہجے کے دائرے میں آتی۔ علی اس پر مکمل بھروسہ کر چکا تھا لیکن زمان ہنوز اس کی جانب سے اشتباہ انگیزی کا شکار تھا۔

”دیکھو بہن!“ علی نے زری سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہارے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن آپ کے حالات جان کر ہمیں بے حد افسوس بھی ہوا ہے۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں مزید کسی ایسے حالات کا شکار بنادیں جو تمہارے لیے ایک بڑی مصیبت کا سبب بن جائے۔“

اریہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ زمان بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے اس سے بولا۔

”اور میرا خیال ہے کہ اب شامل کے مرنے کے بعد تم بھی آزاد ہو۔ اس کا کاروبار اور یہ مکان اب تمہاری ملکیت ہی تصور کیا جائے گا۔ تم نے اب تک ہماری جتنی مدد کی اس کا ہم یہ دل سے شکر ہے ادا کرتے ہیں۔ مجھے اور میرے ساتھی کو اب جلد از جلد یہ مکان چھوڑنا ہوگا۔“

”بابر خت پہرا ہے۔ کلی گلی میں تم دونوں کو تلاش.....“ اریہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ زمان بول پڑا۔

”یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم خود ہی اسے حل کر لیں گے۔“

”تم شاید مجھ پر ابھی تک شبہ کیے ہوئے ہو۔“ اریہ نے زمان کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔ ”جب میں تم لوگوں کی مدد کر سکتی ہوں تو پھر اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا شک صرف سیتا جی موج سیکھ تو نہیں ہو گا نا.....“

علی نے غور کرنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اپنے ساتھی زمان سے مخاطب ہو کر اسے طلب لہجے میں بولا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اریہ کی بات مان لینی چاہیے۔“ زمان خود انکچا پٹ میں جلتا تھا۔ سمجھ تو وہ بھی گیا تھا کہ ان مخدوش حالات میں اریہ کا ساتھ ان کے مشن کو وسیع تر کامیابی سے ہمکنار کر سکتا تھا۔ مگر وہ ابھی تک اس کی جانب سے تشکیک میں جلتا تھا۔

”میرا خیال ہے تمہارا ساتھی مجھ پر ابھی تک بھروسہ..... کرنے کے لیے تیار نہیں۔“ اریہ نے زمان کی طرف دیکھتے ہوئے علی ریحان سے کہا تو علی مسکرا کر بولا۔

”نہیں بہن! ایسی بات نہیں، دراصل ہماری تربیت کا سب سے پہلا اصول ہی یہی ہے کہ اپنے سوا کسی پر بھروسہ

”میں نہیں بھی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ نیچے گلی میں کتنا سخت گھر گھر تلاشی لینے کے باوجود بھی کسی نہ کسی آتے ہاتھ سے اچانک تلاشی کے ساتھ پوچھ کچھ شروع کر دی جاتی ہے.....“ وہ رکی تو زمان اس کے چہرے پر اپنی نظر لگ جاتے ہوئے بولا۔

”تم کہاں گئی تھیں؟“

”یہ معلوم کرنے کے اب تمہارے سلسلے میں تلاشی کا کام چل گیا اختیار کیا جانے والا ہے۔“

”کیا بتا چلا پھر.....؟“ علی نے پوچھا۔

”انہی تھوڑی دیر میں ریاست کا سینا جی موج لگے..... اپنے خاص سپاہیوں کی معیت میں خود بھی نکلنے والا ہے اور کسی بھی مشکوک نظر آنے والے گھر کی تلاشی لینے کے لیے بے دھڑک داخل ہو جائے گا۔“

”اسی جینک۔“ زمان کے منہ سے نکلا۔

”ہاں!“ اریہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مرکوا ثباتی جنش دی۔

”بس! ابھی ایک بڑا خطرہ ابھی سر پر مسلط ہے۔“

اریہ اور زمان نے دیکھا۔ علی ریحان کے چہرے پر ایسا کی عجیب سی سمجھ بھاری ہو گئی تھی۔

”کیا سوچنے کے لیے.....؟“ زمان نے اس سے کہا۔

”میرا خیال ہے ہمارا مشن خود ہی چل کر اس طرف آ رہا ہے۔“ وہ جیسے کوگو سے لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب؟“ زمان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”موج سیکھ کو موت کے گھاٹ اتار دینا بھی ہمارے اس اہم مشن کا ایک حصہ ہے۔“

اس کی بات پر زمان نے ایک نظر سامنے بیٹھی اریہ کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

”اس طرح اریہ کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ یہ دشمن کی نظروں میں زبردست مشکوک کہلائے گی۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“ اریہ نے فوراً کہا۔ ”تمہیں اپنے مشن کے لیے جیسی آسانی ممکن محسوس ہو وہ کر ڈالو، میری فکر مت کرو۔ فرنگیوں کی اس جنگ میں مجھے بھی تم دونوں اپنے ساتھ شامل سمجھو۔ ان فرنگی غاصبوں کی وجہ سے

ہی تو ہمارا گاؤں تباہ و برباد ہوا اور خود میں بے خانماں ہو کر اس حال کو پہنچی ہوں۔“ یہ بتاتے ہوئے اس کا لہجہ مغموم سا ہو گیا۔

زمان بے غور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ

نہ کرو۔“

”اور اگر کسی مددگار کا ساتھ منیر آ رہا ہو تو.....؟“
اریبہ نے اس بار براہ راست زبان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔
جس پر زمان کچھ گڑبڑا سا گیا مگر دوسرے ہی لمحے پورے
اعتماد سے بولا۔

”اس کی وفاداری جانچنے کے لیے بد قسمتی سے ہمارے
پاس اتنا وقت نہیں ہوگا..... جتنا کہ گزرتے ہوئے وقت اور
حالات سے پتا چل سکے۔“

”جانچنے والے تو غصہ کی نگاہ رکھتے ہیں۔ کیا تمہیں
اب بھی مجھ پر بھروسہ نہ ہوگا، جبکہ میں نے تم لوگوں کی
خاطر شامل کوئل کیا.....“

”اس میں تمہارا بھی فائدہ تھا.....“

”اگر صرف میرے فائدے کی بات ہوتی تو میں کب
کااے ختم کر چکی ہوتی۔“ زمان کے محتاط رویے سے اریبہ
کا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔

”تم موقع کی منتظر تھیں۔“ زمان بھی اس کی ہر دلیل
رد کرنے کے درپے تھا۔

”چلو، یہی سنی..... اگر یہ بات ہے تو..... میرا کام ختم
ہوا..... تم لوگ یہاں سے جاسکتے ہو.....“

”تم تمہیں ختم کر کے ہی اب اس مکان سے نکلیں
گے۔“ اچانک زمان کا لہجہ بدل گیا۔ ”تم ہمیں چھینوسکتی
ہو.....“ زمان کہے جا رہا تھا۔ اس کی اور اریبہ کی بحث نفی سے

اب الیکا انکی دھنی پر اتر آئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب اریبہ
نے بد سمرت ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ وہ زمان کے بالکل
قریب آگئی۔ اتنی کہ اس کی گرم گرم سانسوں کا موج زمان

کو اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگا۔ اس کے بدن کی رعنائی کی
قریبیت اور اس سے پھوٹی قدرتی خوشبو اسے مسحور کیے دے

رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ جہاں کا تھاں یک تک اسے دیکھتا ہی
چلا گیا حتیٰ کہ اریبہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو

دبوچ لیا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھوں کی گرفت بھی زمان
کو ایسی غیر مرنی ہی محسوس ہوئی تھی کہ وہ خود اس سے چھڑانے
کی محض کوشش ہی کرتا رہ گیا۔ اریبہ نے اس کے دونوں ہاتھ

اپنی مصراحتی دار گردن کے گرد کس ڈالے اور اس کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”لو..... میرا گلہ دبا کر ابھی ختم کر دو مجھے..... شاید
تب ہی تمہیں اعتبار آئے گا مجھ پر.....“ زمان نے اس کی
اپنے سامنے کھلی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں اسے دکھ کی نمی کی
چمکی نظر آئی۔ اس کے تراشیدہ لب غم دوران کے بوجھ

تے تھر تھرا رہے تھے۔ سایہ دار سی گھنری پلکیں اس کا
کججاری سیاہ آنکھوں کو ایک بل کے لیے ڈھانپیں تو بچھ
بھادوں میں برے ہوئے پھٹکے پھٹکے جھلک کا سامنے چٹھا
کرنے لگیں۔ آنکھوں کی غمناک سنگت میں پلکیں چمکنے لگی
تھیں اس کی۔

علی ریحان خاموش تھا، زبان مٹک..... اریبہ بچھے
ہٹ گئی اور اٹھ کر دیوار کے ساتھ لی کھڑی ہو گئی۔ زمان اور
علی کی آنکھیں ملیں تو علی نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا جسے

سمجھ کر زمان اپنی جگہ سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم
اٹھاتا ہوا اریبہ کی طرف بڑھا۔ وہ ہنوز کمرے کی دیوار سے لگا
کھڑی، سر جھکائے سکے جا رہی تھی۔ تب ہی زمان نے بہت

دیر سے کچ کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کے کانہ مے پر دھرا تو
اریبہ نے جیسے تڑپ کر اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس
کا خوبصورت و حسین مگر اٹکا بار چہرہ حسن نمکسار کا عجیب

ساتاڑتا دکھائی دیا۔ ایسے میں پہلی بار زمان کا بھی دل اس
دکھاری اور الم نصیب حسینہ پر رقت زدہ ہو گیا۔

”مجھے افسوس ہے..... میں نے آپ پر رشک کر کے
آپ کا دل دکھایا.....“ زمان نے ہولے سے کہا۔ اس کے
لہجے میں ملامت آمیز مزی عود کر آئی تھی۔ ”درحقیقت..... ہم

ایسے کا زکے سپاہی ہیں جو اپنے سائے پر بھی کب ہی بھروسہ
کرتے ہیں اور یہ ہماری مجبوری بھی ہے۔ آؤ بیٹھ کر آرام سے
باتیں کرتے ہیں۔“

زمان اسے محبت سے تھامے واپس اس کی جگہ پر لے
آیا۔ اریبہ نے خود کو اس کے سپرد کر دیا تھا۔ زمان کے اس
طرح سہارنے پر اسے بھی اب اپنے دل کا بوجھ کم محسوس

ہونے لگا تھا۔

وہ تینوں ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اریبہ نے

اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

”جب تک اریبہ بہن کے مکان میں ہماری خفیہ
رہائش قائم ہے، ہم اپنے مشن کو کامیابی کی طرف لے جاسکتے
ہیں۔“ علی نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے دیر سے کہا۔

”ہاں! میرا بھی اب یہی خیال ہے..... اریبہ کو زحمت
تو ہوگی مگر.....“ زمان اس کی طرف دیدہ نظروں سے
دیکھتے ہوئے رکا تو اریبہ نے فوراً اس کی طرف گہری نگاہ

اٹھا کے دیکھا۔

زمان کو اس کی جمیل سی گہری آنکھوں میں عجیب سی

گیرائی اور جمیدوں بھرے تاثر کا شائبہ ابھرتا محسوس ہوا تھا۔

ایسا چند بل کے لیے ہوا تھا اس کے بعد اریبہ بولی۔

کراچی
سرگزشت
ماہنامہ

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو
آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا
شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے
کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیک کی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

”مجھے بھلا کسی زحمت ہوگی؟ میں تو خوش محسوس کروں گی کہ میری بے مصرف زندگی کسی نیک مقصد میں کام آئے۔ اپنا منصوبہ بناتا..... موج سٹکھ لکھنے والا ہوگا۔“

”منصوبہ یہی ہے کہ ہم اسے موت کے گھاٹ اتاریں گے۔“ علی رحمان نے کہا اور تائید طلب نظروں سے زمان کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا تھا۔ تاہم بولا۔

”میرا خیال ہے کہ موج سٹکھ سے زیادہ..... اس فرنگی کمانڈر کو موت کے گھاٹ اتارنا زیادہ سودمند رہے گا کیونکہ تربیال اور ناگرہ کے خلاف اصل سازش وہی تیار کر کے لا رہا ہے اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ..... دلی میں قابض..... لیفٹیننٹ جنرل ہائیکل شا..... کا نائب اور خاص آدمی بھی ہے۔“

”ہوں.....“ اس کی بات پر علی نے ایک پُر سوچ سی ہنکاری خارج کی تھی۔

”اس کے ہمیں دوسرے نتائج حاصل ہوں گے۔“ زمان نے اپنی عملی حکمت عملی کی مصراحت جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

”شہر میں قابض فرنگیوں کی ایک بڑی بریگیڈ کو دھوکا پہنچے گا اور ان کی بیرونی آزاد ریاستوں کو بھی ساتھ لے لے کر لڑانے کا خواب ایک خوف کی شکل اختیار کر لے گا، کیونکہ ان کے اتنے بڑے افسر کا دھڑلے سے قتل باقیوں کے لیے دہشت کا ہی سبب بنے گا۔“

”کلیئر..... اس کے بعد ہمیں مشن کا اگلا اور آخری مرحلہ طے کرنا ہوگا۔“ علی نے مطمئن ہو کر کہا۔ ”میں فوراً تربیال کا رخ کرنا ہوگا اور وہاں کے مسلمان نواب شہباز خان کو اس سازش سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے..... اغیار (مہاراجا چندر گپتا) اور فرنگی سامراج کی اس گھناؤنی سازش کے بارے میں بھی آگاہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنی حلیف ریاستوں کو اعتماد میں لے کر آپس میں جنگ کرنے سے گریزاں رہیں اور مذاکرات کے بہانے کسی فرنگی سامراجی آفیسر کے آنے کی دعوت قبول ہرگز نہ کریں بلکہ ہر ممکن طرح سے ان کا راستہ ہی روکیں۔“

”تم دونوں کا منصوبہ بے داغ اور مربوط ہے.....“ ارپیہ نے کہا۔ ”مگر اس کے لیے تم دونوں کو مہاراجا چندر گپتا کی محل نماحوں کی تک رسائی حاصل کرنا ہوگی، نہ صرف یہ بلکہ وہاں سے یہ خطرناک مشن مکمل کر کے زندہ بھی لکھنا ہوگا۔“

”ہاں! اسی کے عمل وقوع کا جائزہ لینے کے لیے ہم نے

اپنی آمد کو خیر رکھنے کی اشد کوشش کی تھی، مگر بد قسمتی سے ہمارا آمد طشت از بام ہو گئی۔ اس لیے ہم نے مجبوراً ریاست سینا پتی موج سٹکھ کو ہی ہلاک کرنے پر اکتفا کرنے کا سہا تھا۔“ علی بولا۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ اب ارپیہ کی مدد سے ہم اصل شکار یعنی اس فرنگی آفیسر جان پال کو ہی موت کے گھانا اتاریں گے۔ دوسرا شکار ہمارا نسبتاً سہل ہوگا یعنی موج سٹکھ.....“ زمان بولا۔

”ہماری کوشش یہی ہوگی کہ موج سٹکھ کو بھی اچھوڑیں.....“ علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ اس طرح فرنگی سامراجیوں کے دلوں میں ہی نہیں بلکہ ان سے کٹھ کرنے والی دیگر بیرونی ریاستوں کو بھی عبرت حاصل ہو سکے۔“

اب یہ تینوں چند ضروری باتیں کرنے لگے۔ انہیں باتیں کرتے تھوڑی دیر گزری تھی کہ باہر نقار پڑے جانے کی آواز پر تینوں چونک پڑے۔ اس کے ساتھ ہی نیچے کی میں یہ آواز بلند منادی کی جانے لگی۔

”موشیار..... خبردار! باخبر رہیں سب..... ریاست ناگرہ کے سینا پتی موج سٹکھ..... دشمن جاسوسوں کی تلاش میں لپکے ہیں مگر کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور جو جہاں وہ ہیں موجود رہے۔ نہ کوئی گھر سے باہر نکلے نہ اندر داخل ہوتا نظر آئے۔ یہ دشمن ریاست کی رعایا کے جان کے ڈر ہیں اور ان کا مقصد انتشار پھیلانا اور کاروبار ریاست کو نقصان پہنچانا ہے، اس لیے آپ سب سے بھی تعاون اور مدد درخواست کی جاتی ہے جس کا فرض یہاں کے ہر مرد و عورت بڑھے اور بچے پر لاگو ہے۔ اعلان ختم ہوا۔“

ڈھنڈورچی کی اس منادی کے بعد وہ تینوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ اس کے بعد لپک کر در پیچے کی جانب بڑھے۔ در پیچے کا ایک ہنٹ ذرا کھٹکا کر نیچے کی گئی جہاں کا تو مخصوص مرد دیوں میں ملبوس بہت سے رخ افراد چوکر کھڑے دکھائی دیے جو جگہ میں موجود ہر گھر پر کڑی نگاہ ڈالے ہوئے تھے۔

”سینا پتی ابھی نہیں پہنچا ہے۔“ ارپیہ نے سرگوشی میں کہا۔ ”منادی کرادی ہے، وہ پہنچنے والا ہوگا۔“ علی بولا۔

”اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچے..... ہمیں چھپنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کی ضرورت پڑے گی۔“ زمان نے کہا تو ارپیہ ایک لمحہ کچھ سوچ کر بولی۔

”ضروری نہیں ہے کہ موج سٹکھ ہر گھر کی تلاشی لے

نمایاں ہوتی تھی جو اسے تند مزاج ظاہر کرتی تھی۔ گھڑسواروں کی رفتار آہستہ تھی اور وہ ایک ایک گھر کے دروازے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ساتھ ہی اور بھی دیکھتے جاتے تھے۔ علی اور زمان کو کچھنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہی سینا پتی موج سنگھ تھا۔

گھڑسواروں کا یہ دست پیادہ فوجیوں کی سنگت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چند ایک گھروں میں رک کر جس گھر کی طرف موج سنگھ اشارہ کرتا، فوجی حرکت میں آجاتے اور چند ہی منٹوں میں کبھی بھی مشکوک گھر کی تلاشی لے ڈالتے۔ پیدل اور گھڑسوار دستہ اب ان کے مکان کے سامنے سے گزرنے لگا۔ علی اور زمان کے دل یکبارگی زور سے دھڑکے اور وہ دونوں ایک دم در پیچے کے پاس سے ہٹ گئے، پٹ بھی آہستہ کے ساتھ بھڑک دیا تھا۔

ٹھیک اسی وقت اسی مکان کے سامنے لوگ رک گئے۔ موج سنگھ نے مکان کی جانب اشارہ کیا۔ زمان اب در پیچے کے پٹ کی باریک جھری سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پیدل سوار دستے میں سے ایک دم دوا فراد موج سنگھ کے گھوڑے کی طرف بڑھے اور وہ مذہبانہ انداز میں دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

موج سنگھ اس مکان کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہوئے ان سے حکمانہ انداز میں کچھ پوچھ رہا تھا اور تب ہی زمان کا دل یلکھت اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ موج سنگھ نے اس مکان کی تلاشی لینے کا حکم صادر کر دیا تھا۔

”پٹو.....“ در پیچے سے ہٹتے ہی زمان نے علی سے کہا۔ نیچے دروازہ بری طرح دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ یہ دونوں لپک کر اسٹور میں آگئے اور تیندو پتوں سے بھری ہوئی بور یوں کے پیچھے جا دیے۔ اریہ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ باقی اسٹور میں دانستہ جی وغیرہ نہیں چلائی گئی تھی۔

دونوں گھورتاریکی میں دم سادھے دیکے بیٹھے رہے۔ تاہم ان کی دھڑکتی ہوئی ساعیں چوکس تھیں۔ نیچے سے کچھ آوازیں آتی رہیں۔ اس کے بعد یلکھت خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے سکون کا سانس لیا کہ شاید خطرہ ٹل چکا ہو۔ دوسرے ہی لمحے ہی ان کی خام خیالی ثابت ہوئی کیونکہ اس کے دولہے بعد ہی کھٹ..... کھٹ..... کھٹ.....

کھٹ..... کی آوازیں ابھریں..... یہ ایک سے زائد افراد کے ہماری جوتوں کی آواز تھی اور وہ لوگ اوپر ہی آ رہے تھے۔ علی

بھی پر شبہ ہوگا اسی گھر کی تلاشی لی جائے گی لیکن پریشان لے کی ضرورت نہیں..... تم ادھر ہی ٹھہرے رہو.....“ زمان کو اریہ کی یہ بات بالکل ہچکچاتا لگی جس کا اس نے مطالعہ اصرار بھی کر ڈالا۔ بولا۔

”یہ انتہا درجے کی بےوقوفی ہوگی کہ ہم اس خوش فہمی سے ہمیں کس مکان کی تلاشی نہیں لی جاسکتی.....“

”جس گھر میں فوجی ہو جائے وہاں اس کے امکانات کم رہتے ہیں۔“ اریہ نے برامنائے بغیر جواب پیش کیا۔

”میرا خیال ہے کہ اریہ بہن کی بات درست ہے۔“ علی رحمان بولا مگر اس کا لہجہ گونگوتا تھا۔ زمان بولا۔

”جادو اس کے اس خطرے کا احتمال موجود ہے کیونکہ جب انہیں بتایا جائے گا کہ اس مکان میں اب صرف ایک ایسی عورت رہتی ہے تو ممکن ہے ان کی نظروں میں ایسی عورت کھٹک جائے۔ اس لیے اب وقت ضائع کیے بغیر فوراً پھل کی کوئی محفوظ جگہ تلاش کر لی جائے۔“

اریہ نے انہیں تہ خانے کے بجائے اسی بالائی منزل لے گاوام میں ایک اسٹور نما کمرے کے اندر ایک ایسی جگہ کے لیے دیکھا دی، جہاں تیندو پتوں کے ٹھکڑوں کی دیوار رکھی ہوئی تھیں۔

اس کے بعد اریہ نے نیچے جا کر سیاہ لبادہ اوڑھ لیا اور گھر سے پرنامی تاثرات قائم کر لیے۔ چولہے کا خاص طور پر ہاتھ لیا کہ ظاہر نہ ہو یہاں چولہا جلا ہے۔ اسے سرد کر دیا گیا۔ چائے وغیرہ کے تازہ استعمال کیے ہوئے برتن بھی ایک طرف سمیٹ کر رکھ دیے کیونکہ فوجی والے گھر میں وہ بھی پہلے دن یہ سب ان کے لیے ٹھکوک کا سبب بن سکتا تھا۔ اسے یہ کام لاتے دیکھ کر علی اور زمان کو بھی اریہ کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا تھا۔

علی اور زمان..... متوقع خطرے کا جائزہ لینے تک درست در پیچے کے قریب ہی کھڑے رہے۔ نیچے کچلی میں لوگوں کی آمد و رفت ایک دم جام کر دی گئی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں لہر گیا تھا اور پھر اسی وقت گھڑسواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ انہوں نے دیکھا تلواروں اور بندوقوں سے لیس اس گھڑسواروں کے دستے میں ریاستی اور چندر نکی فوجی بھی شامل تھے۔ ان میں سب سے آگے دو گھوڑے تھے اور ان کے سپاہیوں میں ایک گھوڑے پر کسرتی بین والا شخص مخصوص لباس میں سوار نظر آیا۔ اس کے چہرے پر مٹی ڈاڑھی اور مونچھیں تھیں۔ سر پہ چمکیلا سا پک تھا۔ میان سے تلوار جھول رہی تھی۔ چہرے پر عرب اور دبے کے ساتھ ایک کرسٹی بھی

اور زمان کے پورے وجود میں اندیشناک وسوسوں کے سناٹے اترتے چلے گئے۔

☆☆☆

چنچ کی آواز پر شوکی بری طرح چونکا..... اس چنچ پر وہی پراسرار کبڑے سائے بھی ٹھکے تھے اور شوکی کی نظروں میں آئے بغیر ادھر ادھر کو لپکتے لگے تھے۔ ان کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اریب قریب کی چٹائی دیواروں میں چھپے ہوئے اپنی چندی چندی چٹختی آنکھوں سے اس مختصر پڑاؤ کو دیکھتے جا رہے تھے۔ کچھ خیموں کے قریب بھی دیکھے ہوئے تھے۔

شوکی چنچ سے مشابہ اس آواز کو ہزار آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ رینا کی چنچ تھی، جو زیادہ بلند تو تھی، مگر کہیں قریب سے آتی ہوئی ضرور محسوس ہوتی تھی۔ تب ہی جیسے اس کے پورے وجود میں ٹیلفٹ بجلیاں دوڑ گئیں۔ وہ بکولے کی طرح پلٹا اور آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے تاریکی میں اسی پہاڑی کی طرف لپکا جہاں سے چنچ کی آواز ابھری تھی۔

اسے یوں ایک دم دوڑتا دیکھ کر اطراف میں چھپے ہوئے وہ پراسرار کبڑے نما سائے بھی دبکے رہے تھے۔

باقی سب لوگ ٹھکن کے سبب بے سدھ سو رہے تھے۔ شوکی..... چنچ ہوئی چاندنی میں پتھر کی اور نا ہمواری زمین پر دوڑتا ہوا، مذکورہ چٹائی اوٹ کے چھپے جا پہنچا اور تب ہی ایک منظر نے جیسے اس کا پورا وجود آگ اور شعلوں سے بھر دیا۔

اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر چھرا دیو کی اور سنگلاخ دیوار تھی، اس کے نیچے خشک سی روئیدی بھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے رابرٹ کو کسی شکرے کی طرح رینا کو بولے ہوئے پایا اور رینا محسوس چیز یا طرح اس کی آہنی گرفت سے نکلنے کے لیے پھل رہی تھی۔ رابرٹ نے ایک

ہاتھ اس کے منہ پر رکھا ہوا تھا تا کہ وہ دوبارہ نہ چنچ سکے۔ رابرٹ کی اس قبیح حرکت کو دیکھ کر صاف نظر آتا تھا کہ وہ رینا سے دست درازی کی کوشش کر رہا تھا۔ شوکی کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ آنکھیں شعلوں کے مانند دیکھنے لگیں۔ اس نے وہیں سے ایک جست بھری..... اور رابرٹ کے سر پر جا پہنچا.....

اسے دیکھتے ہی رابرٹ نے اپنے ایک ہولسٹرے پر ہتھول نکال لیا۔ یوں اسے رینا پر گرفت ڈراؤ بھی کی بنا پڑی تھی۔

”رک جاؤ ادھر ہی..... ورنہ گولی مار دوں گا۔“ وہ شوکی کی طرف دیکھ کر غرایا۔ اس نے شاید شوکی کی غضب ناک کا اندازہ..... لگا لگا تھا کیونکہ خود رابرٹ کے چہرے پر بھی تشویش و پریشانی کی جھلک ابھری تھی۔

”اسے چھوڑ دو..... رابرٹ!“ شوکی نے اپنے اندر غلط تعلق کے نبی.... پورا زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کا آنکھوں سے خون ناک تیز ہو رہی تھی۔ وہ جیسے رابرٹ کو ہانڈ کھانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسے ہتھول نکالتے دیکھ کر وہ اس سے صرف دو تین قدموں ہی کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ رینا پر اسان تھی۔ شوکی کو اس کے کسین چہرے پر سرخ ی خراشیں دکھائی دی تھیں۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے.....“ رابرٹ بھیڑیے جیسی آواز میں اس کی طرف گھور کر غرایا۔ ”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔“ ”ذاتی معاملہ ایسا نہیں ہوتا.....“ رابرٹ سے یہ کلمے ہوئے شوکی نے رینا کے سراپہ چہرے پر بھی ایک نظر ڈالی تھی۔ ”یہ بدستی ہے اور تم رینا کو ہرٹ کر رہے ہو.....“

”بتاؤ بے بی اسے..... کہ ہمارا اور تمہارا کیا معاملہ ہے.....؟“ رابرٹ نے رینا کے کان کی طرف اپنا ہیٹ چہرہ لے جاتے ہوئے اس سے کہا تو شوکی کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن تیر گئی..... رابرٹ کے کہنے کے انداز میں شوکی کو ایک طرح کا جا بابرانہ حجم محسوس ہوا تھا اور اسے رینا بے بس سی نظر آ رہی تھی۔

”تم پہلے چھوڑ دیجئے..... رابرٹ!“ رینا نے بالآخر گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

”نہیں، پہلے اسے جانے کا کہو.....“ رابرٹ بدستور اپنے سامنے کھڑے شوکی کی طرف گھورتے ہوئے رینا سے بولا۔

”شش..... شوکی! تم جاؤ.....“ رینا نے اٹکتے ہوئے لہجے میں شوکی سے کہا تو وہ رینا کی بات پر ہمو نچکا رہ گیا۔ اسے دکھ بھی ہوا، پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ رینا ایسی صورت حال میں اس سے یہ بھی کہہ سکتی ہے۔

”چلو اب دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اپنی اوقات میں رہنا آئندہ..... نتیجہ تم.....“ رابرٹ کو یار رینا کی شے پر شوکی سے بولا۔

”سی سی..... تم کیا کہہ رہی ہو رینا.....! تمہیں ہرٹ کر رہا ہے.....“ شوکی نے دکھ آمیز جبرت سے رینا کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔

”شوکی! پلیز..... کو.....“ رینا نے وہ دے لہجے میں ایک بار پھر شوکی کو جانے کے لیے کہا تو شوکی اپنے ہونٹ چٹچ کر رہ گیا۔ وہ چند ثانیے دونوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد وہاں پلٹ گیا۔ مگر اوٹ سے ہٹنے کے بعد وہ ایک جگہ چٹائی دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس بار اگر رینا کی چنچ سنائی دی تو وہ رینا کی پروا کیے بغیر رابرٹ

بادشاہ کی پسند

ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی میری پسند کا پھل لائے گا، اس کے برابر میرے جواہرات انعام دوں گا اور اگر پسند نہ آیا تو وہی پھل لانے والے کو لگھٹا پڑے گا۔ ایک مسلمان ایک بیر لایا جو بادشاہ کو پسند نہ آیا تو مسلمان نے اسے بے آسانی اسے نکل گیا۔ ہندو ایک سبب لایا وہ بھی بادشاہ کو پسند نہ آیا اور بادشاہ نے ہندو کو سبب لگنے کا حکم دیا۔ (وراصل شرط یہ تھی کہ پھل کھانا نہیں لگھٹا ہے)۔ ہندو رونے لگا پھر اچانک ہنسنے لگا بادشاہ نے غصے سے پہلے رونے اور پھر ہنسنے کی وجہ پوچھی تو ہندو نے کہا: ”بادشاہ سلامت! میں پہلے رو یا اس لیے کہ میں سبب لگن نہیں سکتا۔ بعد میں ہنس اس لیے کہ باہر ایک سکھ بیٹھا ہوا ہے جو تریبوز لایا ہے۔“

(مرسلہ: ریاضِ بٹ۔ حسن ابدال)

کو دیکھ لیتا تو یقیناً خوف کے مارے لنگ ہو جاتا۔
تھوڑی دیر اور ادھر متحرک رہنے کے بعد یہ کپڑے چوپائے پھدکتے ہوئے جمونپڑوں کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی موجودگی سے دیکھتے ہی دیکھتے وہی..... جمونپڑے آباد نظر آنے لگے، جو تھوڑی دیر پہلے ویرانی اور خالی پن کا منظر پیش کیے ہوئے تھے۔ وہاں روشنی ہو گئی۔ الاؤ بھل پڑا۔ اس ویران بستی کی زندگی جیسے انکا ایک بیدار ہونے لگی تھی۔ جمونپڑوں سے ان کی عجیب سی چھٹی چھٹی آوازیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ یہ سب ایک ٹھنڈا جاری رہا اس کے بعد خاموشی چھانے لگی۔ جمونپڑوں کی وہی روشنیاں بھی گل ہوئے نکلیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی سو گئے ہوں۔

دن چڑھے یہ سب جاگے تھے۔ سب سے پہلے پروفیسر ہنری کی آنکھ کھلی تھی۔ شوکی بھی آنکھیں صاف کرتا ہوا اپنے جیسے سے نکلا تو چونک پڑا۔ اس نے دیکھا پروفیسر ہنری نے اپنے ایک ہاتھ میں صندل سے عطر لگھا تھا اور وہ پتھری کی زمین پر جھکے جھکے کچھ دیکھتے ہوئے بھی آگے جاتے بھی پیچھے اور بھی واپس بائیں مڑتے۔

رینا، رابرٹ اور گارشا بھی جاگ چکے تھے۔ شوکی نے محسوس کیا تھا کہ رینا اب رابرٹ سے کچھ کھینچتی تھی نظر اسی

کا چہ دروے گا۔ وہ ابھی تک درطو جیرت میں مبتلا تھا کہ یہ لگا پھر تھا؟ رینا، رابرٹ کے سامنے آتی ہے بس کیوں تھی؟ اچانک اس کی نظر چاند کی طلسمانی روشنی میں سامنے پڑی۔ وہ دونوں اب تیز تیز قدموں سے پڑاؤ کی طرف جا رہے تھے۔ رینا آگے گئی اور رابرٹ اس کے پیچھے..... شوکی نے بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ اس نے دیکھا کہ رینا اپنے خیمے کے پاس پہنچ کر رکی۔ رابرٹ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر رینا نے سختی کے ساتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اندر داخل ہو گئی۔ رابرٹ تھوڑی دیر تک خیمے کے دروازے پر کھڑا رہا، اس کے بعد واپس اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔ شوکی بھی اپنے خیمے میں آکر لیٹ گیا۔

پس منظر میں ہر بنگلک پہاڑیوں کی چوٹیاں تاریک خلا میں برجیوں کی طرح بیست ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور وہاں چاند لگا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بادلوں کے کٹڑے تیرتے ہوئے عجیب منظر پیش کر رہے تھے دو درختیں کسی پہاڑی بھڑیے نے چاند کی طرف ٹھوٹھی اٹھا کر ہوکنے کی آواز نکالی جس نے ماحول کی اسراریت کو دو چند کر ڈالا تھا۔

پڑاؤ پر رات کا سناٹا طاری تھا۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ دھیمی دھیمی چاندنی میں خالی جمونپڑوں کے بدمنع ہونے عجیب سے نظر آ رہے تھے۔ شوکی سوچا تھا۔ رات اپنے نصف پہر میں تھی۔ اچانک وہی پراسرار سائے کراؤ لگ کر تے ہوئے دیرے دیرے خیموں کی جانب بڑھنے لگے اور ایک ایک خیمے کے اندر جھانکتے رہے۔ ان کے جسم پر ہنستے۔ آنکھیں پٹی پٹی سی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے بغیر پہنوں کے ہوں۔ البتہ..... ان کے چہرے انسانی لگتے تھے، مگر قدرے غریبی تھے۔ رنگت سیاہ تھی۔ ان کی جسمانی ساخت انہیں ایک دوسرے سے مختلف جنس ظاہر کرتی تھی۔ یعنی مرد اور عورتیں بھی تھیں، چھوٹی بڑی عمروں کے بچے بھی تھے۔ شیر خوار بچے ماؤں کی پشت اور سینے کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ ان کی وضع انہی کی طرح کی تھی۔ ان کی ہاتھوں پیروں کی ہڈیاں خم کھائے ہوئے تھیں اور ریزہ کی ہڈی بھی خم کھائے ہوئے تھی، جس کی وجہ سے یہ لوگ اپنے دونوں پیروں پر چلنے کے بجائے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور تھے۔

چند سائے ٹھنڈے ضرورتاً اپنے دو پیروں پر بھی کھڑے ہونے کی کوشش کرتے۔ ان کی تعداد کافی ہو چکی تھی۔ وہ سب آزادانہ ادھر ادھر پھدکتے پھر رہے تھے اور عجیب عجیب سی آوازیں بھی خارج کرنے لگتے۔ مگر اس وقت خیموں میں گہری نیند سوئے کسی کی آنکھ کھل جاتی اور وہ باہر نکل کر ان

تھی۔ تاہم وہ اب بھی اس کے ساتھ تھوڑی بہت بات کر لیتی تھی، البتہ لگ ایسا ہی رہا تھا جیسے کچھ ہوا نہیں ہو۔
”خیریت پر دھیر؟ کچھ ہوا ہے یہاں.....؟“ اس نے پوچھا۔

”شش..... شش.....“ پروفیسر ہنری اپنے کام میں محو رہے اور پھر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ان کا رخ اب جمبو پڑوں کی طرف تھا۔ وہ اندر گئے۔ وہاں بھی اسی طرح جبکہ کر فرش پر کچھ دیکھتے رہے۔ اس کے بعد پلٹ آئے۔ شوکی حیران تھا کہ آخر پروفیسر ہنری برنارڈ کو ایک رات گزرنے کے بعد ایسا کیا نظر آیا تھا؟

بہر کیف..... اس وقت تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا لیکن..... ہلکے ہلکے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ایک عجیب و غریب انکشاف کر ڈالا۔

”رات کے کسی پہر..... اس دوران بستی کو آباد کیا گیا تھا.....“ ان کی بات نے سب کو ایک دم چونکا دیا تھا۔ رہنا اور

گارشیاسمیت نندو بابا اور اس کی بیوی شانے کے چہروں پر دبا دبا ہوا اس بھی ابھرا تھا۔ البتہ شوکی اس لیے پروفیسر کی بات پر چونکا تھا کہ اس نے خود بھی رات کے پہر ایک عجیب و غریب وضع کا سایہ دیکھا تھا جو تیزی سے ایک جانب کو لپک گیا تھا۔ اس نے اسے اپنے دم یا کسی چھوٹے موٹے آوارہ جانور پر محمول کیا تھا۔ تاہم سردست خاموش رہا۔

یہ ناچوں دائرے کی صورت میں ایک گول فولڈنگ ٹیبل کے گرد اسی طرح کی چیز پر بیٹھے تھے۔ شوکی کو بھی پروفیسر ہنری اپنے ساتھ بٹھایا کرتا تھا۔ باقی ملازمین نندو بابا، شانے، امجد خان اور دونوں فوجی ان کے گرد کھڑے غور سے پروفیسر کی باتیں سن رہے تھے۔ البتہ شوکی کو پروفیسر کے ساتھ والی کرسی پر بٹھائے جانے پر رابرٹ نے ناگ بھوں ضرور چڑھائی تھی۔

ایک نیا اور چونکا دینے والا موضوع چھڑ جانے کے باوجود شوکی گم گم شہ شب والے واقعے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ پروفیسر ہنری سے رابرٹ کی شکایت کرے یا نہیں..... کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ رینا ناراض ہو سکتی تھی۔ نجائے ان کا آپس میں ایسا کیا رشتہ تھا کہ رینا، رابرٹ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے محتذبھی؟
”انکل ہنری! اس بستی کو تو ہم نے آباد کر رکھا ہے۔ ہمارے علاوہ اور تو کوئی ابھی تک نظر نہیں آیا.....؟“ رابرٹ نے بے تاثر سے لہجہ میں کہا۔

”یہ سب اس وقت ہوا ہے جب ہم لوگ گہری نیند میں

پڑے سو رہے تھے۔“ ہنری بولا۔

”اب آپ ہی بتائیے جناب! آپ کو ایسا کیوں اور کیسے محسوس ہوا کہ یہاں کوئی اور لوگ بھی آئے تھے؟“ اس بار امجد نے سوال کیا۔

”وہ لوگ جو کوئی بھی تھے، اس بستی کے پاسی ہیں۔ دن بھر میں کہیں چلے جاتے ہیں اور رات کے کسی پہر لوٹتے ہیں۔ یہ اسن پسند لگتے ہیں اور یہ بے چارے شاید کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔“ ہنری مرنغور سے انداز میں کہے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک جوش سا امیر محسوس ہوتا تھا۔ اس میں رخ کی خوشی بھی تھی اور کچھ کرنے کا جذبہ بھی۔ اس نے بات جاری رکھی اور آگے بولا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں اپنی بہم کی پہلی منزل پر پہنچ چکا ہوں..... میری علمی تحقیق کا آغاز اسی راکاشی قبیلے کی بستی سے ہوگا۔ یہ لوگ کیوں اور کیسے اس حال کو پہنچے، میں نے نہ صرف اس کا محو لگنا ہے بلکہ ان کی مدد بھی کرنا ہے۔“

”بات اب بھی کلیئر نہیں ہوئی ہے انکل ہنری!“ گارشیانے کہا۔ وہ سب سے زیادہ تجسس ہو رہی تھی۔ ”آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ وہ یہاں آئے تھے؟“

”ان کے جیروں کے نشانات..... جو بے ظاہر انسانی لگتے ہیں، مگر کسی مجبوری کی بنا پر یہ چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور ہیں..... یہ رات کو آئے تھے اور پھر چلے گئے۔ نجائے کہاں جاتے ہیں اور کیوں.....؟“ یہیں سب محسوس آیا۔

”میں نے کل رات ایک ایسا ہی سایہ اپنے جیسے کے باہر دیکھا تھا مگر میں نے اسے اپنا دم سمجھا تھا۔“ بالآخر شوکی بولا۔ ہنری نے مسکرا کر کہا۔

”یقیناً دیکھا ہوگا.....“ پھر وہ کرسی چھوڑتے ہوئے بولے۔ ”انگلے کوچ کی تیاری کرو..... اب ناگرہ پہنچ کر اپنا بیس کمپ سنبھالنا ہے۔ میں دوبارہ یہاں آؤں گا، کیونکہ یہ جگہ یہاں سے دور نہیں ہے۔“

ایک بار پھر کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس نے انکشاف کے بعد ہر کوئی اپنے اندر ایک عجیب سی سستی محسوس کر رہا تھا۔ ہر کسی کو تجسس ہو رہا تھا کہ آخر پتا تو چلے یہ پراسرار چکر تھا کیا.....؟

ناگرہ یہاں سے چند سوکوس کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ رواجی کے وقت سے ذرا پہلے جب شوکی تھا اپنے خیمے میں ضروری سامان باندھ رہا تھا کوئی اندر داخل ہوا..... کسی کی آہٹ پر اس نے گردن گھما کر دیکھا تو چونک پڑا۔

جاری ہے



جیون دان

وسیم بن اشرف

کہتے ہیں جتنی جس کی سانس... اتنی اس کی آس مگر ایک دوسرے کے لیے جینے مرنے والے فقط ایک لمحے میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کسے کس کے لیے جینا اور مرنے... اپنے لیے یا دوسروں کے لیے... اور اسی ایک لمحے پر مشتمل یہ تحریر بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔

جیون دان کرنے والے ایک مخلص دوست کا قصہ

ستمبر کی سہانی شام تھی، آسمان پر بادلوں کے تیرتے ٹکڑوں کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ سمندر کی لہریں ہوا کے خوشگوار جھونکوں کے ساتھ جھوڑھیں۔ شاندار بحری جہاز دھیرے دھیرے سمندر کا سینہ چیرتا اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ مسافروں میں سے کچھ اپنے کینوں میں آرام کر رہے تھے، کچھ ڈانٹنگ ہال میں پیٹ پوجا میں مصروف تھے۔ بہت سے ڈیک پر سمندر کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ڈیک پر ہی دونو جوان ریٹک کا سہارا لیے لہروں کا رقص

دیکھ رہے تھے مایک نوجوان جس کے بال سنہری اور آنکھیں گہرے نیل رنگ کی تھیں اپنے سامھی سے مخاطب ہوا۔
 ”جانتے ہو علی یہ لہرس کہاں جا رہی ہیں؟“
 علی نے دوست کے سرخی مائل حسین و جمیل چہرے پر نظر ڈالی اور جواب دیا۔
 ”انگلیش..... کیونکہ یہ ہمارے جہاز کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔“

”کیا یہ لہرس اس بات سے واقف ہیں کہ ان کی منزل کہاں ہے؟“ نوجوان نے پھر سوال کیا۔
 ”شاید نہیں..... لیکن راجر تم ایسے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟“ علی بولا، راجر نے گہرا سانس لیا پھر بولا۔
 ”انسان کی زندگی بھی ان لہروں کی طرح غیر یقینی ہے، کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کہاں ہے لیکن پھر بھی سب چل رہے ہیں، جیسے چلتے رہنا ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔“

علی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ شاعروں کے سوچنے کی باتیں ہیں، ہم سپاہی ہیں، ہمارے سوچنے کا انداز دوسرا ہونا چاہیے۔“
 راجر نے فوری جواب دیا۔ ”تم غلط کہتے ہو علی، سپاہی ہونے سے انسان کے جذبات بدل نہیں جاتے مثال کے طور پر سوئی چھوٹے سے سپاہی کو بھی انتہائی درد ہوگا جتنا کسی شاعر کو ہوگا۔“

علی خلا میں گھومتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تو اتنا جانتا ہوں کہ شاعر ایک خیالی دنیا کا باشندہ ہوتا ہے لیکن زندگی کے بارے میں ایک سپاہی کا نظریہ دوسرا ہی ہوتا ہے، وہ دشمن کو انجام تک پہنچا کر دوست کی بقا کا ذریعہ بنتا ہے، اس کے دل میں دوسروں کے لیے قربانی دینے کے جذبات ہوتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ راجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایسے کتنے سپاہی ہیں جن کے دل میں دوسروں کے لیے قربانی دینے کے جذبات اتنے مستحکم ہو چکے ہیں کہ وہ صرف اپنے منہ پر کی آواز پر اپنا مناسب کچھ بچھاؤ کر دیتے ہیں۔ میں خارجی حالات کی بات نہیں کر رہا ہوں جن سے مجبور ہو کر کبھی کبھی انسان کو اپنے جذبات کے خلاف بھی کوئی کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ میں تو صرف ایسے لوگوں کی تعداد پوچھ رہا ہوں جو اپنی خوشی سے دوسروں کا جیون روشن کرنے کے لیے اپنے جیون کا دیپ خود ہی بجھا دیتے ہیں۔“

علی نے سر کھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مگنی تو میں بھی نہیں کر سکتا، لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ صرف ایسے ہی لوگ حقیقت

میں انسان کہلانے کے مستحق ہیں اور میں ان کی عظمت کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرتا ہوں۔“
 اسی وقت ماحول میں ٹھنکتا ہوا قہقہہ گونج اٹھا، دونوں نے ہلٹ کر دیکھا تو مسز فرم اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی آ رہی تھیں۔ قریب آ کر مریاں بیوی نے راجر اور علی سے موسم کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد مسز فرم بولے۔

”اچھا دوستو! پھر ملیں گے، اس وقت ہم ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔“
 علی نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے آپ ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں؟“

مسز فرم زور سے ہنس پڑیں، پھر بولیں۔ ”بردستی سے مجھے دو تین پینٹیکس کیا آگئیں کہ انہیں وہم ہو گیا کہ میری طبیعت ناساز ہے، اب زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔“

راجر ہنس پڑا، کہنے لگا۔ ”آپ تو بڑی خوش نصیب ہیں کہ اتنی محبت کرنے والا شوہر ملا ہے آپ کو، مجھے تو شک آتا ہے آپ کی زندگی پر۔“
 مسز فرم کے لبوں پر تبسم تھا، کہنے لگیں۔ ”ضرورت سے زیادہ محبت کبھی کبھی مصیبت بن جاتی ہے۔“
 مسز فرم نے اس کا ہاتھ چمچتے ہوئے کہا۔ ”اب چلو گی بھی یا یونہی باتیں بناتی رہو گی۔“

پھر ملنے کا وعدہ کر کے دونوں رخصت ہو گئے، علی آسمان پر تیرتے بادلوں کے رنگین ٹکڑے دیکھنے لگا۔ شام کے ڈوبتے سورج نے فضا کو چمکدار اور دلکش رنگوں سے سجا رکھا تھا۔ علی کی نظریں آسمان سے پھسلتی ہوئی پانی کے چپکے تخت پر دو رنگ پھسلتی چلی گئیں۔ خود کھادی کے انداز میں بولا۔ ”دو دن اور دو راتیں، پورے اڑتالیس گھنٹے ابھی پانی میں سفر کرتا ہے۔“

علی نے پوچھا۔ ”راجر ڈیم سیدھے وینٹ دتھ جاؤ گے، روتھ کے پاس؟“

”اس بھری پری دنیا میں میرا صرف ایک ہی ٹھکانا ہے۔“ راجر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ علی نے پھر سوال کیا، ”تمہیں پورا یقین ہے کہ روتھ تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی تم اس سے کرتے ہو؟“

راجر پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”وہ مجھ سے کہیں زیادہ پیار کرتی ہے، اس کی محبت میں بناوٹ نہیں ہے، وہ تصنع سے پاک ہے۔ جب میں انگلیٹڈ سے رخصت ہو رہا تھا تو میں نے اس کو شادی کی پیشکش کی تھی، پتا ہے اس کا جواب کیا تھا، اس

گویا

○ پیار تو اندھا ہوتا ہے گویا لیکن پیار کرنے والوں کی تو آنکھیں ہوتی ہیں۔

○ پیار کرنے والوں کی ”آنکھیں جاڑ“ ہوتی ہیں گویا لیکن انہیں دیکھنے والی آنکھیں ہزار ہوتی ہیں۔

○ پیار کرنے والے کسی سے نہیں ڈرتے گویا سوائے محبوبہ کے بھائی کے جوتوں سے۔

○ پیار کیا نہیں جانتا، یہ تو بس جو جاتا ہے گویا تو جب پتا چلے کہ گویا ہے تو کرنا چھوڑ دو۔

○ پیار میں بھوک پیاس اڑ جاتی ہے گویا لیکن عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔

○ پیار کرنے والوں کی آنکھوں سے نیند روٹھ جاتی ہے گویا کیونکہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب بننے لگتے ہیں، جو سچی سچ نہیں ہوتے۔

○ پیار دو دلوں کا بھوک ہے گویا دو زندگیاں کا روگ ہے۔

○ پیار آنکھوں کا نور ہے گویا عقل کا فتور ہے۔

○ پیار جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے گویا خود کشی کے طریقے سکھاتا ہے۔

○ پیار جذبات کی خوبصورتی کا نام ہے گویا اعصاب کی خشکی کا نام ہے۔

○ پیار میں ہر موسم سہانا لگتا ہے گویا پھر شادی کے چند دنوں بعد ہی اپنی اس سوچ پر بچھتا پڑتا ہے۔

○ تبسم نہ..... لاہور

ایسی بھگدڑ میں نہ جانے کتنی عورتیں اور بچے سیزمی سے پھسل کر کبھی نہ اٹھنے کے لیے بیچے جا کرے، لوگ انہیں کھلتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاز میں قیامت مفری پیا ہو چکی تھی۔ جہاز کے ذمہ دار افسروں نے جان بچانے والی چھوٹی کشتیاں پانی میں اتارنا شروع کر دیں، پہلی کشتی میں ہی اتنے مسافر بھر گئے کہ وہ بوجھ برداشت نہ کر سکی، مسافروں کی ہڑ بھگ نے معاملہ اور بھی خراب کر دیا۔ پہلی کشتی نے چند چکر کاٹے اور متعدد مسافروں سمیت غرق آب ہو گئی، جہاز میں کشتیاں کم اور مسافر زیادہ تھے، پہلی کشتی کا بھیا تک انجام دیکھ کر جہاز کے افسروں نے فیصلہ کیا کہ جتنے مسافر بچ سکتے ہیں ان کو بچا لیا جائے جو رہ گئے، وہ خدا کے سپرد۔

لے کہا تھا، راجر شادی دلوں کی ہوتی ہے جسم کی نہیں، یہ تو دو رگوں کے ملاپ کا نام ہے، ہماری شادی ہو چکی ہے، اس وقت ہمیں تمہارا فرض پکار رہا ہے، میں تمہارے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی۔“

علی دو راس لکیر کو دیکھنے لگا جو آسمان اور سمندر کے ملنے سے بن گئی تھی، سورج کی کرنیں طویل مسافت کے بعد مٹیالے پانی کو چومنے آئی تھیں، ماحول کچھ اور گھبر گیا تھا۔

راجر نے..... کیونکہ کھوئے لہجے میں..... پوچھا۔
”علی تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“ علی نے راجر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

”دوست“ مجھے محبت کرنے کے لیے کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ بچپن میں ہی میرے باپ کی بیٹائی ختم ہو گئی، جس عمر میں بچے پریوں کی کہانیوں سے دل بہلاتے ہیں، اس عمر میں مجھے بہت کاہنم سرور کرنے کی فکر لگ گئی تھی، تب سے اب تک میری زندگی کشمیں کے پیسے کی طرح گھوم رہی ہے۔“

راجر کا دل بھرا آیا، وہ بولا۔ ”سنو علی! جنگ ختم ہو چکی ہے، طویل عرصہ بعد زندگی میں سکون اور فرصت کے لمحات میسر آئے ہیں، تم کچھ دن میرے ساتھ وینٹ درتھ چلو، تھوڑا گھوم بھر کر اپنے گھر چلے جانا۔“

علی نے راجر کا ہاتھ تمام لیا اور کہنے لگا۔ ”تمہارے اس غلوں کا شکریہ، لیکن میں سیدھا گھر جاؤں گا، میرے بوڑھے ماں باپ میری راہ تک رہے ہوں گے، میں ان کی زندگی کا واحد سہارا ہوں۔“

اسی اثنا میں جہاز تھوڑا سا ڈمگھایا، دونوں بہ مشکل سنبھلے۔ جہاز کے انجن والی جانب سے شور سنا سنی دیا، ابھی وہ اس شور کی وجہ بھی نہ جان پائے تھے کہ خطرے کا الارم بج اٹھا، ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی، ہل چل بچ گئی، مسافروں کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ ہر کوئی پریشانی کے عالم میں تھا، اسی دوران لاڈ آئیکر پر پاکستان نے اعلان کیا کہ مشرق کی جانب سے خوفناک طوفان آ رہا ہے، جہاز خطرے میں ہے۔

مسافروں کو جیسے سانپ سوکھ گیا ہو، اوپر آسمان نیچے گہرا سمندر، ابھی مسافر سنبھلتے ہی نہ پائے تھے کہ طوفان سر پر آ پہنچا، چھوٹی چھوٹی لہریں پانی کی اونچی دیواروں میں تبدیل ہو کر جہاز سے ٹکرانے لگیں، اچھا خاصا بڑا جہاز کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈمگھانے لگا۔ چاروں طرف سے جہاز میں پانی بھرنے لگا۔

مصلیٰ کی بھرپور کوششوں کے باوجود صورت حال قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ مسافر اس قدر ترقی افتادہ گھبرا کر اوپر والی منزل کی جانب بھاگنے لگے، کبھی کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے راجر کی طرف غور سے دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر موت کی پرچھائیں اسے دور دور تک نظر نہ آئیں۔ علی نے قدم آگے بڑھنا چاہے لیکن جیسے اس کی ٹانگیں کسی نے جکڑ لی ہوں، اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں، اس نے طوفانی موجوں کو دیکھا جو جہاز کو گھٹنے کے نیچے بے قرار نہیں پھر ایک نظر اس چھوٹی کشتی پر ڈالی جو موت کے اسبج پر زندگی کا گیت گنگنا رہی تھی۔ راجر نے علی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور دھیرے سے بولا۔

”تم علی اپنے بوڑھے والدین کا واحد سہارا ہو، اگر تم نہ رہے تو وہ بے موت مرجائیں گے، تمہیں نئی زندگی مبارک ہو، جاؤ اور اپنے والدین کی خوب خدمت کر کے اپنی آخرت سنوار لو۔“

”لیکن..... لیکن روتھ..... وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے، میرے دوست۔“ علی غم آگھوں سے بولا۔

”وہ زندگی بھر میرا انتظار کر سکتی ہے، میں جانتا ہوں اس میں اتنی ہمت ہے۔“ راجر بولا۔ ”کبھی کبھی اسے سیری یاد آئے گی کہ وقت بڑے بڑے گھاؤ بھر دیتا ہے، اس کا دکھ بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جائے گا پھر بھی زندگی میں اس کے دل و دماغ سے نکل جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے راجر بخیریدہ ہو گیا، علی نے اسے گلے لگا کر زور سے پیچھا، اس کے ماتھے پر الوداعی بوسہ دیا اور پیچھے دیکھ کر بغیر اپنی کشتی میں اتر گیا۔ وہ کشتی میں بیٹھا ڈوبے جہاز کو دیکھ رہا تھا، کشتی دھیرے دھیرے دور ہونے لگی اسے راجر جہاز کی سیزم پر کھڑا ہاتھ ہلاتا نظر آیا، اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ لگا لگاتے والے جینکوں سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پانی کی ایک بڑی لہر نے جہاز کو سمندر کا لقمہ بننے پر مجبور کر دیا، جہاز پر چٹخ پکار مچی ہوئی تھی، بے بسی کی موت مرنے والوں کی دل دہلا دینے والی جینکوں سے شاید آسمان کے بھی آنسو نکل پڑے تھے۔ آسمان سے بوندیں برس رہی تھیں۔

راجر ڈوبنے کے آخری کونے پر رینگتا تھا اسے آسمان کو الوداعی نظروں سے دیکھنے لگا، جہاز دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ جہاں راجر کھڑا تھا وہ حصہ بھی تباہ ہو گیا، راجر نے آنکھیں بند کر لیں اور بند مٹی والا ہاتھ بلند کر لیا، ڈوبتے ڈوبتے جب مٹی بھی غرق آب ہوئے گی تو اس نے بند مٹی کھول دی۔ اس کی مٹی سے ایک پرہی نکل اور سب آج پر تیرنے لگی، اس دوسری پرہی پر مٹی کا ہی نام لکھا ہوا تھا۔

جہاز کئی پتنگ کی طرح پانی میں پکارا ہوا تھا۔ پانی بہت تیزی سے بھر رہا تھا، نکاسی آب کے راستے کھولنا صورت حال کو مزید خراب کرنے کے مترادف تھا۔ مسافروں کو سامنے موت نظر آ رہی تھی، دل بری طرح دھڑک رہے تھے، ہر کسی کو شدت سے اپنی باری کا انتظار تھا۔ انتظامیہ نے فوری فیصلہ کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے گی، جن جن کا نام نکلے گا وہ خوش نصیب کشتیوں میں اتارے جائیں گے، چنانچہ کشتیوں میں صرف انہی افراد کو اتارا جا رہا تھا جن کا نام قرعہ اندازی میں نکل رہا تھا۔ نام نکلنے کا مطلب زندگی اور نہ نکلنے کا مطلب گویا خوفناک اور بے بسی کی موت تھا اسی دوران مسز فرم کا نام پکارا گیا۔ وہ زندگی کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے لیکن بد قسمتی سے مسز فرم کا نام نہیں نکلا تھا۔ فرم نے بیوی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کشتی میں اتر گئے۔ مسز فرم شوہر کی سنگ دلی پر رو پڑیں۔ کہنے لگیں۔

”ڈرائنگ ٹیم تو مجھے جان سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے اب موت کے حوالے کر کے جا رہے ہو۔“ فرم نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کشتی میں اترنے کی جلدی کی۔ اس نے صرف ایک بار اپنی بیوی کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ یقیناً یہی سوچ رہا تھا کہ بیوی تو اور بھی مل سکتی ہے لیکن زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔

علی اور راجر نے گہری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی قسمت کا فیصلہ بھی ہونے والا تھا کہ اچانک راجر آگے بڑھا اور نائب کپتان سے مخاطب ہوا۔

”جی فرمائیں۔“ کپتان نے جواب دیا۔
 ”میں اور علی ویرینہ دوست ہیں، ہم اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ بھی خود کرنا چاہتے ہیں۔“ راجر نے جواب دیا۔
 ”کیا مطلب؟“ کپتان نے استفسار کیا۔
 ”ہم اپنی پرہی خود نکالیں گے آپ دو پرچیاں اور قلم عنایت کر دیں۔“ راجر بولا۔

نائب کپتان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، اس نے فوراً دو پرچیاں اور قلم راجر کو دے دیا۔ راجر نے دونوں پرچوں پر نام لکھنے کے بعد اچھی طرح تیکہ اور کپتان کو قلم لوٹانے کے بعد بولا۔ ”پرہی بھی آپ ہی اٹھائیے گا۔“ راجر نے دونوں ہاتھوں میں پرچوں کو اچھی طرح ہلایا اور مٹی کھول دی، کپتان نے ایک پرہی اٹھائی۔

”مسٹر علی تمہیں زندگی مبارک ہو۔“ علی کے نام کی پرہی نکلنے پر وہ بولا۔ ”راجر نے دوسری پرہی مٹی میں بیچ دی،

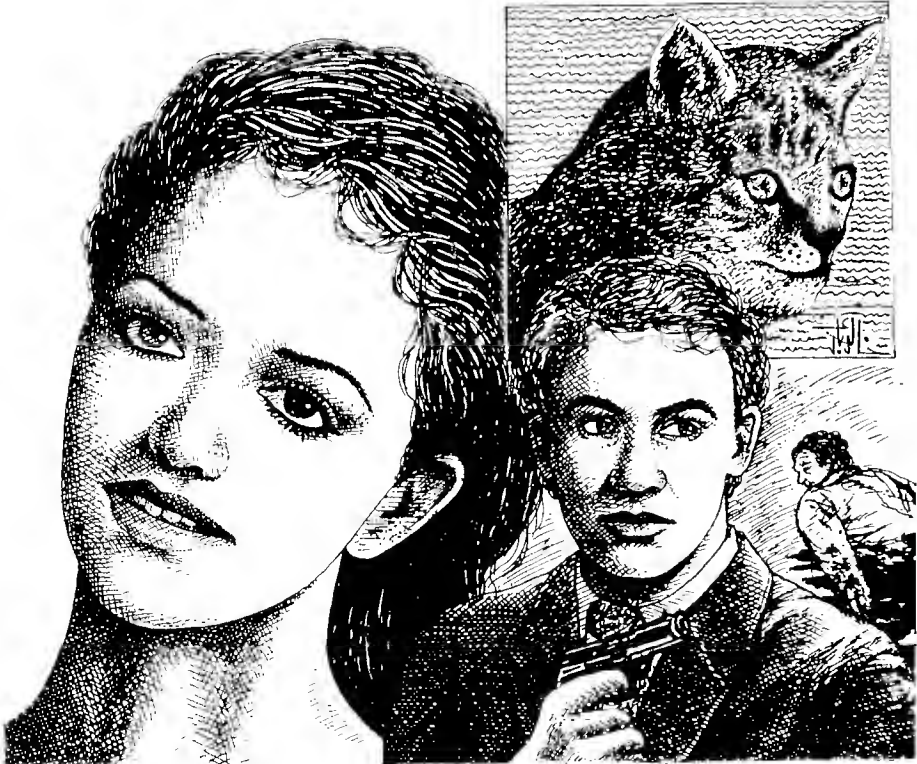
تیسرا کوشش

تویہ ریاض

جسے جان سے گزرنا ہوتا ہے کتنے ہی جی جان سے اس کی حفاظت کرلی جائے... وہ گزر ہی جاتا ہے اور جسے جینا ہوتا ہے اس کی جان کے دشمن بھی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی اسرار بھرے معاملات یہاں بھی چل رہے تھے جب وہ شریک سفر کسی کے ساتھ مجرمانہ سرگرمیوں میں شریک ہوا تو ان کا سفر بھی اپنی سمت بدل گیا۔

قاتل سے متول بننے والے ایک مجرم کی کارروائی کا اجرا

”کیا کہہ رہی ہو؟“
”کچھ نہیں۔“ جینی نے بے پروائی سے کہا۔
”میرا خیال ہے کہ مجھے دفتر واپس جانا چاہیے۔ کافی کام کرنا ہے۔“
میسوزیم میں رکھے ہوئے چھوٹے سے سیاہ رنگ کی بلی کے جیسے کو دیکھ کر جینی نے بے ساختہ کہا۔ ”شاید قدیم مصری بلیوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔“ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا اس کا شوہر جان مارک اس کی بات نہ سمجھ سکا بولا۔



میوزیم کی چھوٹی سی دکان سے وہ بلی کا مجسمہ خریدا اور گھر آگئی۔ کالج کے دروازے پر ایک اصلی بلا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ اور سفید تھا اور وہ اس کے پڑوس میں رہنے والی عمر بیوہ کی ملکیت تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا تاکہ جینی اس کی کسر پر ہاتھ پھیرے لیکن وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور اوپر اپنی اسٹڈی میں چلی گئی۔

کالی ایڈیٹنگ نہیں بھی ہو سکتی تھی اور وہ زیادہ تر کام اپنے ہی گھر میں کرتی۔ کبھی کبھار وہ لندن کا چکر بھی لگاتی۔ اس کے والدین کالی کی دولت مند تھے اور ان کا تعلق ڈاکٹری کے پیشے سے تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ جینی بھی کوئی ایسا ہی کام کرے۔ جینی کو بڑے ہو کر احساس ہوا کہ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس کا باپ اس وقت امریکا جب وہ نو عمر تھی اور ماں کا انتقال ایک سال پہلے ہوا تھا۔ ان کی ساری دولت اس کے حصے میں آئی۔ اس کی ملاقات جان سے اس وقت ہوئی جب وہ اپنی ماں کا فرانسیسی مکان فروخت کرنے یہاں آئی۔ چھ ماہ بعد اس نے جان سے شادی کر لی اور فارم ہاؤس فروخت کرنے کے بجائے وہ جان کے ساتھ اس میں منتقل ہو گئی۔

اس نے مجسمے کو کاغذ کے تھیلے سے نکالا اور ہتھیلی پر رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔ جب جان کام پر چلا جاتا تو وہ دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ایک بلی پالے لیکن جان کو بلیوں سے الرجی بھی لہذا وہ اس چھوٹے سے مجسمے سے ہی دل بہلا سکتی تھی۔ قدیم مصری تہذیب میں بلیوں کو بہت مقدس مانا جاتا تھا۔ اس نے اپنا بلی ٹاپ کھولا اور اس بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرنے لگی۔ قدیم مصری تہذیب میں بلی کو ادھار کا درجہ حاصل تھا اور اسے خوشی، محبت اور راحت کی دیوی سمجھا جاتا تھا۔

اس نے ایک جمالی بلی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مشرق دیکھنے سے اسے نیند آتی تھی۔ اس نے سوچا کہ باہر کا ایک چکر لگایا جائے۔ اس نے گھر کو تالا لگا دیا اور اس سڑک پر جانے لگی جو جنگل کی طرف جاتی تھی پھر اسے میڈیٹلین کا خیال آیا جو ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی جو کسی ماہر جنگلات کی ملکیت تھا۔ وہ وہاں سے گزر رہی تھی کہ میڈیٹلین باہر آگئی۔ وہ ان عمر رسیدہ فرانسیسی عورتوں میں سے تھی جو اپنا خیال رکھتی ہیں۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے جنگ کے زمانے میں ایک جرمن سپاہی کو قتل کیا تھا جو فرانسیسی فوج کی سپلائی لائن کو سمیٹا ڈکڑا رہا تھا گوکہ کبھی اس

ان کی ملاقات کھانے کے وقتے میں ہوئی تھی اور وہاں سے وہ میوزیم آگئے تھے۔ ان دنوں وہ قدیم مصریوں پر ایک کتاب کی ایڈیٹنگ کر رہی تھی اور بولون کے اس عجائب گھر میں مصری نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔

”میں جلدی گھر آ جاؤں گا۔“ جان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور گیلری عبور کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ ایک عورت اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی، جب اس نے دیکھا کہ جینی بھی اسے ہی دیکھ رہی ہے تو اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اکثر کئی عورتیں اس کے شوہر کو دیکھنے لگتیں۔ ”دفع کرو۔“ اس نے سوچا۔ ”وہ میرا ہے صرف میرا۔“ اس میں ان عورتوں کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ اتنا خوش شکل اور میڈم تھا کہ سب کی نظریں اس پر جم ہی جاتیں۔ جینی دوبارہ شوکیں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ وہاں مٹی سے بنی ہوئی بہت سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہ بلی کا مجسمہ اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی عورت تھی جو جان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تقریباً جینی کی ہی ہم عمر تھی۔ اس کا چہرہ پُر کش اور لمبے سیاہ بال تھے۔

”معاف کرنا میڈم۔ وہ شخص.....“

جینی اس کی پوری بات نہیں سمجھ سکی۔ گوکہ اس کی فرانسیسی بہتر ہو رہی تھی لیکن اب بھی اسے لوگوں کی بات سمجھنے میں مشکل ہوتی تھی۔

”تم بہت تیز بول رہی ہو۔“ جینی نے کہا۔

”اوہ میں سمجھی۔ تم انگریز ہو۔“ اس عورت نے کہا۔ وہ شخص جو ابھی تمہارے پاس سے گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے جانتی ہوں۔ کیا وہ تمہارا دوست ہے؟“

”نہیں۔ وہ میرا شوہر ہے۔“

”تمہارا شوہر۔ کیا وہ دیل ہے اور اس کا تعلق بینریز سے ہے؟“

”نہیں وہ یہیں بولون میں اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔“

جان مارک کسی زمانے میں قانونی معاون تھا لیکن وہ لیون کا رہنے والا تھا اور بولون آنے سے پہلے اس نے کچھ عرصے بیرس میں اسٹیٹ ایجنٹ کے طور پر کام کیا تھا۔ بینریز نامی قصبہ فرانس کے جنوب میں کہیں واقع تھا اور جینی جانتی تھی کہ وہ بھی وہاں نہیں رہا۔

”معذرت خواہ ہوں۔“ عورت نے کہا۔ ”مجھے یقین تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور وہاں سے چلی گئی۔ جینی نے

نے اس کا اعتراف نہیں کیا لیکن تردید بھی نہیں کی۔
جینی اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ ان کے درمیان ہائے ہیومن ضرور ہوتی لیکن میڈیٹلین نے بھی اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کی حالانکہ اس کا رویہ غیر دوستانہ نہیں تھا۔ وہ پڑوسی ہونے کا حق ادا کر رہی تھی لیکن اس کا رکھ رکھاؤ اکثر خوفزدہ کر دیتا تھا۔ اس روز اس نے جینی کو اشارہ کیا اور فرانسسیسی میں کچھ کہا جو وہ نہ سمجھ سکی۔

اس نے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے جہاں بہت دور سے فار کی آوازیں آرہی تھیں۔ جب جینی کی سمجھ میں آیا۔ جنگل میں شکاری آگئے تھے۔ وہ جنگلی خنزیر اور خرگوشوں کی تلاش میں تھے۔ وہ یہ بات پہلے سے جانتی تھی کہ شکار کا موسم شروع ہونے کے بعد جنگل کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ ہر سال کئی لوگ حادثات کا شکار ہو جاتے تھے لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ سڑک پر محفوظ ہے جبکہ میڈیٹلین اسے آگے جانے سے روک رہی تھی۔

جینی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور یہ سوچتی ہوئی گھر آگئی کہ اب وہ موسم بہار کی آمد تک جنگل کی طرف چہل قدمی کے لیے نہیں جاسکے گی۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو اسے فون کی کھٹی کی آواز سنائی دی۔ جان کا فون تھا کہ اسے گھر آنے میں دیر ہو جائے گی۔ ایک پارٹی بڑا مکان خریدنا چاہ رہی ہے لیکن وہ لوگ کل صبح بوکے واپس جا رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں دیر تک کام کرنا ہوگا میں اور آرئلڈ کچھ کھالیں گے۔

ان دنوں وہ کبھی کبھار دیر تک کام کرتا تھا۔ یہ ایک اچھی بات تھی اور اس کا مطلب تھا کہ جائداد کی خرید و فروخت میں تیزی آگئی ہے۔ جینی نے آلیٹ بتا کر کھالیا اور اسٹڈی میں چلی گئی۔ اس نے نو بجے تک کام کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بستر پر ہی اس نے نیٹ پر مقامی اخبار کا مطالعہ کیا۔ وہ باقاعدگی سے مقامی خبریں پڑھا کرتی تھی۔ اس سے اسے اپنی فرانسیسی بہتر بنانے میں مدد ملتی تھی۔ زیادہ تر خبریں گھروں میں آتشزدگی اور کار حادثات سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ البتہ بڑی خبر ہالی وڈ سے ہومز میں ڈکیتیوں کی تازہ لہر کے بارے میں تھی۔

وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی جب جان خاموش سے آکر لیٹ گیا اور اس سے چھپڑ چھاڑ شروع کر دی۔ وہ اس کی عادی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن جان کے ہانپنے کی آواز سے دوبارہ

جاگ گئی۔ اس نے اٹھ کر سائنڈ بیڈ کا سوچ آ ن کیا۔ وہ بیڈ کی دراز میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ جینی نے بستر سے چھٹا تک لگائی اور اسے ان ہیلر لاکر دے دیا۔ اس وقت جان کی حالت ایک ڈوبے ہوئے شخص جیسی تھی۔ اس نے بھی اسے اتنا تیار نہیں دیکھا۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ وہ عجیب سی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں باہر نکلی رہی تھیں۔

اس نے ان ہیلر ناک سے لگایا اور بہ مشکل اتنا کہہ سکا۔ ”ہلی..... بستر پر۔“
”میں دیکھتی ہوں۔“

اس نے پورے گھر کا چکر لگایا۔ تمام بیتیاں جلا دیں اور کرسیوں کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہنری کسی طرح اندر آ گیا ہو لیکن اسے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ ”وہاں کوئی نہیں ہے۔“ اس نے جان کو بتایا۔

جان کا سانس اب اعتدال پر آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرے سینے پر ایک بو جھٹکا۔ نرم بالوں سے بھرا ہوا۔“
”شاید تم نے خواب میں ایسا محسوس کیا ہو کیونکہ تمہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔“

”شاید۔“ اس نے بے یقینی کے انداز میں کہا اور نیچے پر سر رکھ دیا۔

اسکے ویک اینڈ پر موسم خوشگوار تھا۔ وہ پکنک منانے گئے اور شام کو اپنے پسندیدہ ریسٹوران میں چھوٹی بھیڑ کا تمکین بھنا ہوا گوشت کھایا۔ کار میں بیٹھے ہی جینی پر غنودگی طاری ہو گئی پھر اچانک ہی ایک دھماکا ہوا اور زور سے بریک لگنے کی آواز آئی۔ وہ آگے کی طرف جھکی لیکن سیٹ بیلٹ نے اسے گرنے نہیں دیا۔

”یہ کیا تھا؟“ وہ متحش ہوتے ہوئے بولی۔

”معاف کرنا سوچی۔“ جان بولا۔ ”سڑک پر کوئی جانور آ گیا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے جس کے جسم پر سیاہ اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ ہاں۔ بچہ۔ وہ نیو لے کی ٹیل کا ہوتا ہے تم ٹھیک تو ہو؟ بس ہم گھر پہنچنے ہی والے ہیں۔“ اس نے کار دوبارہ اسٹارٹ کی اور اپنے گھر کے ڈرائیوے میں لاکر کھڑی کر دی۔

”کیا وہ تمہاری کار سے ٹکرایا تھا؟“

”وہ بھاگ گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ زخمی ہوا ہوگا۔“
اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس نہیں تھیں البتہ سیکوٹی کے لیے بیتیاں جل رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

آ گیا تھا۔ اگر وہ ہنری ہوا تو..... ہو سکتا ہے کہ کم روشنی میں جان کو نظر نہ آیا ہو اور وہ ہنری کو بوجھ بیٹھا۔ اسے یاد آیا کہ جان نے اس جانور کو دیکھنے کے باوجود کار نہیں روکی اور بجو کو نگر مارنے کے بعد ہی بریک لگایا، اگر وہ واقعی بجو ہی تھا۔

شام کو اس نے جان کو ہنری کی کشدگی کے بارے میں بتایا تو اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تاہم اس نے ہنری اور میڈیلین کو اسپتال لے جانے والی بات گول کر دی اور نہ ہی یہ بتایا کہ جب ہنری ٹھیک ہو جائے گا تو وہ اسے لینے اسپتال جائے گی۔ البتہ اس نے جان سے یہ ضرور پوچھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بجو ہی تھا... کہیں تم نے ہنری کو تو لکڑ نہیں ماروی؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پورا یقین ہے ڈارلنگ۔ سیکورٹی لائسنس روشن تھیں اور میں نے واضح طور پر دیکھا تھا۔ وہ جانور بلی سے بہت بڑا تھا اور اس کی شکل بھی مختلف تھی۔“

وہ غسل کرنے گیا تو جینی بستر پر لیٹ کر مقامی اخبار پڑھنے لگی۔ اس کی شرسرخی تھی، ڈسٹنٹ میں ایک عورت کا پراسرار قتل، ڈسٹنٹ ساحل کے کنارے ایک چھوٹا سا خوب صورت ریسورٹ تھا۔ وہ بھی کبھار وہاں جاتے تھے۔ اس نے خبر پڑھنا شروع کی۔ عورت کی لاش ایک خالی کمرے میں پائی گئی۔ اسے گلا کھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ابھی لاش کی شناخت نہیں ہو سکی۔ ابھی یہ واضح نہیں ہے کہ اس قتل کا تعلق ڈکیتی کی واردات سے ہے۔

جان غسل کر کے واپس آیا اور بستر میں کھس گیا۔ اس نے معمول کے مطابق چھبڑ چھاڑ شروع کر دی۔ جینی نے بھی گرم جوشی سے جواب دیا اور کچھ دیر کے لیے وہ دنیا کو بھول گئے پھر وہ سو گیا اور جینی پہلو میں لیٹی اس کے خراٹوں کی آواز سنتی رہی۔ وہ اس کا شو ہر تھا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی اور وہ اس پر بورا بھروسا کرتی تھی۔ ٹھیک ہے اسے بلیاں پسند نہیں تھیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہنری کو مار دے پھر اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اگر جان کی گاڑی نے کسی جانور کو نگر مارا ہو تو اس کا کوئی نہ کوئی نشان کار پر ضرور ہوگا مثلاً خون یا کھال کے بال۔

وہ خاموشی سے ابھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ سیزمیاں اتر کر اس نے کوٹ پہنا اور بچن سے نارچ لے کر گھر سے باہر چلی گئی جہاں جان کی کار کھڑی تھی۔ اس نے نارچ روشن کر کے کار کے اگلے حصے کو غور سے دیکھا۔ اگلے پچیسے کے کنارے پر اس کی اگلیاں بالوں کے نیچے سے

دو دن بعد صبح کے وقت میڈیلین اس کے دروازے پر آئی۔ جینی اس وقت نیٹ پر مقامی اخبار پڑھ رہی تھی جس میں ایک اور ڈکیتی کا ذکر تھا جو وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہوئی تھی۔ تب ہی کھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ جینی نے دروازہ کھولا تو میڈیلین تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ وہ کافی بے چین نظر آ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ ہنری دو دن سے غائب ہے۔ وہ ہمیشہ صبح کو آ جاتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ وہ شاید کہیں بند ہو کر بیٹھا ہو۔

”ہم دیکھ لیتے ہیں۔“ جینی نے کہا۔

وہ گھر سے ہوتی ہوئی باغ میں گئیں اور شیڈ میں دیکھا لیکن وہاں ہنری نہیں تھا۔ وہ پھلوں کے باغ کے آخری کونے تک گئیں اور اس کا نام لے کر کھار۔ جینی کو امید تھی کہ وہ جنگل کی طرف نہیں گیا ہوگا ورنہ خرگوش کے صو کے میں کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بن جاتا پھر انہیں ایک باڑ سے اس کی دردناک میاؤں سنائی دی۔ جینی نے ٹھنوں کے بل جھک کر شاخوں کو ہٹایا۔ ہنری پلکیں جھپک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

لگتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں چوٹ آئی ہے اور وہ شدید تکلیف میں تھا۔ میڈیلین کے پاس کار نہیں تھی اور وہ بس یا اپنی بیٹی پر انحصار کرتی تھی جو اسے ہر شے خریداری کے لیے لے جاتی۔ لہذا جینی اسے اور ہنری کو اپنی کار میں جانوروں کے اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اسے کسی کار نے نگر ماری ہے اور اس کی ٹانگ کو ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ اسے آپریشن کے لیے دو دن اسپتال میں رکنا ہوگا۔

جینی اسے گھر چھوڑنے آئی تو میڈیلین نے اسے خاطر تواضع کے لیے روک لیا۔ اس کا سٹنگ روم جینی کے تصور کے عین مطابق تھا۔ وہاں بھاری فرنیچر، آرائشی چیزیں اور بچوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جب میڈیلین بچن سے کھانے پینے کا سامان لائی تو جینی اس کی جوانی کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مونچھوں والے شخص کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک بندوق اور قدموں میں کتا بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ میرا شو ہے۔“ میڈیلین نے بڑے پیار سے کہا۔

جب جینی واپس جانے لگی تو میڈیلین نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ میچ لیا۔ جینی نے بھی جواب میں ایسا ہی مظاہرہ کیا۔ اسے ایک دوست مل گئی تھی۔ گھر آ کر اس نے غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے لیج کرنے بیٹھ گئی۔ اس دوران وہ بھی سو رہی کہ اس کی گلی میں عام طور پر کاریں نہیں آتیں۔ جان کا کہنا تھا کہ اس کی کار کے آگے ایک بجو

کھراگین گوکہ وہ خون آلود نہیں تھا لیکن بالکل سفید، ملائم اور ربیعہ تھا۔

اگلے روز وہ اپنی میز پر بیٹھی کام کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جان کی کار سے کھرانے والا ہنری ہی تھا لیکن یقیناً اس نے جان بوجھ کر ہنری کو کھر نہیں ماری ہوگی۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جان اتنا سنگ دل بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اس نے کافی بنائی اور نیٹ پر اخبار پڑھنے لگی۔ اس عورت کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی تھیں۔ اس کی ابھی تک شناخت نہیں ہوئی تھی اور پولیس نے اس سلسلے میں لوگوں سے مدد کی اپیل کی تھی۔ اس کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس کی عمر تیس کے لگ بھگ، لمبے گہرے براؤن بال اور ہونٹوں پر رتل کا نشان۔ اس کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں لیکن نیلی فون پر آنے والے ایک پیغام سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ ”بولون پہنچ گئی ہوں۔ تم سے جلد ملاقات ہوگی۔ ایچ۔“

ہیئر میٹ اس کی دوست تھی۔ وہ اس سے لچ میں ملنا چاہ رہی تھی۔ جینی نے اپنا کوٹ اور بیگ اٹھایا اور اس سے ملنے چلی گئی۔ ان دونوں کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی جہاں جینی انگریزی اور ہیر میٹ فراسیسی پڑھ رہی تھی۔ اب وہ خود منچر تھی اور ویک اینڈ پر اپنے دوستوں سے ملنے مارمنڈی جا رہی تھی۔

”تم جان کے ساتھ خوش ہو؟“ ہیر میٹ نے پوچھا۔
لحہ بھر کے لیے جینی الجھ گئی۔ وہ کیا کہتی کہ میرے شوہر نے پڑون کے بلے کو جان بوجھ کر مار دیا۔ وہ کسی صورت میں بھی جان کے ساتھ نا انصافی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہیر میٹ اس کے شوہر کو چما سگھے۔ اس کے کچھ دوست یہ سن کر بڑے حیران ہوئے تھے کہ وہ ایک ایسے شخص سے شادی کر رہی ہے جسے وہ صرف چند ماہ سے جانتی ہے تاہم ہیر میٹ جان کو شروع سے ہی پسند کرتی تھی۔
اسی وقت ایک شخص ان کی میز کے پاس آ کر رک گیا۔ ”جینی! کیسی ہو؟“

وہ جان کا پارٹنر آرنلڈ تھا۔ جینی نے ہیر میٹ سے اس کا تعارف کروایا۔ انہوں نے مصافحہ کیا اور کچھ رکی جیلے ادا کیے۔ آرنلڈ کو ہیر میٹ کے لہجے پر بہت تعجب ہوا تو جینی نے وضاحت کی۔ ”ہیر میٹ فراسیسی پڑھاتی ہے۔“
”تم لوگ باتیں کرو۔ میں کچھ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ آج ہمارا ایک سودا ہو گیا ہے۔“

بے ضرر

سرکس کے منبر نے نوجوان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تمہیں نوکری چاہیے تو شیر کے منبر سے میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ شیر بالکل بے ضرر ہے۔ دودھ پر پلا ہے۔“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”میں بھی دودھ پر پلا تھا لیکن اب گوشت کھاتا ہوں۔“

کن کن سورج

☆ لوگ تو ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوتے..... غم میں کون شریک ہوگا۔

☆ اگر کشت میں لطف نہیں تو تیرے کا انتظار رکھ ہے۔

☆ دنیا کو ہانے والا تنہائیوں میں روتا بھی ہے۔

☆ ناپسندیدہ انسان سے پیار کرو، اس کا کردار بدل جائے گا۔

☆ اگر کیفیت یا کسی نہ بھی میسر ہو تو نماز ادا کرنی چاہیے۔ نماز فرض ہے۔

☆ اس دوست کا گلہ کر رہے ہو جو دھوکا دے گیا۔ گلہ اپنی عقل کا کردار دھوکا دینے والے کو دوست سمجھتے رہے۔

☆ سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے جس کو پہلی بار دیکھنے سے دل تھکنا ہو، میں نے اسے پہلی بار سے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔

چند پسند سود مند

☆ خاموشی بغیر تخت کے بادشاہی ہے۔

☆ دعا مانگتے رہو کیونکہ دعا گناہوں کے داغ ایسے مٹاتی ہے جیسے راو آب اپنے نشانات۔

☆ روز و شب با مقصد طریقے سے گزارو ورنہ ایسے گرجاؤ گے جیسے سوکھے ہوئے پتے۔

☆ اپنا غم کسی دوسرے کو مت سناؤ کیونکہ اس سے دشمن خوش، دوست پریشان اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

☆ باتوں کی لوگوں کی زبان ان کے قابو میں نہیں رہتی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بولتے ہیں۔

☆ ہماری سب سے بڑی خوبی یہ سمجھنا نہ کرنے میں نہیں بلکہ ہر دفعہ کرنے کے بعد انھنے میں ہے اور یہی کامیابی کا راز ہے۔

☆ ہر روز: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

”کہیں تم اس بڑے ولا کی بات تو نہیں کر رہے ہو
ویرکس میں واقع ہے؟“
”ہاں دی۔ ہم ابھی رجسٹرار کے یہاں سے آئے
ہیں۔ ساری کارروائی بڑی تیزی سے مکمل ہوئی۔ دو مہینے
کے اندر۔“

جینی سوچنے لگی کہ اس روز جان کس کو یہ مکان
دکھانے گیا تھا، کیا اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی؟
آرنلڈ نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا جہاں کچھ
لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ”مجھے چلنا چاہیے۔“
رخصت ہوتے وقت ہیریٹ نے جینی سے کہا۔
”جینی! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے ضرور بتانا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
گھر آ کر جینی نے اینجینی کی ویب سائٹ کھولی۔ وہ
ولا جو آج ہی فروخت ہوا، وہ سائٹ سے ہٹا دیا گیا تھا۔
فرانس کا نظام انگلستان سے مختلف ہے۔ اگر فروخت کی
کارروائی آج مکمل ہوتی ہے تو معاہدے کی رقم کا دس فیصد
بطور ایڈوانس کئی ماہ پہلے جمع کرایا ہوگا اور اس مکان کو
مارکیٹ سے ہٹا دیا گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں
کوئی اور ولا برائے فروخت نہیں تھا پھر جان اس رات
گاہک کو کون سا مکان دکھانے گیا تھا جب وہ رات گئے دفتر
میں کام کر رہا تھا؟

اس نے سیاہ بلی کا جسم اٹھایا اور اس کی پشت پر ہاتھ
پھیرنے لگی پھر اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور کام میں مصروف
ہو گئی۔ چھ بجے فارغ ہوئی تو اس نے یہ دیکھنے کے لیے ایک
نظر اخبار پر ڈالی کہ شاید اس عورت کے بارے میں کوئی خبر
ہو لیکن اس کے بجائے معافیاتی علاقے میں ڈسٹریکٹ کی ایک خبر
نظر آئی۔ وہ جگہ اس کے گھر سے چند میل کے فاصلے پر تھی
اور ڈاکو کسی وقت بھی یہاں آ سکتے تھے۔ وہ دن بھر ایلی
رہتی تھی اور پڑوس میں کچھ فاصلے پر صرف ایک بوڑھی
عورت تھی۔ ان دنوں جلدی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ اس کے دل
میں شدت سے خواہش ابھری کہ جان جلدی گھر آ جائے۔

اس رات جینی کو ٹھیک طرح نیند نہیں آئی۔ یہی حال
جان کا بھی تھا۔ وہ سانس کی تکلیف سے ایک سے زائد مرتبہ
بیدار ہوا اور اسے ان ہیلر استعمال کرنا پڑا۔ اگلے روز صبح
جان کے جانے کے بعد وہ میڈی لین کو لے کر اسپتال گئی اور
ہنری کو ڈسچارج کروا کر واپس لے آئی۔ میڈی لین نے ایک
بار پھر اسے گھر میں آنے کے لیے کہا لیکن جینی نے منع کر دیا
اور کہا کہ اب وہ شام چھ بجے اس کے گھر آئے گی۔ وہ جانتی

تھی کہ جان ساڑھے سات بجے تک گھر آتا ہے۔

سہ پہر میں اس نے مقامی اخبار کی ویب سائٹ
کھولی۔ اس عورت کی شناخت ہو گئی تھی جس کی لاش وسنٹ
کے مکان سے ملی تھی۔ خبر کے ساتھ اس کی بڑی سی تصویر بھی
تھی، جینی کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ یقیناً یہ وہی عورت تھی
جو اسے میوزیم میں ملی اور اس سے جان کے بارے میں پوچھا
تھا۔ وہ عورت چھٹیوں پر وہاں آئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی
شناخت میں دیر ہوئی۔ دراصل وہ بینرز میں رہتی تھی۔ اسے
یاد آ گیا کہ اس عورت نے میوزیم میں بھی بینرز کا تذکرہ کیا
تھا اور وہ غلطی سے جان کو دیکھ بھجور ہی گئی۔

جینی نے گوگل پر بینرز کو تلاش کیا۔ وہ جنوبی فرانس
میں اسپین کی سرحد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی
آبادی پچھتر ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک کونے میں وہاں
پیش آنے والے اہم واقعات درج تھے۔ اس کی نظر ایک
سرنی پر گئی جو کسی قتل کے بارے میں تھی۔ اس نے وہ ننگ ہولا
تو ایک مقامی اخبار کی خبر سامنے آ گئی۔ چار سال قبل ایک
مقامی وکیل جین مانگیل کیزن گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیوی کی
لاش دیکھی۔ اس کی شادی صرف چھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ مظاہر لگتا
تھا کہ وہ ڈسٹریکٹ کی مزاحمت کرتے ہوئے ماری گئی۔ خبر کے
ساتھ نوٹیا جتا جوڑے کی تصویر بھی تھی۔ مرد کی شکل جان سے
ملتی تھی۔ البتہ بالوں کا اسٹائل مختلف تھا اور اس نے چشمہ لگایا
ہوا تھا لیکن ناک اور چہرہ بالکل ایک جیسا تھا۔ اس نے بزرگوں
سے پڑھا اور اس کا ایک ایک لفظ ذہن میں بٹھالیا۔

اس نے ایک بار پھر تصویر دیکھی۔ اس عورت کو غلط
نہی ہوئی ہوگی۔ وہ جان نہیں ہو سکتا۔ اس کا اپنا ایک پس
منظر تھا۔ شادی میں آنے والے مہمان اسے جانتے تھے۔
اس نے ان مہمانوں کے بارے میں سوچا۔ وہ اپنی ماں کی
موت کی وجہ سے زیادہ لوگوں کو بلا نا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں کا
کوئی بڑا خاندان بھی نہیں تھا۔ جان کے والدین وفات
پا چکے تھے اور اس کا کوئی بھائی بہن نہیں تھا۔ صرف ایک
کزن امریکا میں رہتی تھی۔ اس نے شادی کے موقع پر ایک
تحفہ اور کارڈ بھیجا تھا۔ اب یہ بات جینی کی سمجھ میں آئی کہ
شادی میں شریک ہونے والے چند مہمان وہ تھے جن سے
اس کی حال ہی میں پیرس میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہی میں
آرنلڈ اور اس کی بیوی بھی شامل تھی لیکن یہ ایک اجتماع سوچ
تھی۔ پیرس آنے سے پہلے جان کی رہائش لیون میں تھی۔
وہ میزبیاں اتر کر اس چھوٹے سے شنگ روم میں گئی
جو جان اپنے ہوم آفس کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس نے

دیکھا۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ اس کا شوہر غالباً ایک قاتل ہے۔ یہ ایک احمقانہ بات ہوتی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی۔
”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئیں اور جینی نے لپ ٹاپ کھول کر مقامی اخبار کی ویب سائٹ پر جین مائیکل کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔
”کیا اس کی شکل جان سے نہیں ملتی؟“
”ہاں۔ تھوڑی بہت۔“

”جین مائیکل کافی عرصے سے آن لائن نہیں ہے اور مجھے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا کہ جان چار سال سے کہیں گیا ہو۔ تم پوری خبر پڑھو۔“

ہبرٹ نے وہ خبر پڑھی۔ تبھی جینی کو یاد آیا کہ تین روزے ایک جانا بچا تا نام کیوں لگا۔ ”کیا یہ وہی جگہ نہیں ہے جہاں تم معاون ہجرت تھیں۔ کیا یہ واقعہ تمہارے ہوتے ہوئے پیش نہیں آیا؟“

”ہاں۔ مجھے یاد ہے لیکن جینی تم یہ مت سوچو کہ.....؟“
”یہ دونوں ایک ہی ہیں ہبرٹ اور مجھے اس کا یقین ہے۔ کیا ہوا اگر جین مائیکل نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور جان ہی جین مائیکل ہو؟“

”لیکن شوہر پر بیوی کے قتل کا الزام عائد نہیں ہوا؟“
”اس کا کہنا ہے کہ جب گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گھر میں دھکیت ہوئی تھی اور وہاں اس کی بیوی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ان دنوں اس علاقے میں دھکیت کی وارداتیں ہورہی تھیں اور یہاں بھی یہی ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہبرٹ کو میوزیم میں ملنے والی عورت کے بارے میں بتایا۔
”یہ وہی عورت ہے جس کا خیال تھا کہ اس نے جان کو بچان لیا ہے۔ وہ بھی قتل کر دی گئی۔“

وہ کہنا چاہ رہی تھی۔ ”ہوسکتا ہے کہ وہ میرے قتل کا منصوبہ بھی بنا رہا ہو۔“ لیکن وہ کہہ نہ سکی۔
”اوہ جینی۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ جو کچھ جین مائیکل کے ساتھ پیش آیا۔ وہ محض حادثہ نہیں؟“

جینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمپیوٹر اسکرین پر نوجوان دلہن کی تصویر دیکھ رہی تھی، ہبرٹ نے کہا۔ ”لیکن اس کا شوہر قاتل نہیں ہوسکتا۔ اس کے پاس جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کا ثبوت موجود ہے۔ اس نے دفتر سے اپنی بیوی کو اس کی موت سے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا۔ کیونکہ ہم ایک کپ چائے پی لیں۔ اس پر بعد میں سوچیں گے۔“
جب وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں تو جینی نے

فائل کینٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں زیادہ تر گھر کے بل تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کی ذاتی فائل کہاں ہے۔ اس نے میز کی دراز میں کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھیں۔ وہ واپس اوپر چلی گئی۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا، اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور یوں لگا جیسے باغ میں کوئی درختوں کے درمیان کھڑا ہے لیکن شاید یہ اس کا وہم تھا کیونکہ جب اس نے دوبارہ دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس کے بارے میں آن لائن معلومات حاصل نہ کروں۔ جب وہ پہلی بار جان سے ملی تو اسے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ سوشل میڈیا کا زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ جب اس نے گوگل کھولا تو وہاں فیس بک پر صرف اس کی اسٹیٹ ایجنسی کا مینج تھا لیکن اس نے اپنا ذاتی اکاؤنٹ نہیں بنایا تھا۔ اب اس نے دوبارہ گوگل پر دیکھا لیکن اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

جینی نے جین مائیکل کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن اس کے حوالے سے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی۔ البتہ جس فرم میں وہ کام کرتا تھا، اس کے کچھ پرانے اشتہارات ضرور موجود تھے۔ اس کا بھی کوئی فیس بک اکاؤنٹ نہیں تھا۔

وہ تھک کر بیٹھ گئی اور اس بارے میں سوچنے لگی لیکن اس کا دماغ صحیح طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کسی پُر سکون جگہ بیٹھ کر غور و فکر کرنا چاہتی تھی، لیکن کہاں جائے؟ اس کا فیصلہ بعد میں بھی ہوسکتا تھا۔ فی الحال تو اسے گھر سے باہر نکلنا تھا۔
جیسے ہی وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی، سٹینک روم میں روشنی پھیل گئی۔ وہ دم بخود بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جس سے باہر کی سیکورٹی لائٹس کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ یہ جان نہیں ہوسکتا، اس کے پاس بیرونی دروازے کی چابی تھی اور نہ ہی جینی نے کار کی آواز سننی تھی۔ جینی نے ایک گہرا سانس لیا اور دروازے کی کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ وہاں ہبرٹ کھڑی تھی۔ جینی نے دروازہ کھول دیا اور اس سے لپٹ گئی۔

”مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔“ ہبرٹ نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”میں کل ہی سمجھ گئی تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔“
”اوہ ہبرٹ۔ میں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔“
”کیا مسئلہ ہے مجھے بتاؤ؟“

جینی نے ہبرٹ کے پُر سکون چہرے کی طرف

کہا۔ ”تم نے اپنی کار کہاں چھوڑی ہے؟ میں نے گاڑی کی آواز نہیں سنی۔“
 ”وہ کچھ تنگ کر رہی تھی۔ اسے میں نے لین کے باہر ہی چھوڑ دیا۔“

وہ دونوں بکن میں گئیں اور جینی نے چائے کا پانی ابلانے کے لیے رکھ دیا لیکن کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ہیریٹ کی طرف دیکھا جس نے ابھی تک باہر نکلنے کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں تک کہ دستانے بھی نہیں اتارے تھے۔
 ”کیا تم کوٹ نہیں اتار دو گی؟“ جینی نے پوچھا۔
 ”میں یونہی ٹھیک ہوں۔“

جینی کے ذہن میں سوال ابھرا۔ ”کیا درجہ ہے کہ ہیریٹ دستانے نہیں اتار رہی؟ پھر اسے اخبار میں شائع ہونے والی خبر کا خیال آیا جس میں جین مائیکل کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی تھیں پھر ہیریٹ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ دونوں باتیں ایک ساتھ اس کے ذہن میں آئیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ واضح نہیں تھا۔ اس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا چلا گیا اور پھر جو منظر نامہ ابھرا وہ ناقابل یقین تھا۔

اسے جان کے بارے میں سوچ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اس کے بارے میں پہلے سے سب کچھ جانتا تھا اور جینی سے ملنے سے پہلے ہی اسے معلوم تھا کہ وہ ایک دولت مند عورت ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جان نہیں بلکہ ہیریٹ اسے قتل کرنے آئی ہے۔

جائے کا پانی گرم ہو گیا تو بجلی کی کیتلی سے ایک سیٹی نما آواز نکلی جس نے خاموشی کا سینہ چیر دیا۔ ہیریٹ کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب میں گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے بکن کے سلیب پر رکھی ہوئی جینی کی کار کی چابی اور اس کا موبائل اٹھا لیا۔

”میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔“ اس نے وضاحت پیش کی۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح پرسکون تھا لیکن اب وہ ایک مختلف عورت تھی۔

اسی وقت دروازے کی کھنٹی بجی۔ ”یہ کون آ گیا؟“ ہیریٹ نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے جینی بھی نہ سمجھ سکی پھر اسے یاد آ گیا۔ ”یہ پڑوس میں رہنے والی میڈیلین ہوگی۔ میں نے اسے مدعو کیا تھا۔“

”اس کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ تم دروازے پر جا کر

اس سے معذرت کر دو اور کہو کہ آج تمہاری طبیعت خراب ہے۔ اس لیے اس کی خاطر تو وضع نہیں کر سکتیں۔ بھاگنے یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اس کے ساتھ تمہیں بھی گولی باردوں گی۔“

کھنٹی بارہ بار بجی تو ہیریٹ نے سختی سے کہا۔ ”جاؤ اور اس سے جان چمراؤ۔“

جینی کو اس کے رویے پر بڑی حیرت ہوئی لیکن اسے ہیریٹ کے کہے الفاظ پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے بھی ایسی بات نہیں کہی جس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کیا وہ کسی طرح میڈیلین کو ممکنہ خطرے کے بارے میں کوئی اشارہ دے سکتی ہے؟

میڈیلین دروازے کے باہر کھڑی ہمیشہ کی طرح پرسکون نظر آ رہی تھی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ جینی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”سر میں درد ہے۔“

میڈیلین نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا اور جب جینی نے دوسرے دن آنے کی تجویز پیش کی تو اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں چار ہو گئیں۔ جینی نے اسے آنکھوں کے ذریعے پیغام دینے کی کوشش کی لیکن میڈیلین کی آنکھوں میں اس کے لیے صرف ہمدردی تھی۔ وہ جانے کے لیے مڑی اور جینی نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے آخری موقع بھی گنوا دیا تھا۔

ہیریٹ بکن سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ”آؤ بیٹھ جاویں۔“ پھر اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”دس منٹ میں فون کی کھنٹی بجے گی۔ جان کا اسسٹنٹ یہ بتانے کے لیے فون کرے گا کہ تمہارا شو ہر کسی پارٹی کو مکان دکھانے گیا ہے اور دیر سے گھر آئے گا۔ میڈیلین کی گواہی بھی بہت اہم ہوگی۔ وہ تصدیق کرے گی کہ جب وہ آئی تو تم اس وقت زندہ تھیں۔“

وہ دونوں کانی کی میز پر آئے سانسے بیٹھی ہوئی تھیں اور درمیان میں فون رکھا ہوا تھا۔ ہیریٹ نے ابھی تک کوٹ کی جیب سے ہاتھ نہیں نکالا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ جینی کی نظر ریو الوور پر جائے۔

”تم نے مجھے کب سے نظروں میں رکھا ہوا تھا؟“ جینی نے پوچھا۔ ”یقیناً جان اس ارادے سے بولون نہیں آیا ہوگا۔“

ہیریٹ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ محض ایک اتفاق تھا لیکن تمہاری ماں کی موت کے بعد ہمیں اس

انکشاف ہوا کہ جان بلیوں سے ڈرنے میں حق بجانب تھا۔ وہ ہیریٹ کی شکر گزاری بھی جس کی وجہ سے جان کی موت واقع ہوئی۔

ہیریٹ گاڑی چلاتی ہوئی اس مکان تک گئی جہاں جان جانے وقوع سے اپنی غیر موجودگی کا ثبوت دینے کے لیے ایک گاؤں کے لیے لے کر گیا تھا۔ ہیریٹ کے بازو سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ لہذا جان نے اسٹیرنگ وھیل سنبھال لیا۔ وہ پیرس کی جانب جا رہے تھے کہ جینی کی کار میں رہ جانے والے ہنری کے بالوں کی موجودگی محسوس کر کے جان کو بے کا دورہ پڑ گیا۔ گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو گئی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ ہیریٹ کو نسبتاً کم چوٹیں آئیں لیکن اسے کافی عرصہ اسپتال میں رہنا ہوا۔ اس کے بعد اس کی بقیہ عمر جیل میں گزرے کیونکہ اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ جان کی پہلی بیوی اور میوزیم میں جینی سے ملنے والی عورت کو اسی نے جان کے کہنے پر قتل کیا تھا کیونکہ اس نے جان کو پہچان لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس کی اصلیت ظاہر نہ کر دے۔ ہیریٹ نے یہ بھی اعتراف کیا کہ وہ شروع دن سے ہی جان کو چاہتی تھی اور جان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جینی کی دولت ہاتھ آنے کے بعد وہ اس سے شادی کر لے گا۔

جینی نے سوٹ کیس بند کیا۔ وہ واپس لندن جاری تھی۔ اس نے آرنلڈ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس مکان کی فروخت کا بندوبست کرے۔ دروازے کی کھنٹی بجی۔ وہ سیزر حیاں اترنے ہی والی تھی کہ اسے خیال آیا کہ وہ کچھ بھول گئی ہے۔ وہ واپس اسٹڈی میں گئی اور مصری بیلی کا مجسمہ اٹھایا جو عورتوں کی محافظ ہی نہیں بلکہ محبت اور خوشی کی دیوی بھی ہے۔ اس وقت جینی اپنے آپ کو اس مریضہ کی طرح کمزور محسوس کر رہی تھی جو طویل بیماری سے اٹھی ہو اور اسے صحت یاب ہونے میں وقت لگے گا لیکن اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکے گی۔

اس نے وہ مجسمہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور سیزر حیاں اترتی ہوئی نیچے کی جہاں دروازے پر آرنلڈ اور میڈیلین اسے ایئر پورٹ لے جانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میڈیلین کا شکریہ ادا کیا جس کی بروقت مداخلت سے ہیریٹ تیسری بار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔

منسوبے پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔“
فرانسیسی قانون وراثت کے تحت والدین کے مرنے کے بعد بچے اس کے ترکے میں پچیس فیصد کے حق دار ہوتے ہیں۔ جینی کے والدین مر چکے تھے اور اب اس کا سارا ترکہ جان کے حصے میں آتا۔

جینی کی پہلی چھوٹ گئی۔ یہ خضوف کی وجہ سے نہیں تھا۔ کمرے میں اچانک ہی خضوف کی لہر دوڑ گئی۔ ہیریٹ نے بھی یقیناً اسے محسوس کیا ہوگا اور اس نے اپنے کوٹ کا کارل بند کر لیا تاہم اس نے جیب سے ہاتھ نہیں نکالا۔ کیا کمرے کی کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی؟

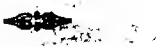
ہیریٹ کی پشت چکن کے دروازے کی طرف تھی۔ لہذا جو کچھ جینی نے دیکھا، وہ اسے نظر نہیں آیا۔ چکن کا دروازہ دھیرے دھیرے کھل رہا تھا۔ اسے جینی کے چہرے پر حسرت کے آثار محسوس ہوئے۔ مڑ کر دیکھا تو میڈیلین ایک شکاری بندوق لیے کھڑی ہوئی تھی اور اس کی ٹال کا رخ ہیریٹ کی جانب تھا۔

اسی وقت فون کی کھنٹی بجی۔ جینی نے لپک کر میسور اٹھا لیا اور ہڈیانی انداز میں چلاتے ہوئے بولی۔ ”ہیریٹ..... یہاں ہیریٹ موجود ہے۔“

ہیریٹ کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو میڈیلین نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور ہیریٹ کے ہاتھ سے ریوالور نیچے گر گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا بازو پکڑ لیا۔ ریوالور جینی کے قریب پڑا ہوا تھا۔ میڈیلین جینی کو اشارہ کر کے چلا رہی تھی لیکن جینی ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکی اور اسے اس کی ضرورت بھی نہیں لگی۔ وہ آگے کی طرف جمی اور اس نے ریوالور اٹھا لیا۔

ہیریٹ شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ اس نے میڈیلین کی طرف دیکھا، اب اس کے پاس اپنے بچاؤ کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میڈیلین کی آنکھوں میں سفاکی دیکھ کر اس نے پاپا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بیرونی دروازے تک گئی اور اس نے شکست تسلیم کرنے کے انداز میں اپنا بازو اوپر اٹھا لیا۔

اس سے پہلے کہ جینی کچھ سمجھ سکتی، ہیریٹ دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو جینی اس جانب پکی۔ ایک گاڑی کا انجن غرایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ چند لمحوں میں اس کی عقبی روشناس نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہیریٹ اس کی کار میں فرار ہو گئی تھی۔ اگلے ہفتے جب جینی اپنا سامان باقاعدہ رہی تھی تو اس پر



ناکتلے

ملک صفدر حیات

زن، زن زمین کو ازل سے فتنہ و فساد کی جڑ تصور کیا جاتا رہا ہے اور شاید ابد تک ایسا ہی سمجھا جاتا رہے گا... کیونکہ ان کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات اور ضمیر سے بہت گہرا ہوتا ہے اور جانے کب جذبات کے دریا میں طغیانی آجائے، جانے کب احساسات اپنی سمت بدل ڈالیں اور جانے کب ضمیر نیند کے ہلکے لپٹا لپٹا سو جائے مگر... قدرت اپنا کام مخصوص رفتار سے جاری رکھتی ہے اور جہاں کسی کے قدم لڑکھڑائے... اسے درست سمت چلانے کے لیے ایسا عبرتناک سبق ترتیب دیتی ہے کہ ساری دلفریب خوش گمانیاں ایک بھیانک فریب میں ڈھل کر مجرم کو دنیا کے سامنے عبرت کا نشان بنادیتی ہے... وہ جو ناک تلے جذبات کے طوفان میں بہے جارہے تھے اچانک بھنور میں پھنسے تو احساس ہوا کہ مردہ ضمیری نے انہیں کس مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔

عشق کے نام پر دیوانگی میں بسکے والوں کی لرزہ

خیز روداد

مکھور سب سے زیادہ کام کا بندہ لگا تھا لہذا تھوڑے ہی عرصے میں اس کے ساتھ میری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ وہ ایک باشعور، ذہین اور معنی پولیس افسر تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

”ملک صاحب! خبر بڑی سنسنی خیز ہے۔“

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر سوال کیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

اس سے پہلے کہ مکھور میرے سوال کا جواب دیتا، ایک کانشیل ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ مکھور سر کو اٹھائے جینٹل دیتے ہوئے بولا۔

”آپ ٹھنڈا پانی پیئیں، پھر بتاتا ہوں۔“

اے ایس آئی کا انداز میرے اندر جس چکا چکا تھا۔ جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے تھانے کے برآمدے میں چند افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ابھی مکھور حسین نے جس سنسنی خیز خبر کا ذکر کیا تھا، اس کا تعلق یقیناً انی افراد سے تھا۔

گندم کی کٹائی چل رہی تھی۔ جو لوگ کاشت کاری کے حوالے سے معلومات رکھتے ہیں، ایسے واقفان حال بہ خوبی جانتے ہیں کہ گندم کی کٹائی کے وقت موسم گرما شبا ب پر ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی چٹا ہوا دن تھا۔

ان دنوں میری تعیناتی نوشہرہ درگاں کے تھانے میں تھی۔ میرا تھانہ مذکورہ موضع سے باہر تھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رہائش حسب معمول تھانے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے سرکاری کوارٹر میں تھی۔ جب میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو تیز چمکی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ صبح کا وقت تھا لیکن دھوپ کی حدت اور موسم کی شدت سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا سورج سوا نیرے پر اتر آیا ہو۔!!!!

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد مکھور حسین سے پوچھا۔ ”کیا خبریں ہیں؟“

مکھور حسین اے ایس آئی تھا۔ اس تھانے میں مجھے



میں نے صرف ایک گلاس پانی پر اکتفا کیا اور منکھور کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اب بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟“

”معاملہ کافی سنگین ہے ملک صاحب۔“ وہ گمبیر انداز میں بولا۔ ”لوشہرہ درگاں گاؤں میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے۔ مقتول کا باپ اور گاؤں کے دو افراد اسی سلسلے میں باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں موقع واردات پر فوراً پہنچنا ہوگا۔“

”تو سمجھو، تمہارا انتظار ختم ہو گیا۔“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بانی باقی راستے میں ہوں گی۔“

لوشہرہ درگاں جانے کے لیے منکھور حسین نے ایک تانکے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جولوگ اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے، ہم نے انہیں بھی تانکے پر سوار کیا اور فوراً سے پیشتر موضع لوشہرہ درگاں کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمارے چچ جو منکھور ہوئی، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مقتول کا نام آفتاب تھا۔ مقتول، فیاض علی کا بڑا بیٹا تھا۔ آفتاب سے چھوٹا ذوالفقار تھا جس کی عمر بیس سال تھی۔ مقتول آفتاب اپنے بھائی سے دو سال بڑا تھا۔ آفتاب کی شادی ایک ماہ پہلے ہوئی تھی۔ مقتول کا باپ فیاض علی ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ لوشہرہ درگاں میں اس کے پاس دس ایکڑ اراضی تھی۔ دونوں بیٹے کا شکاری میں باپ کی مدد کرتے تھے۔ میرا تھا نہ گاؤں کے نزدیک ہی واقع تھا لہذا چند منٹ میں ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

وہ دو کدروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ڈیرا تھا جو کھیتوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ مذکورہ ڈیرا فیاض کی اراضی کا ہی حصہ تھا۔ دونوں کدروں کے آگے ایک کشادہ مچن تھا جس کے ایک حصے میں کئی ہوئی گندم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈیرے کا کل رقبہ بیس سے پچیس مرلے ہوگا۔ اگرچی کے رہائشی جاسوسز سمجھ لیں۔ یہ نسبتاً ایک چھوٹا ڈیرا تھا مگر دس ایکڑ اراضی کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ فیاض علی کی راہنمائی میں، میں ڈیرے کے عقبی حصے میں پہنچے ہوئے کدروں میں سے ایک کے اندر پہنچ گیا۔ مقتول آفتاب کی لاش اسی کمرے کے اندر موجود تھی۔ کمرے کے ایک حصے میں ایک چار پائی بھی ہوئی تھی۔ آفتاب کی لاش مذکورہ چار پائی کی پائنتی کی طرف کمرے کے فرش پر پڑی تھی۔

میں نے اکڑوں پیٹھ کر غور لاش کا جائزہ لیا۔ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ

آفتاب اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ منہ کے بل کمرے کے کچے فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے منہ کے نیچے اور سر کے نزدیک نیم دائرے کی شکل میں خون کا ایک ننھا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ لاش کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ مذکورہ خون مقتول کی کھوپڑی میں سے نکل کر نیم دائرے کی شکل میں فرش پر پھیل گیا تھا۔ مقتول کی کھوپڑی کا عقبی حصہ بری طرح زخمی تھا۔ ہادی انکھر میں یہی سمجھ میں آتا تھا کہ کسی شقی القلب شخص نے کسی آہنی چیز کی مدد سے مقتول کے سر کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ واردات کاروبار ثابت ہوا کہ مقتول آن واحد میں منہ کے بل زمین یوس ہو گیا اور پھر اسے ہلکی جنبش کا بھی موقع نہ مل سکا۔ زمین پر گرتے ہی وہ اس جہان سے اس جہان میں منتقل ہو گیا تھا۔

میں نے مقتول کے سر کے عقبی حصے کا بڑی توجہ سے معائنہ کیا۔ کھوپڑی بری طرح کٹی گئی تھی۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ اپنے دل میں مقتول سے شدید نوعیت کی نفرت رکھتا تھا۔ کمرے کے فرش پر پھیلے ہوئے خون کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس خونچکاں واقعے کو پیش آئے چار پانچ گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ مگر یا میرے محتاط اندازے کے مطابق، مقتول آفتاب کو چھ پانچ اور چھ بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

میں نے لاش والے کمرے کی تسلی بخش تلاشی لی لیکن مجھے کہیں بھی آلہ قتل یا کوئی بھی ایسی اہم چیز نہیں ملی جو اس واردات پر روشنی ڈالتی یا قاتل تک میری راہنمائی کا وسیلہ بنتی ہو۔ میں نے اس کمرے سے ملحقہ دوسرے کمرے کا بھی تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کمرے میں مختلف نوعیت کے زرعی آلات رکھے ہوئے تھے اور ایک کونے میں بیج والی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا پھر جائے واردات کی ضروری کارروائی کے بعد مقتول آفتاب کی لاش کو ہسپتال مارٹم کے لیے منسلکی اسپتال روانہ کر دیا۔ اے ایس آئی منکھور حسین کو میں نے لاش کے ساتھ اسپتال بھیج دیا تھا۔

جب ہم اس ڈیرے پر پہنچے تھے تو ڈیرے کے باہر درجن بھر افراد جمع تھے۔ ان سب کے چہروں پر خوف و ہراس کو بہ آسانی دیکھا اور پڑھا جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے، قتل کی واردات کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ گاؤں والوں کا پریشان ہونا عین فطری تھا۔ لاش کو سب سے پہلے مقتول کے باپ فیاض علی نے دیکھا تھا لہذا میں نے نفیث کا آغاز بھی اسی سے کیا۔

روزانہ صبح آٹھ بجے تک کھیتوں میں جاتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے اس سے کافی پہلے گھر سے نکل جاتے تھے۔ آفتاب عموماً صبح پانچ بجے اور اس کا چھوٹا بھائی ذوالفقار عرف زلفی چھ بجے تک کھیتوں میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ جب وہ خود گھر سے نکلتا تو بیٹوں کا ناشا بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”کیا آئی بھی تم آٹھ بجے ہی گھر سے نکلے تھے؟“

”جی.....!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اور تمہارے دونوں بیٹے اس سے پہلے کھیتوں کی جانب روانہ ہو چکے تھے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”دونوں نہیں، آج صرف آفتاب ہی کھیتوں کی طرف گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور زلفی.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”زلفی کی رات سے طبیعت خراب ہے۔“ فیاض علی نے بتایا۔

”جب میں کھیتوں کی طرف آ رہا تھا تو زلفی گھر میں پڑا سو رہا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں جس آفتاب کے لیے ناشا لے کر جا رہا ہوں وہ مجھ سے بہت دور جا چکا ہے۔“

اس کی آواز بیگ گئی۔ میں نے چند لمحات کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیا۔

جوان بیٹے کی موت نے اس کے اعصاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان لمحات میں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس عورت کی کیا حالت ہوگی جو ایک ماہ پہلے اس گھر میں بہو بن کر آئی تھی۔ مقتول آفتاب کی کو بیاتا بیوی کا نام خالدہ معلوم ہوا تھا۔ خالدہ، آفتاب کے تایا کی بیٹی تھی۔

میں نے مفکور کو لاش کے ساتھ روانہ کرتے وقت ہدایت کردی تھی کہ وہ تھانے سے کسی کانشیل کو میرے پاس بھیج دے۔ سرکاری اسپتال کا راستہ میرے تھانے کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اے ایس آئی نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کانشیل ساجد کو مجھے دعوہ پر بھیج دیا تھا۔ میں نے آتے ہی ساجد کو کام پر لگا دیا۔

”تم اس ڈیرے کے اندر اور باہر اچھی طرح گھوم پھر کر ایک ایک چیز کا جائزہ لو۔“ میں نے ساجد سے کہا۔ ”اور اگر کچھ بھی اہم اور غیر معمولی نظر آئے تو فوراً مجھے رپورٹ کرو۔“

”اوکے سر.....“ ساجد نے فرمان برداری سے کہا اور کام میں جت گیا۔

فیاض علی کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ”آج آٹھ بجے صبح جب تم ناشا لے کر ڈیرے پر پہنچے تو تم نے اپنے بٹے کو خون میں سر رکھے جس و حرکت پایا۔ کسی نے آفتاب کو مل کر دیا تھا۔

”فیاض علی! مجھے تمہارے جوان بیٹے کی المناک موت کا افسوس ہے۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد آفتاب کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پانچا دوں گا لیکن اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔“

”میں تعاون کروں گا جی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرا بیٹا جان سے گیا ہے۔ جب تک آفتاب کا قاتل پکڑا نہیں جاتا، میں سکون کی سانس نہیں لے سکوں گا۔“

”میں تمہاری کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں فیاض علی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ، آفتاب کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تمہارا صاحب۔“ وہ روپنسا ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟“

”تمہارا صاحب! آفتاب تو بڑا ہی بھلے ماں انسان تھا۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”دشمنی تو بہت دور کی بات ہے جی۔ اس کا تو آج تک کسی سے جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔“

”فیاض علی! تم نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھی ہے نا.....“ میں نے اس کی اداس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”آفتاب کو جس بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو تمہارے بیٹے سے بہت سخت ہیر تھا۔“

”میں اس کے کسی دشمن کو نہیں جانتا جناب۔“ وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔“

اس کے لہجے سے سچائی کی مہک آئی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”فیاض علی! مجھے قاتل کی تلاش کے لیے کسی نہ کسی اشارے کی ضرورت ہے۔ میں نے قانون کا جو سبق پڑھ رکھا ہے اس کی روشنی میں کوئی کسی کو خواہ مخواہ قتل نہیں کر دیتا۔ اگر تمہیں کسی پر شک ہے تو بتا دو تا کہ میں جلد از جلد تمہارے بیٹے کے قاتل تک رسائی حاصل کر سکوں۔“

”اگر مجھے کسی پر شک ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں خود وہی چاہتا ہوں کہ آپ آفتاب کے قاتل کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دلوائیں۔“

”یہ تو مجھے کرنا ہی ہے.....“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تم نے کتنے بجے آفتاب کی لاش دریافت کی تھی؟“

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ

پھر تم اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے تھانے چلے آئے تھے..... ہیں نا؟“

”آپ کی بات کافی حد تک درست ہے لیکن.....!“
اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا
فاضل علی؟“

”بات دراصل یہ ہے جناب کہ میں گھر سے سیدھا کھیتوں کی طرف جاتا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ دونوں بھائی کھیتوں ہی میں مصروف ہوتے ہیں۔ آج بھی میں نے کھیتوں ہی کا رخ کیا تھا۔ ہم نے کل جہاں پر کٹائی کا کام چھوڑا تھا، آفتاب کو وہیں سے آج کام شروع کرنا تھا لیکن جب میں مذکورہ مقام پر پہنچا تو آفتاب مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے کھیتوں میں ہر طرف نگاہ دوڑائی مگر وہ بھی کہیں نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی میں ڈیرے کی طرف آیا تھا اور پھر.....“

وہ ایک مرتبہ پھر روہانسا ہو گیا۔ بیٹے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔ میں نے اپنا تہ بھرے انداز میں کہا۔
”ہو سکتا ہے، آفتاب کسی ضروری کام سے ڈیرے کی طرف آ گیا ہو۔“

”تمہیں جتاب.....“ وہ نفی میں گروں ہلاتے ہوئے
 بولا۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

”کس چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فیاض علی؟“

”جناب! آپ نے آفتاب کے جسم پر جو لباس دیکھا ہے نا، یہ وہی کپڑے ہیں جو وہ گھر سے پہن کر نکلتا تھا.....“ اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”تو.....“ میں نے اچھٹن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

”اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟“

”تھانیدار صاحب! میرا آفتاب دوسرے لوگوں سے بہت مختلف تھا۔“ وہ ایک پوچھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”کھیتوں کے اندر اس کا لباس عام کھیت مزدوروں والا ہوا کرتا تھا لیکن کھیتوں کے باہر وہ اپنے پھتاوے کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ وہ جب بھی کھیتوں کا رخ کرتا تو سب سے پہلے اس ڈیرے پر آتا تھا۔ یہاں وہ لباس تبدیل کرتا اور پھر کھیتوں میں جا کر اپنے کام میں جت جاتا تھا۔ شام کو جب ہم کا کوٹ ختم کرتے تو وہ ایک بار پھر ڈیرے پر آ کر لباس تبدیل کرتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا تھانیدار صاحب۔“

میں نے اس کی بات کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔ ”تو تم

یہ کہنا چاہتے ہو کہ آج آفتاب کھیتوں کی طرف جا ہی نہیں سکا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ لباس تبدیل کر کے اپنے کام میں مصروف ہوتا، کسی نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا.....“

فیاض علی کی بات کو میں نے اس لیے بھی درست مان لیا کہ مقتول آفتاب کے بدن پر میں نے صاف سقر الباس دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں کمرے کی ایک دیوار پر مجھے آفتاب کا کھیت مزدوروں والا لباس ایک کھونٹی پر لٹکا دکھائی دیا تھا۔

”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کبیر انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل، آفتاب کی آمد سے پہلے اس ڈیرے پر موجود تھا.....!“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بد بخت آفتاب کے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہو۔“ وہ قیاس آرائی کرنے والے انداز میں بولا۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ میں نے قطعی انداز میں

کہا۔ ”میں نے لاش کا بہ غور جائزہ لیا ہے۔ قاتل نے

آفتاب کی بے خبری میں عقب سے اس پر وار کیا تھا اور ایسا

کاری دار کہ آفتاب کو اپنے بچاؤ کے لیے ایک لمحے کی مہلت

نہ مل سکی۔ اگر قاتل، آفتاب کے ساتھ اس ڈپرے پر پہنچا

ہوتا تو پھر وہ اپنی آسانی سے آفتاب کی جان نہیں لے سکتا۔

تھا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ قاتل کمرے میں پہلے

لہیں لگا ہوا تھا۔

ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے، تمہارے گھر کے افراد میں سے کوئی قاتل کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ تمہارے گھر میں کل کتنے افراد ہیں؟“

فیاض علی بھی میرے پیچھے ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ میں نے کمرے کی عقیقہ دیوار میں واقع واحد کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار یہ انداز میں کہا۔

”میرے علاوہ میری گھر والی سلطانہ ہے، آفتاب کی بیوی..... میرا مطلب ہے، بیوہ خالدہ اور میرا چھوٹا بیٹا ذوالفقار عرف زلفی۔“ وہ ہنچکا ہٹ آمیز انداز میں بولا۔

”اگر آپ لوگ کمرے کے دروازے پر تالا لگا کر جاتے ہو تو کوئی بندہ اس کھڑکی کے راستے بھی تو کمرے کے اندر داخل ہوسکتا ہے..... اور یہ کھڑکی کھلی ہوئی بھی ہے..... اس پر کھڑکی نہیں لگی ہوئی؟“

”مجھے تمہارے اس خیال پر کوئی اعتراض نہیں فیاض علی۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”حیرت ہے.....“ وہ بے یقینی سے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایسی کھڑکیاں دونوں کمروں میں موجود ہیں لیکن ہم ڈیرے سے رخصت ہوتے وقت کھڑکیوں کو کھڑکی لگا کر بھی لہیں بھولتے، خاص طور پر یہ کھڑکی کیونکہ دوسرے کمرے کی کھڑکی عموماً بند ہی رہتی ہے۔ وہاں زرعی آلات اور دوسرا قیمتی سامان رکھا ہوا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کمرے کی کھڑکی کھلی کیسے رہ گئی۔“

”میرے گھر نہیں جناب.....“ وہ فنی میں گروں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ ضرور میرے ساتھ گھر چلیں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ آفتاب کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو جائے۔“

”ہوسکتا ہے، کل تو ہم یہ کھڑکی بند کرنا بھول گئے ہو۔“ میں نے مذکورہ کھڑکی کی جانب قدم بڑھا تے ہوئے کہا۔ ”اور قاتل کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے اندر آ گیا۔“

فیاض علی کے تعاون بھرے انداز کے بعد میں نے ڈیرے کے دونوں کمروں کی کھڑکیوں کو اچھی طرح چیک کر کے اندر سے کھڑکی لگائی پھر جائے وقوعہ والے کمرے کے دروازے پر سرکاری تالا لگانے کے بعد فیاض کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ زرعی آلات والے کمرے پر جوتا لگا ہوا تھا، میں نے اسے تبدیل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے اس کے اندر موجود کچھتی باڑی کے آلات کو اچھی طرح چیک کر لیا تھا۔ خصوصاً آلہ کش کی تلاش کے سلسلے میں، میں نے بڑی باریک بینی سے وہاں کا جائزہ لیا تھا اور کوئی بھی مشکوک چیز میری نگاہ سے نہیں گزری تھی۔ میں نے اس بات کی بھی تسلی کر لی تھی کہ دونوں کمروں کے بیچ آمدورفت کا بھی کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔

میں نے کھڑکی کے پت کھول کر باہر جھانکا۔ دور تک کھیت نظر آئے۔ میں نے گردن باہر نکال کر کھڑکی کے زریں صے کا جائزہ لیا۔ زمین سے کھڑکی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص بہ آسانی کھڑکی کے راستے کمرے تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ کھڑکی میں کسی بھی نوعیت کی سلاخی یا کوئی جالی وغیرہ لگی ہوئی نہیں تھی۔ ڈیرے کی عقیقہ دیوار اور کھیتوں کے بیچ میں پانچ چھٹ چوڑا ایک ٹالار گز تھا جس کے اندر مثیلا پانی رواں دواں تھا۔ یہ ٹالاکھیتوں کی سیرابی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس ٹالے کے کنارے اور کھڑکی والی دیوار کے درمیان لگ بھگ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس مقام پر گھڑے ہو کر کھڑکی پر چڑھنا اور پھر کمرے کے اندر کودنا کوئی مشکل کام نہیں تھا یہ شرط یہ کہ مذکورہ کھڑکی کو اندر سے کھڑکی نہ لگا لی گئی ہو۔

☆☆☆

مقتول کے گھر کے اندر کافی لوگ جمع تھے جن میں غالب تعداد خواتین کی تھی۔ وہاں کا ماحول انتہائی بوجھل اور سوگوار تھا۔ مقتول کی بیوہ خالدہ اور ماں سلطانہ عورتوں میں گھری ہوئی تھیں۔ مجھے وہاں پر مقتول کا چھوٹا بھائی ذوالفقار عرف زلفی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس فضا میں، میں اہل خانہ سے کوئی کام کی بات اٹھواؤں سکوں گا۔

میں نے کھڑکی کو بند کر کے اندر سے کھڑکی لگا دی پھر مقتول کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فیاض علی! اب میں تمہارے گھر چلوں گا۔“

”گھر..... وہ کس لیے جناب؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”فیاض علی!“ میں نے مقتول کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے گھر پر آنا فانا میں جو قیامت ٹوٹی ہے اس

”وہ اس لیے فیاض علی کہ تم تو اس واردات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

نے سب کچھ نکھیر کر رکھ دیا ہے۔ تم افرادِ خانہ کو سنبھالو۔ میں پھر کسی دقت یہاں آکر پوچھتا چھ کر لوں گا۔“

”جیسی آپ کی مرضی جناب۔“ وہ آبدیدہ ہو گیا۔

”آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب جی چاہے، آپ تشریف لائیں۔ میرے گھر کا دروازہ آپ کو ہمیشہ کھلا ملے گا۔“

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا چھوٹا بیٹا ہمیں نظر نہیں آ رہا.....؟“

”زلفی کو اس واقعے کی اطلاع دینے کے لیے دوڑایا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”بے چارے کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں لیکن یہ کام بھی تو کرتا ہے نا۔“

میں فیاض علی کو ملی دلا سادے کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ ابھی تک مجھے آفتاب کے قتل کے حوالے سے کوئی اہم بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ میں کاشیمل ساجد کے ساتھ اس تانکے کی جانب قدم بڑھانے لگا جس پر سوار ہو کر ہم تھانے سے یہاں تک آئے تھے۔ مذکورہ تانکا کو چوان کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی ہم گلی کے کڑ پر پہنچے، میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ یہ خیال ایک دکان کو دیکھ کر آیا تھا۔

وہ گریانے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جس پر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا دکاندار کی کر رہا تھا۔ کسی بھی علاقے میں گریانے کی دکان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ایسا دکاندار علاقے کے تمام افراد اور ان کے معاملات سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے۔ میں نے اس دکاندار سے آفتاب کے قتل کے حوالے سے کچھ معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے پاس چلا گیا۔

دکاندار مجھے اپنی سمت بڑھتے دیکھ کر چونکا ہو گیا تھا پھر جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خیر مقدمی انداز میں بولا۔ ”آئیں جی تمہانیدار صاحب..... بسم اللہ.....“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”میرا نام رب نواز ہے تمہانیدار صاحب لیکن پنڈوالے مجھے نواجا کہہ کر پکارتے ہیں مگر ٹھہریں.....“ وہ دکان کے اندر دینی حصے کی سمت مڑا۔ اس کی زبان اپنے کام میں مصروف رہی۔ ”آج بہت زیادہ گرمی ہے۔ میں ٹھنڈی بوتلوں سے آپ کی تواضع کرتا ہوں۔“

میرے دیکھتے ہی دیکھتے نواجانے لکڑی کی ایک بیٹی کا ڈھکن اٹھایا پھر برف میں دبی ہوئی دو ٹھنڈی بوتلیں نکال کر ہماری جانب بڑھادیں اور بولا۔ ”لیں جی..... ٹھنڈی بوتلیں پیئیں اور اپنی پیاس بجھائیں۔“

میں نے اور کاشیمل ساجد نے اس کے ہاتھ سے بوتلیں لے لیں پھر میں نے اس سے پوچھا۔

”چاچا! تم کتنے عرصے سے یہ دکان چلا رہے ہو؟“

”ساری عمر نوشہرہ درکان ہی میں گزری ہے سرکار۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”پہلے میرا باپ جی تو ازیہ دکان چلاتا تھا اور اب میں چلاتا ہوں۔“

”یہ خیر تک تو پہنچی ہی گئی ہوگی کہ آج صبح کسی نے فیاض علی کے بیٹے آفتاب کو اصر ڈیرے پر قتل کر دیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا بات کرتے ہیں جناب۔“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”اس واردات کی خبر تو پورے نوشہرہ درکان میں گردش کر رہی ہے۔ یہ علاقہ ہے ہی کتنا بڑا.....!“

رب نواز عرف نواجا بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے تب نوشہرہ درکان ایک چھوٹا سا پنڈا ہوا کرتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی بوتل کے ٹھونٹے سے حلق کو تر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تمہارا اس واردات کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”بہت بڑا ہوا جناب۔“ وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آفتاب بڑا گہرہ جوان تھا۔ بزرگوں کا بڑا احترام کرتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت کھلاڑی تھا۔“

”کھلاڑی.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آفتاب کس چیز کا کھلاڑی تھا؟“

”کبڈی کا۔“ اس نے بتایا۔ ”نوشہرہ درکان نے کبڈی کے بہت سے نامور کھلاڑی پیدا کیے ہیں۔ آفتاب انہی میں سے ایک تھا۔ بتائیں، اس جوان کو کس نامرادی نظر لگ گئی۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی تو اس کی شادی ہوئی تھی۔“

بات کے اختتام پر نواجا اداس ہو گیا۔ ”چاچا! میں نے آفتاب کی لاش کا تقصیلی معائنہ کیا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کسی سفاک شخص نے بڑی بے دردی سے اسے قتل کیا ہے۔ کیا تم اس واقعے پر کوئی روشنی ڈال سکتے ہو؟“

”جی کیا.....؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے تنکے لگا۔

”میرا مطلب ہے، آفتاب کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خیال میں اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو سہنا رہی جاتا ہے سرکار۔“ وہ محتاط انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں اس بارے میں!“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا ہو مگر پھر کسی خیال کے تحت رک گیا تھا۔ میں نے ذرا زیادہ بدل کر سوال کیا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ بھی تھی؟“

”نہیں جی۔ آفتاب تو بڑائی ہی باندھ تھا۔“ نوا جانے جواب دیا۔ ”اس کا مزاج لڑائی جھگڑے والا نہیں تھا۔ دشمن بنانا تو بہت دور کی بات ہے۔“

”چاچا! دشمن بنائے نہیں جاتے، بن جاتے ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اور شہ زوری کے کھیلوں میں تو یہ بڑی عام بات ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں سرکار مگر میں نے بتایا ہے نا، آفتاب بڑے دھمکے مزاج کا جوان تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اگر کبھی بد مزگی کی صورت حال پیدا ہو بھی جاتی تو وہ ہمیشہ محل مزاحی سے کام لیتا تھا۔ چند روز پہلے کبڈی کے ایک مقابلے میں اچھی خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی تھی۔ اگر اس موقع پر آفتاب کچھ داری سے کام نہ لیتا تو پھر خون خرابا لازمی تھا۔“

نوا جاک کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”ہنگامہ آرائی کس بات پر ہوئی تھی۔ مجھے اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ؟“

”بس جی، پنڈے کے جوانوں کا آپس میں کبڈی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ وہ بتانے لگا۔ ”کسی بات پر دونوں ٹیموں میں سخت کلامی ہو گئی۔ آفتاب کی مخالف ٹیم میں سے کسی کھلاڑی نے بے ایمانی کی تھی۔ جب آفتاب نے اس پر احتجاج کیا تو دونوں طرف کی فضا گرم ہو گئی۔ بے ایمانی کرنے والے کھلاڑی کا نام فیضی تھا اور فیضی کا ایک ساتھی جید اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہ چوری اور سیزہ زوری والا معاملہ تھا تھانیدار صاحب“ لٹائی تو تفت کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”فیضی اور جید اچھے پھلے باز قسم کے جوان ہیں۔ جید، آفتاب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ فیضی سے اپنی دوستی کا حق نہاتے ہوئے خون خوار لہجے میں بولا۔

”فیضی نے کوئی بے ایمانی نہیں کی، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہاری شادی کیا ہو گئی کہ تم نے خود کو نوشرہ و رکال کا ہیرو سمجھنا شروع کر دیا ہے لیکن کبڈی کے کھیل میں فیصلہ میدان میں ہوتا ہے۔“

”بالکل، کبڈی کا فیصلہ میدان ہی میں ہوتا ہے۔“

آفتاب نے تحمل لہجے میں کہا۔ ”مگر ہر کھیل کے کچھ قاعدے اور قانون ہوتے ہیں جن کی پاس داری ہر کھلاڑی کو کرنا پڑتی ہے۔ دنیا کے کسی کھیل میں بے ایمانی کی کوئی گنجائش نہیں۔“

”تمہارے دماغ پر بے ایمانی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔“ جاوید عرف جیدانے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”لیکن تم فکر نہیں کرو، بہت جلد ہم تمہارا یہ بھوت اتار دیں گے۔“

”تم زیادتی کر رہے ہو جید!“ آفتاب نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

جیدانے پھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں حق سچ کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں یہ زیادتی نظر آ رہی ہے تو جا کر اپنی آنکھوں کا علاج کرو۔“

”جیدانے جس تحقیر آمیز انداز میں یہ بات کی تھی، اگر آفتاب کے بجائے اس کے سامنے کوئی گرم دماغ والا ہوتا تو ادھر ہی خفرتاک جنگ ہو جانا تھی۔“ نوا جانے اپنی بات کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ”مگر آفتاب نے کمال برداشت کا مظاہرہ کیا اور چپ چاپ گھم آ گیا۔ اس کے بعد بھی گاؤں میں کبڈی کا کھیل جاری رہا مگر آفتاب نے پھر کبھی اس کھیل میں حصہ نہیں لیا۔“

”یہ واقعہ کتنا عرصہ پہلے کا ہے؟“ نوا جانے کا خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

نوا جاک کی باتوں نے مجھے تشویش میں ڈال دیا تھا۔ اگر سب کچھ ویسے ہی پیش آتا جیسا نوا جانے بیان کیا تھا تو پھر اس ٹیم میں جیدانے بھی نفیٹش ہونا لازمی تھی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ فیاض علی نے اس واقعے کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا۔

”یہ واقعہ آفتاب کی شادی کے چند روز بعد کا ہے جناب۔“ نوا جانے بتایا۔

”لیکن فیاض علی نے مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔“ میں نے ابھمن زدہ انداز میں کہا۔

”تھانیدار صاحب! فیاض کا جوان بننا قتل ہوا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ایسے واقعات تو بڑے بڑوں کی مت واردیتے ہیں۔“

نوا جاک کی بات میں وزن تھا۔ عین ممکن ہے، اپنی پریشانی میں فیاض علی کا اس واقعے کی طرف دھیان نہ گیا ہو یا اگر اس کے ذہن میں یہ بات تھی بھی تو اس نے اسے اہم نہ سمجھا ہو۔ وہ جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا، اس میں اس سے صد فیصد ہوش مندی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

میں چند منٹ مزید نوا جانے بات کرتا رہا پھر واپس تھانے آ گیا۔ نوا جانے جیدانے حوالے سے کافی فکر انگیز

تھا۔ میں نے تازہ ترین حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔

”تم نوشہرہ ورکاں میں بسنے والے افراد سے بخوبی واقف ہو۔ کیا تمہیں اس گاؤں کے حالات کی بھی کچھ خبر ہے؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”جی ملک صاحب! مجھے گاؤں کے حالات سے کافی حد تک آگاہی حاصل ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ کے پوچھنے کا مقصد کیا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو.....“

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ اور دھواڑا جھوڑا تو میں پوچھتا ہوں۔ ”اگر تم غلطی پر نہیں تو پھر کیا؟“

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ آفتاب کے قتل کے حوالے سے آپ کے ہاتھ کچھ لگ گیا ہے.....!“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... کچھ ہاتھ لگا تو ہے.....“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”تمہارے اس اہمیت پر روشنی تم ڈالو گے۔“

”آپ حکم کریں ملک صاحب۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”جاوید عرف جیدا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”کبڈی کا اچھا کھلاڑی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کبڈی کا کھلاڑی تو آفتاب بھی تھا!“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”جی ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں گروں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات مجھے معلوم ہے۔“

”مجھے پتا چلا ہے کہ چند روز پہلے جیدا اور آفتاب کے بیچ کبڈی کے میدان میں اچھی خاصی تلخ کھلائی ہو گئی تھی؟“

”جی، میں نے بھی اس ناخوشگوار واقعے کے بارے میں سنا تھا۔“

”تو کیا تم ایسا نہیں سوچتے کہ آفتاب کے قتل میں اس واقعے کا کوئی ہاتھ ہو؟“ میں نے کہا۔ ”ہم ان دونوں کے جھگڑے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“

”آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ ہم اس کیس میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ وہ تائیدی انداز میں گروں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا۔“

”کیا مطلب..... جنہیں کیسا نہیں لگتا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا ہے اس جھگڑے میں اگر غلطی آفتاب کی ہوتی اور آفتاب نے جیدا کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہوتی تو ہم سوچ سکتے تھے کہ جیدا نے

مطلبات فراہم کی تھیں۔“ تمہارے پہنچ کر میں نے ایک آدمی کو ہارٹ عرف جیدا کی جانب روانہ کر دیا۔ میں چاہتا تو گاؤں کے اہل اپنی موجودگی کے دوران ہی میں جیدا کو تلاش کر داکر اس سے پوچھتا چکر لیتا لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت ہمارے گاؤں پر باہمی نفضانے پہنچے گاؤں کے تھے اور گرمی لگی کہ وہ انسان کے صبر اور برداشت کو چیلنج کر رہی تھی۔ نوابا لے جو باتیں مجھے بتاتی تھیں ان کی روشنی میں، میں جیدا سے جھگڑا میں بات کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے تمہارے کا عمل زیادہ سوزوں تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میرا بیجا ہوا آدمی واپس آ گیا۔ میں نے اسے اکیلا دیکھا تو پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”جیدا گاؤں میں موجود نہیں ہے ملک صاحب۔“ اس نے بتایا۔

کاشییل کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”اگر وہ گاؤں میں نہیں تو پھر کہاں گیا ہے؟“

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ہوسکتا ہے، آفتاب کے قتل میں جیدا کا کوئی ہاتھ ہو اور وہ اسی وجہ سے کہیں غائب ہو گیا ہے لیکن کاشییل کے جواب نے میرے اس خیال کی تردید کر دی۔

”جناب! وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا ہے۔“

کاشییل نے بتایا۔ ”اس کے گھر سے پتا چلا ہے کہ جیدا شام سے پہلے واپس آ جائے گا۔“ میں نے اس کے گھر والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ جیسے ہی واپس آئے، اسے فون سے پہنچ دیں۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے سناٹھی نظر سے کاشییل کی طرف دیکھا۔ ”لیکن ہم جیدا کے گھر والوں پر ہمسوا کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ کسی بندے کو سادہ لباس میں گاؤں کی طرف روانہ کرنا ہوگا تاکہ وہ گاؤں کے داخلی راستے پر نظر رکھے اور جیسے ہی اسے جیدا دکھائی دے، وہ اسے پکڑ کر قاتل لے آئے۔“

”جی ملک صاحب۔“ کاشییل نے فرماں برداری سے کہا۔ ”میں ابھی اس کا بندوبست کرو دیتا ہوں۔“

سر پہر میں اسے ایس آئی منگھور حسین اسپتال سے واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ آئندہ روز کسی وقت آفتاب کی لاش واپس کر دی جائے گی۔

منگھور حسین اس قاتل نے کافی عرصے سے کام کر رہا تھا اور نوشہرہ ورکاں کے تقریباً تمام لوگوں کو اچھی طرح جانتا

انتقاماً آفتاب کی جان لے لی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میری معلومات کے مطابق، معاملہ اس کے برعکس تھا۔“

”تمہاری بات میں وزن ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے جیدا کی طرف بندہ دوڑایا تھا مگر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ گاؤں میں موجود نہیں۔ وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا ہے اور شام سے پہلے لوٹ آئے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جیدا بڑا کرم دماغ کا ہے۔“

”جی..... واقعی وہ خاصا غصہ ور ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور آفتاب کے حوالے سے تو اس کا غصہ اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔“

”ایسا کیوں.....“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ”کیا آفتاب نے اس سے کوئی قرض لے رکھا ہے؟“

”قرض نے نہیں رکھا بلکہ قرض چڑھا رکھا ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔

”مشکور نے بتایا۔“ میری معلومات کے مطابق، جیدا کی بہن فریدہ کی آفتاب کے ساتھ شادی ہونے والی تھی۔ ان کی منگنی تقریباً ایک سال تک رہی پھر آفتاب کے گھر والوں نے منگنی توڑ دی۔ اس کے کچھ عرصے بعد آفتاب کی شادی اس کے تایا کی بیٹی خالدہ سے ہو گئی تھی..... ”وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”بہن کی منگنی ٹوٹ جانے کے سبب وہ آفتاب کو ناپسند کرتا تھا لیکن آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا، وہ خالصتاً کبڈی کے کھیل کا جھگڑا تھا۔“

”میرے لیے کبڈی کے کھیل والے جھگڑے سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ جیدا کے دل میں مقتول کے لیے ناپسندیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اب تو اس کا انزویا اور بھی ضروری ہو گیا ہے.....“

پھر میرے اور اے ایس آئی کے بیچ مختلف زاویوں سے آفتاب مرڈر کیس پر بات چیت کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے اے ایس آئی مشکور کو ضروری ہدایات دیں اور خود فیاض علی سے ملنے نوشہرہ ورکان روانہ ہو گیا۔ میری غیر موجودگی میں تھانے کی کمان مشکور کے ہاتھ میں ہوئی تھی۔ وہ امور تھانیداری سے بہ خوں آگاہ تھا۔ ایک بات بتاتا چلوں کہ گزشتہ روز جیدا تھانے نہیں آیا تھا۔

فیاض علی کی طرف جاتے ہوئے میں جیدا ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مشکور نے مجھے جیدا کی بہن کی منگنی ٹوٹنے کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا، اس کی روشنی میں جیدا کی ذات شک کی ویز چادر میں لپی نظر آتی تھی اور پھر کبڈی کے میدان میں ہونے والا جھگڑا بھی اہمیت کا حامل تھا۔

فیاض علی کے گھر میں سوکوری کی فضا جوں کی توں تھی تاہم لوگوں کا اس وقت رش نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کی بیوہ سے اظہارِ تعزیت کیا۔ انسان کی زندگی کا زیاں اتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ اس کی تلافی کے لیے الفاظ بہت حقیر اور چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ بہر حال، متاثرہ شخص کی اشک شوئی کے لیے کسی نہ کسی طرح رسم دنیا بھانا ہی پڑتی ہے۔ خالدہ ایک خوب صورت اور دلکش نقوش کی مالک لڑکی تھی۔ اس واقعے نے اس کے حسن اور رعنائی کو چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک بت کے مانند کم سمٹتی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ بہت جلد میں اس کے شوہر کے قاتل کو گرفتار کر لوں گا۔ اس کے بعد میں فیاض علی اور اس کی بیوی سلطانہ کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

”تھانیدار صاحب! آفتاب کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”آج شام تک اسپتال سے آپ کے بیٹے کی لاش آ جائے گی۔“ میں نے سلطانہ کو بتایا پھر فیاض علی سے پوچھا۔

”تم نے تو کہا تھا کہ آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ نہیں تھی لیکن میں نے تو پوچھا اور یہی سنا ہے.....!“

”کیسا ہے آپ نے؟“ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

”مجھے پتا چلا ہے، شادی کے فوراً بعد کبڈی کے میدان میں آفتاب کا جیدانایا ایک کھلاڑی سے جھگڑا ہو گیا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب! آپ کو پتا ہی ہے، کھیل کو دس لڑائی جھگڑے کا امکان تو رہتا ہی ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے، بات ادھر میدان ہی میں ختم ہوئی تھی۔ مجھے نہیں لگتا، اس معمولی سے واقعے کی وجہ سے جیدا کوئی سنگین قدم اٹھائے۔“

”آپ بہت سیدھے ہو اس لیے آپ کو دوسرے لوگ بھی معصوم اور بے ضرر نظر آتے ہیں۔“ سلطانہ نے فیاض علی کو گھورتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تھانیدار صاحب! آپ درست سمت میں سوچ رہے ہیں۔ ہمارے دشمنوں میں ایسا ہو گیا ہے۔ جیدانے اس دن آفتاب سے جو جھگڑا کیا، اس کے پیچھے فیضی کا دماغ تھا۔“

فیضی کا نام میں نے نواجا کی زبانی سنا تھا۔ اس جھگڑے

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو فیضی پر پکا شک ہے۔ جیدا کی بہن کی تو صرف منگنی ہی ٹوٹی تھی، آفتاب کی شادی نے تو فیضی کی گردن جھکا دی ہے۔“

مجھے نواجا کی بتائی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کبڑی والے بھٹورے کے تفصیل بتاتے ہوئے جیدا اور آفتاب کے مکالمے بھی شامل کیے تھے۔ جب آفتاب نے فیضی کی بے ایمانی پر آواز اٹھائی تو جیدا نے اس کی شادی کا حوالہ دے کر کہا تھا۔ ”تمہاری شادی کیا ہوئی کہ تم نے خود کو شوہرہ ور کاں کا بہرہ سمجھنا شروع کر دیا ہے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ اور اب سلطانہ بھی کچھ اسی نوعیت کی بات کر رہی تھی۔

”آفتاب کی شادی سے فیضی کی گردن کیسے جھک گئی تھی؟“ میں نے سلطانہ سے سوال کیا۔

”کبڑی کے میدان میں تو میرا بیٹا فیضی کو ہمیشہ لڑاتا ہی تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔“ لیکن خالدہ سے جب آفتاب کی شادی ہوئی تو فیضی کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ آفتاب نے کبڑی کے میدان سے باہر اسے گلست فاش دیکھی تھی تھانیدار صاحبہ۔۔۔۔۔

”میں اس گلست فاش کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔“ میں سیدھا ہو کر پیشہ کیا۔ ”مجھے ایک ایک بات بتاؤ۔“

”میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔“ فیاض علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”خالدہ میرے بڑے بھائی کی بیٹی ہے۔ بھائی فدا حسین گوجرانوالہ شہر میں رہتا ہے۔ وہاں اس کا بھتیجے کے برتنوں کا کارخانہ ہے۔ کسی زمانے میں بھائی فدا بھی ادھر نوشہرہ ورکاں ہی میں رہتا تھا۔ پھر اس نے ساری اراضی فروخت کر دی اور بیوی بچوں کو لے کر گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ اب وہ ایک طویل عرصے سے ادھر گوجرانوالہ شہر میں ہے۔ شہر جا کر اس نے خوب ترقی کی اور زمیندار سے کارخانے دار بن گیا۔ اس کی صرف دو اولادیں ہیں۔ ایک خالدہ اور خالدہ سے تین سال چھوٹا ایک بھائی جس کا نام سعید ہے۔۔۔۔۔“

”یہ آپ تھانیدار صاحب کو فضول کہانی سنارہے ہو۔“ سلطانہ نے اپنے شوہر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”وہ فیضی اور آفتاب والے معاملے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔!“

”تو پھر تم خود ہی تھانیدار صاحب کو سب کچھ بتا دو۔“ فیاض علی خفگی آمیز لہجے میں بولا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اضافہ کیا۔ ”تھانیدار صاحب! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ آپ سلطانہ سے سوال جواب کریں۔“

اپنی بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ نے کہا۔ ”لو جی۔۔۔۔۔ میں نے تو کوئی غلط بات

۱۲ اصل کردار فیضی ہی تھا۔ فیضی نے کبڑی کے کھیل میں بے ایمانی کی تھی اور۔۔۔ جیدا اپنے دوست فیضی کی حمایت میں آفتاب کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

فیاض علی کی یہ نسبت اس کی بیوی مجھے زیادہ ہوشیار اور بھوار لگتی تھی اس لیے پوچھتا چھ شروع کر دی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے فیضی کا ذکر بھی سنا ہے۔ جیدا سے اس کی بڑی گہری دوستی ہے۔ ایک بات پوچھوں۔ اس کا بالکل درست جواب دینا۔۔۔۔۔“

”جی پوچھیں۔“ سلطانہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔“

”مجھے پتا چلا ہے خالدہ سے شادی سے پہلے آفتاب کی مہر کی بہن فریدہ سے منگنی ہوئی تھی۔“ میں نے سلطانہ کے ہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ منگنی سال بھر رہی پھر آپ لوگوں کی طرف سے منگنی توڑ دی گئی۔ اس واقعے کی بنا پر بھی مہر آفتاب سے نفرت کر سکتا ہے۔“

”جی، آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”واقعی یہ منگنی ہم نے ہی فسخ کی تھی۔“

”منگنی توڑنے کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے تھانیدار صاحب اس لیے آپ کو سب کچھ کھول کر بتاؤں گی۔“ سلطانہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ آفتاب کی ایک سال تک فریدہ کے ساتھ منگنی رہی لیکن اس دوران میں ہمیں فریدہ کے کردار کے حوالے سے چند ایسی شرمناک باتیں پتا چلیں کہ کوئی بھی عزت دار انسان فریدہ کو اپنے گھر کی بہو بنانے کا فیصلہ نہیں کر سکتا لہذا ہم نے منگنی توڑ دی۔“

”چھوڑو سلطانہ۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود سے دار ہے۔“ فیاض علی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تھانیدار صاحب! منگنی توڑنے کے کچھ ماہ بعد ہم نے آفتاب کی شادی خالدہ سے کی تھی۔ اگر جیدا کے دل میں آفتاب سے انتقام لینے کا خیال ہوتا تو وہ ان چھ ماہ میں کوئی تہ کوئی اونچی حرکت ضرور کرتا۔“

”آپ یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ شاطر دشمن وقت اور موقع کا انتظار کرتے ہیں۔“ سلطانہ نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”اور اب تو اس بد بخت جیدا کے ساتھ ایک اور غمیٹ بھی جو گیا ہے۔“

”کون غمیٹ؟“ میں نے بے اختیار سوال کیا۔

”میں فیضی کی بات کر رہی ہوں تھانیدار صاحب۔“ اس

نہیں کی۔ یہ تو خواجوا ہی ناراض ہو رہے ہیں۔“

”جوان بیٹے کی موت کوئی معمولی حادثہ نہیں ہوتی سلطانہ۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”فیاض علی کی ذہنی حالت کو میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔“

”آفتاب صرف فیاض ہی کا بیٹا نہیں تھا تھانیدار صاحب۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ میرا بھی لختِ جگر تھا۔ اس کی جدائی نے مجھے اندر سے مار دیا ہے۔“ وہ غم ہوتی ہوئی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن کیا کریں..... مرنے والے کے ساتھ مرنا تو نہیں جانتا..... اگر ہم ہمت ہار کر بیٹھ گئے تو پھر قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں آپ کی مدد کوں کرے گا!.....!“

”تم بڑی بہادر اور حوصلے والی عورت ہو سلطانہ!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، اصل کہانی کیا ہے؟ آفتاب کے قتل کے حوالے سے جہیں کس پر شک ہے؟“

اب تک کی گفتگو سے میں نے یہ خوبی بہ اندازہ لگا لی تھی کہ فیاض علی کی بہ نسبت سلطانہ سے کوئی کام کی بات اگلوئی جاسکتی تھی۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”تھانیدار صاحب! میں نے اپنے بیٹے کا خون ہوتے نہیں دیکھا اس لیے قسم اٹھا کر تو میں قاتل کی نشاندہی نہیں کر سکتی لیکن میرا شک صرف اور صرف فیاض پر جاتا ہے۔“

”اس شک کا سبب کیا ہے؟“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں ان ٹھوس وجوہات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا پر تم فیاض کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمے دار سمجھتی ہو۔“

”تھانیدار صاحب.....“ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس معاملے کو سمجھنے کے لیے آپ کو تین گھرانوں کی آپس کی رشتے دار پولی سے آگاہ ہونا پڑے گا۔ یعنی ہمارا گھرانہ، خالدہ کا گھرانہ اور فیاض کا گھرانہ۔“

”ابھی تمہارے سامنے فیاض علی نے بتایا تو ہے کہ خالدہ اس کے بڑے بھائی فدا کی بیٹی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس طرح دو گھرانوں کا رشتہ تو واضح ہو گیا۔“

”ہاں۔ دو گھرانوں کی رشتے داری آپ کے علم میں آ چکی ہے۔“ وہ بڑی رمان سے بولی۔ ”لیکن تیسرا گھرانہ ابھی باقی ہے اور اس کی رشتے داری بڑی میزگی ہے۔ میرا اشارہ فیاض کے گھرانے کی طرف ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے فیاض کے گھرانے کے بارے میں بتاؤ۔“ میں نے گہری تنجیدگی سے کہا۔ ”اس کی میزگیوں کا لے

کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”فیاض کے گھرانے کی ہم سے کوئی رشتے داری نہیں مطلب براہِ راست ہمارے بچ کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن ان کی فدا حسین کے گھرانے سے بڑی گہری رشتے داری تھی۔“

”رشتے داری تھی..... سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ آج کل شدید نوعیت کی ناراضی چل رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”رشتے داری تو اپنی جگہ پر موجود ہے مگر دلوں کی ریش میں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ دونوں گھرانوں کے افراد ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے کردار نہیں ہیں۔“

”اس نفرت آمیز بازی کاٹ کی کیا وجہ ہے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

”فیاض اور آفتاب کا رشتہ۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”میں سمجھتا ہوں.....؟“ میں نے انھیں زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”خالدہ کی ماں شاہدہ فیض کی خالہ ہے یعنی فیض کی ماں زاہدہ کی چھوٹی بہن۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”زاہدہ کی خواہش تھی کہ وہ فیض کی شادی اپنی چھوٹی بہن کی بیٹی خالدہ سے کرے لیکن دوسری جانب سے صاف انکار ہو گیا۔“

”اوہ..... اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”ظاہر ہے، یہ انکار خالدہ کے باپ نے کیا ہو گا کیونکہ وہ خالدہ کی شادی اپنے چھوٹے بھائی کے بیٹے آفتاب سے کرنا چاہتا تھا۔“

”نہیں جناب! آپ بالکل سبھی نہیں سمجھے۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بتایا ہے نا، ان دونوں خاندانوں کی رشتے داری بہت میزگی ہے۔“

”تو پھر تم ہی بتاؤ.....“ میں نے ٹٹولے والی نظر سے اسے دیکھا۔ ”اس رشتے سے کس نے انکار کیا تھا؟“

”شاہدہ نے!“ وہ اعتراف انگیز لہجے میں بولی۔

”یعنی چھوٹی بہن نے بڑی بہن کو انکار کر دیا.....؟“

”جی بالکل چٹا انکار۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”ورنہ فدا حسین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہدہ کسی بات پر

زاہدہ سے ناراض ہوگی ورنہ انکار کی کوئی وجہ یہ ظاہر

دکھائی نہیں دیتی۔“

”آپ کی اس بات سے پورا ٹوشہرہ درکاں اتفاق

کرے گا کہ یہ ظاہر رشتے سے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی

میں مزید چند منٹ سلطانہ کے پاس بیٹھا بھر جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سرسری انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا چھوٹا بیٹا کہاں ہے؟ ابھی تک اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی.....!“

”زلفی آپ کے آنے سے پہلے تو ادھر گھر ہی میں تھا۔“ وہ چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ ”گھر میں، میں باہر کھلی میں دیکھتی ہوں۔ بھائی کی موت نے اسے بھی بہت متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی بیماری کو بھول کر مارا مارا پھر رہا ہے۔“

”تم آرام کرو سلطانہ۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”زلفی سے ملنا ضروری نہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی رواروی میں پوچھ لیا تھا۔“

مجھے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے اچھا خاصا مواد مل گیا تھا۔ سلطانہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں یہ آسانی میں قاتل تک رسائی کے راستے کا تعین کر سکتا تھا۔ میں نے دو افراد کے ناموں پر دائرہ لگایا اور فیاض علی کے گھر سے باہر نکل آیا۔ یہ دو نام تھے..... جاوید عرف جید اور فیض عرف فیضی۔ یہ دونوں مقتول کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان دونوں کے پاس مقتول کو نقصان پہنچانے کا بہانہ بھی موجود تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جید اور فیضی کے بیچ گہری دوستی بھی تھی۔

جب میں باہر کھلی میں آیا تو مجھے فیاض علی نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک ادیب عمر حفص اور ایک نو عمر لڑکا بھی موجود تھا۔ ادیب عمر حفص کے چہرے میں فیاض علی کی شبابت پائی جاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فیاض علی تعارف کرانے والے انداز میں بولا۔

”یہ ندا بھائی ہیں۔ آفتاب کی موت کا سن کر گوجرانوالہ سے آئے ہیں۔“ پھر وہ نوجوان لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ سعید ہے، خالدہ کا چھوٹا بھائی۔“

میں ندا حسین اور اس کی کھلی سے غائبانہ طور پر متعارف ہو چکا تھا۔ میں نے ندا حسین سے مصافحہ کیا اور آفتاب کو پیش آنے والے واقعے پر اظہارِ افسوس بھی کیا۔

ندا ایک دینگ حفص تھا۔ رکی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! آفتاب مجھے بہت عزیز تھا۔ میں نے خالدہ کو اس کے نکاح میں دے کر اسے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ اس کی موت میرے لیے ایک عظیم جذباتی نقصان ہے اور اس نقصان کی تلافی صرف اور صرف آپ کر سکتے ہیں۔“

..... لمحاتی توقف کر کے اس نے میری آنکھوں میں دیکھا پھر گمبیر لہجے میں مختصر ہوا۔

”اس انکار سے پہلے دونوں بہنوں میں بڑے گہرے تعلقات تھے اور ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی عام تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن فیضی کے رشتے کے انکار کے بعد سے زاہدہ کا دل ایسا کھٹا ہوا ہے کہ وہ شاید ۱۲ لیتا بھی پسند نہیں کرتی اور..... زاہدہ کے گھر والے غریب ملی کو تو ایسا صدمہ پہنچا کہ بے چارے کو فاق..... ہو گیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”آپ لوگوں نے بتایا کہ خالدہ کا میکا گوجرانوالہ شہر میں ہے۔ کیا فیضی ابھی رہتا ہے یا یوگ بھی گوجرانوالہ ہی کے وسٹیک ہیں؟“

”صرف ندا حسین اپنے بیوی بچوں کو لے کر گوجرانوالہ چلا گیا تھا اور وہ بھی کئی سال پہلے جب خالدہ اور مدد بہت چھوٹے تھے۔“ سلطانہ نے بتایا۔ ”باقی سب لوگ ابھی لوشہرہ ورکان ہی میں ہیں۔ زاہدہ کا گھر ابھی اسی گاؤں میں آباد ہے۔“

”تو تمہارا یہ خیال ہے کہ فیضی کو اس بات کا بہت غصہ تھا کہ اس کی شادی اس سے نہ ہو سکی وہ آفتاب کی بیوی بن کر لوشہرہ ورکان آئی؟“ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”لہذا تمہیں شک ہے کہ آفتاب کے قتل میں فیضی کا ہاتھ ہو سکتا ہے.....؟“

”اگر میں ایسا سوچتی ہوں تو اس میں میرا کوئی تصور نہیں تھا۔ تھانیدار صاحب۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ”آپ پورے لوشہرہ میں گھوم پھر کر فیضی کے بارے میں معلومات اکٹھی کر لیں۔ آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنا کمینہ اور لہو پرور ہے۔“

”اس بات کا مجھے کافی حد تک اندازہ ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”باقی ماندہ میں اس کے گھر جا کر معلوم کر لوں گا۔ ان لوگوں سے ملنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”آپ ضرور میں ان سے ملنی اور دوسرے لوگوں سے ملنی۔“ وہ ایک پوچھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”میرے کیجیے میں تو اس وقت ٹھنڈ پڑے گی جب آفتاب کا مال پھاکی کے چندے میں لٹکا ہوا نظر آئے گا۔“

”یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد تمہارے لیے کھنڈک کا بندوبست کر دوں گا۔“ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”اس سلسلے میں تمہیں مایوسی کا منہ نہیں دیکھنا آئے گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانیدار صاحب!“ وہ اب ناک لہجے میں بولی۔

”آپ میری بات تو سمجھ گئے ہیں نا؟“

”میں آپ کی بات کی نہ میں اتر گیا ہوں جناب۔“

میں نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ”آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ بہت جلد آفتاب کے قافل کو قافون کے کٹھنرے میں دیکھیں گے۔“

”بس..... میں یہی چاہتا ہوں۔“ وہ مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس سلسلے میں اگر کسی بھی نوعیت کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو زحمت دینے میں کسی سوچ بچار سے کام نہیں لوں گا۔“ میں نے کہا۔

”شکر ہے تمہارا صاحب۔“ وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ”آفتاب کی لاش کب تک ہمارے حوالے کر دی جائے گی؟“

”آپ لوگ تدفین کی تیاری کر لیں۔“ میں نے مغفوم لہجے میں کہا۔ ”شام سے پہلے کسی وقت بھی آفتاب کی لاش اسپتال سے تمہارے پہنچ جائے گی۔ کاغذی کارروائی پوری کرنے کے بعد میں لاش کو آپ کے سپرد کر دوں گا۔“

فدا حسین نے میرا شکریہ ادا کیا پھر اپنے بھائی فاض کے ساتھ گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں تانگے کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ میں جس تانگے پر سوار ہو کر نوشہرہ ورکاں آیا تھا، وہ نواجا کر یا نہ فروش کی دکان کے قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو نواجانے مجھے سلام کیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

”تمہارا صاحب! آخر آپ نے نوشہرہ ورکاں میں گرفتاری ڈال ہی دی.....“

فوری طور پر میں اس کی بات کو سمجھ نہیں پایا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ”چاچا! تم کس گرفتاری کی بات کر رہے ہو؟“

”وہ جی..... ابھی آپ کے تمہارے کا ایک بندہ جیدا کو اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ اچھا.....“ میں نواجا کی بات سمجھ گیا اور کہا۔ ”یہ سب تفتیش کا حصہ ہے چاچا۔ اگر ضرورت پڑی تو تمہاری گرفتاری بھی عمل میں لائی جاسکتی ہے!“

آخری جملہ میں نے ایسے ہی ٹانگ ویا تھا۔ میری بات سن کر وہ سہم گیا اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ”جناب! میں نے کون سا جرم کیا ہے؟“

”جیدانے بھی میرے بندے سے یہ سوال ضرور پوچھا ہوگا۔“ میں نے نواجا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہم یوں چلتے پھرتے کئی کوچوں میں لوگوں کو ان کے بار کی تفصیلات پڑھ کر نہیں سنایا کرتے۔ ایسے کاموں کے تمہانہ ہے نا.....!“

”معافی چاہتا ہوں سرکار۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے گرفتار ہوگا تمہانے میں عیش ہونا پڑے۔“

”بس تو پھر تمہیں فکر نہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں! میں نے سرسری انداز میں کہا اور تانگے پر سوار ہو گیا۔

نواجانے جیدا کی گرفتاری کی بات کر کے مجھے بے چہم کر دیا تھا۔ میں تو کل شام ہی جیدا کی تمہانے میں آمد کی نوٹ کر رہا تھا لیکن کل کی تاریخ میں میری یہ توقع پوری نہیں ہو پا سکی۔ خیر..... دیر آید، درست آید!

☆☆☆☆

جادو عرف جیدا میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے عقد میں ایک پھر تھلا کا نشیمل بھی موجود تھا تاکہ میرے سوالات دوران میں اگر جیدا کوئی کر بڑ کرنے کی کوشش کرے تو وہ اسے اپنے مخصوص جھکندوں سے ”سیدی راہ“ دکھا سکے۔

جیدا کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک آ اور اور صحت مند جوان تھا۔ رنگت گندمی اور سر کے بال غلط..... اس کے چہرے پر ایک خاص نوعیت کی کھنگلی پائی جا سکتی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر اس سے بات کی جائے تو وہ فو لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس کی شخصیت سے ایک جھٹکڑا انسان کا تاثر ابھرتا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”بہت دیر کی مہرباں آتے آتے..... ہوں؟“

”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے پکڑ کر یہاں کیا لایا گیا ہے؟“ وہ بیزار سے بولا۔ ”آخر میرا قصور کیا ہے؟“

”ہم تمہارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تمہارا سچا کر نہیں بیٹھے ہوئے۔“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہیں یہاں ضروری پوچھ سمجھ کے لیے لایا گیا ہے۔ سوال کر س کے اور جواب تم دو گے۔ اس سوال و جواب میں تمہارا قصور مکمل کر سامنے آ جائے گا۔ بات آئی سمجھ میں یا.....“

دوسرے طریقے سے سمجھاؤں؟“

جیدے کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ میرے چار چاند انداز نے اسے محسوس کرادیا کہ آنکھیں سے کام نہیں چلے گا لہذا اس نے

”جیدانے بھی میرے بندے سے یہ سوال ضرور پوچھا ہوگا۔“ میں نے نواجا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ساتھ ٹرائل روم میں لے جانا۔ تمہیں اس کی خاطر مدارات کی کھلی اجازت ہوگی۔“ میں نے کانشیل کو فری ہینڈ دیتے ہوئے کہا پھر جیڈا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”تمہارے دونوں سوالوں کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ یہ توکل ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم نوشہرہ وراکاں میں موجود نہیں ہو اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تم شام سے پہلے واپس آ جاؤ گے مگر تم نہیں آئے۔ آخر تم اس دوران میں تھے کہاں اور کیا کرتے پھر رہے تھے؟“

”جناب! مجھے پروگرام کے مطابق، شام سے پہلے واپس آنا تھا۔ بس پھر دیر ہوگئی اور میں رات کو کافی دیر سے گھر پہنچا ہوں اور صبح ہوتے ہی آپ کا بندہ پکڑ کر مجھے تھانے لے آیا ہے۔“ وہ فریادی لہجہ میں بولا۔

”میرے بندے نے جو کچھ بھی کیا اس میں میری مرضی شامل تھی۔“ میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ، تم گئے کہاں تھے؟“

اگرچہ جیڈا کے گھر والوں سے یہ معلومات مجھ تک پہنچ چکی تھیں کہ وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا تھا لیکن میں تفتیشی تقاضے پورے کرتے ہوئے یہ سب اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ جیڈا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”میں غلہ منڈی گیا ہوا تھا جی۔“

”کون سی غلہ منڈی۔“ میں نے پوچھا۔ ”پرانی یا نئی؟“

”پرانی غلہ منڈی جناب۔“

”وہاں کس کام سے گئے تھے تم؟“ میں نے سوال کیا۔

”سبز بوں کے بیج لانا تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کے علاوہ گندم وغیرہ کی مارکیٹ بھی چیک کرنا تھی۔ آج کل گندم کا

سبز چل رہا ہے۔ کاشت کار کو ہر چیز کی خبر رکھنا پڑتی ہے جناب۔“

”تم کل صبح کتنے بجے گھر سے روانہ ہوئے تھے؟“

میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

”لگ بھگ سات بجے میں گھر سے نکلا تھا۔“ اس نے بتایا۔

میرے اندازے کے مطابق، آفتاب کی موت صبح

پانچ اور چھ بجے کے درمیان ہوئی تھی اور اس کی خونچکاں

لائٹ کو آٹھ بجے فیاض علی نے ڈیرے کے ایک کمرے میں

دریافت کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب جیڈا اپنے گھر

سے روانہ ہوا تو اس سے پہلے آفتاب کا قتل ہو چکا تھا اور جب

آفتاب کی موت کی خبر منظر عام پر آئی تو تب تک جیڈا گاؤں

سے جا چکا تھا۔ اس تناظر میں جیڈا کسی بھی صورت آفتاب

ادھر جیڈا کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کے پیچھے گھرے ہوئے قوی الجیش کانشیل نے نہایت ہی پھرتی کے ساتھ جیڈا کی گردن پر ایک دو ہنتر رسید کیا اور خون خوار

میں بولا۔

”ملک صاحب کے سامنے سوال نہیں..... صرف جواب!“

”یہ تو آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔“ وہ نیم

انتہائی انداز میں چلا یا۔

کانشیل نے ایک مرتبہ پھر مستعدی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے جیڈا کی کمر پر سرکاری بوٹ کی ٹھوکر جھاتی اور غراہٹ

امیز لہجہ میں کہا۔ ”ملک صاحب کے سامنے آواز نیچی.....!“

کانشیل کے اس خیر مقدمی سلوک نے جیڈا کے کسبل

کافی حد تک نکال دیے۔ میں نے تھانیدار انداز میں کہا۔

”ابھی تو میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی

جیڈا لیکن اگر تم نے میرے سوالات کے سیدھے اور سچے

جوابات نہ دیے تو پھر تمہیں زیادتی کے مفہوم سے آشنا کرنے

کے لیے مجھے مجبوراً تمہیں دو چار ٹھنوں کے لیے ڈرائنگ روم کی

بیر کرانا پڑے گی۔ ہمارے ڈرائنگ روم کی ضیافت بڑے

بڑوں کو کھایا یا سب اگلے پر آمادہ کر دیتی ہے.....!“

وہ خنجر زدہ نظری سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ

پوچھیں جی..... میں آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔“

”تم نے آفتاب کو کیوں قتل کیا؟“ میں نے سرسرتی

ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مم..... میں نے.....“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے

ہوئے الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ”میں نے کسی کو قتل نہیں

کیا..... تھانیدار صاحب۔“

”میں نے تم سے کسی کو قتل کرنے کے بارے میں نہیں

پوچھا۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

کہا۔ ”میں آفتاب کی بات کر رہا ہوں۔“

”جناب! میں آفتاب کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں

جانتا۔“ وہ منت ریز انداز میں بولا۔ ”مجھے تو خود کل رات کو اس

وائے کا پتا چلا ہے۔ میں توکل کا پورا دن ادھر نوشہرہ وراکاں میں

تھا ہی نہیں اور..... پھر میں آفتاب کو کیوں قتل کروں گا؟ میری

اس سے کیا دشمنی؟“

”ملک صاحب! اس بد بخت کو تھوڑی دیر کے لیے آپ

میرے حوالے کر دیں۔“ کانشیل نے مجھ سے مخاطب ہوتے

ہوئے کہا۔ ”میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ نہیں رہی۔ یہ آپ

سے سوال پر سوال کیے جا رہا ہے۔“

”اب اگر یہ کوئی سوال کرے تو پھر تم اسے اپنے

کے قتل میں ملوث نظر نہیں آتا تھا لیکن یہ تو جید کا بیان تھا کہ گزشتہ روز وہ صبح سات بجے گھر سے نکلا تھا اور میں آنکھیں بند کر کے اس کے بیان پر یقین نہیں کر سکتا تھا لہذا حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے جید کی زبانی کلائی اور ضرورت پڑنے پر ہاتھ پاؤں کے موثر استعمال سے رگڑائی بچھا کر کرنے میں مجھے حارثیں تھیں۔

”جب تم گھر سے روانہ ہوئے تو تمہیں پتا نہیں تھا کہ آفتاب کو کسی نے بے دردی سے قتل کر دیا ہے؟“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں گزشتہ رات اس واقعے کی خبر ہوئی تھی..... ایسا ہی ہے نا؟“

”جی! وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ بالکل ایسا ہی ہے۔“

”تم نے پرانی غلہ منڈی کی کس دکان سے سبزیوں کے بیج وغیرہ خریدے تھے؟“ میں نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

”چودھری نواز علی اینڈ سنز سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”چودھری نواز علی اینڈ سنز تو کافی مشہور دکان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”غلہ منڈی میں ان کا ایک نام ہے اور وہ اپنی دکان سے خریدی ہوئی ہر چیز کی رسید ضرور دیتے ہیں۔ کیا تم نے ان سے سبزیوں کے بیج خریدے تھے اس کی رسید لی تھی؟“ ”جی بالکل لی تھی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”وہ رسید اس وقت بھی میری ڈب میں موجود ہے۔“

”لاؤ..... وہ رسید مجھے دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔ جید نے پالمین کا کرتہ اور تہ بند پہن رکھا تھا۔ میرے رسید کے مطالبے پر اس نے اپنی دھونی کی ڈب میں سے ایک مڑاڑا کاغذ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ ”یہ لیں جناب۔ دیکھ لیں رسید۔“

تہ بند یا دھونی کے پلوں کو کھٹا کر کمر کی دونوں جانب ایک مخصوص انداز میں اڑس لیا جاتا ہے جو کہ ”ڈب“ کہلاتی ہے۔ اکثر دیہاتی ہلکی پھلکی چیزیں اپنی ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ ڈب ایک طرح سے جیب کا کام دیتی ہے۔

میں نے جید کی فراہم کردہ رسید کا بغور جائزہ لیا۔ ”وہ چودھری نواز علی اینڈ سنز“ کی ہی پرنٹ رسید تھی۔ رسید کے بالائی حصے میں جلی حروف میں ”چودھری نواز علی اینڈ سنز“ چھپا ہوا تھا۔ نیچے خریدے گئے سامان کی تفصیل تھی۔ میں نے وہ تفصیل پڑھی۔ رسید کے مطابق، متذکرہ بالا دکان سے مختلف سبزیوں کے بیجوں کی خریداری کی گئی تھی۔ میرے

لیے اس رسید میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ تاریخ تھی جس روز یہ خریداری کی گئی تھی۔ رسید پر گزشتہ روز کی تاریخ درج تھی یعنی رواں مہینے کی اٹھارہ تاریخ۔ یہ کیش میو اس امر کا بین ثبوت تھا کہ گزشتہ روز یعنی اٹھارہ تاریخ کو جید نے چودھری نواز علی اینڈ سنز سے مختلف سبزیوں کے بیج خریدے تھے۔ اس رسید کی رو سے جید کا جائے ادوات سے عدم موجودگی ثابت ہوتی تھی مگر میرا شک ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ میری تسلی اس وقت ہوئی جب میں اس رسید کی تصدیق کر لیتا۔

میں نے مذکورہ رسید کو اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور جید کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم نے آفتاب کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس واقعے سے تمہارا دور در کا واسطہ ہے.....؟“

”جی۔ میں نے یہی کہا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور میں اپنے اس بیان پر کھڑا ہوں۔“ ”تمہارے خیال میں آفتاب کو کس نے قتل کیا ہے؟“ میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

”مجھے کیا پتا تھی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”آفتاب کے قاتل کو ڈھونڈنا تو آپ کا کام ہے۔“ ”ٹھیک کہتا ہے۔“ میں نے یہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا ہی کام ہے اور میں اپنے کام میں مصروف ہوں لیکن اس کام میں ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔“

”کسی رکاوٹ تمہانیدار صاحب؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”اس رکاوٹ کا نام ہے جاوید عرف جید۔“ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تمہانیدار صاحب۔“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”میں بھلا آپ کے راستے کی رکاوٹ کیسے بن سکتا ہوں.....؟“

”وہ اس طرح کہ میں اپنی تفتیش کے ٹھوڑے کوجس بھی سمت دوڑاتا ہوں، سامنے ہی ٹکڑے دکھائی دیتے ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیمتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ خالدہ سے شادی سے پہلے آفتاب کی تمہاری بہن فریدہ کے ساتھ منگنی ہوئی تھی؟“

”جی۔ یہ بات بالکل درست ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک سال تک یہ منگنی برقرار رہی پھر ٹوٹ گئی۔“ اپنے منہ کے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے

بھی باتیں کرتے رہتے ہو۔“ میں نے غیر محسوس انداز میں جیدا کو ایک خاص مقام کی طرف دھکیلتی کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”تمہاری باتوں سے آفتاب کے لیے نفرت بولکتی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”تمہیں دار صاحب! آفتاب اور اس کے گھر والوں نے میری بہن کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے بعد میں ان لوگوں کو پھولوں کے ہاتھ تو پہتا نہیں سکتا۔“ وہ کڑواہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہاں..... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آفتاب اور اس کے گھر والوں سے شدید نفرت کرتا ہوں۔“

”اور تمہاری یہ نفرت حق دوستی کی انجام دہی کے سبب دو آتشہ ہو چکی ہے.....!“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”حق دوستی؟“ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔
”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تمہیں دار صاحب!“
”فیضی سے تمہاری دوستی ہے نا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی، جی..... فیضی میرا جگر یار ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔
”اگر جگر یار پریشان ہو تو تمہارے جگر میں بھی درد ہوگا نا..... یا نہیں؟“
”ہوگا جی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”فیضی کی تکلیف میری تکلیف ہے۔“
”اور تم دونوں کا درد بھی مشترک ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آفتاب نے ایک طرف تمہاری بہن کو مسترد کر کے تمہارے دل میں خنجر گھونپا ہے تو دوسری جانب اس نے خالدہ سے شادی کر کے فیضی کی انا اور غیرت کو لٹکا رکھا۔ فیضی اپنی خالدہ کی بیٹی خالدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس رشتے سے انکار کی وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالدہ، فیضی سے چھن گئی تھی..... ہیں نا؟“

”جی..... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایسا ہی ہوا تھا۔“

”موت جب ہمارے کسی پیارے کو ہم سے چھین لیتی ہے تو ہمیں بہت گہرا صدمہ پہنچتا ہے۔“ میں نے گہری تنہائی سے کہا۔ ”ہم کئی دنوں تک نیچے ہوئے دل اور ویران آنکھوں کے ساتھ بولائے بولائے پھرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سمندر میں جتنا بھی پانی ہوتا ہے، اسے ہم آنسوؤں کی صورت بہا دیتے ہیں حتیٰ کہ ہماری آنکھوں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں لیکن پھر وقت کا ہمارے دل و جگر کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے اور رفتہ رفتہ ہم نائل زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ ایسا

میرے پر تپتی کے تاثرات ابھرا آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔
”یہ ممکن کیسے ہو سکتی؟“
”آفتاب کے گھر والوں نے معنی توڑ دی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”معنی ٹوٹنے کا سبب کوئی بھی رہا ہو، میں اس بحث میں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے گہری تنہائی سے کہا۔ ”لیکن یہ بات تو تم مانو گے نا کہ اس ممکن کیے ٹوٹنے سے تمہیں دلی صدمہ پہنچا تھا؟“

”ظاہری بات ہے جناب۔“ وہ ضمیر سے بھرے لہجے میں بولا۔ ”فریدہ میری اکلوتی چھوٹی بہن ہے۔ اگر کسی لڑکی کی ممکن ٹوٹ جائے تو اس کی ذات پر ایک طرح کا دھبہ سا لگ جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے منحوس بھی سمجھتے لگتے ہیں اور اس کا رشتہ ڈالنے والے یہ تحقیق بھی کرنا لازمی سمجھتے ہیں کہ پہلی ممکن کیوں ٹوٹی تھی۔“ لچائی توقف کر کے اس نے ایک پوچھ سانس خارج کی پھر افسردہ لہجے میں بولا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔ فریدہ کی ممکن ٹوٹنے کا مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس واقعے کو لگ بھگ ایک سال ہوئے کو آیا ہے لیکن ابھی تک ہم راہ دیکھ رہے ہیں..... کہ اس کا کوئی رشتہ آئے.....!“

بات کے اختتام پر وہ اچھا خاصا مغموم ہو گیا تھا۔ میں اس کے درد کو کچھ سمجھ سکتا تھا اور اس دکھ سے اتفاق کرتا تھا۔ اس کا مسئلہ واقعی جینیوں تھا۔ محبت کرنے والے بھائی اپنی بہنوں کے رشتوں کے لیے اسی انداز میں پریشان اور فکر مند ہوا کرتے ہیں۔ سلطانہ نے مجھے اس ممکن کو توڑنے کا جو سبب بتایا تھا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اس بحث میں فریدہ کی کردار کشی کا پہلو اجاگر ہوتا تھا۔ بیٹیاں اور بہنیں سب کی سبجی ہوتی ہیں۔ کسی کی بیٹی یا بہن کے بارے میں لب کشائی کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا چاہیے۔ کسی سیانے کا بڑا خوب صورت اور معنی آفریں قول ہے..... باجیا کو حیا ماری ہے اور بے حیا زہر سے بھی نہیں مرتے!

عین ممکن تھا کہ سلطانہ کے بیان میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ یہ اس کا وہم یا گمان یا غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے جیدا سے کہا۔

”بہن کی ممکن ٹوٹنے سے تمہیں جو اذیت پہنچی تھی تم اس تکلیف کا اظہار گاہے بگاہے کرتے رہتے تھے۔“
”جی، ایسا ہی ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا۔
”تم اپنی تکلیف کے اظہار کے لیے آفتاب کے خلاف

”میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔“ وہ احتجاجی انداز میں بولا۔ ”آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ آفتاب کے قتل کے معاملے سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔۔۔۔۔!“

”بیٹا جی! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تمہیں کھانے سے معاملات حل نہیں ہوا کرتے۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”ہمارا تفتیش اور تحقیق کا اپنا ایک طریقہ کار ہے اور میری ریسرچ یہ بتاتی ہے کہ اگر آفتاب کو تم نے قتل نہیں کیا تو پھر اس کا قاتل فیضی کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔“

”میں یہ مانتا ہوں کہ میرے اور فیضی کے دل میں آفتاب کے لیے بہت زہر بھرا ہوا ہے۔“ وہ راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے آفتاب کی جان نہیں لی۔ باقی جہاں تک فیضی کا تعلق ہے تو اس کے حوالے سے بھی میرے پاس معلومات نہیں ہیں۔ میں صرف اپنی ذات کی قسم کھا سکتا ہوں، کسی دوسرے کی نہیں۔ آپ فیضی کو بلا کر پوچھنا چھوڑ کر اس کی تسلی ہو جائے گی۔“

”برخوردار! میں اپنی تسلی کے لیے محض پوچھنا چھوڑ کر ہی محدود نہیں رہتا۔“ میں نے قدرے دھیمے مگر مستحکم خیز لہجے میں کہا۔ ”تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس سلسلے میں، میں کہاں تک جاسکتا ہوں۔۔۔۔۔“ لمحائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے۔“

وہ ہمت نہ کھو کر کہنے لگا۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔!“

”تمہاری ذات بھی خلیک کے دائرے سے باہر نہیں نکلی۔“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ”تم نے مجھے جتنی بھی کہانیاں سنائی ہیں میں ان پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کروں گا۔ جہاں جہاں بھی تصدیق کی ضرورت محسوس ہوگی، میں اس کام میں ذرا سی غفلت یا کوتاہی نہیں برتوں گا لہذا۔۔۔۔۔“

میں نے لمحائی توقف کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ جب تک اس کیس کی تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، تم نوشہرہ درگاں سے باہر قدم نہیں نکالو گے اور اگر تمہارا گناہ سن سے باہر جانا گزیر ہو تو پھر تم اس مقصد کے لیے پیشگی تھانے میں اطلاع دو گے۔“

”جو حکم تمہارا صاحب۔“ وہ فرمان برداری سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”اور میں: جب بھی تمہیں تھانے میں طلب کروں، تم فوراً تہ تیغ یہاں پہنچو گے۔“

”جی۔ ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے میری بات کی تائید کر دی۔

”اور اگر ہم سے چھین جانے والا جینا جاگتا شخص، ہمارے آس پاس، ہماری نظروں کے سامنے، کسی دوسرے انسان کے تصرف اور اختیار میں ہو تو پھر ہمیں کیسا محسوس ہوتا ہے؟“ بات ختم کر کے میں نے نئی ہی ہوئی نظر سے جیدا کو دیکھا۔

”بہت برا محسوس ہوتا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

”دل چاہتا ہے، ہماری پسندیدہ سستی کو چھیننے والے کی ایسی کم کیسی کردیں۔۔۔۔۔ اس کا وہ حشر نشر کریں کہ آئندہ کسی کو ایسی چھیننا چھینی کی جرأت نہ ہو سکے۔“

”مطلب، اس نوعیت کی ذہنی کیفیت میں انسان اپنے رقیبِ رو سیاہ کی جان بھی لے سکتا ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔ یہ ناممکن نہیں۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

”تمہارا اپنے دوست کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

میں نے تھکے لہجے میں استفسار کیا۔

”کون دوست جناب؟“ وہ بے ساختہ بولا۔

فوری طور پر میری بات جیدا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”میں فیضی کی بات کر رہا ہوں۔ آفتاب کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جس سے فیضی شادی کا خواہاں تھا۔ اپنی پسندیدہ چیز چھین جانے کے کم میں وہ انعاماً آفتاب کی جان بھی تو لے سکتا ہے۔۔۔۔۔!“

”آپ۔۔۔۔۔ یہ کہنا۔۔۔۔۔ چاہتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ آفتاب کو فیضی نے قتل کیا ہے؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مطلق طور پر ایسا سوچنے میں مجھے تو کوئی قحاح نظر نہیں آ رہی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کہتے ہو؟“

”مم۔۔۔۔۔ میں کیا کہوں جناب۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”آپ نے تو مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔“

”سر دوست نوشہرہ درگاں میں صرف دو افراد ایسے ہیں جن کے دل و دماغ میں مقتول کے لیے نفرت ہی نفرت بھری ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی آفتاب کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکنے کے بعد سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ان دو افراد میں ایک کا نام ہے، جاوید عرف جیدا اور دوسرے کا نام ہے، فیض عرف فیضی۔۔۔۔۔ اور اتفاق سے یہ دونوں افراد آپ میں گہرے دوست بھی ہیں۔ میرے محتاط تجربے کے مطابق ان دونوں ہی میں سے کسی نے آفتاب کو بے دردی سے قتل کیا ہے۔“

تا کہ وہ ”چودھری نواز علی انڈسٹری“ جا کر جیدا کے بیان کی تصدیق کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے وہ رسید بھی اے ایس آئی کے حوالے کر دی تھی جو جیدانے اپنے تہ بندی ڈب سے نکال کر مجھے دی تھی۔ دوم، میں نے ایک اہلکار کو شوکت علی کے گھر کی جانب دوڑا دیا تا کہ وہ فیضی کو پکڑ کر تھانے لے آئے۔

میرے تھانے سے غلہ منڈی کا فاصلہ اچھا خاصا تھا تاہم نوشہرہ ورکاں چند منٹ کی دوری پر تھا چنانچہ اے ایس آئی کی واپسی سے بہت پہلے فیضی کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ وہ میرے سامنے حاضر ہوا تو میں نے تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

فیض عرف فیضی کی عمر تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ اپنے حیلے اور جتنے سے ایک فتنہ پرور اور پھٹے باز قسم کا شخص لگتا تھا اس کے چہرے پر برہمی کے آثار بڑے واضح طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ میرے بیچے ہوئے پولیس اہلکار نے اسے باقاعدہ پتھڑی پہتا کر یہاں تک نہیں پہنچایا تھا تاہم وہ غصیلے لہجے میں مسخر ہوا۔

”تھاندار صاحب! مجھے کس سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے؟“

”مذاکرات کے لیے.....“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک نہایت ہی اہم اور ہنگامی مسئلے پر مذاکرات کے لیے تمہیں تھانے بلایا ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میری مدد کی ضرورت.....“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور وہ بھی پولیس کو..... میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“

”میں نے سنا ہے کہ تم نے بد معاشی اور غنڈہ گردی کی دنیا میں نیا نیا قدم رکھا ہے اور پورے نوشہرہ ورکاں میں تم نے تھڑھکی بجا رکھی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”یہاں کا ہر چھوٹا بڑا بد معاش اور لپا لنگہ تمہارے سامنے ہاتھ باندھے ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا ہے.....!“

”ہاں نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟“ وہ شک زدہ نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔“

”تمہارے پلے میں تو میں اتنے وزنی بات ڈال دوں گا کہ تمہارے لیے کس سیدھی رکھ کر اور گردن کو اٹھا کر چلنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”بتاؤ..... تم نے آفتاب کو کیوں قتل کیا؟“

میرے آخری سوالیہ جملے پر وہ اس طرح اچھلا جیسے اس

”جی..... میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے ہر وقت ہمدرد ہوں گا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے اسے چند ہدایات دینے کے بعد رخصت کر دیا۔ اسی روز سہ پہر کے بعد اسپتال سے آفتاب کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آگئی۔ لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی آئی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، آفتاب کو اٹھارہ تاریخ کی صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ موت کا سبب وہ کاری وار بتایا گیا تھا جو اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر کیا گیا تھا۔ اس وار نے متوّل کی کھوپڑی کو بری طرح پٹخا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا گیا تھا کہ متوّل کے سر کے عقبی حصے پر کسی ہماری آہنی چیز سے ہلک ضرب لگائی گئی تھی اور یہ وار متوّل پر اس کی بے خبری میں کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے اندازے کی تصدیق کرتی تھی۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد آفتاب کی لاش کو فیاض علی کے گھر بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔

معاملہ خاصا سمجیر اور پیچیدہ ہو گیا تھا۔ قاتل کے حوالے سے ابھی تک کوئی حتمی اور دو ٹوک بات سامنے نہیں آئی تھی۔ اب تک کی تفتیش سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آفتاب کے متوّل قاتلوں کے حوالے سے جیدا یا فیضی میں سے کوئی ایک ہو سکتا تھا۔ جیدا کو تھانے بلا کر میں نے اس کا بھرپور ”انٹرویو“ کر لیا تھا لیکن اس عمل سے کوئی کام کی بات سامنے نہیں آ سکی تھی تاہم جیدا کے دورہ غلہ منڈی کی چیلنگ ابھی باقی تھی۔ اب مجھے فیضی کا انکسیرے کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچا جاسکتا تھا۔

جیدا کو میں نے آسانی سے جانے کی اجازت دے دی تھی تاہم میں نے ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کو اس کی نگرانی پر متعین بھی کر دیا تھا۔ مذکورہ اہلکار جیدا کے رخصت ہوتے ہی تھوڑا وقفہ دے کر تھانے سے روانہ ہو گیا۔ اگر جیدا واقعی آفتاب کے قتل میں ملوث تھا تو وہ کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا جس سے مجھے اس کی گردن ناپنے کا موقع مل جاتا۔ میں ابھی تک بند گلی میں کھڑا تھا لیکن مایوس نہیں تھا۔

☆☆☆

اٹھارہ تاریخ کی صبح آفتاب کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور انیس تاریخ کی شام اس کی تدفین ہو گئی۔ بیس تاریخ کی صبح میں نے دو اہم کام کیے۔ اول، میں نے اے ایس آئی مسکور حسین کو پرانی غلہ منڈی روانہ کر دیا

نے غلطی سے بجلی کے نیچے مار کھینچ لیا ہو۔ پھر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے لگتا زہد انداز میں بولا۔
 ”مم..... میں نے..... آفتاب کو..... قتل کیا ہے..... یہ آپ..... کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

”جو تم نے سنا، میں نے وہی کہا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بات آئی سمجھ میں یا نوچار کا لٹر منگوا کر تمہاری لٹرول کرواؤں؟“

ہمارے زمانے میں ابتدائی تفتیش کے لیے نوضرپ چار انچ کا ایک چمڑے کا جوتا نما ہتھیار استعمال کیا جاتا تھا۔ جوتے سے مشابہت کی بنا پر اسے چھتر یا لٹر کہا جاتا تھا۔ جب بھی کسی مجرم کو گرفتار کر کے تھانے لایا جاتا، پہلے مرحلے پر اسے مرغابنا کر اس کی تشریف مبارک پر اسی چھتر یا لٹر کی سلائی دی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر چیز تبدیل ہو گئی ہے۔ تفتیش کے نئے طریقے اور انداز وضع کر لیے گئے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق اب بھی بعض تھانوں میں اس روایتی تفتیشی ہتھیار ”چھتر“ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

”میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔“ وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔
 ”تو کیا تمہارے باپ نے کیا ہے.....؟“ میں نے کڑک دار آواز میں کہا۔ ”تمہارا باپ تو مظلوم ہے۔ وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا اور پھر اس کے پاس اس کام کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔“

میرے جارحانہ رویے کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ قدرے نرم پڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”تو میرے پاس آفتاب قتل کرنے کا کیا جواز ہے؟“

”تم آفتاب سے نفرت کرتے تھے، اسے اپنا رقیب سمجھتے تھے، اسے غاصب اور خود کو محروم تصور کرتے تھے۔“ میں نے اس کے کان کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خالہ شاہدہ نے تمہیں رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور پھر اسی لڑکی کی شادی آفتاب کے ساتھ ہو گئی۔ یہ تمہاری ہار اور آفتاب کی جیت تھی۔ وہ کبڈی کے میدان میں تو اکثر تمہاری درگت بناتا ہی رہتا تھا، زندگی کی بساط پر بھی اس نے تمہیں مات دے دی تھی۔ تم اسے فاتح اور خود کو مفتوح سمجھنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ تمہارے پاس اپنی ہزیمت، اپنی ناکامی اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اس پتھر کو راستے سے ہٹا دو جس نے تمہیں خود تمہاری نظر سے گرا دیا تھا اور پھر..... تم نے اپنی مجروح انا کی مرہم ہنی کے لیے آفتاب کی زندگی کا چراغ

کل کر دیا.....!“

وہ حیرت اور الجھن کے طے جلے تاثرات کے ساتھ آنکھیں پھیلائے میری بات سن رہا اور جیسے ہی میں خاموش ہوا، اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہاں دار صاحب! آپ کی زیادہ تر باتیں درست ہیں۔ میں واقعی آفتاب سے شدید نفرت کرتا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے جذبات سے مظلوم ہو کر اس کی جان لینے کے بارے میں بھی سوچا لیکن کبھی کبھی میں اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔“

”تو گویا تم مجھے یہ بتا رہے ہو.....“ میں نے کاٹ دار آواز میں کہا۔ ”کرم نے آفتاب کو قتل نہیں کیا..... ہوں؟“

”جی، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہی حقیقت ہے۔“

”اگر تم نے آفتاب کے خون میں ہاتھ نہیں رنگے تو پھر اس کا قاتل کون ہے؟“ میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔
 وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

”تو جاننے کی کوشش کرو اور سوچو کہ آفتاب کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے جواب چاہیے..... دو ٹوک اور حتمی جواب..... اور جب تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل جاتا، تم میرے تھانے کی حوالات میں بندر ہو گے!“

وہ بہت ہمت لایا اور اس نے رسی تڑانے کی بھی جتنی الامکان کوشش کی لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سنی اور ایک کاشییل کو بلا کر فیضی کو حوالات میں بندر کروا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ فیضی پر پکا ہاتھ ڈالنے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا لہذا میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے مار پیٹ سے گریز کیا تاہم اسے زیر حراست رکھنے کا میرا ایک مقصد تھا۔ حوالات میں بیٹھ کر وہ موجودہ صورت حال پر غور و فکر ضرور کرتا اور اگر اس کے ذہن میں اس کیس کے حوالے سے کوئی اہم اور مفید معلومات تھیں تو وہ انہیں میرے سامنے اگنے کے لیے ضرور تیار ہو جاتا۔ فیضی کی زبان کھلوانے کے لیے یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ اس نوعیت کے تجربات اکثر کامیاب رہتے ہیں۔

فیضی کی گرفتاری کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیضی کی ماں زہدہ دو تین گاؤں والوں کے ہمراہ تھانے پہنچ گئی۔ میں نے باقی لوگوں کو برآمدے میں روک کر زہدہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے مجھ سے احتجاج کرنے لگی۔

”تھانیدار صاحب! آپ نے میرے بیٹے کو خواہ بند گردو یا ہے۔ آخر اس کا قصور کیا ہے؟“
”میری سب جاننے کے لیے تو میں تمہارے بیٹے کو یہاں لا رہا ہوں کہ اس کا قصور کیا ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں اس کے لیے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ معمول کی پوچھ گچھ ہے۔ میں آج کی تاریخ میں اسے داغ کر دوں گا۔“

”مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے فیضی کو آفتاب کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔
”نہ۔۔۔ ہمارا آفتاب کے قتل سے کیا لینا دینا۔“ وہ تھک چکا ہوا بولی۔ ”نرور سلطانہ نے آپ کو ہمارے خلاف بھڑکایا ہوگا۔“
مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ زاہدہ، مقتول کی ماں کے لیے اپنے دل میں شدید نوعیت کا غم و غصہ رکھتی تھی۔

”زاہدہ بی بی! میری بات غور سے سنو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ساٹ لہجے میں کہا۔ ”میں تھانیدار ہوں ذرا دھری ٹائپ کا۔ میں کسی کے بھکانے اور بھڑکانے میں نہیں آتا۔ میں اپنے داغ کو استعمال کر کے قانونی تقاضوں کے اندر رہ کر کام کرتا ہوں۔ فیضی کی گرفتاری تفتیشی عمل کا حصہ ہے۔ اگر وہ بے گناہ ہے تو اس کا ایک بال بھی بیک نہیں ہوگا، میں تمہیں اس بات کا اطمینان دلاتا ہوں۔“

”میں نے سلطانہ کا نام اس لیے لیا کہ وہ ہر وقت ہمارے خلاف ادھر ادھر زہر لگتی رہتی ہے۔“ وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں، ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ اس نے ہمیں نشانے پر کیوں رکھا ہوا ہے۔۔۔؟ پر کسی کو کیا دوس دیں جب۔۔۔۔۔“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھر ادھر پھوڑا تو میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”جب کیا۔۔۔۔۔؟“
”جب اپنی تکی چوروں کے ساتھ مل جائے تو پھر گھر کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے!“ اس نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

زاہدہ کا اشارہ اپنی چھوٹی بہن شاہدہ کی طرف تھا۔ میں اب تنازع کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ شاہدہ نے فیضی کے لیے اپنی بیٹی خالدہ کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور پھر خالدہ کی شادی مقتول آفتاب

سے ہو گئی تھی۔ جب میری سلطانہ سے بات ہوئی تھی تو اس نے اپنے بیٹے کے قتل کے حوالے سے فیضی پر بڑے قوی شک کا اظہار کیا تھا۔ گویا زاہدہ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ سلطانہ اس کے لیے اپنے دل میں ناپسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی۔ دوسری جانب زاہدہ بھی سلطانہ کو ایک شرانگیز اور فتنہ پرور عورت سمجھتی تھی بلکہ ابھی اس نے ایک محاورے میں سلطانہ کے لیے چوروں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ معما ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ چھوٹی بہن نے اپنی بیٹی کے لیے بڑی بہن کے بیٹے کا رشتہ کیوں ٹھکرا دیا تھا۔۔۔۔۔؟

جب کوئی شے کسی سمجھ دار انسان کی سمجھ میں ٹھیک طرح نہ بیٹھے تو وہ اندر سے مضطرب ہو جاتا ہے۔ ان لحاظ میں، میں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے زاہدہ کو غیر محسوس انداز میں ٹھکراتا شروع کیا۔

”زاہدہ بی بی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھدار انداز میں کہا۔ ”تم تھوڑی دیر پہلے اپنی چھوٹی بہن شاہدہ کے لیے کتنی (کتنا) اور سلطانہ کے گھرانے کے لیے چوروں کے الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ ان لوگوں کی ملی بھگت سے آفتاب کی شادی خالدہ سے ہو گئی اور تمہارا بیٹا فیضی دیکھا اور ہاتھ ملتا رہ گیا۔۔۔۔۔“ میں نے چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”تم نے شاہدہ کو جو ٹائپل دیا ہے اس کی مناسبت سے میں تمہارے بہنوئی کے لیے کتنے کا لفظ تو استعمال نہیں کروں گا لیکن اگر تمہیں توفیق ہو تو چند لحاظ کے لیے یہ ضرور سوچنا کہ ممکن ہے، اس سارے کشمکش میں شاہدہ کا کہیں کوئی قصور نہ ہو۔ فدا حسین نے چھوٹے بھائی کی محبت کے جھکاؤ میں اپنی بیٹی کا رشتہ فیض کے بیٹے آفتاب کو دے دیا ہو۔۔۔۔۔!“

”سب جاںیں جہنم میں۔“ وہ برا سامنے بتاتے ہوئے بولی۔ ”میں تو یہ جانتی ہوں، شاہدہ کو شہر کی ہوائے خراب کر دیا ہے۔ جب وہ گاؤں میں تھی تو ایسی نہیں تھی۔“

”اگر شہر کی ہوائے شاہدہ کا دماغ خراب کیا ہوتا تو وہ خالدہ کو نوشہرہ ورکاں بیٹا ہنے کے بجائے ادھر گوجرانوالہ میں یا پھر لاہور میں اس کا رشتہ طے کرتی۔“ میں نے زاہدہ کی بے گلی بات کے جواب میں ایک منطقی دلیل دی۔

”بھر جال۔۔۔۔۔“ وہ آکٹا ہٹ آئیز انداز میں بولی۔
”مجھے کسی اپنے پرانے، ایرے غیرے، تنخواہ خیرے کی پروا نہیں ہے۔ میں صرف اور صرف اپنے خاوند کے لیے پریشان ہوں۔“

میرا سارا دھیان شوکت علی میں لگا ہوا ہے۔“

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ فیضی کے باپ پر فاج کا ایک ہوا تھا۔ اس کے بدن کا زیریں حصہ بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف اوپر کے دھڑ میں جان تھی۔ جسکی علاج جاری تھا مگر وہی بات کہ فاج کا مرض گھوڑے کی رفتار سے آتا ہے اور جوں کی رفتار سے جاتا ہے، جسکی علاج سے ابھی تک شوکت علی کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تھا۔

”کیا ہوا تمہارے خاوند کو؟“ زادہ کی بات کے جواب میں، میں نے استفسار کیا۔

”آپ کو یہ بات پتہ ہی ہوگی کہ شوکت کو فاج کا ایک ہوا تھا۔“ وہ غمزہ لہجے میں بولی۔ ”جب شاہدہ نے فیضی کو خالدہ کا رشتہ دینے سے انکار کیا تو اس کے فوراً بعد ہی شوکت پر فاج پڑا تھا۔ شروع میں وہ بات چیت کرتا تھا۔ بولنے کی طاقت اب بھی ہے اس میں لیکن خالدہ کی شادی کے بعد اس نے زبان پر تلا ڈال دیا ہے، ہونٹ سی لیے ہیں۔ بس ہر وقت بیٹھا آئسو بہا کرتا رہتا ہے۔ میں تو شوکت کی اس کمپری اور بے بسی کی ذمہ دار شاہدہ کو سمجھتی ہوں۔ اس کی ہٹ دھرمی اور عاقبت نااندیشی نے ہمارے ہستے ہستے گھر کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔“

زادہ نے بات ختم کی تو اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے اس پرتکس آیا۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”زادہ! تم مطمئن ہو کر گھر جاؤ۔ اگر فیضی نے کچھ نہیں کیا تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔ تم گھر جا کر شوکت علی کی دیکھ بھال کرو۔ میں بھی آج کسی وقت تمہارے گھر آ کر شوکت کی خیریت دریافت کروں گا۔“

میری تسلی بھری باتوں نے اس کی آنکھوں میں بے فکری کے دے روشن کر دیے۔ اس نے امید افزا نظر سے مجھے دیکھا اور میرا شکریہ ادا کر کے تھانے سے رخصت ہو گئی۔ اس کیس کے مختلف کرداروں نے مجھے جذباتی کشش سے دوچار کر دیا تھا۔ ہر کردار ایک لمحے تصور وار اور دوسرے لمحے بے گناہ دکھائی دیتا تھا۔ میں محل کر کسی پرستش کرنے کے بارے میں سوچتا تو اس کی ذات کا مظلوم پہلو میری نگاہ میں اجاگر ہو جاتا اور جب میں کسی کو رعایت دینے کا فیصلہ کرتا تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی جلوہ افروز ہو جاتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں الجھ کر رہ گیا تھا لیکن میں مایوس ہرگز نہیں تھا۔ میں مایوسی کو گناہ بکیرہ تصور کرتا تھا۔ میرا یہ ماننا تھا اور عملی زندگی کا تجربہ بھی یہی تھا کہ انسان کی کامیابی اور ناکامی کے بیچ میں ایک ہل صراط کے مانند پتلی لکیر کا فاصلہ

ہوتا ہے۔ انسان جس لمحے مایوس ہو کر ہمت ہار بیٹھے، وہ ناکام ہو جاتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت اور کر کے امید کے دامن کو تھام کر صرف ایک قدم آگے بڑھ کر اس لکیر کو عبور کر لے تو لکیر کی دوسری جانب کامیابی کا نہیں دایکے اسے کھلے لگانے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے..... ہمت مرواں، مدد خدا!

میں نے بھی امید کے دامن کو تھامے رکھا اور سہ پہر میں میری مراد برآئی۔ اے ایس آئی منگھور حسین کی دایہ سی نے اس کیس کو ایک نئی سمت سے روشناس کر دیا تھا۔

منگھور حسین میرے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش نظر آیا جیسے اس نے کوئی اہم نکتہ دریافت کر لیا ہو۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے پوچھا۔

”کیا تمہیں چودھری نوازش علی اینڈ سنز آسانی سے مل گئی تھی؟“

”جی ملک صاحب! یہ غلہ منڈی کی بہت مشہور دکان ہے۔“ اس نے جواب دیا پھر قدرے آگے کو جھک کر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”میں فوری طور پر جیڈا کو گرفتار کرنا ہوگا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم پرانی غلہ منڈی سے کون سی خاص خبر لائے ہو؟“

اے ایس آئی نے اپنی جیب میں سے تہ شدہ کاغذات نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ خود دیکھ لیں۔ میں کیسی سنسنی خیز خبر لے کر آیا ہوں.....!“

میں نے وہ تہ شدہ کاغذات اس کے ہاتھ سے لے کر انہیں کھول کر دیکھا۔ ان میں سے ایک تو دی مختلف بیجوں کی خریداری کی رسید تھی جس کی تصدیق کے لیے میں نے اے ایس آئی کو پرانی غلہ منڈی روانہ کیا تھا اور دوسرا کاغذ اسی کیش میو کی کاربن کا پی کی رسید تک میں سے جب کوئی رسید کاٹ کر گا ہک کو دی جاتی ہے تو اس کی کاربن کا پی اسی رسید تک کے اندر محفوظ رہ جاتی ہے۔

میں نے وہاں نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا اور پوچھا۔ ”اس میں ایسی کوئی خاص بات ہے؟ ایک رسید ہے اور دوسری اس کی کاربن کا پی.....!“

”ملک صاحب! وہ زہر پرل مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں ہوا۔“ آپ اس رسید پر درج خریداری کی تاریخ تو دیکھیں!“

دل

دل اور آنکھوں میں کس قدر گہرا رشتہ ہے۔ آنکھیں دل کی ترجمان ہوتی ہیں۔ دل پر چوٹ پڑے تو آنکھوں کا پیاناہ چمک پڑتا ہے۔ اگر دل میں جذبات موجود ہیں تو آنکھیں خوشی سے مہک اٹھتی ہیں، کرمیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ محبت سے خالی دل اس غار کے مانند ہے جس میں جانور بھی داخل ہونے سے خوف کھاتے ہیں۔ حقیقی خوبصورتی کا سرچشمہ دل ہے۔ اگر دل سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔

مسکراہٹ

☆ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔
☆ یقین دلاتی ہے کہ مسکرانے والے کا دل کدورتوں سے پاک ہے۔
☆ ایسی کے تاریک بادلوں میں امید کی کرن ہے۔
☆ ایک ایسا تحفہ ہے جو دینے والے کو مفلس کیے بغیر پانے والے کو بہت کچھ دیتا ہے۔
☆ ایک ایسا نذرانہ جو ٹھکرایا نہیں جاسکتا۔
☆ ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے ہزار راز پنہاں ہوتے ہیں۔
☆ دینے والے کو بھی مسرور کرتی ہے اور سامنے والے کو بھی سرشار کر دیتی ہے۔
☆ زندگی جینے کی ہر آن نئی امیگ پیدا کرتی ہے۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ قصور سٹی

یادیں

یادیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے کھرچنے کی کوشش کر دو تو رد کی خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ بھلا یاد بھی بھی مٹ سکتی ہے وہ تو چاند کے بھی نہ مٹنے والے داغ کی طرح ہے جو سدا نمایاں رہتا ہے۔ زندگی بیت جاتی ہے لیکن زندگی کی راہ گزر پر پیتا ہوا کوئی لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔ ہانے کی خواہش تو صرف ایک لمحے کی ہوتی ہے لیکن پا کر کھودینے کا غم جان لیوا عذاب ہوتا ہے۔ ہر غم اسی طرح تازہ رہتا ہے جیسے کبھی کی بات ہو۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

”رسید پر اس ماہ کی اٹھارہ تاریخ ڈلی ہوئی ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”جب جیدا سبزیوں کے بیج کی خریداری کے لیے پرانی غلہ منڈی گیا تھا اور اسی روز صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان آفتاب کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔“

”بالکل ٹھیک۔“ اے ایس آئی کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے رسید کی کاربن کاپی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب ذرا آپ اس پر درج تاریخ کو پڑھیں۔“

میں نے پڑھا اور چونک اٹھا۔ کاربن کاپی پر خریداری کی تاریخ اسی ماہ کی تین ڈلی ہوئی تھی۔ جب میں نے اصل رسید اور اس کی کاپی کو پہلو پہلو کر رکھ کر غور جائزہ لیا تو مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ کسی نے رسید کے تاریخ والے حصے میں کاریگری کر کے تین کے ہند سے کو آٹھ بنا ڈالا تھا اور پھر اس آٹھ کے بائیں پہلو میں ایک کا اضافہ کر کے اس تاریخ کو تین سے اٹھارہ میں بدل دیا تھا اور یہ ”کسی“ جیدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

”جیدا تو بڑا فنکار نکلا ملک صاحب۔“ اے ایس آئی نے سرسری ہوئی آواز میں کہا۔

”اس کی ساری فنکاری تو میں پتا نہیں، کہاں کہاں سے نکالوں گا۔“ میں نے دانت کچکپاتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی نوشہرہ درکاں جاؤ اور جیدا کو گرفتار کر کے یہاں لے آؤ۔“ اے ایس آئی کی انور میر سے حکم کی تعمیل میں نوشہرہ درکاں روانہ ہو گیا۔

اس امر میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ مذکورہ رسید میں جعل سازی جاوید عرف جیدانے ہی کی تھی گویا اس نے حقیقت کو ڈھانپنے کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ ایسی کون سی بات تھی جو وہ چھپانا چاہتا تھا۔ فی الحال میرے پیش نظر تو صرف ایک ہی اہم معاملہ تھا اور وہ تھا، آفتاب کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا۔

پرانی غلہ منڈی سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وقوع کے روز یعنی اٹھارہ تاریخ کو نہ تو جیدا وہاں گیا تھا اور نہ ہی اس نے چودھری نواز علی اینڈ سنز سے کوئی چیز خریدی تھی۔ یہ سارا چکر اس نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے بچلا یا تھا۔ آخریوں؟

جب کوئی شخص دروغ گوئی یا تحریری جعل سازی یا غلط بیانی سے کام لیتا ہے تو دراصل وہ اپنے کسی جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ تو کیا..... آفتاب کو جیدانے قتل کیا تھا؟

اس سوال کا جواب ”ہاں“ یا ”نہ“ میں حاصل کرنے کے لیے مجھے اے ایس آئی کی واہسی کا انتظار کرنا تھا اور..... یہ انتظار آدھے گھنٹے میں ختم ہو گیا۔

جید ایک مرتبہ پھر میرے کمرے میں موجود تھا لیکن اس بار میں نے اسے آڑے اٹھو لیا۔ بات شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے گال پر ایک زنانے وارطانچہ رسید کیا پھر اصل اور کاپی دونوں اس کو دکھاتے ہوئے خوں خوار لہجے میں پوچھا۔

”اس کی ضرورت کیوں پیش آئی تھیں.....؟“

”مم..... میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا.....“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”اُوئے غلط فہمی کی اولاد.....!“ میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا اور سخت انداز میں کہا۔ ”میں آفتاب کے قتل کے بارے میں نہیں، اس رسید کی تاریخ میں تبدیلی کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے تاریخ میں ردوبدل کیوں کیا؟“

میرے کڑے سوال پر اس کا رنگ اڑ گیا، لڑکھڑاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کیا جناب۔ یہ رسید مجھے چھانسنے کے لیے.....“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے دوسرے گال کو بھی ”شرف“ بخش دیا پھر خوفناک لہجے میں دریافت کیا۔ ”اٹھارہ تاریخ کا پورا دن تم نے کہاں گزارا تھا؟“

”جی..... میں نے آپ کو..... بتایا تو تھا کہ..... میں سبزیوں کے بیج..... لینے پرانی غلہ منڈی گیا تھا.....“ وہ اپنے جھوٹ کو طاقت کا آئینہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں پرانی غلہ منڈی.....“

اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے میں نے باقاعدہ اس کی دھلائی شروع کر دی۔ اس دوران میں اسے میں ”تبدیلی تاریخ“ والے اس کے کارنامے سے بھی آگاہ کرتا جا رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں پتھار ہوا اور اس کے ”علم“ میں خاطر خواہ ”اضافہ“ بھی ہوتا گیا۔ جب اس کے پاس کوئی راہ فرار نہ رہی تو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

جیدانے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ چند لمحات کے

لیے میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے لہجے سے بے پناہ اعتماد جھلکتا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”اگر آفتاب کے قتل میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تو پھر تم نے اپنی جعل سازی سے تین تاریخ والی رسید کو اٹھارہ تاریخ والی رسید کیوں بنایا۔ وہ بھی تین اس روز جب آفتاب کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ تمہارے اس عمل کے پیچھے کون سا مقصد چھپا ہوا تھا؟“

وہ اپنی قمیص کی آستین سے ہونٹوں سے رنے والے خوں کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے باپ کو دھوکا دے کر کچھ رقم حاصل کرنا چاہتا تھا۔“

میں نے غصے میں اس کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ میرے چائوں اور گھونسوں نے اس کے چہرے کی کھال کو کئی جگہ سے بری طرح مجروح کر دیا تھا اور بعض مقامات سے باقاعدہ لہو بھی رس رہا تھا۔ اس ذیل میں اس کے ہونٹ سر فرست تھے۔ مجھے اس کی حالت زار پر ترس بھی آیا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

تین تاریخ کو جید پرانی غلہ منڈی سے مختلف سبزیوں کے بیج خرید کر لایا تھا اور ان کی اصل رسید بھی اس کے پاس تھی۔ جید کے باپ کی یادداشت گزربڑکا شکار تھی۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آ گیا۔ اس نے سبزیوں کے بیج والے تھیلوں کو کہیں چھپا دیا اور باپ سے کہا کہ بیج لاتا ہوں اس لیے وہ اسے پیسے دے۔ باپ نے اس ذیل میں جید کو کچھ رقم دے دی۔ جیدانے اپنے منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تین تاریخ..... کو اٹھارہ تاریخ کی رسید بنا دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے چھپائے ہوئے تھیلے باہر نکال لیے اور اپنے باپ کو مطمئن کر دیا کہ وہ غلہ منڈی سے سبزیوں کے بیج خرید کر لے آیا ہے۔ اس کی بد قسمتی کہ اس نے اس کام کے لیے جودن چنا اسی روز آفتاب کا قتل ہو گیا اور جید اس کیس کی تفتیش کی لپیٹ میں آ گیا۔

میں نے جید کی کٹھا کو گہری سنجیدگی سے سنا اور جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”تم نے اپنے باپ کو دھوکا دے کر جو رقم حاصل کی اس کا تم نے کیا کیا؟“

میرے سوال پر وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا ہے لیکن کسی اندرونی

میں فوراً سے پیشتر اس کا اشارہ سمجھ گیا اور غمبھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نہیں..... دوسرے کمرے میں۔ یہ تھا نہ ہے۔ باہر کے رشتوں اور تعلقات کی یہاں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوستی نبھانے کے لیے نوشہرہ درکاں کی نفسی بات کافی ہے.....!“ جیدا کے کان کھڑے ہو گئے۔ خاصا ہوشیار و باغ پاپا تھا اس نے۔ پلک جھپکتے میں وہ میری بات کی تہ پہنچ گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا..... آپ نے نفسی کو بھی..... بند کر رکھا ہے؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

اکیس تاریخ کی صبح میں نے ایک چٹیا چال باز قسم کے کانیاں کا ٹیلیفون کو پرانی غلہ منڈی روانہ کر دیا تاکہ وہ حریف اور بدرمیر سے ملاقات کر کے جیدا کے بیان کی تصدیق کر سکے۔ یہ جیدا کے لیے آخری موقع تھا۔ اگر اس مرحلے پر وہ جھوٹا ثابت ہو جاتا تو پھر اس کی بچت کے امکانات معدوم ہو جانا تھے۔ گزشتہ شب میں نے فیضی کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں خود اس کے گھر چلا گیا تھا۔ زاہدہ کی زبانی شوکت علی کے جو حالات مجھ تک پہنچے تھے، انہوں نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میں شوکت علی کی اٹک شوٹی کی غرض سے اس سے ملنے گیا تھا۔

شوکت علی سے یہ مختصر ملاقات نہایت ہی اہم، ہنسینی خیز اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر مومنے بیٹھے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ جب زاہدہ نے اسے میری آمد کی اطلاع دی تو وہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ زاہدہ نے میرے بیٹھنے کے لیے شوکت علی کے نزدیک ایک کرسی رکھ دی تھی۔ میں شوکت علی سے مصافحہ کرنے کے بعد اس کرسی پر بیٹھ گیا مگر اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا اور زاہدہ کی جانب دیکھتے ہوئے نگاہوں ہی نگاہوں میں اپنی بیوی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

جب زاہدہ رخصت ہو گئی تو شوکت علی نے میرے ہاتھ کو تھامے تھامے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے اس کی بند آنکھوں کے گوشے بھگ گئے۔ اس نے بد دستور میرے ہاتھ کو تھام رکھا تھا جس کے سبب مجھے اس کے بدن پر طاری دھمے لرزے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ چھوٹے ہی مجھ سے فیضی کو چھوڑنے کی بات کرے گا لیکن اس نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد بند آنکھوں کی چپ سادھ لی تھی۔

وہ زبان سے خاموش تھا لیکن بزرگان خاموشی اس کا پورا

چمکا پھٹ کے باعث وہ اپنے ارادے پر عمل نہیں کر پا رہا۔ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”جیدا! اس خوش بھی میں نہیں رہتا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری کہانی پر یقین کر لوں گا اور یہ فرض خیالی میں ایک لمحے کے لیے تمہاری داستان کو سچ مان بھی لوں تو تمہیں بتانا ہوگا..... تم نے کس مقصد کو پورا کرنے کے لیے دھوکا دی سے رقم حاصل کی تھی؟“

”تمہارا صاحب! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔“ بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

”بات یہ ہے جناب کہ مجھے جوا کھیلنے کی لت لگی ہوئی ہے۔ میں نے یہ رقم جوا کھیلنے کے لیے حاصل کی تھی۔ اور پرانی غلہ منڈی کے نزدیک میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں اپنے اس دوست کے ساتھ جوئے کے ایک اڈے پر جا کر بازی لگاتا ہوں۔ ہار جیت اس مکمل کا حصہ ہے لیکن اٹھارہ تاریخ والا دن میرے لیے بہت منحوس ثابت ہوا۔ ایک تو میں ساری رقم جوئے میں ہار گیا اور جب نوشہرہ درکاں واپس آیا تو مجھے آفتاب کے نکل کے الزام میں دھریا گیا۔“

میرا اندازہ تو یہی کہہ رہا تھا کہ جیدا دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا لیکن میں نے اپنے اس انداز سے کو چہرے کے تاثرات سے جھٹکنے نہیں دیا اور جیدا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حتیٰ لہجے میں کہا۔

”جب تک تمہارے بیان کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم تھانے کی حوالات میں سیرے مہمان رہو گے۔ مجھے اپنے اس دوست کا نام بتاؤ جو پرانی غلہ منڈی میں رہتا ہے۔ میں تمہارے بیان کی پرکھ کے لیے صبح اپنے کسی بندے کو پرانی غلہ منڈی روانہ کروں گا۔“

”اس کا نام حریف ہے۔“ جیدا نے بتایا۔ ”حریف غلہ منڈی میں لیے داری (مزدوری) کرتا ہے۔“

”اور تم لوگ جوا کھیلنے کس اڈے پر جاتے ہو.....؟“

”بدرمیر کے اڈے پر۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس اڈے کا اتنا بھی بتاؤ؟“

اس نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں نے ایک کاغذ پر یہ تمام معلومات نوٹ کیں پھر ایک کانٹیل کو بلا کر جیدا کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کو حوالات میں بند کر دو۔ آج کی رات یہ ہمارا مہمان ہے۔“

کانٹیل نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”کیا ایسی

حوالات میں یا.....؟“

جسم جو کلام تھا اور بند آنکھیں آنسوؤں کی تحریر میں باقاعدہ کھنکھو کر رہی تھیں۔ میں کتنی آمیز انداز میں اس کا ہاتھ چٹکنے لگا۔
”سب ٹھیک ہو جائے گا شوکت علی۔“ میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”اللہ نے ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی جس کا علاج بیماری سے پہلے زمین پر نہ اتارا ہو۔ دیکھ لیتا، تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے۔“

”موت بھی ایک بیماری ہے تمہیں دار صاحب.....“ وہ بند آنکھوں کے پیچھے سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”جس کا کوئی علاج نہیں۔ میں بھی چند دن کا مہمان ہوں۔ بہت جلد موت مجھے گلے لگا لے گی۔“

”حوصلہ رکھو شوکت علی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔
”واقعی، موت کا کوئی علاج نہیں لیکن میری نظر میں موت کو بیماری سے تعبیر کرنا مناسب نہیں۔ موت تو ایک ایسی ترین ہے جس پر سوار ہو کر انسان اپنے خالق کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس ترین کو اپنے نزدیک پر رواں دواں رہنا چاہیے تاکہ خالق اور مخلوق کی ملاقات کا سلسلہ جاری و ساری رہے۔“

شوکت علی کے بدن کی ہر تھڑا ہٹ ہاتھ کے راستے میرے وجود میں منتقل ہو رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ صرف آنکھیں ہی نہیں بلکہ اس کا دل، جگر حتیٰ کہ جسم کا رواں دواں جو گریہ ڈنڈاری تھا۔ وہ آنکھوں کو بہ دستور بند رکھتے ہوئے تمناک آواز میں بولا۔

”لوگ سمجھتے ہیں، فیضی کی خالده سے شادی نہ ہو سکنے کے سبب مجھے پہنچنے والے صدمے سے میں مفلوج ہو گیا ہوں۔ یہ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں شاید کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں۔ اگر شاہدہ اس رشتے کے لیے راضی ہو بھی جاتی تو میں انکار کر دیتا۔ یہ زائدہ کی خواہش تھی کہ وہ خالده کو اس گھر کی بہو بنا کر لائے۔ میں ہرگز اس کے حق میں نہیں تھا.....“

شوکت علی نے لمبائی توقف کیا تو میں نے اس سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ اس نے جس انداز کی بات کی تھی، اس پر سو استفسارات بنتے تھے۔ اس کی آنکھیں اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اس کے گالوں کو بھگور رہی تھیں۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”انسان خطا کا پتلا ہے تمہیں دار صاحب۔ کوئی چاہے کتنا بھی عقل مند ہو، اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ شاہدہ نے بھی ایک سنگین غلطی کی تھی۔ والدین کو اپنی اولاد کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر وہ خالده کا رشتہ آفتاب کے بجائے زلفی کو دیتی تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔“

شوکت علی کے ایک ایک لفظ میں سوسو بھید چھپے ہوئے تھے۔ قبل اس کے کہ میں اس سے اس کے آخری جملے کی وضاحت مانگتا، وہ بند آنکھوں کے پیچھے سے کرناک آواز میں بولا۔

”تمہیں دار صاحب! میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گا۔ مجھے نہیں امید کہ ہماری دوبارہ بھی ملاقات ہو پائے، اس لیے میں آپ کو اپنی زندگی کے سب سے اہم راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں..... وہ راز جو صرف میرے، شاہدہ اور اللہ کے بیچ میں ہے اور اب آپ اس راز میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنا کان ادھر لائیں.....“

میں نے بے ساختہ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے نزدیک کر دیا پھر یہ زبان سرکشی شوکت علی نے میری سماعت میں پھلکا ہوا سیسا انڈیل دیا تھا۔

میں گزشتہ شام سے اب تک شوکت علی کے الفاظ کے سحر میں گرفتار تھا۔ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے اور سچ بولنے والا بہت بہادر۔ میری نظر میں شوکت علی ایک بہادر انسان تھا۔

میں شوکت علی اور اس کی جرأت کے بارے میں سوچ رہی رہا تھا کہ کانشیل ساجد میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی نے ڈیرا بھاڑ رکھا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر وہ گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا ہو ساجد! تمہاری شکل پر بارہ کیوں بن رہے ہیں؟“

”مجھ سے ایک سنگین غلطی ہو گئی ہے ملک صاحب!“ وہ مناجیبا نہ انداز میں بولا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں سر.....“

”معاف کرنا یا سزا دینا تو بعد کی بات ہے، پہلے مجھے یہ توہینا چلے کہ تم نے کون سا جاندہ چڑھا دیا ہے۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”اور اس بات کا فیصلہ بھی میں ہی کروں گا کہ تمہاری غلطی سنگین ہے یا نہیں..... اس لیے شروع ہو جاؤ..... شاباش!“

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک انگٹھی برآمد کی پھر مذکورہ انگٹھی کو میری جانب بڑھاتے ہوئے ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

”مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے ملک صاحب!“
میں نے اس کے ہاتھ سے انگٹھی لے کر یہ غور جائزہ لیا۔ وہ چاندی کی ایک خوب صورت انگٹھی تھی جس کے اندر ایک دلکش مانک جڑا ہوا تھا۔ مانک کا وزن لگ بھگ دس قیراط ہوگا۔ مانک کے گرد بیضوی شکل میں ننھے ننھے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ فیروزی اور سرخ رنگ کے گینوں کے استراج نے اس انگٹھی کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مانک کو فیروزوں

سے کہا۔ ”آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونا چاہیے۔“
”جی ملک صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ فرماں
برداری سے بولا۔

”جاؤ..... فیضی کو حوالات سے نکال کر یہاں لے آؤ۔“
میں نے جھکنا سنا انداز میں کہا۔

ساجد نے فی الفور میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ جب فیضی
میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو میں نے یہ غور اس کے ہاتھوں کا
جائزہ لیا۔ وہ بے چینی سے مجھے تنگے لگے۔ میں نے کڑے لہجے
میں استفسار کیا۔

”تمہاری انگوٹھی کہاں ہے؟“

”کوئی انگوٹھی تھا تھانیدار صاحب!“ اس نے حیرت اور
الٹھن کی لمبی لمبی کیفیت سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”میں نے تو ابھی
کوئی انگوٹھی پہنی ہی نہیں.....“

وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ کوئی انگوٹھی پہننے کا
عادی ہوتا تو اس کی کسی نہ کسی انگلی پر انگوٹھی کی بیشک کا مخصوص
نشان ضرور بن گیا ہوتا۔

میں نے ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جیدا کو ابھی
یہاں لے آؤ۔“

تھوڑی دیر کے بعد جیدا بھی لائن حاضر ہو گیا۔ میں نے
وہی سوالات جیدا سے بھی کیے جو اس سے پہلے فیضی سے پوچھ
چکا تھا اور حسب معمول جیدا کے جوابات بھی وہی تھے۔ جیدا
کیے ہاتھوں کی تمام انگلیاں بھی اس بات کی گواہی دے رہی
تھیں کہ وہ انگوٹھی پہننے کا شوق نہیں رکھتا۔ اس صورت حال نے
مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا۔

فیضی نے مجھ سے پوچھا۔ ”تھانیدار صاحب! یہ انگوٹھی کا
کیا معاملہ ہے؟“

میں چند لمحات تک ٹٹولنے والی نگاہ سے باری باری ان
دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا پھر اپنی میز کی دراز میں
سے مذکورہ انگوٹھی کو نکال کر میز کے اوپر رکھتے ہوئے ان سے
سوال کیا۔

”کیا تم اس انگوٹھی کو پہچانتے ہو؟“

وہ بے یک زبان ہو کر بولے۔ ”یہ تو زلفی کی ہے.....!“

☆☆☆

کچا وارد اتنا جب کچے ہاتھوں کی گرفت میں آتا ہے تو
صرف دو زنائے وارطائے اور دو سکتے ہوئے سوال اس کا پتا
پانی کرنے کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ذوالفقار عرف زلفی
کو جب گرفتار کر کے میرے سامنے لایا گیا تو میں نے اس کے
گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا پھر پانک جزی انگوٹھی اس کی

کے درمیان براجمان دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ستاروں کے
جبرمٹ میں چاند مسکرا رہا ہو۔

ساجد نے اس انگوٹھی کی نسبت سے اپنی کسی غلطی کا ذکر
کیا تھا لہذا میں نے کڑے لہجے میں سوال کیا۔ ”یہ انگوٹھی تم نے
کہاں سے چرائی ہے؟“

”میں نے یہ انگوٹھی چرائی نہیں ملک صاحب۔“
وہ فنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پڑی ہوئی
ملی تھی۔“

”کہاں پڑی ہوئی ملی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے اضطرابی انداز
میں ساجد سے استفسار کیا۔ ”کمرے کی عقبی کھڑکی کے نیچے
سے؟“

”جی جی.....“ وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے
بولا۔ ”بالکل وہی ہے۔“

میری چھٹی حس نے سگنل دیا، اس انگوٹھی کا آفتاب کے
قتل سے گہرا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں نے سرزنش کرنے والے
انداز میں ساجد سے کہا۔

”اور..... تم تین دن کے بعد یہ انگوٹھی مجھے دکھا رہے
ہو۔ تم نے اس انگوٹھی کے بچے نکالنے کے لیے کسی سرنفی کے
نیچے تو نہیں رکھ دیا تھا.....؟“

”نہیں ملک صاحب۔“ وہ سرونفی میں حرکت دیتے
ہوئے بتانے لگا۔ ”میں نے اس خیال سے یہ انگوٹھی اٹھا کر
اپنی جیب میں رکھ لی تھی کہ اندر جا کر آپ کو دروں کا پھر پتا
نہیں، کس طرح یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی اور انگوٹھی
میری جیب کے اندر ہی پڑی رہ گئی۔ یہ تو کل جب گھر میں
میری یونیفارم دھوئی گئی تو اس کی جیب سے انگوٹھی برآمد
ہوئی.....“ لمحائی توقف کر کے اس نے لجاجت آمیز نظر سے
مجھے دیکھا اور بولا۔

”مجھے معاف کر دیں ملک صاحب!“

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔
میں نے آفتاب کے قتل کے شبے میں اس وقت دو افراد کو قتل
کی حوالات میں، الگ الگ کمروں میں بند کر رکھا تھا۔ میرے
مختاط انداز سے کے مطابق، اگر جیدا یا فیضی میں سے کسی نے
آفتاب کو موت کے گھاٹ اتارا تھا تو اس انگوٹھی کا تعلق اسی سے
ہونا چاہیے تھا اور اس بات کو چیک کرنا بہت آسان تھا کیونکہ وہ
دونوں میری تحویل میں تھے۔

”ٹھیک ہے ساجد! میں تمہاری اس کوتاہی کو نظر انداز
کرتا ہوں۔“ میں نے کانسٹیبل کی جانب دیکھتے ہوئے نرمی

آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں رہا ہے؟“

انگوٹھی پر نگاہ پڑتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا، حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے استفسار کیا۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملی؟“

”جہاں سے تم کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر پہنچتے تھے۔“ میں نے اس کے دوسرے گال کو نشانہ بناتے ہوئے زہر خند لیچے میں کہا۔

وہ ہکا بکا ہو کر میری صورت دیکھنے لگا۔ شوکت علی کے نم ناک الفاظ میری سماعت میں گردش کرنے لگے..... کوئی چاہے کتنا بھی عقل مند ہو، اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ شاید وہ بھی ایک عکس غلطی کی تھی۔ والدین کو اپنی اولاد کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر وہ آفتاب کے بجائے خالدہ کا رشتہ زلفی سے کرتی تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔

”کیا خالدہ تمہیں پسند کرتی ہے؟“ میں نے زاہدہ کے خیالات کی روشنی میں زلفی سے استفسار کیا۔

”جی..... یہ سچ ہے۔“ وہ تھوک ننگے ہوئے بولا۔ ”میں بھی خالدہ کو بہت چاہتا ہوں۔“

”تو کیا اپنی پسند اور چاہت کے حصول کے لیے تم نے مجھے بھائی کی جان لے لی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔
”خود غرضی اور سفاکی کی اس سے زیادہ بدترین اور کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔“

اس نے مجرمانہ انداز میں گردن جھکا دی۔

اگلے ایک گھنٹے کے اندر میں نے اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کر لیا۔ واقعات کے مطابق، خالدہ اور زلفی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن آفتاب کی شادی کے موقع پر دونوں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔ خالدہ بیاہ کر گوجرانوالہ شہر سے زلفی کی بھائی کی حیثیت سے نوشہرہ وکراں آ گئی۔ اس صورت حال نے زلفی کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ ہمہ وقت خالدہ کے حصول کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر اس نے ایک شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا..... مجھے بھائی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ!

اپنے منصوبے کے مطابق، وقوعہ سے ایک روز پہلے اس نے اپنی پیاری کا بڑا کامیاب ڈراما چایا اور اٹھارہ تاریخ کی صبح وہ بد ظاہر ہتھیوں کی طرف نہیں گیا۔ وہ رات کو چھت پر سوتا تھا۔ اس لیے کسی کو اس کی کارکردگی کا پتا نہ چل سکا۔ کسی کو کانوں کان خبر کیے بغیر وہ مقتول سے پہلے چپکے سے ڈیرے پر پہنچ

گیا۔ اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ گزشتہ روز کمرے کی عقبی کھڑکی کو بھیڑ آ یا تھا مگر اس کی کھڑکی بند نہیں کی تھی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں چھپ کر آفتاب کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ آفتاب جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھول کر لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اندر آیا، زلفی نے ایک آہنی وزنی ریش پانے سے اس کے سر کے عقبی حصے پر ایک خوفناک وار کر دیا۔ اگلے ہی لمحے آفتاب کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند دھڑام سے زمیں بوس ہو گیا۔

کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر کودتے وقت اس کی انگلی سے ٹانگ والی انگوٹھی نکل کر کھال (ٹائل) کے کنارے جا گری تھی۔ اگر نہ کوہ انگوٹھی ساجد کے پیسے نہ چڑھتی تو شاید اس کیس کو حل کرنے میں مجھے مزید جو حکم اٹھانا پڑتے۔ دیر آید، درست آید کے معصداں میں آفتاب کے اصل قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”زن، زر، زمین“ کو ازل سے فتنہ و فساد کی جز تصور کیا جاتا ہے اور میرے خیال میں اب تک ایسا ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ زندگی کے ننانوے فیصد تنازعات کے پیچھے انہی تینوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا عمل دخل ہوتا ہے۔

میں جانتا ہوں، آپ کے ذہن میں یہ سوال بڑی بے قراری سے کروٹیں بدل رہا ہو گا کہ اس شام شوکت علی نے میرے کان میں کون سی راز دارانہ سرگوشی کی تھی!

اب اس واقعے کو اتنا زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ اس وقت متعلقہ کرداروں میں سے کوئی بھی بد قید حیات نہیں ہے لہذا آپ سے شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں شوکت علی کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔

”تھانیدار صاحب! میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گا اس لیے میں آپ کو اپنی زندگی کے ایک اہم راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ راز جو صرف میرے، شایدہ اور اللہ کے سچ میں ہے اور اب آپ اس راز میں شریک ہو رہے ہیں..... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ خالدہ، میری اور شایدہ کی سبھی گمراہ تاجرانہ اولاد ہے۔ جب شایدہ کی فدا حسین سے شادی ہوئی تو خالدہ اس کے پیٹ میں اپنی زندگی کا سفر شروع کر چکی تھی۔“

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے جید اور فیضی کو اسی روز رہا کر دیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

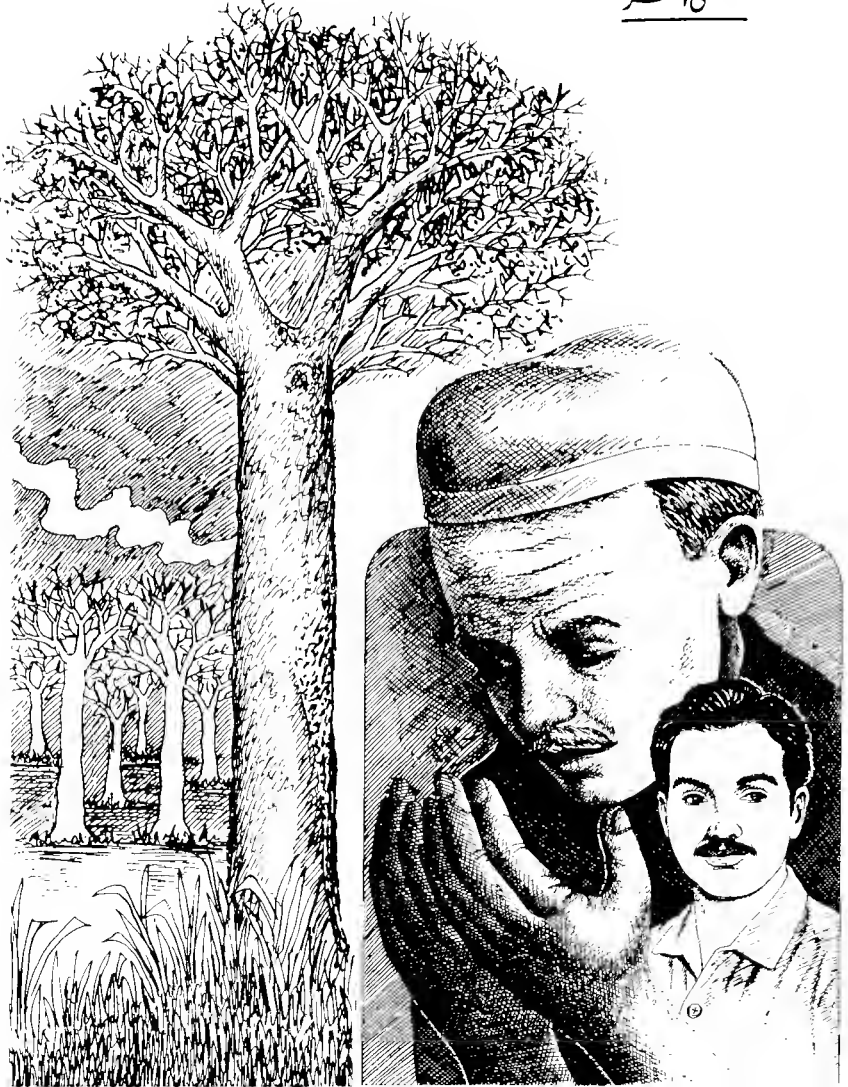
ڈاڑھی..... جو حجام تک عدم رسائی کی چغلی کھار ہی تھی۔ وہ اپنے
رعشہ زدہ وجود کو سنہالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یوں جیسے اس کا
کوئی قدم غلط پڑا تو جسم کی ساری ترتیب بگڑ کر رہ جائے گی۔ مگلی
کے درمیان ٹین کی وکٹیں بتائے لڑکے بربر کی گیند سے کرکٹ

وہ بڑی مشکل سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاشیٹیکٹا ہوا
آگے بڑھتا، پاؤں آگے رکھتا اور اپنے کانپنے ڈولتے وجود کو
لاٹھی کے سہارے متوازن کرتا اور پھر قدم قدم آگے بڑھتا۔
چہرے پر کہن زندگی کی چغلی کھاتی جھریاں، یہی بے ترتیب سفید

تہائی کا شکار ہونے والے چند دن کے مہمان کا انداز بیان

خیالوں میں گم رہے والا ہویا خیالات کو لفظوں کا پیرا پہن پہنانے کا
ماہر ہو... اکثر ایسی ہی دلفریب کہانیاں تراش کر بیان کرتا ہے کہ
سننے والا گرویدہ ہو جائے... یہی حال اس کا بھی تھا جس نے دل کے
کسی گوشے میں چھپی نا آسودہ خواہشات کو داستان میں ڈھال
کر من کا بوجھ اتارنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا۔

داستان گلو علی اختر



کھیل رہے تھے۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا ان کے درمیان آ گیا۔ لڑکے اپنا کھیل روک کر اس کے ادھر ادھر ہونے کے منتظر تھے مگر وہ خاصی دیر میں بہ مشکل دو یا تین قدم آگے بڑھا پایا ہوگا کہ اسی دوران..... میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے بے بسی کے ساتھ مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”بیٹا۔ ذرا مجھے آگے کر دینا۔“

میں نے اس کی لالچی پکڑنا چاہی تو وہ ایک بار پھر سے بولا۔ ”نہیں میرے بچے! ایسے نہیں۔ تم مجھے صرف اپنا کندھا دو۔ اس لالچی کی مدد سے میں ایک قدم خود آگے بڑھاتا رہوں گا اور تمہارا کندھا مجھے دوسرا قدم اٹھانے میں مددگار ثابت ہوگا!“

تب میں نے خاموشی سے اپنا کندھا اس کے آگے کر دیا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی۔

”کہاں جاؤ گے؟“ میں نے اپنی چال کو بہت آہستہ کر کے اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملائے۔

”وہ سامنے جو برگد کا درخت ہے، وہاں تک جانا ہے مجھے۔“ بوڑھے نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اس ویرانے میں اور اس قدر گری میں..... صبح ہی صبح وہاں جانے کی کیا ضرورت پڑی؟.....؟ گھر والوں نے آپ کو نہیں روکا!“ میں نے استفسار کیا۔

”روکا تھا۔ بہت روکتے ہیں مگر ایک عادت سی پڑ گئی ہے۔ جب تک وہاں نہ جاؤں، بے چینی سی رہتی ہے۔ تم تو دفتر جا رہے ہو گے۔ بڑی تکلیف دی ہے تمہیں۔“ بابا نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں لیکن ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ اس لیے آپ کو وہاں پہنچا کر آگے نکل جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے اور تمہیں جزا دے۔“ اس نے اسی لہجے میں کہا۔

”تمہارا کوئی نہیں ہے بابا؟ جو تمہیں میرا مطلب ہے..... وہاں تک پہنچا جایا کرے۔“ میں نے اگلا سوال کیا تو وہ بولا۔

”کیوں نہیں..... بیٹے ہیں جو تمہاری طرح ملازم ہیں۔ پوتے پوتیاں ہیں جو اسکول جاتے ہیں۔ انہیں صبح اسکول جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ میرا ساتھ نہیں دے پاتے اور پھر اگر ابھی جاؤں تو ان کی مائیں انہیں برا

بھلا کہتی ہیں۔ وہ میرے لیے کہاں اتنا تردد کریں گے۔ میں خود ہی اپنی عادت نہمٹائے چلا جا رہا ہوں۔ اگر نہ آؤں، وہاں تک تو وہ بہت گلہ کرتا ہے۔ بڑی شکایت ہوتی ہے اسے بچہ سے!“ وہ ذرا سار کا تو میری رگ تجسس پھڑک اٹھی۔

”تو کیا وہاں کوئی اور بھی ہوتا ہے..... آپ کے علاوہ بھی؟“

”ہاں ہاں۔ وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے۔ ہر بار مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر مجھے شرمندہ کر دیتا ہے!“ وہ بولا۔

”مگر میں نے تو سنا ہے برگد کا یہ بوڑھا اور پرانا درخت بڑا بیمار ہے۔ تبھی تو وہاں جاتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں۔ وہاں کوئی آسیب یا ہوائی مخلوق موجود ہے۔“

کیا واقعی وہاں ایسی چیزیں موجود ہیں۔ آپ نے تو ضرور دیکھی ہوں گی۔“ میں نے اپنے اندر کا غدشہ اس پر ظاہر کیا۔

میری بات سن کر اس کے بوڑھے کانپتے ہونٹوں پر لہجہ بھر کے لیے مسکراہٹ کی چاندنی اتری۔

”ارے نہیں بیٹا۔ جن کو لوگ بھوت اور چڑیلیں سمجھتے ہیں، وہ تو سب میری پرانی یادوں اور کہانیوں کے وہ کردار ہیں جو یہ روپ دھارے بیٹھے ہیں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔

میں وہاں جاتا ہوں تو وہ سارے میرے ارد گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کے آنے سے میری برسوں کی تنہائی دور ہو گئی ہے۔ یہ جو درخت تم دیکھ رہے ہو۔

ہو۔ یہ میرا بڑا پرانا یار ہے اور اگر میں اس کے پاس نہ آؤں تو تھوکے شکایت لے کر بیٹھ جاتا ہے۔“

اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں مگر مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے میں اسے وہاں چھوڑ کر اپنے آفس چلا آیا۔ دفتر آ کر اپنے کاموں میں اس قدر الجھ گیا کہ مجھے اس کی یاد ہی نہ رہی۔ البتہ جب شام کو میں ادھر سے گزرا تو اچانک میری نظر اس جانب اٹھ گئیں مگر اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔

میں اس راستے سے روزانہ گزرتا تھا اور جب سے میرا اس بوڑھے سے تعارف ہوا تھا، میں اب نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف ضرور دیکھنے لگا تھا جہاں اس روز میں نے اتنا چھوڑا تھا مگر اب کتنے روز سے میرا اس سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا بلکہ ایک دن میں نے اسے دیکھا بھی مگر میں اس روز جلدی میں تھا۔ وہ اس وقت درخت کے تنے سے لگا بیٹھا تھا اور اس کی ہانسی اور لمبی رگوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا جو زمین کے پہلے۔ ہمارے اہل ہوتی ہیں۔

تب میں نے فوراً جواب دیا۔
 ”نہیں عاصم! جو تم سوچ رہی ہو ایسی بات نہیں ہے
 اور ویسے بھی اب ایسے معاملات سے ہماری عمریں آگے نکل
 چکی ہیں!“
 ”گھوڑے اور مرد کے پھسلنے میں وقت ہی کتنا لگتا
 ہے!“ اس نے جواب دیا۔

تب میں نے اس روز والا سارا واقعہ اور بابے کی باتیں
 اسے سنا ڈالیں۔ اس نے ساری باتیں سننے کے بعد پوچھا۔
 ”تو آپ خود کہیں اس برگد کے نیچے تک تو نہیں گئے؟“
 ”ہوں!“ میں نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت
 سے سر لگاتے ہوئے کہا۔

”تو شمار..... مجھے لگتا ہے کہ برگد پر رہنے والے سائے کا
 اثر آپ پر بھی ہو گیا ہے۔ کیا بتایا تھا آپ نے کہ اس درخت
 پر ہوائی چیزوں کا سایہ ہے!“ اس نے پریشانی سے کہا۔

”ارے نہیں محضی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس بابے
 کی باتیں ہی اس قدر دلچسپ تھیں کہ مجھے جب بھی یاد آئی
 ہیں تو مسکراہٹ میرے لبوں پر خود بخود آ جاتی ہے۔“ میں
 نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

”دوبارہ نہیں ملے اس سے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”جی تو چاہتا ہے مگر وقت ہی نہیں ملا۔“ میں نے مختصراً

جواب دیا
 اور واقعی میری یہ خواہش دن بہ دن میری سوچوں کو
 جکڑنے لگی تھی کہ میں اس سے دوبارہ ملوں۔ مجھے وہ خاصا
 دلچسپ لگنے لگا تھا لیکن صبح آفس جانے کی جلدی اور شام گھر
 آنے کی پھرتی پھر رفتہ رفتہ یہ باتیں میرے ذہن سے محو
 ہونے لگیں۔ اس روز اتوار تھا۔ آفس سے چھٹی تھی۔ میں
 نے اپنے پر وگرام پہلے سے طے کر رکھے تھے مگر اچانک
 جیسے ایک کوندا سا ذہن میں لپکا۔ کیوں نہ آج بابا سے
 ملاقات کر لی جائے۔

اس روز بھی صبح ہی سے سورج نے سلگنا شروع کر دیا
 تھا۔ میں نے اپنے دوسرے سارے پر وگرام اور محو رہے
 چھوڑ دیے اور گھر سے نکل کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں برگد کا یہ
 بوڑھا اور پرانا درخت کھڑا تھا۔ یہ بیماری نئی بنی ہوئی کالونی
 سے ذرا ہٹ کر قدرے ویران جگہ تھی اسے میری خوش قسمتی
 جانے کہ وہ مجھے اسی درخت کے نیچے بنی ہوئی صرف ستری
 کی جگہ پر بیٹھا لگ گیا۔

میں پیچھے کی جانب سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو
 مجھے اس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے وہ کسی

اسے معروف دیکھ کر میں بھی مسکرا کر آگے نکل گیا
 حالانکہ اس کی باتیں میرے ذہن میں ابھی تک گونج رہی
 تھیں بلکہ اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ میں جب بھی کہیں تنہا
 بیٹھتا، وہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ دفتر میں میرے
 ساتھی مجھے یوں مرا تے میں بیٹھے دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ اس
 روز بھی میں آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹ سے قہقہے لگائے ذرا
 فارغ بیٹھا تھا کہ مجھے اس کی باتیں یاد آ سکیں اور میں
 خود بخود مسکرا نے لگا۔ میرے قریب بیٹھے والے میرے
 ساتھی نے اپنی میز کو زور سے بجا کر مجھے مخاطب کیا۔
 ”نار صاحب! کہاں پہنچے ہوئے ہیں اور یہ لبوں پر پھیلنے
 والی مسکراہٹ آپ کے اندر کی کبھی کہاں بیان کر رہی ہے!“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس یونہی ذرا!“
 میں نے پورے طور پر اپنے حواس بحال کرتے ہوئے
 جواب دیا۔

”ہم جانتے ہیں۔ آپ چاہے بتائیں یا نہ بتائیں۔
 پیار کے ابتدائی دنوں میں۔ چاہتوں کے وصل لمحوں میں
 اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اس نے جیسے مجھ سے کچھ اگھواتا چاہا
 مگر کچھ تھا ہی کیا جو اس انہیں بتاتا لیکن وہ بعقد تھے۔

”ارے۔ تم یہ کیا بکمیڑا لے بیٹھے ہو۔ قسم لے لو۔
 ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے اپنی مفاہی پیش کی۔

”ہم سے بھی قسم لے لیں۔ ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔
 آپ کے دوست اور ساتھی ہیں۔ ہم پر اعتماد کر کے تو
 دیکھیں۔ ہم یہ معاملہ بھائی سے بھی چپا کر رکھیں گے۔“ وہ
 سارے بیک زباں ہو کر بولے۔

میں نے بڑی مشکل سے جان چھرائی۔ اگرچہ میں
 انہیں مطمئن نہ کر سکا۔ میری یہی حالت گھر میں بھی تھی۔ گھر
 میں بھی جب بھی میں اکیلا ہوتا تو مجھے وہ بابا اور اس کی باتیں
 یاد آ جاتیں اور پھر میرے لبوں پر کھرتی مسکراہٹ نے تو
 کئی بار میری بیگم کو بھی شک میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ یہ الگ بات
 کہ میں اس سے کس طرح جان چھڑاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح
 یاد ہے۔ اس روز بھی میں بیٹھنا جانے خیالوں کے کن
 راستوں سے بھٹکتا ہوا اس بوڑھے پر آ رکھا تھا اس روز مجھے
 یوں تنہائی میں اکیلے مسکراتے دیکھ کر میری بیگم نے قدرے
 غصے سے مجھ سے کہا۔

”میں کتنے دنوں سے آپ کی حالت دیکھ رہی
 ہوں۔ کیا یاد آ جاتا ہے کہ یکا یک خاموش اور چپ رہنے
 کے باوجود خود بخود آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہنسنے
 لگتی ہے۔ کہیں کوئی معاملہ گڑبڑ تو نہیں ہو گیا؟“

سے ہمسکام ہو مگر وہاں دوسرا کوئی نہ تھا۔ میں اس کے اور نزدیک ہو گیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں باتیں کر رہا تھا۔

”اوہ۔ یار غصہ نہ ہوک دے۔ کہا نا۔ بیمار ہو گیا تھا میں، نہیں چلا جا رہا تھا مجھ سے۔ آج بھی بڑی مشکل سے اٹھ کر آیا ہوں۔ اعتبار کر میرے پر اور تمہارا منہ ابھی تک بنا ہوا ہے۔ معاف کر دے نا مجھ نمائے کو۔ تیرے سوا اب ہے بھی میرا کون جس سے اپنا دکھ درد کہہ سکوں۔ وہ تو سارے اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس مجھ سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہیں!“ ابھی نہ جانے وہ اور کیا کیا باتیں کر تا کہ میں بیچ میں ہی بول اٹھا۔

”جو کیا..... بیٹھے کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنے ایک ہاتھ کی اواک بنا پر اپنی آنکھوں کے اوپر رکھ کر تقریباً مجھے پہچانتے ہوئے بولا۔

”آگئے ہوئے پتر۔ میں بڑے دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

اس کی یہ بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے اسے واقعی میرا انتظار رہا ہو۔

”جو کیا.....“ میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

”نہ پتر۔ میں نے یہاں کونسا جوگ لیا ہے۔ نہ میں سنیا سی ہوں اور نہ جوگی۔ سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ اس ہمدرد کے پاس آ جاتا ہوں اپنا دکھڑا سنانے مگر یہ بھی ناراض ہو گیا ہے۔ ترلے کر رہا ہوں دیکھو کب مانتا ہے! بیٹھو۔ اور تمہیں بتا دوں۔ میرا نام جوگیا نہیں، علمو دین ہے!“

میں اس کے نزدیک ہی برگد کی چھدری چھاؤں تلے بیٹھ گیا۔

”یہ برگد کا درخت میرا یار ہے۔ اس نے میرے جسم پر اترتے سارے موسم دیکھے ہیں۔ یہ میری ساری باتوں کا سا بھی ہے۔ یہ جگہ جہاں آج کل بنی کالونی بنی ہے، یہاں کبھی غلہ منڈی ہوا کرتی تھی اور برگد کا یہ درخت اس کے درمیان میں ہوا کرتا تھا۔ میں یہاں بڑی مدت سے آیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی سفید دودھ دو پہریں جب سانولی ہونے لگتی تھیں، ہم اس کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں کے جس سے تنگ آ کر یہاں آ جاتے تھے۔

”یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک روز یہاں آیا تو مجھ سے پہلے یہاں دو چار بڑی عمروں کے لوگ بیٹھے تھے۔ درمیان میں رکھے

ہوئے حق کی نے گھومتی ہوئی کبھی کسی کے اور کبھی کسی کے ہاتھ آ جاتی۔ وہ سارے کسی اور کے منتظر تھے۔ جب وہ منتی دیر تک نہ پہنچا اور ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو ان میں سے ایک ادھیر عمر کا آدمی مجھے مخاطب کر کے بولا۔

”پتر! پڑھے لکھے ہو؟“

”ہاں جی۔ اللہ کا کرم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پتر! ادھر آؤ، اگر فارغ ہو۔ جب تک رحمان نہیں آتا تو ہمیں یہ کتاب ہی پڑھ کر سنا دو۔“

”میں ہچکچاتا ہوا آگے بڑھ کر ان کے درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کتاب اٹھالی۔ یہ بوسیدہ اور پانی والی ایک بڑی سی کتاب تھی۔ شاید امیر ترزہ کی داستان تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کی۔ وہ سارے بڑی خاموشی کے ساتھ اسے سن رہے تھے۔ درمیان میں کبھی کبھی جھڑکڑانے کی آواز آنے لگتی۔ جوں جوں میں اسے پڑھتا جا رہا تھا، میری اپنی دلچسپی اس میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شام کی سانولی رنگت دھیرے دھیرے رات کی گہری سیاہی میں بدلنے لگی۔

جب انہوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

”بس پتر! یہاں نشانی رکھ کر اسے بند کر دے۔ اللہ تمہیں حیاتی دے۔ باقی کل پھر سہی۔ شاید کل رحمان بھی آ جائے۔ وہ آگے سے شروع کر دے گا۔“

”بس اسی روز سے میرا شوق بڑھتا چلا گیا۔ میں اب روزانہ وہاں آنے لگا تھا اور جس روز رحمان نہ ہوتا اس روز میں کتاب پڑھتا تھا اور یوں میرا نام داستان گورکھ دیا گیا حالانکہ میں صرف پڑھنے والا ہوتا تھا۔ ایک روز میں جب وہاں پہنچا تو میری طرح دو تین بندے اور آ کر ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ابھی چوپال جننے میں دیر بھی کہ ان میں سے ایک بولا۔

”داستان گو پتر! تمہیں پتا ہے رتے کے بیٹے نے اپنا مکان بیچ دیا ہے۔ وہ کل یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ اس لیے کہانی سنانے کی ڈیوٹی آج سے تمہارے حصے میں آگئی ہے۔ لہذا آئندہ سے تم ہمارے لیے یہ کام سرانجام دو گے۔ تمہیں علم ہے کہ ہم یہاں صرف اسی خاطر آتے ہیں۔ گھر والے ویسے ہی ہماری شکلوں اور باتوں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہم سب یہاں آ جاتے ہیں۔ کچھ ایک دوسرے کے دکھ درد سیننے اور کچھ اپنا دل بھلانے۔“

”میں ابھی اس سوچ میں تھا کہ انہیں کیا جواب دوں کہ دور سے ایک چھ سات سال کا بچہ ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ہمارے قریب آ کر رک گیا اور پھر اس نے

ہاتھ میں پکڑا ہوا روپے کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو!“

میں نے نوٹ پکڑ کر بچے سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے پتر!“
 ”یہ میری باجی نے بھیجا ہے۔ وہ ادھر کھڑی ہے۔“
 اس نے دور کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔
 ”کس لیے؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”آپ مانتے والے نہیں ہوا“ لڑکے نے جواب دیا تو ایک بوڑھے نے جواب دیا۔

”ہم بھکاری نہیں ہیں پتر۔ جاؤ واپس لے جاؤ۔“
 ”اس نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے تقریباً کھینچتے ہوئے اسے دوبارہ پکڑا دیا۔ وہ نوٹ لے کر واپس پلٹ گیا۔
 میری نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ جب وہ لڑکی کے قریب پہنچا تو چند لمحے ان کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں پھر اس نے سرکراتے ہوئے نوٹ واپس لیا اور آگے چلی گئی۔

”پتا نہیں کیوں اس لمحے میرا اس لڑکی سے ملنے اور باتیں کرنے کو دل چاہنے لگا تھا۔ پتر! شاید یہ ان لوگوں نے اسی کا نام خواہش رکھا ہو۔ بہر حال کچھ تھوڑے دنوں اور اس لمحے سے میرے دل میں کہیں اپنا گھر بنانے لگا تھا۔

”پھر میں نے بھی روزانہ شام کو یہاں آنے کی ہامی بھری۔ اب میں روزانہ ان کے درمیان آ کر بیٹھ جایا کرتا اور داستان سنانے لگتا۔ بزرگوں کا وہ نولہ جو رحے کے جانے کی وجہ سے بکھر گیا تھا، دھیرے دھیرے دوبارہ جمع ہونے لگا۔ میں ان کے درمیان روزانہ آ کر بیٹھ جایا کرتا۔ یہ اب میرا روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ میں ان دنوں محنت مزدوری کر کے یہاں ایک قریبی کوارٹر میں آ جایا کرتا جہاں میں رہائش پذیر تھا۔ میرے والدین گناؤں میں رہتے تھے اور یہاں میں اکیلا۔ اس وقت یہ برگد بھی میری طرح جوان تھا۔ ہم اس کے بچے اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک مکمل اندھیرا نہ ہو جاتا۔“

”پھر اس لڑکی کا کیا ہوا؟“ میں نے اس کی کہانی کا سب سے دلچسپ ٹکڑا اٹھایا۔

”وہ لڑکی تو جیسے میری سوچوں کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ میں وہاں جاتا تو مجھے اس کا انتظار شروع ہو جاتا کہ کبھی تو وہ دوبارہ یہاں سے گزرے گی۔ اس کے ذہن میں تو شاید یہ بات ہوگی بھی نہیں کہ کوئی اس کا اس طرح شدت سے انتظار کرتا ہوگا۔

”اس برگد کے قریب سے گزرنے والا واحد رستہ تھا جو ارد گرد کی آبادیوں کے لیے شہر پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا۔ اسی

لیے لوگ عموماً اسے استعمال کرتے تھے۔ میں اپنے کام سے فارغ ہو کر یہاں آ جاتا پھر ہولے ہولے دوسرے بھی آ جاتے۔

”اس روز بھی حسب عادت میں ہی وہاں پہلے پہنچا تھا۔ ان میں سے ایک اوجیز عمر شخص جو ہر روز برگد کے نیچے وہ زمین پر پانی کا جھڑکا ڈرتا تھا، ابھی آ یا ہی تھا اور وہ سرکاری نکلے سے پانی لینے گیا تھا۔ میں نہ جانے کن خیالوں میں تھا کہ مجھے وہ آتی ہوئی دکھائی دی۔

”اس بات کا احساس میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں نے مجھے دلادیا تھا۔ یقیناً وہ اور اس کے ساتھ آنے والا چھوٹا لڑکا وہی تھے۔ میں برگد کی چھاؤں تلے بیٹھا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر وہ رک گئی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوٹ اس لڑکے کو دے کر میری طرف اشارہ کر کے بھیجا اور خود وہیں کھڑی رہی۔ لڑکا روپیہ لے کر میری طرف آیا اور میرے نزدیک روپیہ پھینک کر واپس مڑنے والا تھا کہ میں نے آواز دی۔“

”سنو بیٹے.....!“

وہ رک کر میری طرف پلٹا۔

”یہ روپیہ کس لیے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میری باجی نے بھیجا ہے۔ آپ مانتے والے ہوتا۔“ لڑکے نے حیرانی سے میری طرف دیکھ کر پوچھا اور واپس مڑنے لگا کہ میں نے پھر اس سے پوچھا۔
 ”بیٹے۔ میں تمہیں مانتے والا لگتا ہوں؟ اور سنو، کیا نام ہے تمہارا؟“

وہ دوبارہ ٹھہر گیا اور بولا۔ ”پتا نہیں۔ میرا نام جبار ہے!“
 ”پڑھتے ہو؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔
 ”ہوں۔ چوتھی کلاس میں پڑھتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور وہ تمہاری باجی، اس کا کیا نام ہے؟ وہ بھی پڑھتی ہے کیا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”شینہ باجی..... وہ پڑھنے سے اٹھ گئی ہے؟ ابا کہتے ہیں بیٹیاں زیادہ نہیں پڑھا کرتیں۔“ جبار نے بتایا۔

”اس کے منہ سے اس کا نام سن کر میرے دل میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ میں نے اپنے دل میں سر اٹھائی بے شمار خواہشوں کو سہیتے ہوئے کہا۔

”چلو میں تمہاری باجی کو بتاؤں کہ میں بھیک مانتے والا نہیں ہوں۔“ میں نے اس کا پھینکا ہوا روپیہ اٹھایا اور اس کے ساتھ ادھر چل دیا۔

”وہ تقریباً میری ہم عمری تھی۔ اس قدر خوب صورت

بھی نہ تھی کہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان ملائے جاسکیں۔ بس جوانی کی چڑھی دھوپ نے اس کے جسم کے سارے زاویے کچھ اس طرح خوب صورت کر دیے تھے کہ دیکھنے والے کے دل میں خواہواہ گدگد کی سی ہونے لگتی..... میں اس کے قریب پہنچا تو وہ تھوڑا سا سسکرائی۔

”میں آپ کو بھیک مانگنے والا لگتا ہوں؟“ میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ان کے ماتھے پر بھی نہیں لکھا ہوتا۔ ان میں اور تم میں اتنا ہی فرق ہے۔ وہ فٹ پاٹھوں اور سڑکوں پر بیٹھتے ہیں اور تم درخت کے نیچے دھرنادے کر بیٹھے ہو۔ وہ آتے جاتے لوگوں کا راستہ روک کر مانتے ہیں مگر تم آتے جاتے لوگوں کو تنگ نہیں کرتے۔“ اس نے شریر آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔ کہاں رہتی ہو؟“ میں نے بات بدل کر کہا۔

”پچھلے بڑے کا ارادہ ہے۔“ وہ ایک بار پھر چبکی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ سو جانتا ہوں کہ تم نے والی گڑیا کو کوئی تو ٹھکانا ہوگا مگر لگا تم بھی میری طرح ہی ہو!“ میں نے بھی باتوں کو کھمانے کا فن آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

”ادھر غلہ منڈی کی اس طرف۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

”کیا کرتی ہو؟“ میں نے ایک لائینی سا سوال کیا۔

”گھر میں رہتی ہوں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”بڑے دن بعد آئی ہو۔ ادھر سے روزانہ نہیں گزرتیں؟“ میں نے پوچھا تو وہ میرے سوال پر ہنس دی۔

”جب شہر کام ہوتا ہے تو آئی ہوں، روز روز کام تھوڑا ہوتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب آیا کرو گی؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”دکس لیے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”میرے لیے۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”چلو بھی جاؤ۔“ جبار نے مداخلت کی تو مجھے بہت ناگوار لگا۔

”سوچیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

”جو گیا! تمہاری داستان خاصی رنگین لگتی ہے مگر مجھے جلدی ہے۔ کیوں نہ ایسا کریں کہ آج ہم کہانی یہیں ختم کر دیں۔ اگلی ملاقات پر دوبارہ یہیں سے شروع کریں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”پتا نہیں پترا! دوبارہ ملن ہوتا ہے یا نہیں۔ کون جانے!“ اس نے مایوسی سے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس کا ارادہ مجھے مزید بھائے رکھنے کا تھا مگر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ اگرچہ جی میرا بھی چاہتا تھا کہ میں اس کی پوری کہانی سن لوں لیکن نہ جانے کیوں میں نے اسے اگلی ملاقات کے لیے کہا تو وہ بولا۔

”پترا! آج برسوں بعد دل پر رکھا ہوا کچھ بوجھ ہلکا ہوا تھا۔ آج یوں لگا جیسے مدتوں بعد میری باتیں سننے کے لیے کسی نے وقت نکالا ہے۔“

میں اٹھنے لگا تو میں نے دوبارہ پوچھا۔

”جو گیا! ابھی اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“

”یہ تو نے مجھے جو کیا بنا دیا ہے۔ کہا ہے نا کہ میرا نام علم دین ہے۔ میں ابھی اس کیلئے کونسا ڈنکا تم جاؤ۔ اگر وقت مل جایا کرے تو آجایا کرو۔“ اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

”کیوں نہیں جو گیا۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

میری اور اس کی ملاقات میں تقریباً دوڑ بڑھ بیٹھے کا وقت گزر گیا۔ اس دوران نہ تو مجھے فرصت ملی اور نہ ہی سر راہ اس سے ملاقات ہو پائی۔

اس دوران دو تین چٹھیاں اتفاقاً ایک ساتھ مل گئیں۔ میری بیوی، بچوں کو ساتھ لے کر والدین کے پاس چلی گئی اور مجھے فرصت مل گئی۔ اس روز میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس سے ملنے وہاں گیا تھا اور وہ مجھے وہیں مل بھی گیا۔ میں حسب سابق آستنی سے چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔

”جو گیا!.....!“ میں نے آستنی سے پکارا۔

”ارے پترا! آگئے ہو۔ آؤ آؤ، دیکھ لو۔ میں نے اپنے دوست کو منا لیا ہے۔“

اس نے یہ بات کہی تھی کہ گرم لوکا تھیٹر آیا تو برگد کے سارے پتے ٹھٹھڑا اٹھے۔

”دیکھو، اب کمینہ تالیاں بجا رہا ہے۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

میں ایک بار پھر اس کے قریب آلتی پالتی مار کر پیٹھ گیا۔ ”ہاں تو جو گیا.....“

”مزرے لیتے ہوتا میرا نام لگاؤ کے۔ چلو اگر تمہیں اچھا لگتا ہے تو یونہی سہی!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہوں.....“ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا اور ایک ماہر داستان گو کی طرح سلسلہ وہیں سے جوڑا۔ ”شینہ اور میری ملاقاتیں آہستہ آہستہ ہونے لگی تھیں لیکن میرا یہاں سے رابطہ بھی قائم تھا۔ میں روزانہ شام ہوتے ہی یہاں آکر داستان سنا تا اور اب تو داستان سننے والے بڑے بوڑھوں

کی ایک بڑی تعداد یہاں جمع ہونے لگی تھی۔ تنہائی کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور اپنوں کے دبے دھوں سے نجات حاصل کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اب تو ان میں سے ایک اپنے گھر سے مٹی کے تیل کا گیس سیپ بھی اٹھالایا تھا جس کی روشنی میں ہم یہاں اب خاصی رات تک بیٹھ رہتے تھے۔

”شبینہ بھی یہاں سے گزرتے ہوئے مجھے مل جاتی یا پھر میں اس کے گھر کے ارد گرد اسے ملنے چلا جاتا۔ ہم دونوں کے درمیان رابطہ جبار ہوتا تھا۔ ایک انجانہ جذبہ تھا جو دھیرے دھیرے میری اور شبینہ کی سوچوں کے ارد گرد اپنا حصار بناتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام سنتے ہی میری سوچوں میں ایک انجانا سا خوف اور دل کی دھڑکنوں میں بھراؤ سا کیوں پیدا ہونے لگا تھا۔ میں اگر اسے کسی دن نہ دیکھتا تب میرے ارد گرد نا معلوم سی اداسی اپنا گھیرا تنگ کرنے لگتی تھی۔ وقت کو تو جیسے پر لگ چکے تھے۔

”ان ہی دنوں مجھے گاؤں سے پیغام ملا کہ گھر والوں نے مجھے جلدی بلایا ہے۔ بس معاملہ اسی روز سے بڑ گیا۔ میں گھر گیا تو مجھے پتا چلا کہ میری شادی کے معاملات طے کیے جا رہے ہیں۔ میں نے انکار کیا تو میری والدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا مگر والدہ کی التجائیں اور زیادہ ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر میرے والد نے مجھے الگ ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کچھ اس طور مجھے گھیرا کہ میں جب گاؤں سے واپس آیا تو میری شادی ہو چکی تھی۔

”میں اس رات اسی برگد کے نیچے پہنچا تو یہاں کی محفلیں بھی اجڑ چکی تھیں۔ وہ سارے ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ البتہ ان میں سے ایک ابھی تک یہاں آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سارے میرا بڑی در تنگ انتظار کرتے رہے۔ وہ روزانہ ہر شام یہاں آتے لیکن پھر میرے نہ ہونے پر آہستہ آہستہ مایوس ہوتے چلے گئے۔“

”ارے ہاں۔ دو ایک بار ایک بچہ تھا یہاں پوچھنے ضرور آیا تھا۔ بھلا سنا تمہارا کیا۔ شاید میں بھول گیا ہوں۔“

”اس نے مجھے بتایا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ یقیناً جبار ہوگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر سے بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں اس سے اجازت لے کر شبینہ کے گھر کی طرف چلا گیا۔

گزارہ

فیملی ڈاکٹر ایک کھنے سے کمرے کے اندر مریض کے معائنے میں مصروف تھا۔ بیوی بچے دوسرے کمرے میں بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کڈا کٹر کیا خبر لے کر آتا ہے۔ آخر ڈاکٹر کمرے سے پرآمد ہوا اور مریض کی بیوی کے پاس پہنچ کر بولا۔ میں اس وقت آپ کے شوہر کو جس حالت میں دیکھ کر آ رہا ہوں مجھے وہ ٹھیک نہیں لگ رہے۔“

”مجھے تو وہ بھی بھی ٹھیک نہیں لگے لیکن کیا کروں بچوں کی خاطر گزارہ کر رہی ہوں۔“ بیوی نے غمزہ لہجے میں جواب دیا۔

زندگی

زندگی اس جزیرے کے مانند ہے جہاں پر خوابوں اور عذابوں کے بہت سے درخت ہوتے ہیں۔ دھوپ لگے تو سائے نہیں دیتے اور بھوک لگے تو پھل دور ہوتا ہے۔ زندگی نہ جانے کس کا انتظار کرتی ہے اور موت بن بلائے مہمان کی طرح اچانک آ جاتی ہے۔ دولت کماتا مشکل ہے مگر اپنی محنت حاصل کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ پل دو پل کی زندگی میں اگر کسی کا انتظار شامل ہو جائے تو یہ پل بھی نہیں گزرتے۔

”کتنی دیر تک ادھر ادھر پکر لگانے کے بعد میں مایوس ہو کر وہاں سے مڑنے والا تھا جب مجھے جبار نظر آ گیا۔“

”ارے جبار! تو.....“ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”کہاں تھے آپ۔ میں نے آپ کو بڑا تلاش کیا۔ حاجی روز مجھے ادھر بھیجا کرتی تھی مگر آپ وہاں تھے ہی نہیں۔ کہیں گئے ہوئے تھے آپ؟“ اس نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال کر ڈالے۔

”اب کہاں ہے شبینہ؟ اسے بتاؤ۔“ میں نے دھڑکنے والے دل سے کہا۔

”وہ..... وہ تو اپنی سسرال چلی گئی ہیں۔ بھائی جان سے صلہ ہو گئی ہے نا!“

”کون بھائی جان۔“ میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

”تو کیا آپ کو نہیں پتا..... ان کے خاندانہ وہ سارے اکٹھے ہو کر آئے تھے۔ کتنے دن یہاں خاصی گرما گرمی رہی۔ باجی تو مان ہی نہیں رہی تھی مگر ان کے آگے نہ چل سکی۔ اس لیے مجبوراً پھر باجی کو ان کے ساتھ بھجوا دیا گیا۔“
 ”وہ مجھے نہ جانے کیا کیا بتا رہا تھا مگر میں تو کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔“

”تو کیا وہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھی؟“ میرے دل کے کسی گوشے نے تصدیق چاہی۔

”ہاں تو اور کیا۔ آپ کو نہیں بتایا تھا باجی نے۔ وہ تو یہاں روڈ کرائیٹیبل ہوئی تھی۔ اب صبح ہو گئی ہے تو اسے جانا ہی تھا۔“

”میں وہاں سے بڑا مایوس ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اس سے اگلی شام جب میں دوبارہ اس کے پاس آیا تو یہ کیسے نہ بچوں کی طرح تالیاں بجا کر مجھ پر ہنسا تھا۔ میں یہاں آنے لگا تو رفتہ رفتہ یہاں دوسرے بھی آنے لگے مگر نہ تو پھر یہاں ویسی چو بال جم کر آئی اور نہ ہی ویسی محفل۔ ان میں سے کبھی کوئی آ جاتا اور کبھی کوئی۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر ناکام رہا۔“

”پھر میں نے بھی اپنی بیوی کو یہیں شہر میں اپنے اسی کوارٹر میں بلا لیا۔ ان ہی دنوں یہاں سے منڈی اٹھنے لگی۔

رفتہ رفتہ پتا چلا کہ اب یہاں الاغٹسٹ کے بعد دوبارہ کچی دکانیں بنیں گی۔ درمیان والا رستہ جو کہ اس منڈی سے شہر تک آنے کا مختصر راستہ تھا، بند کر دیا گیا۔ لوگوں نے الاٹ منٹس لے کر یہاں دکانیں بنانا شروع کر دیں مگر یہ درخت یہیں کا نہیں رہا۔ میرے بھی بچے ہو گئے۔ میں نے بھی ادھر ہی چھوٹا موٹا کام شروع کر دیا۔ اللہ نے برکت دی اور پھر میں ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو رہا۔“

”پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر سے افواہ پھیلی کہ یہاں منڈی کی جگہ کالونی بنے گی۔ اب تو میرے بچے بھی بڑے ہو چکے تھے۔ ان میں سے میں نے ایک کی شادی بھی کر ڈالی۔ جب مجھے اسی کالونی میں ایک مکان مل گیا۔ وقت بدل گیا۔ لوگوں کی سوچیں بدل گئیں۔ اب یاریاں جیب، عہدہ اور رتبہ دیکھ کر کی جانے لگی تھیں۔ لوگوں کے رویے تبدیل ہو گئے۔ وقت میں ایک تناؤ اور تیزی آ گئی لیکن نہیں بدلا تو یہ درخت نہیں بدلا اور یا پھر میری بوسیدہ اور پرانی باتیں۔ جنہیں اب کوئی سننے والا نہیں رہا۔“

”میں نے کئی بار اپنے پوتوں اور پوتیوں کو کہانی سنانے کا پوچھا۔ کئی جاکتی راتوں کو ان کے من کہانی سن کر بھلانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ہر بار مجھے ٹوک دیا۔“
 ”میں نے ایک بار زبردستی اپنی پوتی کو کہانی سنانا

چاہی۔ میں نے کہانی شروع کی۔“

”ایک نئی شہزادی! تو اس نے فوراً مجھ سے پوچھا۔
 ”ڈیانا کی طرح تھی۔ سچی دادا مجھے ڈیانا بڑی اچھی لگتی تھی۔ کیا بالوں کا اسٹائل تھا اس کا!“

”اس کی یہ بات سن کر میں شرمسار سا ہو گیا اور پتا ہے، اگلے دن میں نے اپنے چھوٹے پوتے کو اپنے پاس لٹاتے ہوئے کہا۔“

”گلدو! آؤ میں تمہیں کہانی سناؤں۔“

”وہ میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ میں نے ابھی کہانی شروع کی کہ ایک تھا بادشاہ..... اس نے فوراً اپنا ہاتھ سا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھا اور کہنے لگا۔“

”چھوڑو دادا۔ اس وقت کیبل پر میرا پسندیدہ ڈراما لگا ہے۔ ان کہانیوں سے زیادہ خوب صورت اور دلچسپ ہے۔ کہانی پھر سن لوں گا۔ اب مجھے جانے دو۔“ یہ کہہ کر وہ میری گرفت سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ٹی وی پڑا ہے۔

”میں اسی روز سے دوبارہ یہاں آنے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے وجود کو تنہائی کی ویک جلد ہی چاٹ جائے گی۔“

”یقین کرو۔ تنہائی کا یہ خوف مجھے اندر ہی اندر سے کھانے لگا تھا۔ میں ان لوگوں سے دور ہو جانا چاہتا تھا جو میری سنائیں چاہتے اور مجھے اب فالٹو شے سمجھنے لگے تھے۔“

”میں نے بچوں کے اس رویے کی اپنے پتر بشیر اور اپنی بہو سے شکایت کی تو انہوں نے انہیں ڈانٹنے کے بجائے مجھے کہا۔“

”ابا۔ یہ نئی نسل کے بچے ہیں اور سائنس کا دور ہے۔ بھلا وہ آپ کی دقیقہ نوی باتوں کو کہاں سمجھیں گے۔“

”اس لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔“ اس نے اپنے اندر کے دکھوں کو کھولتے ہوئے بتایا۔

”یہ سب وقت کی بات ہے جو گیا۔ ایسا ہوتا ہی چلا آیا ہے۔“ میں نے دوبارہ اس کی ڈھارس بندھائی۔

”پتر! یہ سمجھتے کیوں نہیں کہ بڑے بوڑھے اور مادی اشیا میں بہت فرق ہے۔ اشیا کو نے میں پڑی بھی رہیں تو فرق نہیں پڑتا مگر بوڑھے..... ان کے نجف جسموں میں اللہ نے دل نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو کسی عمارت کی وقت بھی اپنے ہونے کا اظہار کر نہیں ہونے دیتا۔ بوڑھوں کو کسی کو نے کھدے میں ڈال کر یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان لوگوں کا بھی باتیں کرنے اور اپنا دکھ سکھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کا بھی دل کرتا ہے کوئی ان کی سنے۔ کوئی ان سے

کہے مگر اب وقت کس کے پاس ہے۔ کون ہے جو ہم ایسے بوڑھوں کو پسند کرے گا۔“

اس کی بوڑھی ویران آکھوں میں اداسی کی گہری ٹوپ گھٹا ٹوٹ کر برسنے کو تیار تھی اور اس کی ابتدا بھی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بوڑھے کا بچنے ہاتھ کی پوروں سے آکھوں کے پیچھے کوٹوں کو صاف کیا اور کہنے لگا۔

”میں یہاں نہ آؤں تو کہاں جاؤں مگر اب یہ مکینہ بھی غزے دکھانے لگا ہے۔ جب ناراض ہو جاتا ہے تو بڑے ترے اور منتیں کراتا ہے۔“

اس روز میں وہاں سے اداسی کا ایک بہت بڑا بوڑھ لے کر واپس آیا تھا۔ شاید میں بھی اب وہاں بھی نہ جاتا کہ ایک روز میں نے دیکھا، برگد کے اس پرانے اور بوڑھے درخت کے نیچے اسی طرح کا ایک اور بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جانا کہ شاید وہ بھی اسی طرح کا ہوگا۔ ویسے بھی اس روز میں کسی کام کے سلسلے میں جلدی گھمرا گیا تھا۔ اس لیے میں سیدھا چلا آیا۔

اس سے اگلے کئی دن تک میں اپنے کاموں میں الجھا رہا۔ ایک روز اچانک پھر مجھے وہی بوڑھا نظر آیا تو میں تعجب و غصے کے لیے ادھر چلا گیا۔ وہ یقیناً کوئی اور ہی تھا۔ میرا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”وہ یہاں علم دین آتا تھا۔ تمہیں پتا ہے، کہاں ہوگا؟“

”وہ..... لیکن آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بڑی مدت سے وہ اسی برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کبھی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ اس وقت سے میں اسے جانتا ہوں۔ بلکہ میں تو اس کا مدتوں سے بھیدی اور ساتھی رہا ہوں۔ ابھی برسوں ترسوں اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں ہر روز آتا ہے۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

”ہاں۔ آتا تو ہے۔ شاید آج نہ آیا ہو۔ اچھا تو آپ بھی.....“ میں نے اس سے باتیں کرنا شروع کیں تو مجھے لگا جیسے وہ بھی جو گیا بابا کی طرح تنہائی کا دسا ہوا ہے۔

”پھر تو آپ ایک دوسرے سے ایسے خاصے واقف ہوں گے؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”ہاں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا آپ اس سے بھی واقف ہیں جو یہاں اس سے ملنے آیا کرتی تھی؟“ میں نے پانسا پھینکا۔

کون..... جہاں تک مجھے یقین ہے، میں نے تو یہاں کسی کو آتے کبھی نہیں دیکھا۔ میں بھی ان دنوں یہاں تقریباً ہر روز آیا کرتا تھا۔“

”شاید اس کا نام شبنم تھا۔ مجھے خود بابا نے بتایا تھا جو کبھی کبھی اس سے یہاں ملنے کی خاطر آیا کرتی تھی اور بابا اس سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔“ میں نے وضاحت سے پوچھا۔ میری بات سن کر وہ بڑے زور سے ہنسا۔ ایسے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں بھی جتنے لگیں۔ اس کی ہنسی سے برگد کے درخت پر بیٹھے پرندے بھی اڑنے لگے۔ تب اس نے اپنی ہنسی مٹی کھانسی کو قابو کرتے ہوئے کہا۔

”ارے میرے بچے! تو بھی کس قدر سادہ اور بھولا ہے۔ نہیں جانتا۔ ارے اس نے یہاں برسوں ہم جیسے بوڑھوں کو داستانیں سنائی ہیں۔ بڑی ہی دلغریب اور خوب صورت داستانیں۔ اپنے سے بڑے لوگوں کو۔ ایسے کئی کردار تو اب وہ خود بھی بناتا تھا۔ اس نے یقیناً کوئی اپنی گھڑی ہوئی کہانی تمہیں سنائی ہوگی۔ خود سے منسوب کر کے۔ بہت بڑا فنکار بن گیا تھا وہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس کی باتوں پر اعتبار کر لیا، یقین کر لیا اس کی کہانی پر۔ ارے وہ تو ساری عمر ترستار ہلکے اس بات کا اکثر تذکرہ بھی کیا مجھ سے کہ بھائی رشید! کیا ہم سے کوئی اس طرح ٹوٹ کر محبت نہیں کر سکتی جیسے داستان امیر حجازہ کے شہزادے سے لڑکیاں کرتی تھیں۔ بڑا ہوشیار ہو گیا ہے یہ داستان گو۔ آنے دے اسے۔ پوچھوں گا ضرور پوچھوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔

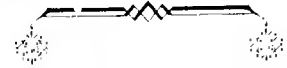
اس کی یہ باتیں سن کر میں سشدردہ گیا تھا اور پھر میں خفت کے مارے وہاں سے بھاگ آیا تھا۔

کتنے دنوں کے بعد اس شام میرا گزر وہاں سے ہوا تو میں نے دیکھا۔ کارپوریشن کے کتنے ہی مزدور اس بوڑھے برگد کو گرانے کے لیے کوشاں ہیں اور علم دین جیسے جو گیا لہا کرتا تھا، ان سب سے تقاہت بھری آواز میں جھگڑا تھا۔ وہ انہیں برگد کے درخت کو کاٹنے سے روک رہا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے برگد کے اس درخت کو کاٹ ڈالا۔ اس پر بے راہ کرنے والے سارے پرندے درخت کے گرتے ہی ادھر ادھر اڑنے اور چیخنے لگے تھے۔ بے گھر پرندے اور بے گھر بے چارے بوڑھے..... ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔

محفل شہر و سخن



✽ ایم سخاوت کرنا ہی..... آزاد کشمیر
مجھے اس سے کچھ گلہ نہیں سو میں نے جیون ہار دیا
اے کاش کبھی تم جان سکو جو عشق نے ہمیں آزاد دیا
✽ اوشارا راضی..... منشی سندھ
جہاں عشق میں گو پیکر وفا ہوں میں
تیرہ نگاہ میں جب کچھ نہیں تو کیا ہوں میں
✽ شبانہ حسن..... لاہور
اچھا بن کر کیا ملنا جو بُرا بنا تو کیا کھوتا
دنیا کھیل تماشا ہے ہر شخص پہ تالی بھتی ہے



✽ زرین خان آفریدی..... حیدر آباد
انجمن میں نے کئی جھک کے بھی سلجھائی ہیں
لوگ سارے تو نہیں..... قد کے برابر ہوتے
✽ محمد شفیق حسین..... شیگرہ جی
میری خوبی پر رہتے ہیں یہاں اہل زباں خاموش
میرے محبوب پہ چڑا ہوا تو گنگے بھی بول پڑتے ہیں
✽ عرفان شاہ، عتیق الرحمن..... فیصل آباد
زمانے میں کون کرتا ہے وفا ایک سے ایک
دل کے دو حروف ہیں وہ بھی جدا ایک سے ایک
✽ مایین فاطمہ..... حجرہ شاہ مہتمم

دے دیا تھتی ہوئی دھوپ کے صحرا کا سفر
میں نے خوشبو کی رفاقت کا سفر مانگا تھا
✽ داؤد اشفاق..... حجرہ شاہ مہتمم

ہے ادھر شہر نگاراں تو ادھر دشت جنوں
آج کس موڑ پر قسمت ہمیں لے آئی ہے
✽ ملائکہ حریم..... حجرہ شاہ مہتمم

پلٹ سکوں نہ میں آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص

✽ عبد الجبار روی انصاری..... قصورٹی
گہرائی الگ لہروں کا پھیلاؤ الگ ہے
ساحل سے مگر موجوں کا ککراؤ الگ ہے
جو خود کو سیٹھ ہوئے بیٹھا ہے بظاہر
اس ٹوٹے ہوئے شخص کا بکھراؤ الگ ہے
✽ نعیم احمد..... بہاولپور

اپنا جلوہ تم دکھا دو سب کو تا معلوم ہو
ہم جو کہتے ہیں تمہیں رشک قریح ہے کہ جموٹ
کہتے ہیں آج اے دل ان کو ہم اپنی طرف
دیکھتے ہیں جذب الفت میں اتر چ ہے کہ جموٹ
✽ وزیر محمد خان..... بعل ہزارہ

پوچھا تھا حال اس نے بڑی مدتوں کے بعد
کچھ پڑ گیا ہے آنکھ میں یہ کہہ کے رو پڑے

❀ شاملہ سلمان..... کورنگی، کراچی
 کی نہیں تھی کسی چیز کی مگر اکثر
 اکیلے بیٹھ کے رویا ہوں زار زار بہت
 ❀ باسط ولید الرحمن..... تلہ منگ، سکھر
 میرے حجرے میں نہیں، اور کہیں پہ رکھ دو
 آسمان لائے ہو، لے آؤ، زمیں پہ رکھ دو
 ❀ مظہر بلال..... تلہ منگ، سکھر
 گھر کی دشت سے لرزتا ہوں پر نہ جانے کیوں
 شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
 ❀ محمد رشید سیال..... سکھر
 اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دھبک
 شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
 ❀ نوشہہ گلزار..... بکھر
 ہم ایسے نہیں ہیں کہ جو آنکھ اپنی جھپک جائے
 گو برق سی ہر دم بڑی شمشیر سے چمکے
 آگ نہیں وہ کہ بجا دے جسے پانی
 عشق اور مرے گریہ کی تاثیر سے چمکے
 ❀ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف
 نہیں ہم کو شکایت اب کسی سے
 بس اپنے آپ سے روٹھے ہوئے ہیں
 بظاہر خوش ہیں لیکن سچ بتائیں
 ہم اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں
 ❀ ریاض بٹ..... حسن ابدال
 کس کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے درد سنا دے ہم
 ساری دنیا جھانی ہم نے اک نہ ایسا فرد ملا
 ❀ شمیمہ کمال..... لاہور
 بن تیرے عجب حال مری جان ہے میرا
 بیٹھا ہوں کہیں اور کہیں دھیان ہے میرا
 حال دل انگیز نہ کہا میں نے کسی سے
 اے حضرت غم تم پہ یہ احسان ہے میرا
 ❀ اشفاق شاہین..... لاہور
 گر بتادیں گے بادشاہی کے
 ہم فقیروں سے دوستی کرلو
 ❀ محمد صفدر معاویہ..... خانیوال
 دنیا نے مالِ غنیمت سمجھ لیا ہے مجھے
 جس کے ہاتھ بھتا لگا اڑا لیا ہے مجھے

❀ اور لیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
 یہی ہے آزمانا تو سنا کس کو کہتے ہیں
 عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو
 ❀ حکیم سید محمد رضا شاہ..... میانوالی
 ہم نے مانا کہ تغافل نہ کر دے لیکن
 خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
 ❀ حمزہ آریان..... تلہ منگ، سکھر
 میرے گھر کی ساری روشنیاں تیرے ساتھ تھیں
 دکھ کی راتیں سکھ کی گھڑیاں تیرے ساتھ تھیں
 ❀ عزیزین ناز..... جھنگ سٹی
 اگر میں آؤں گا صدیوں کی عمر لاؤں گا
 کہ تیرے پاس مجھے مختصر نہیں رہتا
 ❀ انعم کمال..... حیدر آباد
 جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
 دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہو دے گی
 ❀ میمونہ اعظمی..... گلستان ہجر کراچی
 اسے دیکھوں تو بس اس کو دیکھتا جاؤں
 وہ حسنِ خاص بڑے کردار میں رہتا ہے
 تمہارے خواب مرے رجحان میں جاگتے ہیں
 تمہارا چہرہ مری چشمِ تر میں رہتا ہے
 ❀ سائرہ نواب..... پشاور
 رات بھر سڑکوں پہ اب تاریکیاں جتنے پھر دو
 سو گئے سب لوگ دروازہ کھلا کوئی نہیں
 ہم سفر سے لوٹ کر آئے تو یہ عقدہ کھلا
 اپنی بستی میں ہمیں پہچانتا کوئی نہیں
 ❀ شاہین نسیم..... ٹنڈوالیار
 دیکھنا دشتِ نظر میں وہ بھی منظر آئے گا
 شام کی دہلیز پر دن کا گداگر آئے گا
 سو نہ دو اک دوسرے کو اپنے چروں کے نقوش
 بے کسی کا دور چل نکلا ہے گھر گھر آئے گا
 ❀ اسلم احمد..... سکھر
 دل میں ہیں سوطر کے ڈر دیکھیے ہوتا ہے کیا
 لے کے واں مجھ کو مری تقدیر پھر پہنچی تو ہے
 ❀ ممنون حسین..... چنیوٹ
 شبِ فرقت میں جی لگتا نہ تھا اپنا کہانی میں
 بڑے چپکے سر بستر سنا کرتے تو ہم بھی تھے

✽ شاہد علی..... فیصل آباد

گلی سے یار کی جائیں کہاں ہم اے واعظ
کہے ہے تو جسے غلہ بریں یہی تو ہے

✽ خیام خان..... پشاور

جی گئے کیونکر مرا تجھ بن کہ نظروں میں مری
گھر ہے دیانہ سا بھی اور شہر اک جنگل سا ہے
✽ فیاض احمد..... اوکاڑہ

جہاں سنان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
بھی کیا کیا تھے بگائے یہاں اور شور شراباں تھے

✽ شیر اکاشان..... کراچی

لبو میں شوق کا اک رقص تھا جو جاری تھا
پر ان کے سامنے لب بستہ ہم رہے یونہی

✽ ناہید یوسف..... اسلام آباد

کیسے سنبھال رکھی ہے تو نے یہ کائنات
ہم سے تو ایک دل بھی سنبھالا نہ جا سکا
✽ صباحر..... کراچی

سر اٹھاتی ہے خواہش تغیر
جب بھی گرتے مکاں کو دیکھتا ہوں
✽ اسد خان..... ہاشمرہ

تا امید ہے دیدنی اس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو

✽ مہتاب احمد..... حیدر آباد

اک دہرے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم
اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں
✽ امتیاز احمد..... بھالیہ

نکالا تو نے ہم کو تو گئے ہم تیرے کوچے سے
دگر نہ جیتے جی کب جاتے مرجاتے تو ہم جاتے
✽ محمد راجیل..... وہاڑی

تری اس بے وفائی پر فدا ہوتی ہے جان اپنی
خدا جانے اگر تجھ میں وفا ہوتی تو کیا ہوتا

✽ خالد خان..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

دوست اچھے ہو تو پورے دوستی کے ہو رہو
یا کسی کو کر رکھو تم یا کسی کے ہو رہو

✽ شاہدہ جنید..... کراچی

کسی کو دے کے دل کوئی نواخ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
✽ فرحانہ عاصم..... سکھر

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے ہم دوست جس کے اس کا دشمن آساں کیوں ہو

✽ جنید ملک..... کراچی

از مہر تاپہ ذرہ دل د دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
✽ اسد علی..... ملتان

صد جلوہ روبرو ہے جو مڑگاں اٹھائے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائے
✽ ذاکر خان..... لاڑکانہ

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ جہراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی
✽ اولیس احمد..... حیدر آباد

ہے بزم بیتاں میں سخن آزرده لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

✽ ایشا طارق..... ڈیرہ اسماعیل خان

غم دینا سے گر پائی بھی فرصت سراٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
✽ وجاہت علی..... بمکر

چلو کہ کوچہ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخل دار پہ کب سے شمر نہیں آیا!
✽ تانیہ خورشید..... منڈی بہاؤ الدین

دلوں میں اور ستاروں میں اچانک جاگ اٹھتی ہے
عجب ہلچل، عجب جھل مل چراغ شام سے پہلے

مُحَفَّل شِعْر و سِخَر

کوین
برائے
شمارہ
جنوری
2018

نام :

پتا :

کر دو۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”جلدی کرو۔ ورنہ میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔“
اس نے کانپتے ہوئے دراز کھولی۔ ہر روز صبح وہ بینک سے چھوٹے نوٹ اور سکے لے کر آتی تھی تاکہ نقد خریداری کرنے والوں کو بقیہ رقم واپس کر سکے۔ ویسے تو آج کل زیادہ تر لوگ کریڈٹ کارڈ ہی استعمال کرتے تھے۔ اس وقت دراز میں صرف دو سو سات ڈالر ہی تھے۔

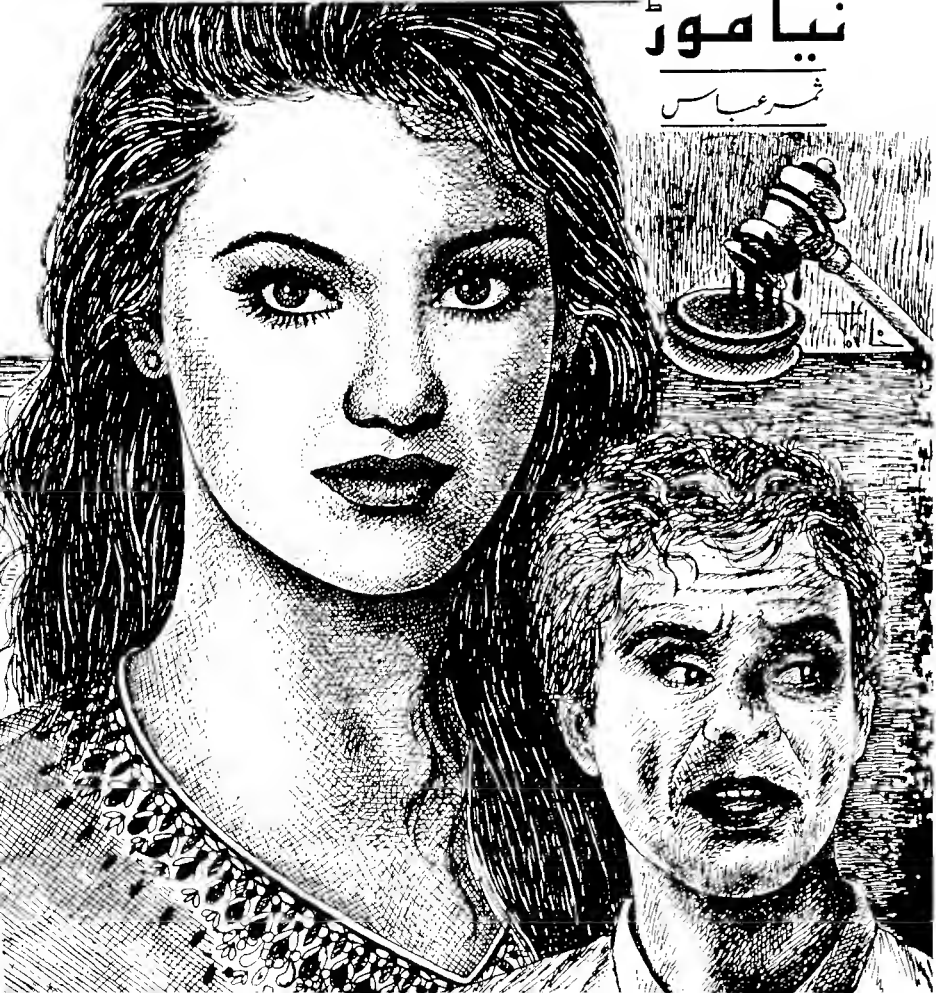
دکان کی مالکن نے کاؤنٹر سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی۔ دو افراد سیاح کوٹ پہنے اور چہرے پر ماسک لگائے اسٹور میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر بڑے بڑے بیگ لٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے تھیلوں سے شاٹ گنیں نکالیں اور ان کا رخ اس کی طرف کر دیا۔
”کیش رجسٹر کھولو اور ساری رقم میرے حوالے

تیزی سے گزرتے حالات کی ڈوری تھامے ایک حید کی ذہانت

جس طرح بعض اوقات بغیر منزل کے سفر کرنا ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح بغیر اختتام کے کسی موڑ پر کہاں نہ کھو روک دینا لازم ہوتا ہے کیونکہ... نئے موڑ کے بغیر اس کا مکمل ہونا ممکن نہیں ہوتا... اس کی زندگی میں بھی ایک ایسا ہی موڑ آنے والا تھا جس کے بارے میں خود اسے بھی ادراک نہیں تھا۔

نیا موڑ

شرعباس



”بس؟“ پہلے نقاب پوش نے کہا۔

وہ بری طرح خوفزدہ تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہا۔ ”پلیز مجھے گولی مت مارو، میرے پاس بس یہی رقم ہے۔“

”کچھ لمبوسات لے لیتے ہیں۔“ پہلے نقاب پوش نے اپنے ساتھی سے کہا۔

دوسرا نقاب پوش کپڑوں کی الماری پر گیا اور اس نے الٹ پلٹ کر دولباس نکالے ان میں سے ایک بغیر آستینوں والا سیاہ اور دوسرا اسلک کا تھا۔ دوسرے نقاب پوش نے وہ دونوں لباس اپنے بیگ میں رکھ لیے۔

پہلے نقاب پوش نے اگلے ہاتھ سے بالکن کے بال پکڑے اور اسے اسٹور کے عقبی حصے میں دھکے دیتا ہوا لے گیا جہاں ڈریسنگ روم تھا۔ دوسرا نقاب پوش بھی اس کے ہمراہ تھا۔

”فرش پر بیٹھ جاؤ۔“ پہلے نقاب پوش نے حکم دیا اور وہ بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے ہمارے بارے میں پولیس کو بتایا تو ہم تمہارا کیا حشر کریں گے۔“

پہلے نقاب پوش نے کہا۔

انہوں نے اپنی گتوں کا رخ ڈریسنگ روم کی عقبی دیوار کی جانب کیا اور ہر ایک نے دو فائر کر کے دیوار میں سوراخ کر دیے۔

”تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔“ پہلے نقاب پوش نے کہا۔ ”یہاں بیٹھی رہو اور دس منٹ تک حرکت نہ کرنا ورنہ ہم واپس آ کر تمہارے سر میں سوراخ کر دیں گے۔“

وہ خوف سے اپنی جگہ پر بیٹھی کانپتی رہی۔ دس منٹ بعد وہ اٹھی۔ اسٹور کو تالا لگا یا اور کھر جا کر لیٹ گئی۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ گیا ہے۔ ایک ہفتے بعد وہ اس قابل ہو سکی کہ وہ بارہ دکان کھول سکے۔ اس نے ڈریسنگ روم کی عقبی دیوار میں سوراخ والی جگہ پر سیاہ ویلیوٹ کا پردہ لٹکا دیا اور دوبارہ لمبوسات فروخت کرنے لگی۔ اس نے اس واقعے کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔ اسے یقین تھا کہ ایسی صورت میں وہ نقاب پوش اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے اس کے سر میں سوراخ کر دیں گے۔ جب گاؤں نے پوچھا کہ وہ ایک ہفتہ کہاں رہی تو اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ چھٹیوں پر تھی۔ البتہ کھڑکی میں اطلاعی بورڈ لگا نا بھول گئی۔

☆☆☆

میرا اندازہ ہے کہ اس عورت کی عمر پچیس کے لگ

بھگ ہوگی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اس نے اپنی براؤن آنکھوں میں گہرا آنی لاسٹر لگایا ہوا تھا۔ کوکے مجھے ان باتوں کا تجربہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی مصنوعی پلکیں ضرورت سے زیادہ لمبی تھیں۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کو مضبوطی سے باندھ رکھا تھا لیکن میرے خیال میں یہ اسٹائل کافی عرصہ پہلے متروک ہو چکا تھا۔ بہر حال میں کوئی بھیڑ ڈریس نہیں ہوں جو اس بارے میں کوئی حقیقی رائے دے سکوں۔ وہ دہلی پٹی لیکن جسمانی لحاظ سے پُرکشش تھی پھر اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو یوں لگا جیسے کسی ٹوک کا پچھلا باپ سڑک پر رگڑ کھا رہا ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی خوب صورت عورت کی آواز ایسی خوفناک ہو سکتی ہے۔

”مسٹر وان! تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں؟“ اس نے کہا۔ ”میں اپنے سابق منگیتر کو امریکا کی بدترین جیل میں بھیجا چاہتی ہوں۔“

ہم عمارت کے استقبالیہ حصے میں کھڑے ہوئے تھے جس میں اپنے دفتر کے لیے میں نے ایک مین کرائے پر لے رکھا تھا۔ میں اسی وقت ایک پرانے دوست کے ساتھ لچ کر کے واپس آ رہا تھا جس کے اخبار میں کئی برسوں تک لکھتا رہا پھر ایڈیٹر سے رخ کھائی ہو گئی اور میں نے گھونسا مار کر اس کی تانک توڑ دی۔ اس طرح میرے صحافیانہ کیریئر کا خاتمہ ہو گیا پھر میں نے نیا کام شروع کیا جسے خود ہی حساس معلوماتی ریسرچ کا نام دے ڈالا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ غیر لائسنس یافتہ پرائیویٹ سراغ رساں کی دوسری شکل تھی۔

”اسے کانفرنس روم میں لے جاؤ۔“ ہماری استقبالیہ کلرک کرسٹینا نے حکم دیا۔

”میں اپنے بوائے فرینڈ سے بہت بے زار ہوں۔ اب اس کے منگیتر کی کہانی دوبارہ نہیں سننا چاہتی۔ تم تین بچے تک کانفرنس روم میں بیٹھ سکتے ہو۔“

”اس کا بھی کوئی بوائے فرینڈ ہے؟“ میں نے جانا چاہا۔

”اسی سے پوچھو۔“ کرسٹینا بولی۔ اس نے میری مہمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ پہلے ہی مجھے پوری کہانی تین مرتبہ سنا چکی ہے۔“ ضروری نہیں کہ کرسٹینا ہر گاہک سے اچھا برتاؤ کرے۔ ویسے بھی میں اس کمپن کا صرف چار سو پچھتر ڈالر کرایہ ادا کرتا ہوں جو نیویارک جیسے شہر کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں اور کرسٹینا جیسی بد مزاج استقبالیہ کلرک کو برداشت کرنا میری مجبوری ہے۔ چنانچہ میں اپنی مہمان کو لے کر کانفرنس روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ

اشہاروں میں اپنا ہے۔ اس نے یقیناً اچھے پیسے کمائے ہوں گے۔“

”یہ وہ کام کرتا ہے تو مجھے بھی اچھے ملے ہیں لیکن اس کی اتنی کمائی نہیں ہوئی جس کی توقع تم کسی سپر ماڈل سے کر لیتے ہو۔“ بھی سچی وہ ایک دن میں پندرہ سو ڈالر بھی کمالیتا ہے۔“ سندیہ ہے کہ وہ ایک دن میں ہی اس کی سو تصویریں اتار لیتے ہیں جو سارا سال مختلف اشتہاروں میں کام آتی ہیں۔ اس لیے اسے سال کے بقیہ دنوں میں کام نہیں ملتا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت زیادہ پیسے نہیں بنائے بلکہ اس کے پاس کافی وقت ہوتا ہے۔“

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اس نے تجھے میں تمہیں فرما کوٹ، سونے کا بریسلٹ اور ہیرے کی انگلی دی تھی۔ یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟“

”تم بیچ جانا چاہتے ہو؟ میرا خیال ہے کہ اس نے یہ چیزیں چرائی ہیں۔“

”اور تم یہ بات جانتی تھیں؟“

”پہلے میں جانتا نہیں چاہتی تھی لیکن جب اس کے قریب ہوئی تو مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی۔“

”میری مدد کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے جو کچھ بتایا ہے میں اسے دہراتا ہوں۔ تم اس سے محبت کرتی تھیں۔“

”ہاں۔“ یقیناً اب بھی کرتی ہوں اس کے باوجود کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں ہر روز صبح اٹھ کر اس کے بارے میں سوچتی ہوں جو مجھ سے دور چلا گیا۔ بعض اوقات میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر پاتی ہوں اور کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہتھوڑے سے اس کا چہرہ چل دوں۔“

”یقیناً تم اس میں کشش محسوس کرتی... بہرگی۔“

”وہ انتہائی پرکشش ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا شاندار شخص نہیں دیکھا۔“

”یہ بات تم پہلے بھی بتا چکی ہو۔ تم اس کے پیار میں اتنا ڈوب گئیں کہ اس کی ہر بات ماننے لگیں اور اس کے ساتھ مل کر ڈریس شاپ میں مسلح و کیتی بھی کی؟“

”وہ مجھ سے سب کچھ کر داسکتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی انوکھے کام کرنا چاہیے۔ ہم ہیش ایسے ہی پاگلوں والے کام کیا کرتے تھے ایک دفعہ ہم تین ٹین میں ایک اونچی عمارت کے پاس سے گزر رہے تھے کہ چوکیدار کی نظر بچا کر لفٹ کے ذریعے سب سے اونچی منزل پر چلے گئے اور چھت پر رقص کرنے لگے۔ بعض اوقات مجھے ڈر بھی لگتا لیکن ہی چاہتا تھا کہ میں یہ کام کروں۔ لہذا میں اس کے ساتھ مل کر یہ سب کرتی۔ جیسا

”میں نہیں جانتی کہ تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں یا نہیں۔“ اس نے کہا۔

”پھر یہاں کیوں آئی ہو اگر میں اس طرح کا ہوں سے بات کرنے بیٹھ جاؤں تو زیادہ دیر اس کارہ بار میں نہیں رہ سکتا۔“

وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”دراصل میں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ ہم نے مل کر ایک اسٹور میں وکیتی کی تھی۔“

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کہاں بروکلین میں؟

جہاں تم رہتی ہو۔ میر پرن پارک کے علاقے میں؟“

”بروکلین میں نہیں۔ وہ اسٹور مین ٹین میں ہے۔ ہم اس بجے کے قریب اس ڈریس شاپ میں داخل ہوئے۔

ہمارے ہاتھوں میں شاٹ نکلیں تھیں۔ دکان اسی وقت کھلی تھی اور مالک کے علاوہ وہاں کوئی اور نہ تھا۔ اگر دو کا علاقہ بھی سناں تھا۔ دراصل وہاں سفید پوش رہتے ہیں۔ مرد اپنے کام پر جا چکے تھے اور خواتین گھر کے کاموں میں مصروف تھیں۔ ہم نے وہاں سے تقریباً دو سو ڈالر زور دو

قیمتی بلوساٹ اٹھا لیے۔“

”تم دونوں گرفتار نہیں ہوئے؟“

”ہم نے اسٹور کے عقب میں واقع ڈریسنگ روم میں فائر کیے اور ٹی نے اس عورت کو تنبیہ کی کہ وہ پولیس کو اطلاع نہ کرے۔“

”مٹی تمہارا ابو اے فرینڈ ہے؟“

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مٹی نے اس عورت کو خبردار کیا کہ اگر اس نے پولیس کو اطلاع دی تو ہم واپس آ کر اس کی تھوپڑی میں سوراخ کر دیں گے۔“

”اور اس نے تمہارے جانے کے بعد بھی پولیس کو فون نہیں کیا؟“

”میرا نہیں خیال کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ میں نے باقاعدگی سے ٹی وی کی خبریں دیکھیں اور دو دن تک اخبارات بھی خریدتی رہی لیکن نہیں بھی اس وکیتی کا ذکر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی۔“

”میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سنا۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”لیکن وہ ایک کامیاب ماڈل ہے پھر اسے ڈریس شاپ میں ڈاکا ڈالنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔“

میرا مطلب ہے کہ اس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی تو اس نے تمہیں فرما کوٹ اور سونے کا بریسلٹ تجھے میں دیا۔“

”تم وہ انگلی دیکھتے جو اس نے منگنی کے موقع پر میری انگلی میں پہنائی تھی۔ وہ انتہائی اعلیٰ درجے کی تھی۔“

”یہی میں بھی کہہ رہا ہوں۔ وہ بڑے بڑے

کہ میں نے بتایا کہ اس سے محبت کرتی تھی اور جب تک اس کے ساتھ رہی، میں نے اپنے آپ کو محفوظ سمجھا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا سوائے اس کے کہ وہ اس کے پیار میں اپنی پاگل ہو گئی تھی کہ جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے ہمراہ جہت کے کنارے ناجی رہی یا اس کے ہمراہ اسٹور میں ڈسکتی کرنے چلی گئی۔

”اب تمہیں کس بات کا غصہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے مجھ سے شادی کرنے کے لیے کہا تھا۔“

”اور اس پر تم ناراض ہو گئیں؟“

اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے دماغ کا کوئی اسکرڈ میل ہو۔ ”کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ اس وقت میں اپنے آپ کو میرین پارک کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے ایک بیبرے کی انگوٹھی دی۔ اس کی قیمت ایک لاکھ ڈالرز تھی لیکن وہ اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں خرید سکتا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ بھی اس کے پاس ایک لاکھ ڈالرز جمع ہوئے ہوں گے ورنہ وہ ایک تہ خانے میں کرائے پر نہ رہا ہوتا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ اس نے وہ انگوٹھی چرا لی تھی؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”ظاہر ہے تم خود اس کے ساتھ ایک ڈسکتی میں شریک رہی ہو۔ اس لیے تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟ پھر تم اس پر کیوں ناراض ہو رہی ہو؟“

”میں بتاتی ہوں۔ منگنی کے بعد شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی اور ہم نے شادی کے کارڈ بھی تقسیم کر دیے۔ ہمارا جون میں شادی کرنے کا ارادہ تھا اور چرچے سے اس کا اعلان بھی ہو گیا۔ اس طرح سب لوگ اس شادی کے بارے میں جان گئے۔ اس کے بعد تحائف آنا شروع ہو گئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کیا ہوگی؟“

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں۔

”میں نے انٹرنیٹ پر دیکھا تھا۔ نوڈ پر دیسیر پانچ سو ڈالرز، ڈیکورم کلینر ساڑھے چار سو ڈالرز اور دوسری کئی چیزوں کے علاوہ کچھ لوگوں نے نقد رقم بھی دی۔ جب میں نے حساب لگایا تو ان کی مالیت تقریباً پچیس ہزار ڈالرز بنتی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی اور تحائف اس کے علاوہ تھے۔ جو سب چوری ہو گئے۔“

”انہیں کس نے چرا لیا؟“

”ٹھی۔“ وہ بولی۔ ”یہ حرکت ٹھی کی ہے۔ میں ایک دن کام سے واپس آ کر اس سے ملنے گئی۔ اس کے اپارٹمنٹ کا

دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ خود اپنے سامان سمیت غائب تھا۔ کپڑے، جوتے، ٹوٹھ برش، شیو کا سامان یہاں تک منگھا بھی ساتھ لے گیا۔ تمام تحفے بھی غائب تھے۔ میں نے ایک رات پہلے اپنی انگوٹھی اتار کر بیڈ کی سائڈ پر رکھی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس انگوٹھی کا انشورنس کرانا چاہتا ہے۔ لہذا ایجنٹ کو دکھانا ہوگی۔ وہ انگوٹھی غائب ہے۔ البتہ وہاں سے یہ خط ضرور ملا۔ تم بھی پڑھ لو۔“

اس خط میں لکھا تھا۔ ”لینا! مجھے افسوس ہے کہ ہماری شادی کامیاب نہیں ہوگی۔ میری خواہش ہے کہ تم ایک اچھی زندگی گزارو۔ میں تمہیں ان سب چیزوں کی قیمت ادا کر دوں گا۔ ٹھی۔“

”وہ مجھے کیا واپس کرے گا۔“ لینا اونچی آواز میں بولی۔ ”میں اسے واپس کرنا چاہتی ہوں۔ پادری نے چرچ میں اس منگنی کا اعلان کیا تھا۔ سب لوگوں کی موجودگی میں..... خدا کے سامنے۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جس سے اس کا میک اپ خراب ہو رہا تھا۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنے دوستوں کا سامنا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر منگنی ٹوٹ جائے تو تحائف واپس کرنا ہوتے ہیں لیکن میں کیسے وہ تحائف واپس کر سکتی ہوں، وہ تو سب چرا کر لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ میں یہ سب چیزیں واپس کرنے کے لیے پچیس ہزار ڈالرز کہاں سے لاؤں گی۔ اگر میرے پاس وہ انگوٹھی ہی ہوتی تو اسے بیچ کر سب لوگوں کی چیزیں واپس کر دیتی۔ اب میں اپنے کسی دوست کا سامنا نہیں کر سکتی یہاں تک کہ سڑک پر لوگوں کو بھی منہ نہیں دکھا سکتی۔ پورا علاقہ یہ بات جانتا ہے میرے لیے تو یہ زندگی عذاب بن گئی ہے۔“

اگر میں اس چوڑی میز کے دوسری طرف نہ بیٹھا ہوتا تو ضرور اس کے کندھے پر چھکی دیتا یا اسے گلے لگا کر کہتا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس کی شرمندگی اور غصے کو محسوس کر رہا تھا لیکن مجھے اپنا کاروبار بھی دیکھنا تھا۔ لہذا خالص پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔ ”مجھ سے ملنے کیوں آئی ہو؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم اسے تلاش کرو۔“ اس نے کہا۔ ”اور اس سے شادی کے تحائف لے کر مجھے واپس کر دو تاکہ میں انہیں دوستوں اور رشتے داروں کو لوٹاؤں۔ اسی طرح یہ شرمندگی دور ہو سکے گی۔ اس کے بعد وہ یہاں کہیں بھی رہ رہا ہوگا میں وہاں جا کر اس کے چہرے پر ہنسنے سے پرہیز کر دوں گی۔ اسے تو حیل میں ہونا چاہیے۔“

”کیا تم نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی ہے؟“

میں نے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”پولیس والے نکلے ہیں۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ میں پہلے ہی ان کے پاس جا چکی ہوں۔ وہاں ایک احقانہ قانون کے بارے میں معلوم ہوا کہ شادی اور منگنی کے تحائف فریقین کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی دوسرے فریق کو بتائے بغیر اپنے مصرف میں لاسکتا ہے یا فروخت کر سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی ایک فریق تمام تحائف اپنے پاس رکھے تو یہ خلاف قانون نہیں ہے۔ اس لیے میں اس کا چہرہ ہتھوڑے سے پکچا چاہتی ہوں۔“

مجھے اس کی حالت پر آنسو ہونے لگا اور سوچنے لگا کہ اس سے اخراجات کے نام پر کچھ رقم اینٹھ لوں یا اسے بچ بتادوں۔ میں نے اسے دھوکے میں رکھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں اپنی چیزیں یا پیسے ملنے کا کوئی امکان ہے۔“

اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے شدید صدمہ ہوا ہو یا مایوسی ہوئی ہو۔
”کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟ تمہیں صرف وہ تحفے تلاش کرنا ہیں اور.....!“

”دیکھو۔ میں بھی پولیس والوں کی طرح ہی نہیں تلاش کرتا اگر یہ چوری ہونے والے دہساکے بجائے کسی اور نے کی ہوئی۔ میں نیویارک میں تمام کمپازوں، پرانے سامان کی خرید و فروخت کرنے والوں، لانگ آئی لینڈ اور نیو جرسی کی خاک چھانتا۔ تمام مختلف ویب سائٹ دیکھتا ایک دوسری ویب سائٹ پر اس کشیدہ سامان کی فہرست بنا کر ڈال دیتا۔ نائن الیون کو فون کرتا اور زیورات کی دکانوں پر جا کر معلوم کرتا کہ حالیہ دنوں میں کسی نے ڈائنمنڈ کی انگوٹھی بیچنے کی کوشش کی ہے۔ میں فقہ اور سسٹھ ایونیو کے درمیان سینا لیسویں اسٹریٹ پر جاتا۔ یہ جگہ ڈائنمنڈ سٹرکٹ کہلاتی ہے۔ وہاں ہر شے چورز ڈائنمنڈ کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ان سے بات کر کے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ میری فیس پندرہ سو ڈالرز فی گھنٹہ ہے۔ سو گھنٹے کے بعد میری تلاش ختم ہو جاتی، چاہے تمہارا سامان ملتا یا نہیں لیکن تمہیں پندرہ ہزار ڈالرز دینا پڑتے۔“

”کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ میں اس سامان خاص طور سے ڈائنمنڈ کی انگوٹھی کی تلاش کے لیے پولیس والوں کی خدمات حاصل کر سکوں؟“
”مجھے نہیں معلوم کہ ڈائنمنڈ کی انگوٹھی مشترکہ ملکیت

تصور کی جاتی ہے یا نہیں لیکن وہ اس کے بارے میں اطلاعاً مشتہر کر سکتے ہیں۔ شاید وہ مل جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ہی اسٹاپ ورپ بھیج دی گئی ہو۔“

”یہ کہاں پر ہے؟“
”نیو یارک کا ایک شہر ہے۔ وہاں ہیرے کے جوہریوں کی لاتعداد دکانیں ہیں۔ جہاں تک نقد رقم کا تعلق ہے تو اسے بھول جاؤ۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خرچ ہو گئی ہوگی۔“
”وہ میرے ساتھ یہ کیسے کر سکتا ہے۔“ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”تم پہلی عورت نہیں ہو جس نے ایک چور ہوائے فرینڈ سے دھوکا کھایا ہو۔“
”یعنی تم میری مدد نہیں کر سکتے؟“

”فرض کرو میں چھ ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد پرانے سامان کی دکانوں جیولری اسٹور اور مختلف ویب سائٹ کی خاک چھان کر کچھ چیزیں تلاش کر لیتا ہوں تب بھی تم یہ کیسے ثابت کرو گی کہ وہ تمہاری چیزیں ہیں۔ کیا تمہارے پاس نوڈ پروسیسر کا سیریل نمبر یا اس کی خریداری کی رسید ہے۔ اسی طرح تمہیں ہر چیز کا ثبوت دینا ہوگا کہ وہ تمہاری ہیں۔ ورنہ یہ چیزیں تمہیں بھی واپس نہیں مل سکیں گی۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بات سمجھ جائیں گے۔“
”ممکن ہے کہ تم قہری کو تلاش کر سکو۔“ لیتا نہ کہا۔ ”اگر تم نے اسے تلاش کر لیا تو کچھ چیزیں بھی مل جائیں گی اور میں اس کو سبق بھی سکھا سکوں گی۔“

”اس میں کچھ مسائل ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں شاید شادی کے تحائف کے مقابلے میں ٹی کو زیادہ آسانی سے تلاش کر سکتا ہوں تب بھی میرا معاوضہ دس سے پندرہ ہزار ڈالرز کے درمیان ہوگا۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ میں اسے کہاں تلاش کرتا ہوں۔ بروکلین، برازیل یا کسی اور جگہ۔ کیا تم اتنی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہو؟“

مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اب وہ بری طرح رو رہی تھی اور اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو قصور وار محسوس کیا۔

”دیکھو دوست۔ میں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا ایک بہت اچھا دوست سراخا ساں ہے۔“
”یہاں میرین پارک میں؟“ اس نے کہا۔
”نہیں۔ وہ مین ٹین کے مشرقی حصے میں ہوتا ہے لیکن

اچھے پورے نیو یارک میں تعلقات ہیں۔ وہ کئی سال مارک پولیس ڈیپارٹمنٹ میں رہ چکا ہے اور بہت سے لوگوں کو جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرے جو مال سرودھ کے خریدار کو جانتا ہو یا اسے اس میں معلومات ہوں۔“

”اس میں کتنا خرچہ آئے گا؟“ اس نے پوچھا۔
”میں تم سے کچھ نہیں لوں گا اور اگر وہ تمہاری مدد کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ مدد کرنا چاہتا ہے۔“
اس نے کندھے اچکا تے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ بات کر کے دیکھ لو۔“

چنانچہ میں نے اپنے پرانے دوست اور سرانخ رساں لی مورسین کو فون کیا اور اسے پورا قصہ سنایا۔ اس نے بڑے لمبے پوری بات سنی بھر بولا۔ ”میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ٹی کے ساری رقم کو کہیں یا جوئے میں اڑا دی جائے گی اس کی زندگی میں کوئی نئی عورت آگئی ہے اور وہ اس پر لڑچ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کون جانتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔ وہ میکسیکو یا موناکو میں ہو سکتا ہے۔“

”کیا میں یہ سمجھوں کہ تم ان چیزوں کے واپس ملنے کے امکانات کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں ہو۔۔۔؟“
”بالکل بھی نہیں۔ اس سے کہو کہ وہ گھر جا کر اپنے ختم ہونے اور اگلی بار کوئی اچھا سالز کا تلاش کرے۔“

”دیکھو بل، وہ صرف سامان کے لیے پریشان نہیں ہے بلکہ وہ شرمندگی محسوس کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو لوگوں کا سامنا نہیں کر پاتی۔ شاید تم اسے کچھ بتا سکو۔ اسے کوئی امید دلا سکو۔ کم از کم انگوٹھی ہی مل جائے۔“

”دوسرے لفظوں میں تم چاہتے ہو کہ میں اس سے جھوٹ بولوں۔“ مورسین نے کہا۔

”یہ جھوٹ نہیں ہوگا بلکہ تم اسے بتاؤ گے کہ اس کی چیزیں کسی پرانے سامان کی دکان سے مل سکتی ہیں یا کوئی چوری کا مال خریدنے والا پکڑا جائے۔ اس سے ان چیزوں کی تفصیل معلوم کر لو۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ اس سے کہو کہ مجھے فون کرے۔“

میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے غیر متوقع نتائج برآمد ہوئے۔ تین دن بعد مجھے مورسین کی وائس میل موصول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”رہی مجھے فون کرو۔ تم پر ایک ڈرنک

ادھار ہوگئی۔ ہو سکتا ہے کہ لٹج دینا پڑ جائے۔“
میں نے اسے اسی وقت فون کیا۔ ”یعنی تمہیں وہ شخص مل گیا۔“ میں نے بل سے کہا۔ ”مبارک ہو۔ کہاں سے تلاش کیا؟“

”وہ سینٹل میں ہے۔ ہم نے اسے کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہوئے پکڑا۔ وہاں کی پولیس نے اسے تلاش کر کے گرفتار کر لیا۔ ڈسٹرکٹ انٹاری اس سلسلے میں ضروری کارروائی کر رہا ہے۔“
”یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ یہ سن کر خوش ہو جائے گی۔“

”انتاز یادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔“ مورسین نے کہا۔ ”اسے اصلاحی مرکز میں رہنا ہوگا جب تک وہ ضمانت نہ کروالے یا اس کا مقدمہ شروع نہ ہو جائے۔“
”کیسا مقدمہ؟“

”اسی جرم میں جس کا سامنا ٹی کو ہے۔ مسلح ڈکیتی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ان دونوں نے مل کر یہ جرم کیا تھا۔ وہ لیگزٹیشن ایونیو میں واقع ایک ڈریس شاپ میں گئے دونوں کے پاس شاٹ گنز تھیں۔ انہوں نے اسلحے کے زور پر نقد رقم چھینی۔ دو قیمتی جوڑے اپنے بیگ میں ڈالے اور بالکن کو ہراساں کرنے کے لیے ڈریسنگ روم کی دیوار میں گنز فائر کیے۔“
”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری کلائنٹ نے۔ رضا کارانہ طور پر۔“
”یہ پاگل پن ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تمہیں کیوں بتائے گی؟“

”انتقام میرے دوست انتقام۔“ مورسین نے کہا۔
”وہ میرے پاس آئی اور ان چیزوں کی فہرست گنوانے لگی جو ٹی نے چرائی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کی قیمت بھی بتاتی جا رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس بات کی بہت کم امید ہے کہ ان میں سے کوئی چیز مل سکے کیونکہ یہ رقم دونوں کی مشترکہ ملکیت ہیں اگر ہمیں معلوم ہو جائے تب بھی اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔“

”پھر وہ کیا بولی؟“ میں نے پوچھا۔
”اس نے کہا۔ فرض کرو کہ اس نے کوئی مسلح ڈکیتی کی ہو۔ تب تو تم اسے گرفتار کر سکتے ہو؟“

”ہاں۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے۔“
میں خوفزدہ ہو گیا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔
”تب اس نے کہا کہ وہ جانتی ہے۔ اپنے لیے بھی

مشکلات پیدا کر رہی ہے لیکن اب وہ اپنے سابق مگتیر کو کسی دوسری عورت کی زندگی تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی پھر اس نے پورا قصہ بتایا کہ کس طرح وہ اور نجی شات گنوں سمیت اس اسٹور میں گئے اور ڈبکتی کے علاوہ دیوار میں فائر بھی کیے۔ میں نے پولیس ریکارڈ چیک کیا لیکن کسی نے اس واقعے کی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی پھر میں خود اس اسٹور میں گیا اور وہاں دیوار میں سوراخ دیکھے۔ اسٹور کی مالکن نے ان پر سیاہ پردہ ڈال دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت خوفزدہ تھی۔ اس لیے اس نے ڈبکتی کی رپورٹ درج نہیں کروائی کیونکہ ڈاکوؤں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اس کی کھوپڑی اڑا دیں گے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ لیٹا اس وقت پولیس کی تجویز میں ہے تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔“

مورسین نے مزید بتایا کہ دو دن بعد سینٹرل پولیس نے ٹی کو ایک مالدار مطلقہ عورت کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اس کے لیے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بہت تیزی سے کام کرتا ہے۔ دس روز قبل وہ میرین پارک کے ایک تہ خانے میں رہ رہا تھا اور جب پولیس نے اسے تلاش کیا تو وہ ایک شاندار بیڈ روم میں لیٹا ہوا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا۔ جب وہ اسے مکان سے باہر لائے تو اس کے عیاشی کے دن ختم ہو گئے۔ اس نے ایک قیمتی شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

مورسین نے چند ماہ بعد مجھے مقدمے کی کارروائی سے آگاہ کیا۔ لیٹا اور نجی دونوں نے انتہائی کم انٹیل قصور وار نہ ٹھہرایا جائے۔ نجی کے وکیل نے اعتراض کیا کہ لیٹا جھوٹ بول رہی ہے۔ دکان کی مالکن دونوں میں سے کسی کو بھی شناخت نہ کر سکی کیونکہ انہوں نے اپنے چہروں پر نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ اس نے پولیس کو اپنے بیان میں کہا کہ وہ ان دونوں کو مرد سمجھ رہی تھی۔

لیٹا نے بھی اپنے بیان میں یہی کہا کہ ٹی نے بھی اسے یہی بتایا تھا کہ یہ واردات اس نے اپنے ایک مرد ساتھی کی مدد سے کی تھی اور اس نے مورسین کے سامنے صرف اس لیے اعتراض کیا کہ وہ اپنے سابق مگتیر سے انتقام لینا چاہ رہی تھی پھر ایک ہی بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جب لیٹا سارا الزام ٹی پر ڈال رہی تھی۔ وہ کمرائے عدالت میں کھڑے ہو کر چلا گیا۔ ”یہ جھوٹی ہے۔“

لیٹا نے نفرت سے اسے دیکھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جج کے سامنے جا کر اس کا ہتھوڑا اٹھالیا۔ اس نے اتنی تیزی سے غیر متوقع طور پر حرکت کی کہ محافظ اسے بروقت نہ روک سکے وہ دوڑتی ہوئی ٹی کے پاس گئی اور اس کے

چہرے پر ہتھوڑے سے دوسرے وار کیا۔ محافظوں نے بلا مشکل سے اسے قابو کیا اور اس سے ہتھوڑا جھین لیا۔ سامنے کے خاتے پر اسے ہتھکڑیاں لگا کر دواپس لے جایا گیا جبکہ اس کو اسپتال جانا پڑ گیا۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور آنکھ کو بھی نقصان پہنچا تھا۔

کمرائے عدالت میں ہونے والے اس ڈرامے کے بعد جیوری نے متفقہ فیصلہ دیا کہ لیٹا اور نجی دونوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے۔ اب ٹی سنگ سنگ اور لیٹا ہل فورڈ کے اصلاحی مرکز میں سزا کے دن پورے کر رہی ہے۔ ”لیکن میں نے تمہیں اس کہانی کا دلچسپ حصہ نہیں بتایا۔“ مورسین نے دوسرا بعد مجھ سے کہا۔

”کیا اب بھی کچھ بتانا باقی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اس نے اپنے سابق محبوب کا کھلی عدالت میں چہرہ بگاڑ دیا جس سے وہ بھی شدید عمت کرتی تھی۔ کیا اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات کوئی ہو سکتی ہے؟“

”تم سنو گے تو خود حیران رہ جاؤ گے۔“ مورسین نے کہا۔ ”میرا ایک سراغ دوست بیز فورڈ ہلز میں تعینات ایک خاتون محافظ سے ڈیننگ کر رہا ہے جہاں لیٹا کو رکھا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ ان دونوں نے آپس میں خط کتابت شروع کر دی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ”میں نے یہی سنا ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ پہل کس نے کی لیکن وہ دونوں پر روز خط لکھ رہے ہیں۔“ ”دفع ہو جاؤ۔“ میں چلا گیا۔ ”باریئر بھی چونک کر ہنسی دیکھنے لگا۔

”اور انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہیرل پر رہا ہونے کے بعد وہ دونوں شادی کر لیں گے۔“

میں بہ مشکل بیئر کا گھونٹ لے سکا۔ ”اور اس طرح یہ کہانی اپنے انجام تک پہنچے گی۔“ مورسین نے کہا۔ ”مکملی بڑے ریڈاک۔“

میرا خیال ہے کہ مورسین غلط کہہ رہا ہے۔ اگر ان کا رویہ بہتر رہا تو شاید دس سال یا اس سے کچھ پہلے وہ دونوں جیل سے باہر آجائیں۔ تب یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچے گی۔

اب میرے ذہن میں ایک ہی سوال ہے کہ کیا وہ دونوں شادی کر لیں گے یا ایک دوسرے کو جان سے مار دیں گے؟ محبت اور نفرت کا یہ امتزاج کیا رنگ لائے گا اس کا فیصلہ وقت آنے پر ہی ہوگا۔





تلاش

بابر نعیم

انسان کے دل میں اگر جستجو کا جذبہ نہ ہوتا تو شاید آج دنیا اس طرح تسخیر نہ ہوتی اور نہ ہی دریافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس پر بھی نہ صرف دنیا بلکہ بالخصوص سمندر دیکھنے کا جنون کچھ اس طرح سوار تھا کہ وسائل نہ ہونے کے باوجود مسائل کے انبار کی جانب محو سفر ہو گیا۔

ایک مضطرب انسان کے عجیب سفر کی مغرور روداد

پریشانی کا باعث بنتا آیا تھا اور آج بھی خدا سے سب کچھ چھوڑ کر سمندر دیکھنے کے لیے گھر سے باہر لے جا رہی تھی۔ صبح پانچ بجے اس نے آہستگی سے اپنا بھاری بیگ کندھے پر اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اس کے والدین ابھی سو رہے تھے اور وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں سات بجے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تب تک یقیناً وہ بہت دور جا چکا ہوگا اور اسے تلاش نہیں کیا جاسکے گا۔ اس کا گھر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع تھا۔ گھر

”مجھے آج لازمی سمندر دیکھنا ہے اور میں سمندر دیکھے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔“ اس نے اپنے آپ سے گویا عہد کیا اور صبح سویرے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کئی دنوں سے اس مہم کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری اور وہ تمام ضروری چیزیں اپنے بیگ میں ڈال لیں جن کی اسے اس طویل سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس سے پہلے اس نے بھی سمندر نہ دیکھا تھا۔ اس کی طبیعت کا ضدی پن، اس کے والدین کے لیے ہمیشہ

سے باہر نکل کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سمندر کس سمت میں ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی کتاب میں پڑھا تھا کہ سورج سمندر میں غروب ہوتا ہے، اس لیے اس نے مغرب کی سمت میں چلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی بہتر تھا کہ سورج طلوع ہونے کے بعد، سورج کی طرف اس کی پشت رہتی اور وہ سورج کی براہ راست تمازت سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ لڑکے نے فیصلہ کرنے کے انداز میں ایک گہرا سانس لیا اور مغرب کی سمت میں تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔

اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک نوجوان کا ساعزم صاف جھلکتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں سمندر کی صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ ان تصویروں کے مطابق، سمندر نیلے پانی کا ایسا بڑا ذخیرہ تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے شفاف پانی میں وہیل اور شارک جیسی دو بیکل مچھلیاں گھومتی تھیں۔ بس نے سمندر میں تیرتے آکٹوپس اور رنگ برنگی ننھی مچھلیوں کے غول کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ اس نے سمندر کی تہ میں موجود مومنکے اور مرجان کی خوبصورت چٹانوں اور سمندر کے اوپر اڑتے سفید رنگ کے خوبصورت پرندوں کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ ان تصویروں میں اس نے سمندر میں تیرتے ایسے بڑے بڑے بحری جہاز بھی دیکھے تھے جن پر ہزاروں افراد سوار ہوتے تھے۔ وہ سوچتا تھا کہ حدنگاہ تک پھیلا ہوا پانی ہی پانی، آنکھیلیاں کرتی موجیں اور ساحل پر بکھری ہوئی خوبصورت سیپاں، کیسا خوبصورت منظر پیش کرتی ہوں گی۔ وہ اکثر خواب دیکھتا تھا کہ وہ سمندر کے ساحل پر کھڑا ہے اور سمندر کی موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کر رہی ہیں۔ وہ اکثر یہی سوچتا تھا کہ ساحل پر کھڑے ہو کر حدنگاہ تک پہلے ہوئے سمندر کو دیکھنا کیسا دلکش احساس پیدا کرتا ہوگا۔ اس کاغذا داغ اتنے زیادہ پانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے داغ میں نیلے وسیع سمندر کا یہ تصور لیے، وہ ایک پختہ عزم کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جب وہ قصبے کی حدود سے باہر نکلا تو اس وقت صبح کا ہلکا جالا پھیل چکا تھا لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے باہر اس نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ یہ بوڑھا آدمی ہمیشہ سڑک کے کنارے پھرتا تھا اور ہر وقت آسمان کو تکتا رہتا تھا۔ اس بوڑھے آدمی کو دیکھتے ہی لڑکے کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ شاید یہ جھمکے روکنے کی کوشش کرے۔ لڑکے نے دل میں سوچا اور اپنے قدموں کی رفتار کچھ تیز کر لی لیکن اس وقت بوڑھے نے بھی اسے دیکھ لیا۔

”اے لڑکے! اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟“ بوڑھے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”سمندر دیکھنے۔“ لڑکے نے خشک لہجے میں جواب دیا لیکن اس دوران اس نے اپنی رفتار میں کمی نہ کی تھی۔

”سمندر؟“ بوڑھے آدمی نے اپنا پو پلا منہ کھولا اور ہنس پڑا۔ ”اچھا خیال ہے۔“ بوڑھے نے تیزی سے آگے بڑھ کر لڑکے کا بازو پکڑا اور اسے روک لیا۔ ”تم سمندر دیکھنے جا رہے ہو۔ ٹھیک ہے، لیکن اس کے لیے تمہیں پہلے اوپر جانا ہوگا۔“ بوڑھے آدمی نے اپنی کپکپاتی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سمندر وہاں ہے، تمہارے سر کے عین اوپر۔“

لڑکے نے اوپر دیکھا۔ صاف آسمان پر اس وقت ستارے غائب ہو چکے تھے اور سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ لڑکے نے بوڑھے آدمی کی بے معنی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور دوڑ لگا دی۔ ”اس بوڑھے کا داغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔ سمندر آسمان پر کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بوڑھا آدمی آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ”یہ واقعی سنبھلا گیا ہے۔“ لڑکے نے سوچا۔

تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا اور زبان خشک ہو رہی تھی۔ اس نے رک رک کر بیگ میں سے پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پی لیا۔ اسے بھوک بچی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنا کھانا بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ نہ جانے سمندر کتنی دور ہو۔ مجھے اپنی غذا احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا ہوگی۔ لڑکے نے سوچا۔

جلدی وہ ایک چھوٹی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کسی ننھی سمت میں سمندر کی موجودگی کی کوئی علامت نظر نہ آ رہی تھی۔ اب سورج خاصا بلند ہو چکا تھا اور لڑکے کو شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پشت پر دلدا بیگ اتارا اور تھوڑا سا کھانا کھا لیا۔ پہاڑی سے اترنے کے بعد، اس کے سامنے ایک وسیع چمیل میدان تھا اور اس کے دوسری طرف پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جب وہ وسیع چمیل میدان عبور کر کے ان پہاڑیوں کے قریب پہنچا تو اس وقت سورج ڈھلنے لگا تھا۔ اب سورج اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ یہاں پہاڑیوں کے پیچھے سمندر ہوگا جس میں یہ سبز غراب ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ اس خیال سے اس

ہو رہی تھی کیونکہ اس کے خلائی لباس میں موجود آکسیجن کا 200 گھنٹے کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب لڑکے کی سانس رکی تو اس وقت اس کے ہونوں پر ایک مسکراہٹ تھی اور اس کی نگاہ آسمان پر تھی۔ سرخ کے تاروں بھرے آسمان پر اسے ایک نیلے رنگ کا روشن ستارہ نظر آ رہا تھا۔ پر زمین تھی جہاں سمندر موجود تھا لیکن وہ لڑکا کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ سرخ سے بھی کوئی انسان زمین پر واپس نہ گیا تھا۔

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاہدہ دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نمبر عباس 0301-2454188

جاسوس دانجسٹ پبلیشز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، مرکز شہر

63-C نیٹ 63 سٹیشن پبلیشز بلاک اتھارٹی، منٹو، لاہور

مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

کے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی اور اس نے تیزی سے یہ پہاڑی سلسلہ عبور کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ آخری پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہونٹ سکڑ گئے کہ سامنے ایک اور وسیع و عریض چٹیل میدان موجود تھا۔ غروب ہوتے سورج کی سرخ روشنی میں اسے اس چٹیل میدان کے دوسرے کنارے پر پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ حیران تھا کہ اسنے طویل سفر کے دوران، اس کے راستے میں نہ کوئی قصبہ آیا تھا اور نہ ہی اسے کوئی آدمی نظر آیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے کوئی جانور بھی نظر نہ آیا تھا۔ اس کی خوراک کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سمندر اتنی دور کیوں ہے؟ وہ چلتا رہا اور مسلسل چلتا رہا۔ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ راستے میں کتنی بار سویا تھا۔ سوتے جاتے اس کے منہ ذہن میں صرف سمندر کو دیکھنے کی خواہش تھی اور اسے کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسے ایک بار بھی اپنے ماں باپ کا خیال نہ آیا تھا جو اس کے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ٹکان کی وجہ سے جب بھی اسے نیند آتی، وہ خواب میں سمندر میں تیرتی مچھلیاں دیکھتا، خود کو سمندر کی لہروں سے کھیلتا دیکھتا اور سمندر کے نیلگوں پانی میں خود کو تیرتا محسوس کرتا۔ اسے اپنے ارد گرد رنگ برنگی مچھلیاں گھومتی نظر آتیں جو اس کے ساتھ اٹھیلیاں کرتیں۔

پورے سفر کے دوران وہ یہی سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار سمندر کو دیکھے گا تو اس وقت اس کی دلی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ سوچتا کہ اس وقت سمندر کی حالت کیا ہوگی؟ کیا اس کی لہریں پھری ہوئی ہوں گی یا سمندر کا پانی خاموش کھڑا ہو گا؟ کیا ساحل پر اسے اپنے جیسے کچھ اور لوگ بھی ملیں گے جو سمندر کو تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے ہوں گے اور سمندر کی خوبصورتی کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔؟

اس کی ٹانگوں میں جلنے کی سکت ختم ہو رہی تھی لیکن وہ دانت بچھتے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس کا پانی اور خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان کا تھیلہ راستے میں ہی پھینک دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے کانڈھوں کا بوجھ کچھ کم ہو گیا تھا اور وہ مزید کچھ دیر چلنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن جلد ہی اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ لڑکھڑاکر گر پڑا۔

یہ آدمی رات کا وقت تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر دو چاند چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وسیع و عریض چٹیل میدان کی سرخ نمی حدنگہ تک پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اب اسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس

وقت بادشاہ اور کائنات کی پرشہ اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی

قسط نمبر: 9

وقت

Pakistanipoint

حسام

Waqar

Freeom

میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دلربا طویل داستان

میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی دل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کہیں دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کاٹتا ہے اور کہیں موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کہیں مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کہیں سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کہیں محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کہیں درد کی صورت آنسو بن کر دہلیز میں گھانا ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوتل پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔





اس کا نام اسد علی رکھا جائے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں ہمہ تنیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان نیکس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو دبیل چپٹر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی رابرٹ ایڈمز ایلن سے بیٹھ کر ہوا بھی گئی۔ دقت رخصت و رٹ اپنی اکلوتی بیٹی یعنی علی کو اپنے ساتھ لے لی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ رکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتا کر جاتا تھا جو اسے اکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن مرد بنی اکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر بدباغضی نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا..... "میرے بچے! انتظار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔" یہ دعویٰ علی کے تجسس کو بوا دیتی تھی لہذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے نیکس کے علاقے انتھارپن میں واقع "سرکل اے" نامی ایک انسور پر جو وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نئے نئے بچکے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکینکس لڑکے ڈھکی کی نیت سے "سرکل اے" میں محس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ جو موٹر سائیکل پر تھکا کر کھڑے ہوئے۔ پولیس نے ٹھیک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں اس دونوں میکینکس ڈکیت کو بھی نیکس (امریکی رٹ) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج ایک جینکس (نیکس) میں تھا۔ جب علی سلطان کی رہائش بے پٹی (نیکس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور ایک جینکس کے اسٹورینٹوں میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ "وٹی لاؤنچ" نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دو شیر مارا وہ اپنے کال مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشین منہجیں نے علی کے دردل پر سرسبک دہی تو اس کی زندگی میں بہار اترا آئی۔ ایک رات وہ لائیو لانچ میں جب لیونارڈو نامی ایک میکینکس غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدبھیزی کی کوشش کی تو علی بچ چھ میں کود پڑا۔ اس رماراری کو ایک امیر وکیر اسٹیشن لبرٹی ڈیڈیٹھانے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو کھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئی..... "مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کر تو رہا بل کر لینا۔" اس واقعے کے بعد کو یلیو نارڈو نے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اپنا لیونارڈو کے غنڈوں میں گامبے۔ یہ گامبہ مذہم پھیر موتی ہی۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو گارنٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وٹی لاؤنچ والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھوڑ کر اسے اکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹیبلے انسور سے گروسری خریدنے کی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک ترجی سامی چیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بچ خوں معرکہ ہو مگر چیلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے فیش کے عالم میں رہا مار کر چیلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز چیلو کے قتل کی خبر تک جینکس اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ ایک جینکس میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے اکل سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ بند اسے اسورٹ کار میں ایک جینکس سے یوشن بھیج گیا۔ بھروسہ بند اسے اسورٹ میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیڈیٹھانے سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیڈیٹھانے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر کھنسنے تک باہر کی دنیائے کٹ کر اس کے ساتھ بیٹھنے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر کھنسنوں میں ہر علی علی پر چرجوٹوں کا ایک خادروا ہوتا رہا۔ ڈیڈیٹھانے بہت اونچی بھٹی کی مالک ایک پراسرار لبرٹی تھی۔ اس نے اپنا اثر سونخ استعمال کر کے علی کو چیلو سرورٹس سے اس طرح نکال لیا جیسے کھنسن سے ہال..... علاوہ ازیں ڈیڈیٹھانے نفوس ثبوت کی مدد سے علی کو تپا کر لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیو باکے شہر ہونا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو مصمت فریڈی کے جنہم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیڈیٹھانے علی کو بھیج دیا کہ اگر وہ بہتر کھنسنے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو بچ سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیڈیٹھانے کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسن ہالو والے اس بیٹھنے میں ڈیڈیٹھانے کی سنگت میں گزرنے والے وہ ظلم ہوش پر باہر بھٹنے بڑے دشمن، کھنسن، رومان پر اور اور ناقابل فہم تھے۔ ڈیڈیٹھانے کی شخصیت کسی سمجھے سے کم نہ تھی..... اس پرستار، ڈیڈیٹھانے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات رٹی آنزک بارڈو لا اور ایڈیل بام سے علی کی ملاقات بھی کر وادی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد بیویوں کی ایک بیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی "اسکل اینڈ بوز" سے تعلق رکھتے تھے۔ جولوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو ذہنی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں ٹھیک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیڈیٹھانے کی تماشقی سرکلی ان کی شرائط پر صدارت سے ہوئے "اسکل اینڈ بوز" کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیڈیٹھانے کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور پولیس سے بے پٹی اپنے اکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کر وٹ اس کی راہ دکھ رہی تھی۔ اکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سرسبز راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامریک کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامریک، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انش برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چندہ سے اسے عجب کراچی سے رقم آنے ہوئی تھی جس سے مرزا عامریک نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کی معصیت

میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کوئی انور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامریک مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامریک نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاطلاق یہ کبر ہاتھ کر دہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور یوشن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی نئے پنکھوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ان پورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ورائے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی توجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا کیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بچنے پر رہنے لگا وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا انتقال ہو گیا ہے۔ علی سناٹے میں آ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ساتھ ہوتا۔ انہوں نے انیس سال تک میری نگہداشت کی، مجھے پال پوس کر جوان کیا، اعلیٰ تعلیم دلائی اور جب انیس میری ضرورت تھی تو میں ان سے ہزاروں میل دور تھا۔ افسوس..... صد افسوس کہ میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا.....“

”یہ سب قدرت کے کھیل ہیں علی۔“ وہ میری دل جوئی کرتے ہوئے بولے۔ ”تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ سب کی باریاں لگی ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی باری پر ایک دن ہم سب کو اس دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل۔“ میں نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انسان، قدرت سے لڑ نہیں سکتا۔ مالک کی مرضی کے سامنے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔“

”اللہ تمہیں صبر اور حوصلہ عطا فرمائے۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولے پھر پوچھا۔ ”تم جس مقصد کے لیے پاکستان گئے تھے اسے اس کا کیا ہوا؟“

”میں نے اپنی ماں کو تلاش کر لیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اور اس وقت میں ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا ہوں۔“

”بہت خوشی ہوئی یں کہ تم اپنے شے میں کامیاب ہو گئے ہو۔“ وہ پھر بولے۔ ”قدرت کا کیا عجیب اور نالا کھیل ہے علی! جس ماں نے تمہیں جنم دیا، تم انیس سال تک اس سے ہزاروں کلومیٹر دور رہنے پر مجبور ہو گئے اور جس مہربان شخص نے انیس سال تک تمہیں ماں اور باپ دونوں ہستیوں کا پیار دیا، اس کے آخری وقت میں قدرت نے تمہیں ہزاروں کلومیٹر دور پہنچا دیا۔“

”واقعی..... قدرت کی مصلحتوں کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس مہربان شخص کے ایک ایک احسان کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”علی سلطان نے اپنی زندگی میں تم پر جو احسانات کیے سو کیے تھے لیکن اپنی موت کے بعد اس مہربان شخص نے

بعض حقائق اسے تلخ ہوتے ہیں کہ کانوں سے سن کر اور آنکھوں سے دیکھ کر بھی ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دراصل جب ہماری توقعات کے برعکس کچھ وقوع پذیر ہو جاتا ہے تو ہمارا ذہن فوری طور پر اس سچائی کو قبول نہیں کرتا۔ اگر کچھ اچھا ہوا ہوتا ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں لیکن اگر کچھ بُرا پیش آ جائے تو ہماری یہی حیرانی یکا یک پریشانی میں بدل جاتی ہے۔ دل بیٹھ جاتا ہے اور دماغ میں آنسو ہلکتے ہیں۔

ان لمحات میں میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مرزا عامریک نے انکل سلطان کی موت کی خبر سن کر مجھے دہلا دیا تھا۔ اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ ہر ذی روح کو ایک دن موت کا ڈالندہ چمکتا ہے لیکن میں چونکہ انکل کے حوالے سے اس قسم کی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے ان کی ڈتھ کاسن کر سناٹے میں آ گیا تھا۔ چند لمحات تک میں تنگ سا ہو کر رہ گیا۔ عین ممکن تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے اسی کیفیت کا ہو کر رہ جاتا کہ عامریک کی آواز نے مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا دیا۔

”تم خاموش کیوں ہو علی؟“ ان کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”کیا تم مجھے سن رہے ہو.....؟“

”جی.....“ میں نے خود کو سنبھالنے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”یہ سب..... کب ہوا..... کیسے ہوا.....؟“

”بھٹے کی صبح ساڑھے دس بجے انہیں پارٹ الفک ہوا تھا۔“ بگ صاحب نے بتایا۔ ”ان کی کیئر ٹیکر میڈ اسکی نے انہیں فوراً اسپتال پہنچا دیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے لہذا وہ رخصت ہو گئے..... ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔“

”اوہ مائی گاڈ.....!“ میں نے دکتے دل کے ساتھ کہا۔ ”کاش زندگی کے آخری لمحات میں، میں ان کے

اوروں میں کی گئی لاکھوں ڈالرز کی انویسٹ منٹ
الغرض، اپنی ایک ایک چیز میں جہیں فنٹی پرسنٹ کا وارث
بنا گئے ہیں۔ میں نے ان کے لیگل ایڈوائزر سے ملاقات کی
تھی۔ ویل صاحب نے مجھے علی سلطان کی ول (وصیت)
دکھائی تھی۔ میں نے ان کی وصیت کو بڑی تفصیل سے پڑھا
ہے۔ اس ول کے مطابق، علی سلطان کی تمام منقولہ اور غیر
منقولہ جائداد کے فنٹی پرسنٹ کے تم اور فنٹی پرسنٹ کی فنٹی
وارث ہے۔ جب تم واپس امریکا آؤ گے تو اس وصیت کے
مطابق، ایک لیگل پروسس کے بعد تمہیں اور فنٹی کو تمہارا حق
مل جائے گا.....“ لچانی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری
سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری واپسی کی کب تک امید رکھی جائے؟“
”میں ایک ماہ کے اندر واپس آ رہا ہوں۔“ میں نے
بڑے عزم کے ساتھ کہا۔ ”عید الفطر ان شاء اللہ آپ کے
ساتھ مناؤں گا اور میں اپنی والدہ کو بھی لے کر آ رہا ہوں۔“
”ویری گڈ.....“ وہ سر اٹھنے والے انداز میں بولے
پھر کہا۔ ”ذرا اپنی والدہ سے میری بات کراؤ۔“
میں نے سیل فون ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”بیگ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“
آئندہ پانچ منٹ تک ماں نے مرزا عامر بیگ سے
سیلولر ملاقات کی۔ ان کی گفتگو میں انکل علی سلطان کی موت
پر اظہارِ افسوس اور دیگر باتوں کے علاوہ ماں کے امریکا
جانے کا ذکر بھی شامل تھا۔ جب ماں نے سیل فون مجھے واپس
کیا تو انکل عامر بیگ نے کہا۔
”تمہاری والدہ نے بتایا ہے کہ تم علی سلطان کو
میزبان بنا کر اپنی ماں کو مہمان کی حیثیت سے امریکا لانا
چاہتے تھے؟“

”ہی انکل!۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔
”میری بہن پامالک بھی لیکن انکل علی سلطان کو مالک نے اس
”معوہ لے لیگیل سے پہلے ہی اپنے پاس بلا لیا۔“
”اس نے جیسے بھی قدرت کی کوئی منتقن پوشیدہ
ہو کی۔ وہ کہہ بی بی سے بولے۔“ تم پریشان نہ ہو۔
میرا بہن! وہ کہہ بی بی اپنے ریفرنس سے اپنی والدہ کو بلا لائی
کراہ آئیں ماں! نہ کارشتہ ظاہر نہیں کرنا۔ اگر تم انہیں اپنی
آئی لائی بی بی کی فریڈ شوکر وگے تو بہ آسانی تمہاری والدہ
لوں! اہل ماہ!۔“ سیدھی بات ہے۔ تم اپنے عزیز
والدہ!۔۔۔۔۔ ملنے پاکستان گئے تھے اور وہیں پر تمہاری
اماں!۔۔۔۔۔ ملنی صاحبہ کا امریکا کی سیر کا پروگرام بن گیا۔

تم پر جو احسان کیا ہے، اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ
معتدل انداز میں بولے۔
”میں سمجھا نہیں انکل۔“ میں نے الجھن زدہ لہجہ میں
کہا۔ ”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ آپ کا اشارہ کس
احسان کی طرف ہے؟“
”تم جانتے ہو نا، پچھلے انیس سال سے تمہاری والدہ
ہر ماہ ایک مخصوص رقم مجھے بھیجتی رہی ہیں؟“ انہوں نے سوالیہ
انداز میں کہا۔
میں نے جواب دیا۔ ”جی، مجھے یہ حقیقت معلوم
ہو چکی ہے۔“

”یہ مخصوص رقم میرے ذریعے علی سلطان تک پہنچ
جاتی تھی۔“ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔
”علی سلطان اس رقم کو تمہاری دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت پر
خرچ کرتا تھا۔ اس نے تمہارا اتنا خیال رکھا جتنا سکے ماں
باپ بھی اپنی اولاد کا نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے ایک مشفق
باپ اور ایک مہربان ماں بن کر تمہاری پرورش کی لیکن
تمہاری شناخت کو سچ نہیں ہونے دیا۔ تم اپنے ڈاکیومنٹس کا
جائزہ لو تو ہر پتھر پر ولدیت کے خانے میں تمہیں اپنے اصلی
والدہ حیدر علی کا نام لکھا نظر آئے گا اور تمہاری لائف بٹری
ریکارڈ میں یہ بھی درج ہے کہ تمہاری پیدائش کے فوراً بعد
ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں تمہارے والدہ حیدر علی کا انتقال ہو گیا
تھا۔ اس واقعے کے بعد علی سلطان نے تمہاری پرورش کا ذمہ
اٹھ لیا تھا۔“

”جی۔ یہ ساری باتیں مجھے معلوم ہوئی ہیں۔“ میں
نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ابھی
تھوڑی دیر پہلے آپ نے انکل سلطان کی موت کے بعد
کے کسی احسان کی جو بات کی ہے، ذرا اس کے بارے میں
بتائیں؟“

”علی سلطان نے انیس سال تک تمہارا جو خیال رکھا،
اس کے حوالے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کام کے لیے
تمہاری والدہ اسے ایک معقول معاوضہ دیا کرتی تھیں۔“ وہ
وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”لیکن اپنی موت کے بعد
وہ تمہارے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں
کر سکتے۔ یہ اس مجموعی رقم سے کہیں زیادہ ہے جو پچھلے انیس
سال میں تمہاری والدہ نے ان کے لیے بھیجی تھی۔“

”میں..... سمجھا نہیں.....؟“ میں نے الجھن زدہ
انداز میں کہا۔
”وہ اپنی تمام جائداد، بینک بیلنس، مختلف مالیاتی

انکل بیگ سے حاصل ہونے والی ان معلومات سے آگاہ کیا جن کے مطابق، انکل سلطان نے مجھے اپنی آدھی جائداد کا وارث قرار دیا تھا اور یہ کوئی زبانی کلامی بات نہیں تھی بلکہ ایک دل (وصیت) کے ذریعے انکل نے اپنے تمام مال و جائداد کو مجھ میں اور اپنی بیٹی لفتی میں برابر تقسیم کروایا تھا۔

”واقعی..... یہ تو بڑے دل گروے اور اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔“ ماں نے میری بات کے جواب میں کہا۔ ”علی سلطان نے تمہیں اپنی سگی بیٹی کے برابر سمجھا یعنی تمہیں سگی اولاد کا درجہ دیا۔“

”ماں! میرا انکل سلطان کے ساتھ انیس سال کا ساتھ رہا ہے۔“ میں نے ایک طویل و جھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”انکل نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی سگی اولاد نہیں ہوں اور وہ میرے لیے ایک کیرئیر فکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لفتی ان کی سگی اولاد ہے لیکن اس کے ساتھ انکل کی وہ جذباتی وابستگی دیکھنے میں نہیں آتی جو میرے ساتھ تھی۔ ان کی موت میرے لیے ایک گہرا ذہنی اور قلبی صدمہ ہے۔“

”ایسا ہوتا بھی چاہیے میرے لعل۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”میں تو ان کے لیے مغفرت کی دعا ہی کر سکتی ہوں۔ اللہ ان کی اگلی منازل آسان فرمائے۔“

”آمین.....!“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

ماں نے پوچھا۔ ”اپنی بیٹی لفتی کے ساتھ علی سلطان کا ایسا کیا اختلاف تھا جو وہ اس لڑکی سے دور رہتے تھے؟“

”کوئی اختلاف نہیں تھا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انکل، لفتی سے نہیں بلکہ لفتی، انکل سے دور رہتی تھی۔“

”اس کا کوئی خاص سبب تھا؟“ ماں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”میں سمجھتا ہوں، اس کے دو بنیادی اسباب تھے۔“ میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں ماں کو بتایا۔ ”ایک سبب تو لفتی کی ماں تھی اور دوسرا سبب خود لفتی۔“

”وہ کس طرح؟“ ماں نے سوال کیا۔

”انکل علی سلطان نے امریکی ریاست اوہائیو میں ایک عیسائی عورت رینا میڈالین سے شادی کر لی تھی۔ یہ لوگ ساٹھ ایک سو بیس میں رہتے تھے۔ لفتی وہیں پر پیدا ہوئی تھی۔ انکل نے اس بچی کا نام آندرکنا جاپا لکین ریٹا کی خواہش بھی کیا کہ وہ اپنی بیٹی کا نام لفتی رکھے۔ میاں بیوی میں زیادہ جنتی نہیں تھی لہذا ایک روز دونوں نے اپنی زندگی کے راستے الگ

تم انہیں اپنی ذمہ داری پر امریکا لے جانا چاہتے ہو۔ ویس آل.....“ وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئے پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

”ڈنٹ ویزا کے حصول کے لیے تمہارا ریفرنس ہی کافی ہوگا۔ باقی جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کی جیب میں پیسا ہو اور آپ کو راستہ معلوم ہونا چاہیے، بس پھر کوئی کام رکنا نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی انکل! میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔“

”ان شاء اللہ.....!“ وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

”علی سلطان والے گھر کو لاک کر دیا گیا ہے۔ گھر کیلوا ملازمہ پہلی کو بھئی فارغ کر دیا گیا ہے۔ اگر تم وہاں فون کرو گے تو تمہیں جواب نہیں ملے گا۔ تمہیں جو بھی کام ہو، ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“ میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا۔“

الوداعی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سیلوار رابطہ متوقف ہو گیا۔

میں نے سیل فون کو ایک طرف صوفے پر رکھا اور غمگین نظر سے ماں کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی کافی افسردہ نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”علی سلطان کی موت کا مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اس شخص کے احسانات کو ہم زندگی بھر نہیں اتار سکتے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔“

”آمین.....!“ میں نے تہ دل سے کہا پھر دل گرفتہ لہجے میں اضافہ کیا۔ ”ماں! میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں، یہ انکل کی محنت اور کوشش کا ثمر ہے۔ ان انیس سالوں میں انہوں نے مجھے ماں کی کمی محسوس ہونے دی اور نہ باپ کی محرومی۔ ایسے عظیم لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی میں تو انہوں نے مجھے اپنی سگی اولاد سے بھی بڑھ کر قابل توجہ سمجھا ہی تھا، موت کے بعد تو وہ مجھ پر اتنا بڑا احسان کر گئے ہیں کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”موت کے بعد احسان عظیم.....“ ماں نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ماں کو

ہے لیکن انسان اس وقت اللہ کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے جب دوسرے انسانی سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہ دنیا کی بھیڑ میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ میری زندگی کے تجربے نے مجھے بتایا اور سکھایا ہے کہ بے یار و مددگار اور تنہا انسان اللہ کے بہت زیادہ نزدیک ہوتا ہے..... اتنا قریب کہ اللہ اسے اپنے اندر محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں ایسی کیفیات سے گزری ہوں اس لیے بڑے دُشوک کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں۔“

”مجھے خود بھی مالک کے قرب کے کئی تجربات ہو چکے ہیں۔“ میں نے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”اس لیے میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔“

”علیٰ! بتا ہے، میں نے ابھی ابھی کیا سوچا ہے؟“
”مجھے نہیں معلوم تھا اس لیے کہا۔“ نہیں ماں!.....“
”میں نے تھوڑی دیر پہلے ایک فیصلہ کیا ہے..... ایک حتیٰ فیصلہ۔“ وہ محسوس لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔
”یہ تو بات طے ہو گئی کہ میں تمہارے ساتھ امریکا جا رہی ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے میں اپنا بنگلا، گاڑی، جیولری اور تمام قیمتی اشیاء فروخت کر دوں گی۔“

”گڈ! یہ تو آپ کو کراتا ہی ہوگا کیونکہ یہاں سے جانا ہے تو پھر واپس نہیں آتا۔“ میں نے بد دستوران کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے جو حتیٰ فیصلہ کیا ہے اس کا تعلق اس کے علاوہ کسی اور ضمن سے بھی ہے۔ آپ اتنا پیسا ساتھ لے کر تو امریکا نہیں جائیں گی۔“

”تم نے کسی حد تک میرے منصوبے کو سمجھ لیا ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”امریکا روانہ ہوتے وقت میں اپنے پاس صرف ”شونی“ کے لیے دو تین ہزار ڈالر رکھوں گی۔“

ماں نے بات ادھوری کی تھی لہذا میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”اب یہ بھی بتادیں کہ باقی کے کروڑوں روپے کا آپ کیا کریں گی؟ شونی کی رقم پر تو صرف دو تین لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔“

”میں اپنی تمام رقم سے کراچی میں ایک ٹرسٹ قائم کروں گی اور اس ٹرسٹ کا نام ہوگا..... حیدر علی ٹرسٹ۔“ انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا۔ ”مذکورہ ٹرسٹ فلاحی کام کرے گا جس سے دینی انسانیت کی مدد اور خدمت کی جائے گی۔“

کر لیے۔ اس رساکشی کے نتیجے میں بچی ماں کے حصے میں آئی۔ بعد ازاں ریٹا، بیٹی کو لے کر لاس اینجلس چلی گئی اور انکل بھی ادناہ چھوڑ کر ٹیکساس آگئے اور رہائش کے لیے ”بے سٹی“ کا انتخاب کیا۔ بچی چونکہ ریٹا کے پاس رہی تھی اس لیے وہ بھی بھی آسنہ بن سکی۔ دنیا کے سامنے وہ فحشی کی شناخت کے ساتھ ابھری۔ یہ تو سب ہو گیا ریٹا کا۔ اب میں فحشی کی طرف آتا ہوں.....“ میں نے لچائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
”فحشی نے باپ کے سامنے سے محروم رہ کر ماں کی معیت میں اپنی زندگی کو آگے بڑھایا۔ میں یہ بات مانتا ہوں کہ فحشی کو زندگی کی راہ گزر پر بڑا ٹھٹ ٹانم ملا تھا اور اس نے جان تو زحمت کی تھی۔ اس کا مسلسل نے اسے ایک دن ایک نمایاں مقام دلادیا۔ اس وقت وہ ایک معروف نیوز چینل ”فوکس نیوز“ میں کام کر رہی ہے۔ وہ ایک اہم عہدے پر فائز ہے اور پچیس ہزار ڈالر ہانڈل کرتی ہے۔ اس کی جانب اتنی تھکا دینے والی ہے کہ اسے کسی اور طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ انکل سلطان سے زیادہ راہ و رسم اس لیے بھی نہیں رکھ سکتی کہ ظاہر ہے، ماں نے اس کے ذہن میں باپ کا ٹیکلیو امیج بنا رکھا تھا۔ خیر، اب تو ریٹا اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا اور.....“

”اور کیا؟“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو ماں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔
”انکل بھی دنیا چھوڑ کر چلے گئے.....“ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”اس دنیا کا یہی دستور ہے میرے بچے۔“ ماں نے میری دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ ذرا تصور کرو..... جب تمہارے باپ کوئل کر دیا گیا تھا تو میں نے خود کو کس طرح سنبھالا ہوگا.....؟“
”میں تصور کر سکتا ہوں..... اندازہ لگا سکتا ہوں۔“

میں نے گھسیر انداز میں کہا۔ ”میں آپ کی ہمت، جرأت اور حوصلے کو سلیوٹ کرتا ہوں ماں۔ میں تو اس دکھ کے موقع پر اس وقت اپنی ماں سے چدفٹ کی دوری پر بیٹھا ہوا ہوں اور ادھر گیارہ ہزار سات سو گلو میٹر کے فاصلے پر نیویارک میں موجود مرزا عامریگ بھی میری دل جوئی میں مصروف ہیں اور آپ..... آپ تو تنہا تھیں.....!“

”میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا میرے لعل۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ”اللہ تو ہر وقت انسان کے قریب ہے۔ اسے انسان کی شہرگ سے بھی زیادہ نزدیک بتایا جاتا

نے انہیں یہ خوشخبری سنائی تھی کہ مجھے آپ کی تلاش والے کام میں کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ جواب میں پتا ہے، انہوں نے کیا کہا تھا.....؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ تم بتاؤ.....“ ماں گہری دلچسپی سے مجھ سے رہی تھیں۔

”انہوں نے سمجھ آواز میں کہا تھا.....“ میں نے بتایا۔ ”میں مطمئن ہو گیا میرے بچے! میرا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی بھی خلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سکوں گا۔“

”اوہ.....“ ماں نے ایک پوچھل سانس خارج کی اور کہا۔ ”علی سلطان کی رخصت ہو سکوں گا“ والی بات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جان گئے تھے کہ اب ان کی زندگی کا اختتام ہونے والا ہے۔“

”انکل دے کے مریض تھے۔“ میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ”ایک روڈ ایکسیڈنٹ نے ان کے جسم کے زیریں حصے کو بری طرح مفلوج کر دیا تھا۔ وہ وہیل چیریکرک محدود ہو کر رہ گئے تھے لیکن میں نے بھی انہیں باپوسی کی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ ان کی بات چیت میں بھی موت کا تذکرہ نہیں ہوا لیکن اس رات مجھ سے ہونے والی سیلر گفتگو میں انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کا ذکر کیا اور کہا کہ اب وہ بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سکیں گے۔ گویا وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ہی اب تک زندہ تھے اور ان کا مشن تھا..... مجھے آپ تک یہ حفاظت پہنچانا.....“ میں روہانسا ہو گیا۔ ”ماں! آپ انکل کی موت کے وقت پر تو ذرا غور کریں.....“

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا تو ماں نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔ وہ یک نیک مجھے دیکھتی چلی گئیں۔ انکل سلطان کی موت نے انہیں بھی دل گرفتہ کر دیا تھا۔

”انکل عامریگ نے مجھے بتایا ہے کہ انکل سلطان کی موت بے سنی کے وقت کے مطابق، ہفتہ اٹھائیس جون صبح ساڑھے دس بجے واقع ہوئی تھی۔ یہ وہی لمحات تھے جب کراچی میں ہفتہ اٹھائیس جون کی رات کے ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں گزشتہ رات کی بات کر رہا ہوں جب عظیم کے گھر میں ہماری پہلی ملاقات جاری تھی تو انکل سلطان کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اب آپ ان کے الفاظ کی صداقت کو چیک کریں۔ انہوں نے کہا تھا..... میں مطمئن ہو گیا میرے بچے۔ میرا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی خلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے

”بہت ہی عمدہ اور نیک ارادہ ہے۔“ میں نے سنا ہی نظر سے ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ تو میرے ساتھ چند روز کے بعد امریکا چلی جائیں گی۔ اس ٹرسٹ کے قیام کا کام کون کرے گا اور آگے اسے چلانے کا کون، آپ نے تو ساری زندگی امریکا میں گزارنا ہے؟“

”اس کام کے لیے میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام ہے۔“ وہ پُرسوج انداز میں بولیں۔

میں نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ؟“

”نادر شاہ۔“ انہوں نے بتایا۔

”اچھا..... وہی شخص جس سے آپ کل مجھے ملوانے والی ہیں؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں..... بالکل وہی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نادر شاہ پر بہت زیادہ اعتماد کر رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے منہ پر ہونے لہجے میں کہا۔ ”یہ شخص میرے لیے قابلِ بھروسہ ہے۔ نادر شاہ نے بعض نازک مواقع پر میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے اس مشن کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچائے گا۔“

”اگر آپ کو یقین ہے۔ تو پھر میں بھی یہی امید رکھتا ہوں ماں۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”یہ آپ کا نیک مشن ہے۔ اس ٹرسٹ کے ذریعے میرے باپ کا نام بھی زندہ رہے گا اور اس معاشرے کے بے ہوش ضرورت مند افراد کی دادرسی بھی ہوتی رہے گی۔ میری دعا ہے کہ نادر شاہ آپ کی توقعات پر پورا اترے۔“

”آمین.....!“ وہ بڑے وثوق سے بولیں۔۔۔۔۔

”انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“

ہمارے درمیان ایک مرتبہ پھر انکل سلطان کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا۔

”مجھے لگتا ہے، انکل کو اپنی موت کی پہلی خبر ہوگئی تھی۔“

”یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟“ ماں نے سوال کیا۔

”ان سے ہونے والی میری آخری گفتگو کی بنا پر۔“

میں نے جواب دیا۔

”اس گفتگو میں ایسی کیا خاص بات تھی؟“

”انکل سلطان سے آخری بار میں نے اٹھائیس جون کو رات ایک بجے فون پر بات کی تھی۔ بے سنی (ٹیکساس) میں اس وقت ستائیس جون کی سہ پہر کے تین بجے تھے۔“ میں نے نیچے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”میں

ماں کی موجودگی میں آگے بڑھے تھے۔ یہ خاصی اہم پیش رفت تھی۔ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے میں نے کہا۔
”انگل! ماں نے اس مذموم راستے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے اور وہ میرے ساتھ امریکا جانے کے لیے راضی ہوئی ہیں مگر ویزا پر دوس میں تین سے چار ہفتے لگ سکتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اس دوران میں ماں اس بیٹکے میں رہیں۔ میں انہیں کسی ایسے مقام پر شفٹ کرنا چاہتا ہوں جہاں ماضی کی کوئی یاد ان کا تعاقب نہ کر سکے، کوئی جاننے والا ان سے رابطہ نہ کر سکے۔“

”یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے میری جان۔“ وہ بڑی محبت سے بولے۔ ”اسلام آباد میں میرا ایک گھر خالی پڑا ہے، لاہور کی شادمان کالونی میں بھی کوئی کچھ کا بندوبست کیا جاسکتا ہے اور کراچی تو ہے ہی اپنا شہر یہاں بھی عارضی طور پر کرائے پر اپارٹمنٹ حاصل کر کے تمہاری والدہ کی رہائش کا انتظام کیا جاسکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا مسئلہ کا حل نہیں۔“

”پھر.....“ میں نے متذبذب نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی نظر میں اس مسئلہ کا پائیدار حل کیا ہے؟“
”اگرچہ ایک تمہاری والدہ منظر سے غائب ہو گئیں تو ان کی دنیا میں ششخص خیز افراتفری پھیل جائے گی۔ میں اس دنیا کا ذکر کر رہا ہوں جسے وہ خیر یا بد کہہ چکی ہیں مگر انہوں نے اس انقلابی فیصلے کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا لہذا ان سے متعلق ہر شخص کا تشویش میں مبتلا ہو جانا، اس تشویش کے نتیجے میں ادھر ادھر کن سونیاں لینا اور کچھ سمجھ نہ آنے کے بعد ناکام ٹوئیاں مارنا اور ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہونا ایک فطری عمل ہوگا۔“ انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”لہذا میں تو یہی تجویز کر دوں گا کہ انہیں اسی بیٹکے میں رہنے دو اور تم ان کے ویزا کے پروسس میں لگ جاؤ۔ چند روز کی بات ہے۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب انہیں امریکا کا ویزا مل جائے گا تو چپ چاپ دونوں ماں بیٹا یہاں سے پرواز کر جانا اور اگر ضرورت محسوس کرو تو اسے دوست کو بھی ساتھ لے جانا۔“

ان کا اشارہ عظیم کی جانب تھا۔ میں نے ان کی بات پوری توجہ سے سنی اور ان کے خاموش ہونے پر کہا۔
”آپ کا شعورہ دل کو لگ رہا ہے لیکن چند ایٹوز بھی ہیں.....!“

”مثلاً کون سے ایٹوز ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔
”ماں اپنا ٹکٹا، گاڑی اور ہر قیمتی چیز کو فروخت کر کے

اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سوں گا۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کو کہاں جانا ہے انگل؟ تو انہوں نے جلدی سے سہیلے ہوئے کہا تھا..... ارے کہیں نہیں میرے بچے! میرا مطلب یہ تھا کہ تمہاری ماں کا سراغ مل گیا۔ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس خوش خبری نے مجھے بہت سکون بخشا ہے۔ میرا اندرونِ شانت ہو گیا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میں کتنا خوش اور مطمئن ہوں۔ میرے اللہ نے کرم کیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے.....“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمبی تو قف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”گویا آپ کا سراغ مل جانا ان کی نظر میں میری کامیابی تھی اور میری کامیابی ان کے لیے بے پناہ خوشی کا باعث تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماں بیٹے کی ملاقات کے انتظار میں زندہ تھے۔ ادھر یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا، ادھر انگل سلطان کی آنکھ بند ہوئی.....“
”بعض انسانوں کے اندر بڑی نیک اور پاکیزہ روح ہوتی ہے۔“ ماں نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”علی سلطان بھی ایک ایسے ہی انسان تھے۔“
میں اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں اس وقت حفیظ پور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری یہ ملاقات پور صاحب کے بیڈروم میں جاری تھی۔ ہم دونوں کے سوا اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ عظیم ٹھیک آٹھ بجے مجھے لینے ماں کے بیٹکے پر پہنچ گیا تھا اور مجھے اپنے گھر پہنچانے کے بعد اس نے مجھے اپنے پاپا کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ خود کسی کام سے نکل گیا تھا۔

”بیٹی! مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔“ حفیظ پور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم میرے بیٹوں کی طرح ہو۔ عظیم نے تمہارے ایٹو کے بارے میں مجھے پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا ہے۔ میں تمہاری والدہ کے ماضی اور حال سے اچھی طرح آگاہ ہو گیا ہوں اور ان کی مشکلات کو میں نے خاطر خواہ سمجھ بھی لیا ہے۔ اب تم مجھے وہ باتیں بھی کھل کر بتا دو جو یہاں سے جانے کے بعد تمہاری والدہ سے ہوتی ہیں۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بس اہم پوائنٹس بتا دو تاکہ میں تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔“
بات کے اختتام پر انہوں نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا تو میں نے انہیں ان معاملات سے اپ ڈیٹ کر دیا جو

میں ان کے ساتھ آزادانہ گھوموں پھر دوں گا تو میری جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس شہر میں ان کے دشمن موجود ہیں۔ انہی لوگوں نے میرے والد کو بھی قتل کیا تھا اسی لیے.....“

میں نے لچاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہ چاہ رہا تھا کہ اپنی ماں کو چند دن کے لیے کسی ایسی جگہ پر منتقل کر دوں جہاں ان کے کسی دشمن اور کسی دوست کی رسائی نہ ہو تاکہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی معیت میں رہ سکوں۔ میں انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا اور یقیناً ان کی بھی یہی خواہش ہے۔“

”اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔“ وہ دوستانہ لہجے میں بولے۔ ”میں نے تین آپشنز تمہیں بتا دیے ہیں..... اس کے علاوہ جو تھا آپشن بھی موجود ہے۔“ انہوں نے ایک لمحے کو رک کر ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میرے گھر کا اوپر والا پورشن بھی خالی پڑا ہے۔ مہر النساء کی داپھی کا کچھ بتائیں۔ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ ہوتی ہے تو پھر شوہر، بچے..... سب کو بھول جاتی ہے۔ مجھے نہیں امید کہ وہ عید سے پہلے واپس آئے۔ تم ماں بیٹے کے لیے میرا گھر حاضر ہے۔ امریکا کا ویزا ملنے کے بعد آپ لوگ رخصت ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں آج جا کر ماں سے مشورہ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سارے آپشنز ان کے سامنے رکھتا ہوں۔ دیکھیں وہ کیا فیصلہ کرتی ہیں!“

”فیصلہ تو بہر حال انہی کو کرنا ہے۔“ کپور صاحب نے کہا۔ ”کیونکہ اپنے معاملات کو وہ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ تم نے اپنے اور اپنی والدہ کے جن دشمنوں کا ذکر کیا ہے، اگر تمہاری والدہ انہیں خیل ڈالنے کے لیے مجھ سے کسی بھی قسم کی مدد چاہیں گی تو میں حاضر ہوں۔“

”آپ کے پُر خلوص تعاون کا بہت شکریہ اٹھاتا ہوں۔“ میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

وہ مجھ پر انداز میں بولے۔ ”تم میرے احسان کا بدلہ اس طرح چکا سکتے ہو کہ زندگی میں جب بھی میری یاد آئے، میرے حق میں دعا کر دینا۔ دعا سے بڑھ کر کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے جو ایک انسان کسی دوسرے انسان کو بے لوث دے سکتا ہے۔“

”آپ نے بڑی گہری بات کر دی ہے انکل!“ میں

میرے مرحوم والد کے نام سے ایک ویلفیئر ٹرسٹ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ اپنی موجودہ دولت میں سے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جانا چاہتیں۔ یہاں کی تمام تر کمائی کو وہ ایک نیک کام میں لگا کر کسکھ کی سانس لینا چاہتی ہیں۔“

”تو اس میں ایٹھ والی کون سی بات ہے بیٹا جی؟“ انہوں نے مشتقانہ انداز میں کہا۔ ”اپنے شیخ صاحب رینل اسٹیٹ بزنس کے چیٹا ہیں۔ آپ اپنی والدہ سے بچنے کے ڈاکیومنٹس کی فوٹو کاپی کی فائل لے لو۔ میں شیخ صاحب سے کہہ کر چند دنوں میں بہت اچھی قیمت میں ان کا بیگلا بکوا دوں گا۔ گاڑی کو نکالنا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”آپ کی اس مخلصانہ پیشکش کا شکریہ اٹھاتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جانکدہ کی فروخت کے لیے ماں کے پاس پلان ہے۔ وہ اپنے ایک دیرینہ خیر خواہ کے ہاتھ سے یہ کام کرنا چاہتی ہیں۔ اس شخص کا نام نادر شاہ ہے۔ میرے مرحوم والد کے نام سے قائم ہونے والا ٹرسٹ بھی نادر شاہ ہی کی زیر نگرانی چلے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ انہوں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری والدہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہیں ایک قابلِ اعتماد خیر خواہ میرے درنہ آج کل بھروسے کا آدمی ڈھونڈنے نہیں ملتا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں کل نادر شاہ سے ملاقات کروں گا۔ اگر وہ ماں کے لیے لائقِ اعتبار ہے تو یقیناً کوئی بھلا انسان ہی ہوگا۔“

”میری جان! تمہارے سارے معاملات تو ایک دم سیدھے نظر آ رہے ہیں۔“ کپور صاحب نے کہا۔ ”پھر کیوں پریشان دکھائی دیتے ہو؟“

”اصل پریشانی میری شکل و شبابت ہے انکل۔“ میں نے ایک اہم نکتے کی جانب ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری شکل و شبابت کو کیا ہوا ہے؟“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”شاء اللہ! اچھے خاصے تو ہو، شکل و صورت کی فکر تو مجھ جیسے انسان کو کرنا چاہیے۔“

میں نے ان کے اپنی ذات کے بارے میں خیالات پر کوئی تبصرہ نہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ماں نے بتایا ہے کہ میں قد کاٹھ، انداز و اطوار اور شکل و صورت میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔ ماں کو اس بات کی فکر ہے کہ اگر

نے کہا۔

معنی خیر انداز میں کہا۔

”اسد بھائی! میری یہاں کی جاب بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔“ مصطفیٰ براہ راست مجھے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں نے کینیڈا کی بہت تعریف سنی ہے۔ فی الحال، میں وزٹ ویزا وہاں جانا چاہتا ہوں۔ مہینہ بھر کینیڈا میں رک کر وہاں کی زندگی کا مشاہدہ کروں گا۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ میں وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر سکتا ہوں تو پھر مستقل قیام کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کی سوچ بڑی مثبت اور معقول ہے۔ کینیڈا دنیا کے چھ بہترین ملکوں میں پہلے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔“

”برو! یہ چھ ملک کون کون سے ہیں؟“ عظیم نے پوچھا۔

”نمبر ایک، کینیڈا۔ نمبر دو، آسٹریلیا۔ نمبر تین، نیوزی لینڈ۔ نمبر چار، امریکا۔ نمبر پانچ، جرمنی۔ نمبر چھ، سویٹزرلینڈ۔ کیا آپ کینیڈا کے کمرون ہونے کا راز جانتا چاہتے ہیں؟“

”جی..... بالکل..... ضرور.....“

”کینیڈا میں صرف کہنے کی حد تک نہیں بلکہ عملاً بھی مرد اور عورت کو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں حقوق اور ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ اس کی بہترین مثال وہاں کی گورنمنٹ ہے۔ ان کے ہاں جتنی بھی وزارتیں ہیں ان میں آدمی خواتین کے پاس اور آدمی حضرات کے پاس ہیں اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ ہر وزیر اپنے شعبے کا اسپیشلسٹ ہے۔“

”زبردست.....!“ مصطفیٰ نے مڑ جوش انداز میں کہا۔

”بس بھئی، میں تو کینیڈا ہی جاؤں گا۔ بھائی، آپ یہ بتائیں کہ کینیڈا کے ویزا کے لیے سب سے ضروری چیز کیا ہے؟“

”انوی ٹیشن۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”جب تک کینیڈا کا کوئی سٹیشن آپ کو کینیڈا آنے کی دعوت نہ دے، کینیڈا کی انویٹیشن آپ کو وزٹ ویزا جاری نہیں کرتی۔ دیگر چھوٹی موٹی فارملٹیٹیز اس کے علاوہ ہیں۔ امریکا کے ویزا کے لیے سب سے اہم آپ کا پولیس کونسلٹ میں لیا جانے والا انٹرویو ہے، باقی سب چیزیں ثانوی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر آپ نے انہیں مطمئن کر دیا تو سمجھ لیں کہ آپ کو ویزا مل گیا۔“

”کیا کینیڈا کے ویزا کے لیے بھی انٹرویو ہوتا ہے؟“

مصطفیٰ نے استفسار کیا۔

”جیتے رہو میری جان۔“ وہ زندہ دلی سے بولے پھر کہا۔ ”میں اب آرام کروں گا۔ تم عظیم اور علی کے ساتھ تھوڑا وقت گزار کر اپنی ماں کے پاس چلے جانا پھر سنی صاحبہ جو بھی فیصلہ کریں، مجھے اس سے آگاہ کر دینا۔ اللہ خیر کرے گا۔“

”ان شاء اللہ!“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں عظیم، علی اور ان کے کزن مصطفیٰ کے ساتھ پینکے کے باہر بیٹھابات چٹ کر رہا تھا۔ عظیم جو مجھے یہاں پہنچانے کے بعد کہیں غائب ہو گیا تھا، اب حاضر تھا اور سرگرمی نوشی سے دل پھوری کر رہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ مسگرہٹ کی تلاش میں ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ مصطفیٰ سے میرا تعارف کرایا گیا۔

مصطفیٰ، ارباب کا بھائی تھا۔ ارباب سے میری ایک مختصر ملاقات ہو چکی تھی جب میں نے کراچی میں قدم رکھا تھا اور کسی ڈرائیور نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ چند روز پہلے یہی ٹیکسی ڈرائیور، جرمنی سے آنے والی ارباب کی پھرنی کو لوٹ چکا تھا۔ عظیم اور ارباب کی بروقت آمد نے مجھے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھوں لٹنے سے بچالیا تھا۔ ارباب کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا اور وہ انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ عظیم کی زبانی معلوم ہوا کہ مصطفیٰ ایک تجربہ کار شیف تھا۔ وہ دہلی اور بدلی ہر قسم کے کھانے بنانے کا ماہر تھا۔ مصطفیٰ کا انداز بڑا ڈھیلہ ڈھالا اور وزن نارمل رینج سے متجاوز تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ اسے کھانا پکانے سے زیادہ کھانا کھانے کا شوق تھا۔ وہ اگرچہ ایک ہیوی ڈیوٹی انسان تھا تاہم وہ علی کپور سے آدھا تھا۔ مصطفیٰ کو کینیڈا جانے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔

”برو! میں دراصل مصطفیٰ ہی کے لیے تم سے کینیڈا کی معلومات حاصل کر رہا تھا۔“ عظیم نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، کیا شیف کے لیے وہاں کوئی اسکوپ ہے؟“

”ایک اچھے شیف کی دنیا کے ہر ملک میں بڑی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور کینیڈا میں بھی یقیناً اس پٹے کے لیے بہت اسکوپ ہے لیکن آدمی اپنے کام کا ماہر ہونا چاہیے۔“

”آپ اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ یہ کراچی اور اسلام آباد کے بعض معروف ہوٹلوں میں کام کر چکا ہے۔“ عظیم نے بتایا۔ ”اس نے شیف کا کورس بھی ایک انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ سے کیا تھا اور اب اسے کینیڈا کا بخار چڑھا ہوا ہے۔“

”یہ کافی دلچسپ اور پُرکشش بخار ہے۔“ میں نے

تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن بیس سال گزر جانے کے بعد بھی انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ ربی آنرک نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے بتایا تھا کہ انہیں جس نوجوان کی تلاش ہے، وہ غیر معمولی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں نے ربی کی باتوں سے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اسے شک ہے کہ میں غریبہ اور الفریڈ کا بیٹا ہوں۔ میری حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہی ربی نے اپنی چلی ڈیلینا کو میرے پیچھے لگایا تھا لیکن میں ڈیلینا کی پیشکش کی ایسی کم تھی کہ وہ ویس سے ٹیکاس آ گیا تھا۔ اس کے بعد میری نہ تو ربی آنرک سے کوئی ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی ہسٹونوی دوشیزہ ڈیلینا سے سامنا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی طرف عمل خاموشی تھی اور..... میں بہنوئی سمجھ رہا تھا کہ یہ خاموشی آگے چل کر میری زندگی میں کوئی خوفناک طوفان لانے والی تھی کیونکہ میں ان لوگوں کی طاقت اور اختیار کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر چکا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا وہ مجھے فراموش کر کے اتھارہ اپنی آنکھوں سے کر چکا تھا۔ یہ ممکن وہ کسی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ کسی بھی قیمت پر مجھے بھول نہیں سکتے تھے۔ میں ممکن تھا کہ وہ مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کوئی نیا چال مینے میں مصروف ہوں.....!

”کہاں کھو گئے بھائی؟“ عظیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”کوئی یاد آ رہا ہے کیا.....!“

”ہاں یا.....“ میں نے صورت حال کو بڑے سلیقے سے سنبھالتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”کوئی بے طرح یاد آ رہا ہے۔“

عظیم نے ایک انگی اپنی ناک پر رکھ کر اشارتی زبان میں پوچھا۔ ”ہوں.....؟“

”نہیں یا، وہ کوئی لوکی نہیں ہے۔“ میں نے بوجھل انداز میں بتایا۔

”پھر کون ہے؟“

”میرے انکل سلطان۔“ میں نے کہا۔

”اوہ..... کیا ہوا انکل سلطان کو؟“ اس کے لہجے میں تشویش در آئی۔

”ان کی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔“

میں نے عظیم کو انکل علی سلطان کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ اب ہمارے بیچ بہت ہی کم معاملات ڈھکے چھپے باقی بچے تھے۔ انکل سلطان کی موت کی خبر سن کر وہ اس طرح اچھلا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”نہیں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”کینیڈا کا وزٹ ویزا حاصل کرنے کے لیے آپ کو یعنی کراچی والوں کو کینیڈین ایمبیسی نہیں جانا پڑتا۔“

”پھر.....“ عظیم نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”پھر ویزا کیسے ملتا ہے؟“

”کینیڈا کی ایمبیسی اسلام آباد میں ہے۔ یہ سارا کام کوریئر سروسز کے ذریعے ہوتا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”ویزا کا اپلیکیشن فارم آپ آن لائن بھرتے ہیں۔ اس فارم کے نتیجے میں آپ کو چند کوڈز لاٹ کر دیے جاتے ہیں۔“

”پھر تو کوئی بہت ہی ٹکڑا کینیڈین ڈیوٹنڈا پڑے گا۔“ مصطفیٰ نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”جس کے انویٹیشن میں دم ختم ہو۔“

”ارے یا! تم انویٹیشن کی فکر نہ کرو۔“ عظیم،

مصطفیٰ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”میں دو انویٹیشن منگواؤں گا۔ ایک ٹورنٹو سے اور دوسرا ٹیکوور سے۔ ہم دونوں بھائی

ایک ساتھ ہی جا سکیں گے۔“

”ان شاء اللہ.....!“ مصطفیٰ نے کہا۔

علی کو اگلی صبح اپنی بیوی زرتاش کے ساتھ راولپنڈی

جانا تھا اس لیے وہ جلدی اٹھ گیا۔ زرتاش کی کسی کزن کی مفتگی

تھی۔ اسی سلسلے میں وہ میاں بھوی صبح راولپنڈی جا رہے

تھے۔ علی کو تو ایک ہفتے کے بعد واپس آ جانا تھا لیکن زرتاش

کا عید کے بعد ہی واپسی کا ارادہ تھا۔ اغلب امکان یہی نظر

آ رہا تھا کہ یہ مہر النساء بھی عید کے بعد ہی امریکا سے واپس

آنے والی تھی۔ گویا اس شہر میں عید بہوؤں کے بغیر ہی

گزرنے والی تھی.....!

راولپنڈی کے ذکر پر آپوں آپ میرا دھیان میڈم

غریبہ کی طرف چلا گیا۔ وہ میڈم غریبہ جس کا تعلق راولپنڈی

سے تھا اور جو کسی طرح برسوں پہلے امریکا پہنچ گئی تھی۔

اس نے امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سان

ڈیاگو کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ راولپنڈی میں اس کا تعلق ایک

بہرور کریٹ فیملی سے تھا۔ اس نے سان ڈیاگو میں ایک

کرچین مرد الفریڈ سے شادی کر لی تھی۔ یہ ساری باتیں

پریسٹن ہالووالے ہنگے پر ربی آنرک بارون لاؤنے مجھے

بتاتی تھیں۔ اس نے امریکا میں بہت محنت کی اور پھر وہ سان

ڈیاگو میں پام ایونیو پر واقع سپراسٹور ”سیڈن ایون“ کی

فرنیچر نمبرجی بنی۔ اس کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا

ہوا جو لگ بھگ میرا ہم عمر تھا پھر..... ایک روز اچانک یہ

تینوں افراد غائب ہو گئے۔ ربی آنرک کی ٹیم نے انہیں

”میں نے انہیں بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”اس کے بدلے میں انہوں نے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے۔“
”کیسا وعدہ؟“ اس نے پوچھا۔

”انہوں نے کہا ہے کہ وہ میرے ساتھ ایک مرتبہ امریکا جائیں گی تو پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئیں گی۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے عظیم کو بتایا۔ ”مجھے وہاں ان کی مستقل رہائش کے حوالے سے تمام تریگل اریج منس کرنا ہوں گے۔“

”اور یہ کام یقیناً تمہارے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔
”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”لیکن پھر تمہارے مشن کا کیا ہوگا؟“
”کون سا مشن؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”اپنے باپ کے قاتلوں اور ماں کی عزت کے ہتھیاروں سے بھیاں ایک انتقام لینے کا مشن۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر تم اپنی والدہ کے ساتھ امریکا روانہ ہو جاؤ گے تو پھر تمہارے دشمنوں کو مزہ اُکون دے گا؟ وہ اپنے عبرت ناک انجام کو کیسے پہنچیں گے؟“
”یار! اچھی بات تو یہ ہے کہ ان معاشرتی ناسوروں کو نیست و نابود کرنے کا بہت جی کرتا ہے۔“ میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ”لیکن ماں نے اپنی قسم سے میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔“

وہ حیرت بھرے لہجے میں متحضر ہوا۔ ”کیسی قسم برد؟“
”ماں نے مجھے قسم دی ہے کہ میں کسی بھی برے شخص سے نہیں الجھوں گا۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”ان کی خواہش ہے کہ ہم دونوں ماں بیٹا جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ وہ کہتی ہیں، انہوں نے اپنا معاملہ مالک کے سپرد کر دیا ہے۔“

”برو! تمہاری ماں بڑی حوصلے والی عظیم عورت ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ورنہ انسان عموماً اپنی نفسیات کے زیر اثر موقیع میسر آتی ہے اپنے دشمن سے انتقام لینے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنے معاملات کو اللہ کے حوالے کر دینا پختہ ایمان اور اعلیٰ ظرفی کی روشن دلیل ہے۔ سلی آئی نے اپنا کیس اللہ کی عدالت میں لگا کر بات ہی ختم کر دی ہے ورنہ.....“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”ورنہ کیا؟“

”یہ کیسے ہوا..... کب ہوا.....؟“
”ہاٹ ایک.....“ میں نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”کل شام اس وقت انہیں جان لیوا دل کا دورہ پڑا جب میں اوپر تمہارے کمرے میں ماں سے ملاقات کر رہا تھا۔“
”بہت افسوس ہوا یہ سن کر یار۔“ وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا۔ ”اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔“
”آمین.....!“ میں نے پڑ مردہ آواز میں کہا۔
مصطفیٰ نے بھی اپنا ہاتھ بھرے لہجے میں انگلی کی موت پر مجھ سے تعزیت کی۔ تھوڑی دیر تک ہم چپ چاپ سوکوار فضا میں بیٹھے رہے پھر میں نے نظم سے کہا۔
”تم مجھے ڈراپ کر دو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“
مصطفیٰ کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کی خواہش رکھتا تھا لیکن عظیم نے اس سے کہا۔

”مصطفیٰ! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ رہا ہوں۔“
”ٹھیک ہے بھائی۔“ مصطفیٰ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

عظیم نے وہاٹ وٹ نکالی اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ واپسی کے سفر میں، میرے اور عظیم کے درمیان علی سلطان ہی موضوع گفتگو بنے رہے۔ ساڑھے دس بجے رات ہم ماں کے زمرہ والے بٹکنے پر پہنچ گئے۔ بہ وقت رخصت میں نے اس سے پوچھا۔

”کل آفٹرنون میں تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟“
”کوئی خاص نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کوئی کام ہے تو بتاؤ.....!“

”تمہارے پاس کمپیوٹر کا پرنٹر ہے؟“
”ہاں ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور استفسار کیا۔ ”پرنٹر کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“
”کل میں ماں کا آن لائن ایلیکٹرون فارم بھرنے چاہتا ہوں۔ امریکا کے وزٹ ویزا کے لیے۔“ میں نے بتایا۔
”ان کی تصویر اور بعض دوسری چیزیں اسکیں کرنا ہوں گی اور بعض چیزوں کے فوری طور پر پرنٹ بھی چاہیے ہوں گے جو میں اپنے اکاؤنٹ سے اٹھاؤں گا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔
”ویری گڈ!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔
”مبارک ہو یار!“ وہ پھر غلوس انداز میں بولا۔
”تمہاری والدہ امریکا جانے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔“

”در نہ یہ کہ.....“ وہ خاصے سنگین لہجے میں بولا۔ ”تم دونوں ماں بیٹا کے یہاں سے چلے جانے سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا.....“

اس کی بات نے مجھے الجھا دیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں پوچھے بتا نہ رہ سکا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ تم کون سا فرق نہ پڑنے کی بات کر رہے ہو؟“

”مطلب یہ کہ تم لوگ ادھر امریکا میں آرام سے بیٹھے رہتے اور یہاں تمہارے دشمنوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی۔“ وہ بہ دستور سنگین انداز میں بولا۔ ”میرے لنگہ میں ایسے لوگ ہیں جو میری آنکھ کے اشارے پر کسی بھی طرم خان کو اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچا سکتے ہیں یا کم از کم ان کی ہڈیوں کا سرمہ بتا سکتے ہیں.....“

”ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے دوست۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری جاں نثاری اور وفاداری پر کوئی شک نہیں لیکن ایک عام سا اصول ہے کہ جب کوئی معاملہ دنیاوی عدالت میں ہو تو پھر اس کیس پر اخلاقی اور احتیاطی تقاضوں کے پیش نظر رائے زنی سے اجتناب برتا جاتا ہے اور یہاں تو معاملہ مالک کی عدالت میں رکھا جا چکا ہے..... اور تم جانتے ہو، قدرت کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ ہمیں خاموش تماشا کی بن کر قدرت کے کھیل کو دیکھنا ہوگا اور پھر مالک کی عدالت سے جو فیصلہ صادر ہو، اس پر تسلیم خم کرنا ہوگا۔“

”میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں برادر۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اسی لیے تو میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ..... آئی سہلی نے اپنا کیس اللہ کی عدالت میں لگا کر بات ہی ختم کر دی ہے۔“

میرے اور عظیم کے بیچ کیسٹری کچھ ایسی ہیج کر گئی تھی

کہ جب ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے تھے تو شدت سے ملنے کو دل چاہتا تھا اور جب مل جاتے تھے تو پھر جدا ہونے کو مین نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ عظیم نے مجھے ماں کے بچکے پر پہنچایا تھا لیکن ابھی تک میں اس کی گاڑی کے اندر ہی تھا اور ہمارے مابین بات چیت جاری تھی۔ میں نے گاڑی سے نکلنے کے لیے دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا۔

”برو! جاتے جاتے ایک بات بتا دو.....“

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”یار! تم نے کینیڈا کی مختلف وزارتوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے نا.....؟“

”ایک دم سنٹ پرسنٹ سچ۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کینیڈا کی تمام مشرین اور ان پر کام کرنے والے سب پر ڈیفینڈر ایک مکمل حقیقت ہیں۔ کینیڈین گورنمنٹ کو اپنے ملک اور اس ملک میں بسنے والے ہر شخص کے کامیاب حال اور خوشگوار مستقبل کی بڑی فکر ہے اسی لیے گورنمنٹ کے کسی بھی شعبے میں کسی تالاق یا نان پروفیشنل کی کوئی مچائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دو تاقان حال کینیڈا کو بہشت ارضی بھی کہتے ہیں۔“

”کاش! میرا ملک پاکستان بھی ایک جنت نظیر وطن بن جائے!“ وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ”یہاں کے حالات اور معاملات کو دیکھ کر قسم سے دل کڑھتا ہے۔“

”میں تمہارے احساسات کو سمجھ سکتا ہوں یار۔“ میں نے ایک بار پھر اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

”وقت کبھی ایک سانپیں رہتا میرے دوست۔“ میں نے ایک محسوس حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”امید کا دامن کسی بھی حال میں اتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

”یار! کینیڈا پاکستان کے مقابلے میں کافی بڑا ملک ہے۔“ عظیم نے کہا۔ ”لیکن وہاں آبادی کے وہ مسائل نہیں ہیں جو یہاں پاکستان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔“

”بالکل..... یہی ان کی کامیابی کا راز ہے عظیم صاحب۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”اس وقت کینیڈا کی آبادی تین کروڑ پچیس لاکھ ہے جبکہ پاکستان کی آبادی انیس کروڑ دس لاکھ ہے یعنی پاکستان آبادی کے لحاظ سے کینیڈا کے مقابلے میں ساڑھے پانچ گنا زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ کینیڈا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ٹورنٹو ہے۔ اس کے بعد اوٹاوا کا نمبر آتا ہے جو کہ کینیڈا کا کیپٹل بھی ہے۔“

”یار! کراچی کے بارے میں تمہاری کیلکولیشن کیا کہتی ہے؟“ عظیم نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”اس وقت کراچی کی کل آبادی چوبیس ملین یعنی دو کروڑ چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اس شہر کا رقبہ تین ہزار پانچ سو ستائیس مربع کلومیٹر ہے۔ کراچی دنیا کا چوتھا زیادہ آبادی والا شہر ہے..... بس یا کچھ اور؟“

”یار! تم سائیکالوجی کے اسٹوڈنٹ ہو مگر تمہاری جغرافیہ کی ناچ بہت زیادہ ہے۔“ وہ تعریفی انداز میں بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے، میں براڈ ڈیپورٹ کالج میں علم نفسیات یعنی سائیکالوجی کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں مگر میں علم ارضیات میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اس لیے جیولوجی اور جیوگرافی کے معاملات پر مجھے کافی دسترس حاصل ہے۔“

وہ کل سہ پہر میں آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔
میں بٹکے میں داخل ہوا اور سیدھا ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔

تم دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ڈنر کیا پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے ماں کو کپور صاحب سے ہونے والی میٹنگ کا احوال سنایا۔

انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ”کپور صاحب کا مشورہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے نہیں اور شفٹ ہونے کا رسک نہیں لیتا چاہیے بلکہ اسی بٹکے پر رہتے ہوئے اپنے معاملات کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہینڈل کرتے ہوئے تمہارے ساتھ جلد از جلد امریکا روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”جب تک آپ کو امریکا کا وزٹ ویزا نہیں مل جاتا، ہم یہاں سے روانہ نہیں ہو سکتے کیونکہ مجھے ہریت پر آپ کو بھی ساتھ لے کر جانا ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس پر اس میں ایک سے دو فٹنگ لگ سکتے ہیں۔“ میں نے اپنے ذہن میں موجود خیالات ماں تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

”کوئی حرج نہیں ہے۔“ وہ بخیرہ لہجہ میں بولیں۔ ”دو کے بجائے آرتھین ہفتے بھی لگ جائیں تو انتظار کیا جاسکتا ہے۔“
”بات انتظار کرنے کی نہیں ہے ماں!.....!“ میں نے متذبذب انداز میں کہا۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستغرق ہو گئیں۔

”پھر کیا بات ہے؟“

”اصل مسئلہ میری شناخت کا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بتایا ہے کہ میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔ آپ کے ساتھ میرا آزادانہ گھومنا پھرنا کوئی پرابلم بھی کھڑی کر سکتا ہے۔“

”یہ پوائنٹ میرے ذہن میں بھی ہے میرے لعل۔“ وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”اور اس سلسلے میں تم سے زیادہ... فکر مند ہوں۔“

”ماں! آپ کے اس بٹکے پر بھی تو لوگوں کی آمد ہوتی ہے۔“ میں نے دل کی بات کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

”یہاں میری موجودگی اگر راز میں نہیں رہے گی تو پھر بھی کسی وقت کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔.....!“

”میں تمہارا پوائنٹ سمجھ گئی علی۔“ وہ بڑی رساں سے بولیں۔ ”پہلی بات تو یہ کہ اس بٹکے پر لوگوں کی بھی بھیڑ نہیں

لگی اور نہ ہی تو اسے کسی کا آنا جانا رہا ہے۔ یہاں صرف وہی شخص آتا ہے جسے میں آنے کی اجازت دیتی ہوں اور میں صرف اسی شخص کو آنے کی اجازت دیتی ہوں جو میرے لیے قابلِ بھروسہ ہوتا ہے۔.....“ چند لمحات کا توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہاں تک رسائی حاصل کرنے والے افراد میں صرف ایک شخص ایسا ہے جس نے تمہارے والد کو دیکھا ہوا ہے لہذا صرف وہی تمہیں دیکھ کر چونک سکتا ہے کیونکہ تمہاری صورت میں اسے حیدر علی کا چہرہ نظر آئے گا اور یہ شخص میرا سچا خیر خواہ ہے۔ میں اس پر ٹرسٹ کرتی ہوں۔“

ماں نے اس شخص کے حوالے سے جب ذکر کیا کہ وہ میرے والد کا صورت آشنا ہے تو میرا دھیان فوری طور پر جاوید واسطی کی طرف چلا گیا۔ اگلے بیگ نے مجھے بتایا تھا کہ ماں نے آج سے انیس سال پہلے ایک سال کی عمر میں مجھے جاوید واسطی نامی ایک شخص کے ساتھ کراچی سے نیویارک بھجوا دیا تھا۔ بیگ صاحب کے مطابق، جاوید واسطی میری والدہ کا خیر خواہ تھا اور وہ میرے خاندانی پس منظر سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ماں نے جب جاوید واسطی کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو واسطی نے ایک ریکورڈنگ ایجنٹ دوست کی مدد سے نیچے بی بی سی پاسپورٹ پر کراچی سے نیویارک پہنچانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ ابھی ماں نے اپنے کسی سچے خیر خواہ کا تذکرہ کیا تو میرے ذہن میں جاوید واسطی کا نام چمک اٹھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ وہ شخص نہیں ہوگا۔

”میں آپ کے ایک دیرینہ خیر خواہ کو جانتا ہوں۔“ میں نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ تو اب اس دنیا میں باقی نہیں۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو میرے لعل؟“

”جاوید واسطی کی!.....!“ میں نے کہا۔

”اوہ!.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔ ”واسطی صاحب واقعی بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے ایک ایسے نازک موقع پر میری مدد کی تھی جب میرا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے۔.....“ وہ لمحے بھر کو رکیں پھر پھر سے ہوئے لہجہ میں اضافہ کیا۔

”میں اس وقت کسی اور آدمی کا ذکر کر رہی تھی۔“

”تو پھر آپ خود ہی بتا دیں کہ وہ آدمی کون ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جو میرے والد کا صورت آشنا ہے؟“

”اس شخص کا نام ہے نادر شاہ.....“

”ان صاحب کا ذکر تو آپ دوپہر میں بھی کر چکی ہیں۔“ میں نے ماں کو یاد دلایا۔ ”اور کل آپ نادر شاہ صاحب سے میری ملاقات بھی کروانے والی ہیں۔“

”بالکل..... میں نے شاہ جی کو کل شام میں یہاں بلایا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”ان سے مل کر یقیناً تمہیں خوش ہوگی۔ یہی ایک شخص ہے جو تمہیں دیکھ کر فوراً پہچان سکتا ہے کہ تم حیدر علی کی اولاد ہو۔ میں چونکہ شاہ جی پر اندھا اعتماد کرتی ہوں اس لیے میں نے خود ہی انہیں تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے تشریف بھری نظر سے ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا اس راز سے شاہ جی بھی واقف تھے کہ انیس سال پہلے آپ نے مجھے جاوید واسطی کے ذریعے کراچی سے نیو یارک بھجوایا تھا؟“

”نہیں!“ وہ فنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔

”یہ راز صرف میں، جاوید واسطی، مرزا عامر بیگ اور علی سلطان ہی جانتے تھے۔ ان چار افراد میں سے دو یعنی جاوید واسطی اور علی سلطان عدم آباد روانہ ہو چکے ہیں۔ میں کراچی میں اور مرزا عامر بیگ نیو یارک میں موجود ہیں اور چند دنوں کے بعد میں بھی تمہارے ساتھ امریکا پہنچ جاؤں گی گویا..... یہ راز امریکا ہی میں محفوظ ہو جائے گا۔“

”جب نادر شاہ اس راز سے واقف نہیں ہیں تو پھر انہیں اس راز میں شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”میں نادر شاہ کو اس راز میں شریک کرنے کی بات نہیں کر رہی کہ میں نے آج سے انیس سال پہلے کس طرح تمہیں نیو یارک بھجوایا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”وہ معاملہ تو اتنا خفیہ تھا کہ نادر شاہ کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ تو نہ جاوید واسطی کو جانتا ہے اور نہ ہی اس ریکورڈنگ ایجنٹ کو جس نے تمہیں نیو یارک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں تمہیں نادر شاہ سے کیوں ملوانا چاہتی ہوں.....!“

”جی بالکل.....“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس وقت میرے ذہن میں سب سے اہم یہی سوال ہے۔“

”نادر شاہ یہ بات جانتے ہیں کہ میں نے ایک بچہ کو جنم دیا تھا پھر وہ بچہ نہیں کم ہو گیا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”اس دوران میں بھی کبھار وہ میرے گمشدہ بچے کا ذکر لے آتے تھے اور میں ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش

ہو جاتی تھی۔ وقت دے پاؤں آگے بڑھتا گیا اور نادر شاہ اپنے اپنایت بھرے پُر خلوص رویے کے باعث میرے قریب آتے گئے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ بعض نازک مواقع پر انہوں نے میری بے لوث مدد بھی کی۔ نتیجتاً، میں ان پر بھروسہ کرنے لگی لیکن میں نے بھی انہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان کے سامنے تمہارا جب بھی ذکر ہوا تو انہوں نے خلوص دل سے دعا کی کہ تم جہاں بھی ہو، اللہ تمہیں سلامت رکھے اور میری آنکھ بند ہونے سے پہلے اللہ تمہیں مجھ سے ملوادے۔ میں نے نادر شاہ کے خلوص کو کبھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور میں نے ان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جیسے ہی مجھے تمہارا کوئی سراغ ملا، میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گی۔“

لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک طویل آسودہ سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے آج نادر شاہ کو بتایا ہے کہ مجھے تمہارا سراغ مل گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم مجھے کہاں سے ملے ہو اور اس وقت تم کہاں ہو؟ میں نے ان سے کہا کہ وہ کل شام میں میرے گھر آ جائیں پھر میں انہیں تفصیل سے آگاہ کروں گی۔“

”گویا شاہ جی یہ بات نہیں جانتے کہ میں اس وقت آپ کے بیٹکے پر موجود ہوں؟“

”نہیں..... میں نے انہیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔“ وہ معتدل انداز میں بولیں۔ ”جب وہ یہاں آ جائیں گے تو میں انہیں سر پر آرزو دیں گی اور تمہاری طرف اشارہ کر کے ان سے کہوں گی..... پہچانیں، یہ کیوں ہے؟“

ماں نے آخری جملہ کسی محسوس بچے کے انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے کہا۔

”اور یقیناً شاہ جی مجھے پہچان لیں گے کیونکہ وہ میرے والد کے صورت آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں شکل و شبہت میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔“

”بالکل..... ایسا ہی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”یہاں تک تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”اس کے بعد آپ انہیں میرے بارے میں کیا کہانی سنائیں گی کہ میں نے یہ انیس سال کہاں گزارے؟ میں کم کیسے ہوا تھا؟ اب واپس کیسے آیا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ..... کیا اس مرحلے پر آپ انہیں حقائق سے آگاہ کر دیں گی؟“

”ہرگز نہیں میرے بچے!“ وہ پوری قطعیت سے بولیں۔ ”جب تک میں امریکا نہیں پہنچ جاتی، تمہارے

عمرے پر جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ برائی کی راہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کے بعد اللہ کے گھر میں حاضری ضروری ہے۔ میں اس مقدس کام کے اخراجات اٹھانے کی استطاعت رکھتی ہوں اور تم بھی محرم کی حیثیت سے میرے ساتھ حرم جاؤ گے اور عمرہ ادا کرو گے۔ کسی محرم کے بغیر ایلی عورت یہ کام نہیں کر سکتی۔ تم میری یہ خواہش پوری کر دو گے نا۔ میں اپنے ٹریول ایجنٹ سے کہہ کر تمہارے لیے سعودیہ کے ویزا کا انتظام کر دوں گی۔“

”جہاں تک آپ کی خواہش کا معاملہ ہے تو..... یس! میں کسی بھی قیمت پر آپ کی خواہش کو رد نہیں کر سکتا۔“ میں نے گہری تنبیہ کی سے کہا۔ ”الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور اس نیک سعادت کے لیے حاضر بھی ہوں۔“

”خوش رہو۔ اچھا سنو! میں نادر شاہ کو بتاؤں گی کہ ایک سال کی عمر میں تمہیں اغوا کر لیا گیا تھا پھر مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے تمہیں سعودی عرب پہنچا دیا گیا۔ تمہارا بچپن اور نوجوانی ایک غلام کی حیثیت سے گزری پھر کسی طرح تم اس غلامی سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تم نے سعودی عرب کے مختلف علاقوں میں قسمت آزمائی کی اور پھر جدہ کو اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا۔ آج کل تم وہاں ایک ریسٹورنٹ چلا رہے ہو۔ میرا خیال ہے، اسے میری کہانی پر ترقیقین آ جائے گا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں تو یہاں چند دن رہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے ماں! آپ نے جو بھی منصوبہ بنایا ہے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ میں نے ماں سے زیادہ جھج نہیں کی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ شاہ جی کو جو بھی کہانی سنائیں یہ آپ کا اور ان کا معاملہ ہے۔“ ”میرے بچے! اگر میں ”حیدر علی ٹرسٹ“ کے حوالے سے نادر شاہ کے ہاتھ میں کر دوں روپے دینے کو تیار ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس شخص پر مکمل بھروسہ کرتی ہوں۔“ وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”جب ہم دونوں بہ خیریت امریکا پہنچ جائیں گے تو پھر میں نادر شاہ کو حقائق سے آگاہ کر دوں گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”جی ماں! آپ کو وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں ماں کے حکم پر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا اور پیچ کر کے جب بستر پر آیا تو میرا ذہن انکل علی سلطان کی طرف چلا گیا۔ میرا ان کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں تھا مگر زندگی کے تجربے نے مجھے بتایا

بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ شاہ جی سے میں نے چونکہ وعدہ کر رکھا تھا اس لیے تمہاری بازیابی کا انہیں بتانا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ ان کی تسلی کے لیے فوری طور پر رفیق صاحب والی کہانی مناسب رہے گی۔“

”رفیق صاحب والی کہانی.....!“ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں ماں؟“

”میں نے تمہارے سامنے کلینڈر آئی سے تمہارا تعارف کراتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ تم میرے ایک عزیز ہو، تمہارا نام رفیق ہے اور تم ادھر جدہ میں رہتے ہو۔ تم نے ہی میرے لیے عمرے کا انتظام کیا ہے اور میں فرصت کے تمام ایام تمہارے پاس جدہ میں قیام کروں گی۔“ ماں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”نادر شاہ کو بھی میں یہی کہانی سناؤں گی مگر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے ٹھہریں پھر اپنی پلانتک کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگیں۔

”نادر شاہ کو میں بتا چکی ہوں کہ تم مجھے مل گئے ہو۔ اب کل انہیں تم سے ملوانے کے بعد یہ اسناد کرنا ہے کہ آج کل تم جدہ میں ہوتے ہو اور وہاں کوئی ریسٹورنٹ چلا رہے ہو۔ تم نے میرے لیے عمرے کا بندوبست کیا ہے اور میں تمہارے ساتھ میرے بھر کے لیے سعودی عرب جا رہی ہوں۔“

”مگر شاہ جی سے یہ غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے ماں؟“ میں نے انھیں زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ”ایک طرف آپ ان پر اندھا اعتماد کرتی ہیں اور دوسری جانب.....“ میں نے متذبذب انداز میں سرگولی میں حرکت دی اور کہا۔ ”کیا وہ آپ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ میں انیس سال تک کہاں رہا؟ مجھے کس ظالم نے آپ سے چھینا تھا اور میں جدہ کیسے پہنچا؟ انیس سال تک میں نے آپ سے رابطہ کیوں نہیں کیا..... وغیرہ ہا۔“

”یقیناً نادر شاہ مجھ سے یہ تمام سوالات پوچھیں گے اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے میرے پاس مدلل جوابات بھی ہیں لیکن اس کی تفصیل میں تمہیں چند منٹ کے بعد بتاؤں گی۔ پہلے غلط بیانی والے معاملے کو ٹیکہ کر دوں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے جو گفتگو تھیں۔

میں ان کے چہرے پر نگاہ جمائے بہترین گوش بیٹھا تھا۔ وہ اپنے بیان کو دراز کرتے ہوئے بولیں۔ ”اگر میں نادر شاہ سے یہ کہوں گی کہ میں تمہارے ساتھ عمرے پر جا رہی ہوں اور اس عمرے کا سارا رینج منٹ تم نے کیا ہے تو اس میں دروغ گوئی والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں واقعی

تھا کہ روح کا رشتہ خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط اور پائدار ہوتا ہے۔ ہمارے سچے روحوں کا میلان پایا جاتا تھا۔ انکل سلطان کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا وہیان ربی آنزک کی طرف چلا گیا۔ ڈیلس میں پریسٹن ہالووالے پینکلے پر ربی نے مجھ سے روحانی میلان کے حوالے سے بڑی اہم اور قابل غور باتیں کی تھیں۔ اس نے اپنی تاثر انگیز آواز میں مجھے بتایا تھا کہ ہم سب ایک آدمی کی اولاد ہیں اور ہمارے سچے برادر بڑے یعنی بھائی چارے کا رشتہ قائم ہے۔ تمام انسان ایک خالق کی مخلوق ہیں، ایک سمندر کے قطرے ہیں، ایک جگر کے پتے ہیں، ایک گھڑیال کے کانٹے ہیں اور ایک نمکلی کے ممبرز ہیں۔ جس طرح ایک خاندان کے بعض افراد کے سچ بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اسی طرح ارواح کے عالم میں بھی بعض روحوں کے مابین بڑا مضبوط تعلق پایا جاتا ہے۔ جو درمیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہیں، ان کے حامل انسان ایک دوسرے کے سچے دوست یعنی سول میٹ ہوتے ہیں۔ وہ چاہے زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں یا وہ زندگی میں کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں مگر ان کی روحیں بہ خوبی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ ربی نے میرے اور اپنے حوالے سے کہا تھا کہ ہم دونوں سول میٹ ہیں۔ اسی تناظر میں اس وقت میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ انکل علی سلطان بھی میرے سول میٹ تھے.....!

آہ..... میرا روحانی ساتھی مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ انکل سلطان کی ابدی جدائی کا سوچ کر یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم سے روح رخصت ہو گئی ہو.....!

☆☆☆

اس رات میں نے بڑا ممتی خیر خواب دیکھا۔

میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں اس لیے جب بھی میرے بیان میں کوئی ایسی سچویشن آتی ہے جہاں انسانی نفسیات کا عمل دخل ہو تو میں جزئیات میں ڈوب جاتا ہوں۔ میں نے اس رات جو عجیب و غریب خواب دیکھا، وہ ماضی قریب کے ایک خواب کا تسلسل تھا۔ پہلے یہ خواب میں نے ڈیلس میں پریسٹن ہالووالے پینکلے پر دیکھا تھا جب میں بہتر کھٹنوں کے لیے کافر اواہسپانوی وڈیشہ و ڈیلفینیا کا مہمان بنا ہوا تھا اور اس وقت میں اپنی ماں کے پینکلے پر موجود تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک کشادہ ہال ہے اور اس ہال میں دو درجن سے زیادہ افراد جمع ہیں جن میں مرد و زن سب شامل ہیں۔ وہاں کا ماحول قدیم زمانے کا ہے جیسا کہ یونانی

تہذیب ہوتی ہے۔ وہاں پر موجود تمام افراد نے مخصوص قسم کے لباس پہن رکھے ہیں۔ یہ قیمتی لباس جبہ نما ہیں۔ اپنے پہناوے اور شخصیت کے لحاظ سے وہ سب بڑے محترم اور معتبر نظر آتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بڑے سلیکھ ہوئے اور شائستہ انداز سے پیش آ رہے ہیں۔ انہی لوگوں میں مجھے ڈیلفینیا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ بڑی سچی اور سنوری ہوئی تھی۔ اس نے کمال کا بناؤ دکھایا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ تقریب اسی کے نام ہو۔ پھر اس عالی شان ہال میں، میں نے ایک ایسے شخص کو داخل ہوتے دیکھا جو پہلے نظر آنے والے خواب میں میرے لیے اجنبی تھا لیکن اب کی بار میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ تاثر کن شخصیت کا مالک انسان ربی آنزک کا باروخ لاؤ تھا۔ وہ وہاں مہمان خصوصی کی حیثیت سے آیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہاں موجود تمام افراد باادب، ملاحظہ، ہوشیار ہو گئے تھے۔ ربی ڈیلفینیا کے نزدیک پہنچ کر رک گیا۔ ڈیلفینیا نے جھک کر تعظیم بھرے انداز میں ربی کے ساتھ چوہے۔ ربی نے ڈیلفینیا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ پھر ربی نے اپنے ہاتھوں سے ڈیلفینیا کو ایک تاج پہنایا۔ وہاں پر موجود تمام افراد نے ڈیلفینیا کو مبارک باد دی۔ ہونٹوں پر ملکوٹی مسکراہٹ سجائے ڈیلفینیا نے سب سے مبارک سلامت وصول کی۔ اس کے بعد ربی آنزک نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”یہ تاج پوٹی ایک خاص مقدمہ کے تحت تھی۔ جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ ڈیلفینی کا ایک انتہائی اہم پردموشن ڈیو تھا۔ آج اسے اس اعزاز سے نوازا دیا گیا ہے۔ اب یہ سوسائٹی میں اس ڈگری تک پہنچ گئی ہے جس کی یہ مستحق ہے۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑی محنت کی ہے۔ اس نے بڑی ہمت اور ثابت قدمی سے اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ کو جس طرح ٹکست دی ہے وہ آپ سب کے لیے ایک روشن اور سبق آموز مثال ہے۔ جو نیز ڈیلفینی کی کارکردگی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔“

اس کے بعد تقریب کا اختتام ہو گیا تھا۔ میں اس ہال میں موجود تمام افراد کو بڑے واضح انداز میں دیکھ رہا تھا لیکن مجھے اس بات کا بھی بہ خوبی احساس تھا کہ میں ان لوگوں کے سچ حاضر نہیں ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی کسی نے میری جانب توجہ دی تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں مذکورہ ہال سے کہیں دور بیٹھا، اس تقریب کوئی وی اسکرین پر لائیو دیکھ رہا ہوں۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(اشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

اسرائیل، انڈیا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت ملک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاراں پر پتہ پتہ بین الاقوامی ہوسکتا ہے

یہ یون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرجاں (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیروز ٹیکسٹائلز باؤسنگ اتھارٹی مین کوٹہ روڈ، کراچی

فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

لیکن یہ میری غلط فہمی تھی کہ میں سب کو دیکھ رہا ہوں
اور کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس نظم ہال میں جمع
مردوزن میں سے ایک انسان مجھے بھی دیکھ رہا تھا اور وہ بھی
ڈیٹیفیاء عرف ڈیٹیفیاء.....!

وہ مجھ سے ہم کلام ہوئی تھی۔ یہ بڑا چر معنی اور سنسنی
خیز مکالمہ تھا۔

”بچو.....! مجھ سے کہاں تک بچو گے۔ تم اس دنیا یا
اس دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤ، مجھے تمہارے قریب
آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور اس کے لیے مجھے کوئی
خاص کوشش بھی نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ یہ دنیا گول ہے اور
تم ایک دائرے میں بھاگ رہے ہو۔ میں اگر کسی ایک مقام
پر ٹھہر بھی جاؤں تو تم لا محالہ مجھ سے آکر ٹکراؤ گے۔ بھاگو.....
جتنا تیز بھاگ سکتے ہو..... مجھ سے دور ہونے کے لیے اپنے
جسم و جان کی ساری توانائی صرف کر ڈالو..... میں کسی نہ کسی
طرح تم تک پہنچ ہی جاؤں گی.....“

اس کے انداز میں ایک کھلا چیلنج تھا۔ ڈیٹیفیاء کے الفاظ کی
سنسنی خیزی نے مجھے ہلاک کر رکھا دیا اور میں بڑا کرکھ بیٹھا۔

میرا پورا بدن پسینا اگل رہا تھا اور دل کی دھڑکن بھی
بلند ترین سطح کو چھو رہی تھی۔ بیڈروم کا آئینہ بڑی سبک
خوئی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کمرے کا درجہ
حرارت اتنا تھا کہ پسینا آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ یقیناً یہ اس خواب کے اثرات تھے جو تھوڑی دیر پہلے
میں نے دیکھا تھا اور اس سنسنی خیز خواب نے میرا بلند پریشر
بڑھا دیا تھا۔ میری یہ کیفیت ڈیٹیفیاء کے اس معنی خیز چیلنج کے
باعث ہوئی تھی جس کے مطابق، وہ مجھے چھوڑنے والی نہیں
تھی۔ اس کے مزید۔ عزائم کیا تھے، ہر دست میں ان کے
بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں تو اس کے صرف ایک ہی
عزم سے واقف تھا کہ وہ مجھے اپنی سوسائٹی کا ممبر بنانا چاہتی
تھی اور میں نے ڈیٹیفیاء کی اس خواہش کو اپنے پاؤں تلے
روند ڈالا تھا۔ پریسٹن ہال والے بینک پر میں نے اس کی
پیشکش کی یہ قول کے، مٹی پلید کر دی تھی۔ وہ میرے فیصلے پر
زخمی شیرنی کے مانند بہت تملاتی تھی۔ اس وقت ڈیٹیفیاء کو مجھ
پر غرآنے یا مجھ پر جھپٹنے کا موقع نہیں ملتا تھا لیکن اب مجھے اس
کے انداز میں ہلا کی غراہٹ اور خوف ناک محسوس ہوئی تھی۔

میں نے تین چار گہری سانسیں لے کر اپنے حواس کو
مجمع کیا پھر میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھی تھی۔
کلاک ڈھائی بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میں لگ بھگ ساڑھے
بارہ بجے سویا تھا اور سونے سے پہلے میں نے اپنے دماغ کو

ہوئے کہا۔ ”لیکن تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو ادھر گیٹ پر ہونا چاہیے.....!“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔“ وہ خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ ”میری ڈیوٹی ادھر گیٹ پر ہی ہے۔ میں تو ذرا کھانے پینے کا بندوبست کرنے یہاں آیا تھا۔“

”کیا تمہیں بھوک محسوس ہو رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں سر.....“ اس نے نفی میں گردن ہلاتی اور بتایا۔ ”کوئی ایسی خاص تو نہیں۔“

”پھر.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مفہوم سمجھ گیا اور جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”سر! روزہ رکھنے کے لیے سحری کرنا ضروری ہے اور سحری میں کچھ نہ کچھ تو کھانا ہی پڑتا ہے۔“

اس کے جواب سے مجھے قدرے شرمندگی کا احساس ہوا۔ اس وقت میرے ذہن میں ماہِ صیام کا خیال نہیں تھا۔ وہ اللہ کا بندہ روزے کے لیے سحری کا اہتمام کرنے میں مصروف تھا اور میں نے اسے سوالات کی باڑ پر رکھ لیا تھا۔ ندامت محسوس کرتے ہی میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ”کیا اکیلے اکیلے ہی روزہ رکھو گے؟“

”جی.....“ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میدم روزہ نہیں رکھتیں اور آپ کے بارے میں انہوں نے مجھے ایسی کوئی ہدایت دی نہیں۔“

”وہ تمہیں بتانا بھول گئی ہوں گی۔“ میں نے سچویشن کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے لیے بھی سحری تیار کرو۔ میں بھی روزہ رکھوں گا۔“

روزہ رکھنے کا خیال یکایک میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ شاید یہ اس خفت کا نتیجہ تھا جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب میں جشید سے سوال و جواب کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے سر! آپ اپنے کمرے میں جا سکیں۔“ وہ بڑے ادب سے بولا۔ ”میں آپ کی سحری وہیں پہنچا دوں گا۔“ میں نے سوال کیا۔ ”کیا تم یہیں چکن میں بیٹھ کر سحری کرو گے؟“

”نہیں سر..... میں اپنے کیمین میں سحری کروں گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ تو بنگالی بابو چھٹی پر ہے جو مجھے چکن میں آ کر سحری بنانا پڑی ورنہ بنگالی بابو میرے لیے ادھر کیمین ہی میں سحری پہنچا دیا کرتا ہے۔“

”یہ بنگالی بابو کون ہے؟“ میں نے الجھن آمیز لہجے میں استفسار کیا۔ ”ہمارا خاںساں۔“ وہ عام سے انداز میں بولا۔

ہدایت بھی دی تھی کہ میں صبح نو بجے تک پرسکون، بیٹھی اور گہری نیند سوؤں گا لیکن اگر میری اس نیند کے دوران میں میری جان کو کوئی خطرہ ہوا یا اس گھر کی چار دیواری میں کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی توقع ہوئی تو میری آنکھ وقت مقررہ سے پہلے ہی کھل جائے گی۔

میری آنکھ وقت مقررہ صبح نو بجے سے پہلے یعنی ڈھائی بجے کھل گئی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ میرے دماغ نے ہنگامی بنیادوں پر مجھے جگا دیا تھا۔ میری جان واضح طور پر سلامت تھی۔ گویا اس گھر کی چار دیواری کے اندر کچھ غیر معمولی ہونے والا تھا..... اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔

میں بیڈ روم سے باہر نکلا اور ماں کے بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔ مذکورہ دونوں بیڈ رومز کے بیچ چنڈ کا فاصلہ تھا۔ میں نے ماں کے بیڈ روم میں جھانکنا مناسب نہیں سمجھا۔ صورت حال وہاں امن و امان کا پتہ دیتی تھی۔ میں آگے بڑھا تو قریب ہی کہیں مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

یہ احساس ایک لحاظ سے چونکا دینے والا تھا کیونکہ اس وقت ماں، میرے اور سیکیورٹی گارڈ جشید کے سوا بچکے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ ماں اپنے بیڈ روم میں پرسکون نیند سو رہی تھیں، جشید کو بچکے کے گیٹ کے نزدیک بنے گارڈ روم میں ہونا چاہیے تھا..... پھر مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا؟

اس سنسنی خیز سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر چکن تھا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ چکن کے اندر لائٹ جل رہی تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں ماں کی ضرورت کے تحت چکن میں نہ گئی ہوں یا جشید کچھ لینے وہاں پہنچا ہو۔ ایسا ہونا ناممکن تو نہیں تھا.....!

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے چکن میں پہنچ گیا اور وہاں جشید کو دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ چکن کے چولہے کے ساتھ مصروف تھا۔ میری وہاں موجودگی کو محسوس کر کے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھ پر نگاہ پڑے ہی وہ باادب، بااحتظا ہو گیا۔

”سر! آپ اس وقت یہاں.....“ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سب خیریت تو ہے نا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم کریں.....!“

”ایک دم سب خیریت ہے اور مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے

”یہ کیا بات ہوئی جشید۔“ میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ”تمہاری ایسی کیا مجبوری ہے؟“

”میری مجبوری یہ ہے سر۔۔۔۔۔ کہ میری رگوں میں ایک وفادار خون گردش کر رہا ہے۔“ وہ ہنسرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میڈم کے مجھ پر اور میری فیملی پر ان گنت احسانات ہیں۔ میں ان کا نمک خوار ہوں۔ میں انہیں کیسے دھوکا دے سکتا ہوں۔ ان سے کوئی بات چھپانے کو بھی میں دھوکا ہی سمجھتا ہوں اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ۔۔۔۔۔“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے استفسار کیا۔ ”کیا ہو سکتا ہے جشید؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے آزار ہے ہوں!“

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

جشید میری توقع سے زیادہ ذہین، سمجھدار اور وفادار شخص تھا۔ وہ میرے مقدمے کی تک پہنچ گیا تھا۔ ماں نے اس کو اپنا سیکورٹی گارڈ رکھ کر عقل مندی اور بردباری کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”جشید! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری میڈم کو بتا دوں گا کہ میں نے خود اپنی مرضی سے تمہارے کین میں پیٹھ کر سحری کی تھی۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تمہیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں کریں گی۔“

”آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں سر۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی بات کو بھی تو نہیں ٹال سکتا۔“

”ٹھیک ہے، تم سحری لے کر اپنے کین میں پہنچو۔ میں بٹکے کا ایک راؤنڈ گا کر تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”اوکے سر!“

میں جشید کو کین میں چھوڑ کر باہر نکل آیا اور گھوم پھر کر باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ بٹکے کا چکر لگانے لگا۔ اس راؤنڈ کا مقصد محض اپنی تسلی کرنا تھا کہ کہیں اس گھر کی چار دیواری کے اندر تو کوئی گڑبڑ نہیں جو وقت مقررہ سے پہلے میری آنکھ کھل گئی تھی کیونکہ یہ تو میں چیک کر چکا تھا کہ فی الحال میری جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

وہ ایک جس زدہ رات تھی۔ بیڈروم کے اندر تو اسے سی کی وجہ سے خاصا خوشگوار ماحول بنا ہوا تھا لیکن بٹکے کے بیردنی جھے میں کراچی کا اصل موسم جلوہ گر تھا۔ کراچی اور ٹیکساس کے موسم میں اتھارہ بیس ہی کا فرق ہے۔ یعنی اگر ٹیکساس اٹھارہ تو کراچی بیس سمجھ لیں۔ جون جولائی میں ادھر

”اس کا اصل نام تو محمد حسین ہے مگر میڈم اسے بنگالی کہہ کر پکارتی ہیں لہذا میں بھی اسے یہی کہتا ہوں۔ محمد حسین کا لعلق بنگلا ویش سے ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

ماں نے کل مجھے بتایا تھا کہ ان کے ہاں ایک تجربہ کار باورچی کام کرتا ہے جو پختے میں ایک دن یعنی اتوار کی چٹنی کرتا ہے لیکن ماں کی ہدایت کے مطابق وہ اتنا کھانا بنا کر رکھ جاتا ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں ماں کو کسی قسم کی دقت یا دشواری محسوس نہ ہو۔ ماں نے مذکورہ باورچی کے کھانوں کی بہت تعریف کی تھی۔

”بس آج ہی کی بات ہے سر۔“ جشید نے بتایا۔

”بنگالی بابو پھر کی صبح ڈیوٹی پر آ جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے جشید! تم میری اور اپنی سحری لے کر اپنے کین میں پہنچو۔“ میں نے کہا۔ ”پانچ منٹ میں، میں بھی وہیں آتا ہوں۔ پھر ہم دونوں ساتھ مل کر سحری کریں گے۔“

”آپ۔۔۔۔۔ میرے کین میں۔۔۔۔۔ سحری کریں گے۔۔۔۔۔ سر۔۔۔۔۔؟“ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔!“ میں نے پوچھا۔ ”اس میں کوئی پرالیم ہے کیا؟“

”سر۔۔۔۔۔ آپ میڈم کے مہمان ہیں۔“ وہ اپنی عقل اور فہم کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور میں ادنیٰ سا ملازم ہوں۔“

”کیا ملازم انسان نہیں ہوتے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پاکر وہ انسان ہوتے ہیں تو تمہاری نظر میں مہمان انسان نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ اس لیے یہ دونوں ایک دسترخوان پر پیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے۔۔۔۔۔؟“

”یہ بات نہیں ہے سر۔۔۔۔۔“ وہ انجمن زدہ انداز میں بولا۔

”پھر کیا بات ہے؟“

”بس سر! مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اور کیا وضاحت کرے۔ ”اگر میڈم کو اس بات کا پتا چلا تو وہ مجھ سے لازمی تھنا ہوں گی۔“

”میڈم کو بتانے کی ضرورت کیا ہے۔“ میں نے اس کی وفاداری کی جانچ کرتے ہوئے کہا۔ ”نہ تم بتانا اور نہ ہی میں ایسا کوئی ذکر کروں گا۔ اس طرح انہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔۔۔۔۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔“

”نہیں سر۔“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”آپ چاہے کوئی ذکر نہ کریں مگر میں یہ بات ان کے علم میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

نیکاس میں بھی کم دیش ایسی ہی گھن و کینے کو ملتی ہے۔

دس منٹ کی مزگشت کے بعد میں مطمئن ہو کر جشیہ کے کین میں آ گیا۔ بنگلے کی چار دیواری کے اندر ہر طرف امن اور سکون خیرہ زن تھے۔ کہیں بھی مجھے کسی اتیری کے آثار نظر نہیں آئے۔ بنگلے کے چاروں طرف سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اب ایک ہی بات مجھ میں آئی تھی کہ وقت مقررہ سے پہلے میری آنکھ کھلنے کا سبب محض وہ خواب تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا لہذا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مذکورہ خواب میری زندگی میں کسی زاویے سے بے پناہ اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے اس پر خصوصی توجہ دینا چاہیے اور یہ بھی مجھے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس خواب میں میرے لیے کیا پیغام ہو سکتا تھا.....!

سحری کرنے کے دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جشیہ کی زبانی مجھے پتا چلا کہ بنگالی بابو محمد حسین پچھلے پانچ سال سے ماں کے ہاں ملازم تھا۔ اس کی فیملی نزدیک ایک ہستی میں رہتی تھی۔ وہ روزانہ صبح دس بجے بنگلے پر آتا اور رات کو دس بجے اس کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ وہ ہفتہ وار، اتوار کو ایک دن کی مکمل چھٹی کرتا تھا۔ بنگالی بابو کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔

”تم کب سے میڈم کے پاس ملازم ہو؟“ میں نے جشیہ سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”گج بھگ آٹھ سال سے ان کی خدمت میں ہوں۔“

”تم نے کچن میں بتایا تھا کہ میڈم نے تم پر ان گنت احسانات کر رکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم مجھے ان احسانات کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟“

”کوئی ایک احسان ہو تو بتاؤں سر۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”یوں سمجھ لیں کہ میڈم کے سلوک نے مجھے اور میری پوری فیملی کو خرید لیا ہے۔ اگر میڈم کو ہماری جان کی ضرورت ہو تو ہم ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔“

”تھوڑی تفصیل تو بتاؤ یار۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے بھی تو پتا چلے کہ میڈم نے تم کو لوگوں کے ساتھ ایسا کون سا سلوک کیا ہے جو تم اپنی جان ان پر بچھاؤ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہو؟“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو پتا ہے نا، پاکستان میں چند سال پہلے بڑا خوف ناک زلزلہ آیا تھا..... جب آٹھ اکتوبر کو پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں قیامت صغریٰ برپا ہو گئی تھی۔“

”تمہارا تعلق کس علاقے سے ہے؟“

”آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد سے۔“ اس نے کبھی لہجے میں بتایا۔ ”میں مظفر آباد کے علاقے گوجرہ کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔“

”تم لوگوں کا تو بہت نقصان ہوا ہوگا؟“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... اس عفریت نے میرے والد صاحب، میرے بڑے بھائی گل داد کی بیوی جیلہ اور ان کے دو معصوم بچوں کو بھی لنگ لیا تھا۔“

”اوہ.....!“ میں نے غمغوم نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بہت دکھ تھا تمہاری پٹا سن کر۔ مالک مرحومین بلکہ شہداء کے درجات بلند فرمائے۔ کسی قدر ترقی آفت کے باعث ہونے والی ہلاکت بھی شہادت کے زمرے ہی میں آتی ہے۔“

”جب میری یہ پٹا میڈم نے سنی تو انہیں بھی دکھ ہوا تھا۔“ وہ اپنی ہی گھاٹل دھن میں بولنا چلا گیا۔ ”جب میں نے میڈم کے پاس ملازمت اختیار کی تو اس سانسے کو چند ماہ گزر چکے تھے۔ پتا ہے، اس کسپرسی کی حالت میں میڈم نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں فی ٹی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

”میڈم نے اپنی جیب سے ہمارے لیے پہلے سے بھی بڑا گھر تعمیر کروایا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میری بیوی میٹرک تک پڑھی ہوئی ہے۔ میری اور راشدہ کی کوئی اولاد نہیں۔ میڈم نے گھر کے ایک حصے میں راشدہ کو پرائمری اسکول کھول کر دیا۔ اس مصروفیت میں راشدہ اپنی محرومی یعنی بے اولادی کے غم کو بھی بھول گئی ہے۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس کے علاوہ میری اکلوتی بہن شامک کی شادی کا سارا خرچہ بھی میڈم نے اٹھایا تھا۔ گا ہے بے گاہے میری تنخواہ کے علاوہ بھی اگر ادھر گاؤں میں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو میڈم نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اب آپ ہی بتائیں، میں ایسی عظیم ہستی سے کس طرح نمک حرامی یا احسان فراموشی کر سکتا ہوں؟“

اپنی بات کے اختتام پر اس نے میرے لیے ایک بڑا سوال چھوڑا تھا لیکن اسے خبر نہیں تھی کہ میں کون ہوں اور میں نے اسے بتانا ضروری بھی نہیں جانا۔ اس کی زبان سے ماں

نتیجہ برآمد ہوتا کہ..... یا تو ڈیلفینیا کراچی پہنچ چکی ہے یا پھر
عقرب یہ وہ یہاں پہنچنے والی ہے!

جب پہلی مرتبہ پریسٹن ہالو والے بنگلے پر میں نے یہ
خواب دیکھا تھا تو اس کے بارے میں رلی آنرک سے میں
نے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ خواب بالکل سچا
ہے۔ مجھے بشارت دی گئی ہے کہ ڈیلفینی کو ایک بہت بڑے
اعزاز سے نوازا جائے والا ہے۔ جب میں نے اس کی تفصیل
جاننے کی کوشش کی تو رلی نے کمال مہارت سے گفتگو کا رخ
میرے والدین کی جانب موڑ دیا تھا۔ بعد ازاں ایک موقع
پر جب میں نے ڈیلفینیا سے اپنے اس خواب کا تذکرہ کیا تھا
اور اسے یہ بھی بتایا تھا کہ رلی آنرک نے اس کی تصدیق کی
ہے تو اس نے کہا تھا..... ”ہاں! تم نے اپنے خواب میں جو
عالی شان قدیم طرز کا ہال دیکھا، وہ عمارت یروشلم میں ہے۔
میں اپنے حالیہ کیمپوزوں سے نمٹ لوں تو پھر مجھے یروشلم جانا
ہوگا جہاں میرے اعزاز میں اس شاندار تقریب کا انعقاد ہوگا
جو تم نے اپنے خواب میں دیکھا ہے۔“

میں نے اس کا فواد احسنہ سے سوال کیا تھا۔ ”کیا تم
مجھے بتانا پسند کرو گی کہ تمہاری یہ تاج پوشی کس سلسلے میں
ہونے والی ہے؟“

”آئی ایم سوری۔“ اس نے مجھے دکھا جواب دیتے
ہوئے کہا تھا۔ ”یو آر ناٹ اے ممبر آف آڈر سوسائٹی۔ اس
لیے میں تمہارے ساتھ یہ راز شیئر نہیں کر سکتی۔“

میرے اور ڈیلفینیا کے بیچ معاملہ صرف اسی راز کے
شیئر کرنے یا نہ کرنے تک محدود نہیں تھا۔ وہ بڑی چٹکاری
اور موڈی عورت تھی۔ اس نے مجھے دکھایا کہ اور مجھ سے
چھپایا زیادہ تھا۔ وہ اکثر اپنی سوسائٹی کے بارے میں
بڑے انکشاف انگیز انداز میں ادھوری بات کر کے میرے
اندر تجسس کو ابھارتی تھی پھر جب میں پلٹ کر اس کی سیکرٹ
سوسائٹی کے حوالے سے کوئی سوال کرتا تو وہ یکا یک آنکھیں
ماتھے پر ہلکے چوٹی پر رکھ لیتی تھی اور مجھے احساس دلانے کی
کوشش کرتی تھی کہ جب تک میں ان کی سوسائٹی کو جو ان
نہیں کروں گا، وہ میرے ساتھ آنے والی نہیں۔ ڈیلفینیا کا
شمار ان دلکش اور دلغز پر عورتوں میں ہوتا تھا جو بھی کسی مرد کو
کھل طور پر حاصل نہیں ہوتیں، اپنی چند حشر ساماں اداؤں
ہی سے وہ بڑے بڑے جیتا مردوں کے غبارے کی ہوا
 نکال دیتی ہیں۔

وہ مجھے اپنی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانے کے لیے
پریسٹن ہالو والے بنگلے پر لے کر گئی تھی اور وہاں پر اس نے

کی بڑائی سن کر میرے دل و جگر میں ایک ٹھنڈک سی اتر گئی
تھی۔ میں نے جمید کے سوال کا گول مول جواب دیتے
ہوئے صرف اتنا کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو.....!“

سحری کا وقت ختم ہونے میں جب دس منٹ باقی تھے
تو میں جمید کے کیمپن سے نکل کر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔
بستر پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کیں تو بند
آنکھوں کے پیچھے ڈیلفینیا کا دلکش چہرہ روشن ہو گیا۔ اس کے
ساتھ ہی خواب میں کہے ہوئے اس کے الفاظ بھی ذہن میں
تازہ ہو گئے۔ اس نے پہنچنے کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
”ہجھ! تم چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤ، مجھے
تمہارے قریب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مجھ سے دور
ہونے کے لیے جا بے تم اپنے جسم و جاں کی ساری توانائی بھی
صرف کڑا لو، میں کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ ہی جاؤں گی۔“
اس کے پہنچنے سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے
پاس کراچی آنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس خیال نے مجھے بے
حد چوکنہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مقبول بھٹی کے کہے ہوئے
الفاظ میری یادداشت میں ابھر آئے۔ بھٹی صاحب نے
اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ ان لمحات میں وہ علی پکڑ سے
مخاطب تھے۔

”سائیں! میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ میں صرف اتنا
جانتا ہوں کہ اسد صاحب سے جن تین عورتوں کا گہرا تعلق
ہے، ان میں سے دو عورتیں اس وقت پاکستان میں موجود ہیں
اور تیسری ادھر امریکا میں ہے۔ پاکستان میں موجود دو عورتوں
میں سے ایک سے تو اسد کی ملاقات ہو گئی ہے اور دوسری سے
بہت جلد ملاقات ہوگی..... یہیں کراچی میں.....!“

میں نے بھٹی صاحب کو جن تین عورتوں کے بارے
میں بتایا تھا ان میں ایک تو میری والدہ سہیلی یعنی ”ایس“
تھیں۔ دوسری شارو یعنی ”سی“ تھی اور تیسری ڈیلفینیا یعنی
”ڈی“ تھی۔ سہیلی صاحب سے میں ملاقات کر چکا تھا۔ اب
دیکھنا یہ تھا کہ عقرب کراچی میں میری ملاقات شارو سے
ہونے والی تھی یا ڈیلفینیا سے۔ شارو سے ملاقات کا امکان
اس لیے صفر کے برابر تھا کہ لیونا رڈ نے اسے نیکیاس کے
شہر ایک بینکس سے اغوا کر کے یکو کے شہر ہوانا پہنچا دیا تھا
اور وہ وہاں غیبت غنڈے سے لیونا رڈ کی کھڑی میں تھی۔ اب
ڈیلفینیا ہی باقی بچتی تھی۔

مقبول بھٹی کی پیش گوئی کو اگر میں آج والے خواب
کے ساتھ جوڑ کر غور و خوض کرتا تو اس سوچ بچار کا ایک ہی

دو اہم افراد ربی آئزک باروش لاؤ اور فلسفی کی پروفیسر ایما ایپل بام سے میری ملاقات بھی کرائی تھی۔ ان دونوں افراد میں ایک قدر مشترک بھی تھی کہ ایما ایپل بام اور ربی آئزک کا تعلق امریکی ریاست کنکٹی کٹ کے علاقے نیو ہیون میں واقع ہیل یونیورسٹی سے تھا۔ ہیل یونیورسٹی کی اہمیت اس حوالے سے بھی تھی کہ ”اسکل اینڈ ہونز“ نامی سیکرٹ سوسائٹی کا ہیڈ کوارٹر وہیں پر تھا۔ ایما ایپل بام یہود تھی اور اسی یونیورسٹی میں فلسفی کی پروفیسر تھی۔ اس نے مجھے ہیل یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی پیشکش بھی کی تھی مگر میں نے ڈیلفینا کی تمام تر کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا، یہ الفاظ دیگر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سارے غباروں کی ہوائ نکال کر چلا جاتا تھا۔

ڈیلفینا نے بعض مواقع پر ”اسکل اینڈ ہونز“ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مختلف ڈگریوں کا بھی ذکر کیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ کسی بھی ممبر کے لیے سب سے بڑی ڈگری تھری تھری یعنی تینتیس ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ماسٹر ڈگری کہلاتی ہے۔ جب سوسائٹی کا کوئی ممبر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے تھری تھری ڈگری تک پہنچ جاتا ہے اور یہ ڈگری حاصل کر لیتا ہے تو پھر ایک شاندار تقریب میں اس کی تاج پوشی کر کے اسے اس اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ گویا وہ سوسائٹی سے فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سوسائٹی کے حکم پر وہ علی میدان میں قدم رکھ دیتا ہے۔ اسے دنیا کے کسی مخصوص علاقے کا پوشیدہ حکمران بنادیا جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ سکون سے بیٹھ کر ظاہرہ حکمرانوں کی لگا میں کھینچتا رہتا ہے اور انہیں اپنے اشاروں پر بچتا رہتا ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے ایک خطرناک خیال نے میرے ذہن میں سراٹھایا اور وہ یہ کہ..... کہیں ڈیلفینا کو تھری تھری ڈگری سے نواز کر کسی خصوصی مشن پر پاکستان تو نہیں بھیجا جا رہا.....؟

یہ سوال جتنا خطرناک اور فکر انگیز تھا، اتنا ہی ہلاکت خیز بھی تھا۔ اس کے جلو میں مجھے بہت سی وحشتیں اور ڈھشتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ میرے لیے باخبر، ہوشیار ہونے کا وقت تھا۔ میں ڈیلفینا کی اتنا پرکاری ضرب لگا کر پریسشن ہالو والے بینکے سے نکلا تھا۔ وہ مجھے اپنے سامنے جھکانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی..... کچھ بھی!

میں نے ڈیلفینا اور اس کے آئندہ مشن کو جو تے کی نوک پر مارا اور سکون کی چادر اوڑھ کر نیند کی پرفضا وادی میں اتر گیا۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر میں میری آنکھ کھلی۔ میں نے سات آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لی تھی اس لیے خود کو بڑا ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے پندرہ بیس منٹ واش روم میں صرف کیے اور فریش ہو کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔

میرا ارادہ تو سیدھا ماں کے پاس جانے کا تھا لیکن میرے قدم ڈرائنگ روم کی سمت اٹھ گئے اور اس اچانک فیصلے میں تبدیلی کا سبب وہ آوازیں تھیں جو ڈرائنگ روم کی جانب سے چل کر میری سماعت تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ وہ بہت سی خواتین کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں تھیں اسی لیے میں ان آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس بینکے میں ماں کے سوا اور کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ پھر وہ سب کون تھیں اور اس وقت وہاں کیا کر رہی تھیں..... ان پر تجسس سوالات نے مجھے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں ماں کو پانچ حسین و جمیل لڑکیوں کے ساتھ مجھ گفتگو کیا۔ وہ پانچوں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ان لڑکیوں کو حسن و خوب صورتی کے شاہکار کہا جاسکتا تھا۔ ان کے چہرے دلکش و دلنشین تھے اور سراپا میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی جو دیکھنے والے کی آنکھ کو ایک جگہ ٹھہرا کر مسحور و مسحور کر دیتی تھی۔ انتہائی مختصر اور جامع الفاظ میں وہ چاروں دلوں کو تر پانے اور حواس پر بجلیاں گرانے والی لڑکیاں تھیں۔

ماں نے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو بڑے محتاط انداز میں بولیں۔ ”علی! میں تو تمہارے لیے زبردست ناشتے کا بندوبست کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن پھر مجھے پتا چلا کہ تم نے روزہ رکھ لیا ہے۔“

ماں نے مجھے ”علی“ کہہ کر مخاطب ضرور کیا تھا لیکن اپنی بات سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ ہمارے بیچ کیا رشتہ ہے لہذا میں نے بھی احتیاط کے تقاضے نہ مانا ضروری جانا اور ایک خالی صوفے پر بیٹھنے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

”جی آئی..... آپ کا جاسوسی کا نظام بڑا افعال اور شاندار ہے۔ یقیناً آپ کو یہ بات جوشید نے بتائی ہوگی!“

”مگ..... تمہارا اندازہ درست ہے۔“ ماں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر ان پانچوں پری دشوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”یہ رفیق صاحب ہیں، میرے ایک عزیز و صدیق صاحب کے بیٹے۔ ان کا پورا نام رفیق علی ہے لیکن میں صرف علی کہہ کر پکارتی ہوں.....“

ان میں سے ایک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں میڈم! آنٹی نگینہ نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ ادھر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ آپ انہی کے ساتھ عمرہ کرنے جا رہی ہیں۔“

”بالکل..... نگینہ نے تم لوگوں کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔“ ماں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”یہ سحرش، آرزو، پینا، روبی اور شیلہ ہیں۔ یہ پانچوں ادھر نزدیک ہی ایک پتھلے میں رہتی ہیں۔ کل میں نے نگینہ کو انہی کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔“

ماں نام لے کر ان ماہ جینوں کو مجھ سے متعارف نہ بھی کرتی تھیں تو میں بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ کن ہیں اور ماں کے ساتھ ان کا کس قسم کا کنکشن رہا ہے۔ ”رہا ہے“ کے الفاظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ جس بزنس کے توسط سے یہ ماں کی زندگی کا حصہ ہوا کرتی تھیں، اس بزنس کو ماں نے غلوں میں سے خیر باد کہہ دیا تھا۔ ماں کو ایک بار یہاں سے لٹکانا تھا تو پھر حیات اس زندگی اور اس سے متعلق افراد کی جانب پلٹ کر نہیں دیکھنا تھا۔ ماں نے جس لمحے مجھے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تھا، میرے ذہن نے ماں کو اسی وقت اس ”لائف سیٹ اپ“ سے خارج کر دیا تھا لہذا آرزو، سحرش، شیلہ، روبی اور پینا میری نگاہ میں ماں کی ذات کے حوالے سے قصہ پارینہ بن چکی تھیں۔

میں جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کے بائیں ہاتھ والے سنگل صوفے پر ماں براجمان تھیں۔ میرے سامنے والے بڑے صوفے پر آرزو، شیلہ اور روبی بیٹھی تھیں اور میرے دائیں ہاتھ والے صوفے پر پینا اور سحرش موجود تھیں۔ میرے اور پینا کے درمیان ایک، ڈیڑھ فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ ہم سب کے بیچ گلاس ٹاپ والی ایک شاندار منتقل چوبی میز تھی جس کے اوپر ہم سب کے آئی فون رکھے ہوئے تھے۔ ان پانچوں نے اپنے پرس ڈرائنگ روم کے فرش پر تالین کے اوپر رکھ چھوڑے تھے۔ ویسے تو وہ پانچوں کی پانچوں اپنی مثال آپ تھیں لیکن میری نگاہ پینا کے چہرے سے بار بار الجھ جاتی تھی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ وہ باقی چاروں سے کافی مختلف تھی۔ اس کے انداز میں بڑی انفرادیت پائی جاتی تھی۔ دیکھنے میں وہ ایشیا اور یورپ کا ملن نظر آتی تھی۔ میرے مختار انداز سے کے مطابق، اس یوریشین لڑکی کے والدین میں سے ایک کا تعلق ایشیا سے اور دوسرے کا یورپ سے ہونا چاہیے تھا۔ اس خوب رولوکی کو بلاشبہ بلونڈ کہا جاسکتا تھا۔

اس کے بال شہدرنگ تھے مگر آنکھوں کا رنگ ایک دم سیاہ تھا اور وہ خاصی نمایاں بھی تھیں۔ ہونٹ ریلے اور قدرے ابھرے ہوئے جن کے لیے مقابلہ حسن کی اصطلاحات میں ”پولپس“ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ متاثر کن شخصیت کی مالک، بے پناہ اہلی کی حامل لڑکی تھی۔

اس باہمی گفتگو کے دوران میں ماں نے انہیں اپنے عمرے والے پلان سے آگاہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ ماں کی غیر موجودگی میں پوری طرح آنٹی نگینہ کو فالو کریں گی۔ انہوں نے باری باری ماں کو اپنی وفاداری اور فرماں برداری کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہو گئیں۔

ان کے جانے کے بعد میرے اور ماں کے بیچ کافی دیر تک مستقبل کے حوالے سے منصوبہ بندی ہوتی رہی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جس دوران میں، میں سو رہا تھا، انہوں نے امریکا کے ویزے کے سلسلے میں دو اہم کام نمٹا دیے تھے یعنی انہوں نے اپنے بینک سے پچھلے چھ ماہ کا ڈاؤنٹ اسٹیٹ منٹ بنوالیا تھا اور نوٹری پبلک سے مل کر اپنی جائداد اور دیگر قیمتی اشیاء کا بکے اسٹیپ پیپر پر ایفی ڈیوٹ بھی تیار کر دیا تھا۔ گویا انہوں نے اپنے حصے کا کام نمٹا دیا تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے نوٹو بھی کھنچوالیے تھے۔ لگ بھگ تین بجے عظیم میرے پاس پہنچ گیا۔ ماں نے ہمیں فری پیڈ دے دیا تاکہ ہم اطمینان سے آن لائن ان کا اپنی کیشن فارم بھر سکیں۔ ہم دونوں، میرے والے بیڈ روم میں آ بیٹھے۔

کام کے دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ امریکا کا آن لائن ویزا فارم پانچ چھ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے مکمل کرنے میں اچھا خاصا وقت لگتا ہے۔ مجھے ایک ترتیب سے کام کرتے دیکھا تو عظیم نے کہا۔ ”یار! تم تو بڑی روانی سے کام کر رہے ہو۔ ایسا لگتا ہے، یہ تمہارا پروفیشن ہو جبکہ مجھے اس پروسس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تین چار مرتبہ ڈرائی مارنا پڑی تھی۔“

”یہ ہرگز میرا پروفیشن نہیں ہے برو!“ میں نے.. دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”میری روانی اور آسانی کا سبب یہ ہے کہ میں امریکی ہوں اس لیے امریکیوں کی ذہنیت اور امریکی گورنمنٹ کی پالیسیوں سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی کس بات سے ان کی کیا مراد ہے لہذا اس فارم کے مندرجات کو سمجھنے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ بس اتنی ہی بات ہے۔“

لیے کس طرح تم لوگوں کو ملین ڈالرز کی گولڈن آفر کر رکھی ہے۔ ہو سکتا ہے، تمہاری یہ تاثیر ابھی فیک ہی ہو اور تمہارے جذبات سے کھلواؤ کر رہی ہو.....!“

”ایسا نہ کہو برو۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ”پہلے ہی فرحان نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“

”یہ فرحان کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور یہ بندہ ہماری گفتگو کے بیچ کہاں سے ٹپک پڑا؟“

”فرحان میرا بڑا گہرا دوست ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے فرحان کو تاثیر کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ میں نے اسے تاثیر کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ وہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ کہتا ہے، وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ تاثیر مشکل ہی سے ہلا کو خان کی پوتی نظر آتی ہے۔ وہ تمہارے جذبات کا ایسا حشر نشر کرے گی کہ کسی سے ذکر کرنے کے قابل بھی نہیں رہو گے لیکن میں فرحان کی بات کا یقین نہیں کرتا۔“

”دراصل تم تاثیر کے ساتھ دل لگا چکے ہو۔“ میں نے گہری تنبیہ سے کہا۔ ”اس لیے تمہارا دل کسی بھی قیمت پر اس کے فیک ہونے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس کی مخالفت میں جانے والی ہر بات کو تمہارا دل ماننے سے انکار کر دیتا ہے اسی لیے تمہیں فرحان کی..... اور میری بات کا یقین نہیں آ رہا۔ ایم آئی رائٹ؟“

”یسی! یو آر ایسولیوٹیو رائٹ۔“ وہ طعش انداز میں بولا۔ ”یہ واقعی میرے لیے دل کا معاملہ بن چکا ہے لیکن فرحان کی بات پر یقین نہ کرنے کا ایک اور بھی سبب ہے۔“

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یار اودہ کا فر ہے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔

”تمہارا مطلب ہے، فرحان اتھیسٹ ہے؟“

”تم اسے اتھیسٹ کہو، دہریہ کہو، منکر خدا کہو، کیونسٹ کہو، کامریڈ کہو یا کافر کہو..... ایک ہی بات ہے۔“

وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ کافر کیا جیں، دل کا لگانا کیا ہوتا ہے!“

”اتھیسٹ دل کا لگانا جانتے ہوں یا نہیں جانتے ہوں لیکن ایک بات مجھے معلوم ہے کہ یہ لوگ دماغ کا لگانا بیوقوفی جانتے ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو یار؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”برو! اتھی ازم میں کٹ منٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”ہر اتھیسٹ اپنے کاز

کے ساتھ بڑا کیٹیڈ ہوتا ہے۔“

”کیا تم اتھی ازم کی حمایت کر رہے ہو؟“ اس نے عجیب سی نظر سے مجھ دیکھا۔

”بات حمایت یا مخالفت کی نہیں میرے دوست۔“ میں نے معقول انداز میں کہا۔ ”میں نے تو اپنے مشاہدے اور تجربے کو بیان کیا ہے۔ آج میں تمہیں اتھیسٹ افراد کے بارے میں ایک خاص الخاص بات بتاتا ہوں.....“

وہ ہمتن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”بتاؤ برو!“

”یہ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ خدا کو نہیں مانتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی لوگ سب سے زیادہ خدا کی مانتے ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی یار؟“ اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

”بات یہ ہوئی یار کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ پورا تو لیتے ہیں۔ کسی چیز میں ملاوت نہیں کرتے حتیٰ کہ اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا بھی پاس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی خوشی، اطمینان اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ انہوں نے قدرت کے آفاقی اصولوں کو اپنی زندگی میں نافذ کر رکھا ہے۔“

”یار! تمہارے بیان میں بڑی فصاحت اور بلاغت پائی جاتی ہے۔“

”شکریہ۔“ جلیں جی ایک کام تو ہوا؟“

”کونسا کام؟“

”ٹورسٹ کے لیے امریکا کا وزٹ ویزا فارم“ ڈی ایس۔ ون سکسٹی“ مکمل ہو گیا ہے۔“ میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”اور ویزا فیس ون سکسٹی امریکی ڈالرز ڈیپازٹ کرنے کے لیے کونسلٹ کا اکاؤنٹ نمبر بھی امی میل کے ذریعے وصول ہو گیا ہے۔“

”اوکے ویری گڈ..... مگر اب یہ کام پرسوں ہی ہوگا۔“

”پرسوں کیوں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آج باکل کیوں نہیں.....!“

”اگر ہم بارودھاڑ کرتے ہوئے ابھی لائٹ بیٹک کی کسی آن لائن برانچ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ کام ہاتھ کے ہاتھ ہو جائے گا ورنہ معاملہ پرسوں پر چلا جائے گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”اس کا سبب یہ ہے کہ بیٹک کا ٹائم ختم ہونے میں بس پندرہ بیس منٹ باقی ہیں اور کل یکم جولائی کو بیٹک ہالٹیڈے کی

روانہ ہو جائیں گے۔“ ماں نے جواب دیا۔

”بس تو پھر شیک ہے۔“ وہ ایک اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تو آپ لوگوں کی روانگی میں کافی دن باقی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں تمام کام خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔“

”ان شاء اللہ.....!“ ماں نے مضبوط لہجے میں کہا۔
نادر شاہ نے ہمارے ساتھ انتظار کیا پھر ماں سے ہینکلے کی فروخت کے حوالے سے چند متعلقہ دستاویزات کی فوٹو کاپی لے کر رخصت ہو گیا۔

نادر شاہ کے جانے کے بعد ماں نے مجھ سے پوچھا۔
”علی! شاہ جی تمہیں کیسے لگے؟“

”ماں! آپ کو شاہ جی پر اندھا اعتماد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بس، میرے لیے یہی کافی ہے۔ ظاہر ہے، آپ کسی غلط آدمی پر تو بھروسہ کر نہیں سکتیں!“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”آج شاہ جی سے تمہاری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ دو چار مرتبہ ملو گے تو وہ تمہاری سمجھ میں آ جائیں گے۔“
میں نے ماں کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور انہیں پوری تفصیل کے ساتھ وہ کہانی سنائی جو ان کے ویزا کے مسئلے میں میری کوششوں پر مبنی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولیں۔
”واہ بھی..... یہ تو کمال ہو گیا۔ اب آگے اور سکتے اسٹیپ ہیں؟“

”صرف ایک اسٹیپ باقی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”میں سمجھی نہیں۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھ دیکھنے لگیں۔
میں نے سمجھایا۔ ”اگر آج کونسلٹ کے آفس ٹائم میں ہم آپ کی ویزا انٹرویو جمع کروادیتے تو تھوڑی دیر کے بعد انٹرویو کا اسکینول ہمیں موصول ہو جاتا۔ اب یہ کام مجھے امید ہے، کل دو پہر تک ہو جائے گا۔ امریکی کونسلٹ آپ کے انٹرویو کے لیے دو تین تاریخیں اور دو تین اوقات آفر کرے گی۔ ان میں سے جو تاریخ اور وقت ہمیں موزوں لگے گا، وہ ہم کونسلٹ کو کفرم کر دیں گے۔ بس پھر اس تاریخ کو آپ نے مقررہ وقت سے کم از کم ایک گھنٹا پہلے اپنے پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور دیگر ضروری کاغذات کے ساتھ انٹرویو کے لیے امریکی کونسلٹ پہنچ جانا ہے۔“

”وہ لوگ عموماً کتنے دن میں پاسپورٹ واپس کر دیتے ہیں؟“ ماں نے پوچھا۔

”یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”ویسے عموماً اس پردس میں تین سے آٹھ دن لگ جاتے

کر اس کے چرے پر بے پناہ خوشی چمک اٹھی تھی۔ وہ میری بازو بانی پر بار بار ماں کو مبارکباد دے رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی مختصر گفتگو کی۔ چونکہ ماں نے خود ہی میرے بارے میں نادر شاہ کو تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا، اس لیے اس نے مجھ سے زیادہ سوالات نہیں کیے البتہ اس نے دو تین مرتبہ مجھے یہ نصیحت ضرور کی۔

”دیکھو بیٹا! تمہاری ماں نے بہت صدمے اٹھائے ہیں۔ اللہ نے تمہیں سلی بیٹن سے ملوایا ہے تو قدرت کی اس نوازش کی قدر کرنا۔ جب تک تم لوگ یہاں سے روانہ نہیں ہو جاتے، بہت زیادہ احتیاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہاری شکل ہو یہ جو حیرانگی کی صورت ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ زیادہ دقت گھر کے اندر اپنی ماں کے ساتھ ہی گزارو تاکہ تمہارے دشمنوں کو کوئی اچھا وار کرنے کا موقع نہ مل سکے۔“
”بہی انگل۔“ میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ”میں آپ کی ہدایات کو ذہن میں رکھوں گا۔“

”سلی بیٹن! میں تمہارے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ وہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا یہ بڑا بچہ ہے کہ تم نے مجھے قابلِ بھروسہ سمجھا۔ ان شاء اللہ! میں بھی تمہارے اعتماد کو ٹیس نہیں کٹنے دوں گا۔ جو کام تم نے میرے ذمے لگائے ہیں، یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ آپ لوگوں کے جانے سے پہلے میں ہینکلے کی فروخت کا کام نمٹا دوں گا اور اس کے بعد ٹرسٹ والے منصوبے کا آغاز کر دوں گا۔ آپ نے دینی میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ آپ وہاں کسی مقامی عربی کے ساتھ پارٹنرشپ میں کوئی بھی بزنس شروع کر دیں گی تو وہاں آپ کو سیکسٹل ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ میری دعا ہیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

”شاہ جی! آپ میرے سچے خیر خواہ ہیں اس لیے میں نے اپنا منصوبہ آپ کے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے۔“ ماں گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ”میرے ارادے کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں.....“

”بیٹن! میں آپ کی توقع سے بھی زیادہ محتاط ہوں۔“ وہ ماں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھاؤں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ لمحاتی توقف کر کے شاہ جی نے ہم ماں بیٹے کو یکے بعد دیگرے دیکھا پھر سوال کیا۔

”ویسے آپ لوگوں کا کب تک جانے کا پروگرام ہے؟“
”رمضان کے آخری عشرے میں ہم یہاں سے

معاملات ایک ہی روزنٹ جاہیں۔“

”ٹھیک ہے انکل! آپ پیپرز وغیرہ تیار کر دالیں۔“
میں نے کہا۔ ”میں ان شاء اللہ جولائی کے آخری عشرے
میں آپ کے پاس ہوں گا۔ ایک بات ذہن میں رکھیے گا
انکل کہ بے سنی والا پارٹمنٹ میں اپنے پاس رکھوں گا۔ نیکولز
اسکوائر والے اس گھر سے میری بہت سی یادیں جڑی ہوئی
ہیں۔ میں اپنی ماں کے ساتھ وہیں پر رہنا پسند کر دوں گا۔“
”میں تمہاری خواہش کا خیال رکھوں گا۔“ انہوں نے
خلوص دل سے کہا۔ ”اس سلسلے میں تم بے فکر ہو جاؤ۔“

اور میں واقعی بے فکر ہو گیا۔ مزید چند منٹ کی گفتگو
کے بعد ہمارے بیچ رابطہ موقوف ہو گیا۔ میں نے سیل فون کو
سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔
بند آنکھوں کے پیچھے نفی کا چہرہ روشن ہو گیا۔ نفی سے
میری صرف ایک ہی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی بڑے مختصر
وقت کے لیے جب میں پریسٹن ہالو والے ہنگلے پر ڈیلٹینا کے
ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ایما ایل بام کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ نفی
کو میں نے سنجیدہ کم گو، موڈی اور بیزار مزاج پایا تھا۔ اس کا
شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو بہت لیے دینے رہتے ہیں اور
اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ تعویذی دیر پہلے انکل بیگ نے
مجھے جو کچھ بتایا تھا، اس کے مطابق بھی نفی نے اسی خشک
رویے کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کی فطرت کا حصہ بلکہ خاصہ تھا۔

نفی کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان
ڈیلٹینا کی جانب چلا گیا۔ ایسا کیسے ممکن تھا کہ پریسٹن ہالو
کے ہنگلے کا خیال آئے اور ڈیلٹینا کی یاد نہ آئے۔ اب اس
بات کا مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس ہسپانوی
دوشیزہ کا میرے ساتھ بڑا گہرا رابطہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ
تعلق مستقبل میں بہت دیر تک اور بہت دور تک چلنے والا
تھا۔ پچھلی رات وہ میرے خواب میں مجھے چنچل بھی کر رہی تھی
کہ میں اگر لاکھ جاہوں بھی تو اس سے پچھانیں چھڑا سکتا۔
میں دنیا میں جہاں نہیں ہوں گا، وہ میرے تعاقب میں
دہاں پہنچ جائے گی۔

اس کا یہ چنچل خاصا تشویشناک اور فکر انگیز تھا لیکن کیا کیا
جاسکتا ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔
سیل فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے یہ سوچتے
ہوئے اپنے موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا کہ وہ عظیم ہو گا لیکن
جب فون کے اسکرین پر دیکھا تو وہاں ایک اجنبی سیل فون نمبر
نظر آ رہا تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ پوار گیر کلاک کی طرف
اٹھ گئی۔ وہاں پورے بارہ کا وقت دکھائی دے رہا تھا۔ تیسری

میں۔ مطلب، زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا کھیل ہے۔“
”علی! میں انٹرویو میں پاس ہو جاؤں گی نا؟“ وہ
حذبذب لہجے میں مستفسر ہوئیں۔

”کیوں نہیں ماں.....!“ میں نے پورے یقین کے
ساتھ کہا۔ ”آپ ایک سواک فیصد کامیاب ہوں گی۔ جب
میں انٹرویو کی تیاری کرواؤں تو پھر ناکامی کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ آپ نے بس اعتماد کے ساتھ ہر سوال کا جواب
دیتا ہے۔ میں آپ کے کاغذات میں اپنے پاسپورٹ کی
مکمل فوٹو کاپی بھی لگا دوں گا۔ آپ کو کسی بھی حوالے سے
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

وہ مطمئن ہو گئیں۔ ہم نے دس بجے کے بعد ڈنر کیا پھر
لگ بھگ گیارہ بجے میں سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں
آ گیا۔ آج دن میں ماں نے اپنے خاناں یعنی بنگالی بابو محمد
حسین سے بھی میری ملاقات کرا دی تھی۔ بنگالی بابو اپنی شکل
صورت سے ایک خط الخواس پر دفسر دکھائی دیتا تھا۔ یہ میں
نے اس کے بصری تاثر کی بات کی ہے ورنہ وہ ایک ہوش مند
اور تجربہ کار باور تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کے پتے ہوئے
کھانوں کی بہت تعریف سنی تھی اور اس کے تیار کردہ کھانے
کھائے بھی تھے۔ وہ بیان کردہ تعریف پر پورا اترتا تھا۔

میں سونے کے لیے لیٹا تو بیگ صاحب کا فون
آ گیا۔ اس وقت کراچی میں رات کے ساڑھے گیارہ بج
رہے تھے اور نیو یارک میں دوپہر کے ڈھائی یعنی دو بج کر
تیس منٹ۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو انکل! آپ کیسے ہیں؟“
”میں ٹھیک ہوں علی۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”اور
سناء، تمہاری طرف کیا چل رہا ہے؟“

میں نے انہیں ”ڈی ایس۔ ون سکٹی“ ویزا کے
حصول کے سلسلے میں اپنی تازہ ترین کوشش سے آگاہ کیا۔
انہوں نے مجھے سراہا اور بہت سی دعاؤں دینے کے بعد کہا۔
”میں نے بہتیں اس لیے فون کیا ہے کہ تعویذی دیر
پہلے میری نفی سے علی سلطان کی وصیت کے حوالے سے
تفصیلی بات ہوئی ہے۔ وہ کسی لمبے چوڑے بکھیرے میں
پڑنے کو تیار نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ میں اپنے طور پر علی
سلطان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو اسٹیٹ کر کے اس کا
جو حصہ چتا ہے وہ اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرادوں۔ کسی
قانونی کواردوائی کے لیے اگر اس کا آ ضروری ہو تو وہ
سلیکچر کرنے کے لیے ٹیکس آجائے گی۔ میں اسے اس
وقت بلاؤں گا جب تم یہاں پہنچ جاؤ گے تاکہ قانونی

کھنٹی پر اس خیال سے میں نے فون اینڈ کر لیا کہ دیکھوں تو سبکی کر آدھی رات کو کسی اجنبی کو میری یاد کیوں آگئی ہے!

”ہیلو.....!“ میں نے کہا۔

”علی بات کر رہے ہوتا؟“ ایک نسوانی آواز نے بڑی بے تکلفی سے استفسار کیا۔

”ہاں۔ میں علی ہی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کون.....؟“ سچی بات تو یہ ہے کہ دوسری طرف بولنے والی کو میں پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

”میں کوئی بھی ہوں، ابھی اور اسی وقت تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”آئی ایم سوری۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو نہیں جانتا۔ آدھی رات کو میں کسی اجنبی سے ملاقات نہیں کر سکتا۔“

”ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ اس کی مدھر آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”اس لیے ملاقات میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اس کا پرسرا انداز مجھے ان گنت ٹھوک و شبہات میں ڈال رہا تھا۔ میں نے اسے کھنٹی کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اگر ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور میں کسی وجہ سے تمہاری آواز کو پہچان نہیں پا رہا تو تم تعارف کرو۔ اگر تم واقعی میری شاسا ہوگی تو پھر ملاقات کے بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔“

”علی! ہم میری بات کا یقین کرو۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ ”ہم پہلے مل چکے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس وقت ہماری ملاقات اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے، ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔“

”فائدے کی بات ہر کسی کو اچھی لگتی ہے اور پھر تم نے میری کوئی ضرورت پوری کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔“ میں نے اس کے پتے جھانکنے کی کوشش کی۔ ”لیکن جب تک میں تمہارے بارے میں کچھ جان نہ لوں، میں تم سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ آئی ایم ریٹلی ویری سوری۔“

”دیکھو علی! اگر تم مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے تو پھر مجبوراً مجھے تمہارے پاس آنا پڑے گا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ میں تم سے ملے بغیر ملنے والی نہیں ہوں۔ میں اگر تمہارے پاس آگئی تو تمہارے لیے کبھی مسائل کمزورے ہو جائیں گے۔“

اس کے آخری جملے میں ایک نامعلوم دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ اس سیلوار گفتگو کے دوران میں، میں مسلسل اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح یہ جان لوں کہ آخر..... وہ کون سی؟ لیکن ابھی تک میری یہ سعی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے اسے کریدنے کی خاطر ایک چال چلتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ بتاؤ، مجھے کہاں آنا ہے۔ ویسے میں کراچی میں بالکل اجنبی ہوں۔“

”اوکے میں سمجھاتی ہوں۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں مجھے پتا سمجھا دیا۔“

”ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ”لیکن ایک مسئلہ ہے.....!“

”کیسا مسئلہ؟“ اس نے پوچھا۔

”اگرچہ تمہارا دعویٰ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟ کم از کم تم مجھے اپنا نام تو بتا دو۔“

”تمہارے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے صورت کے آشنا ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اگر تمہیں کچھ یاد نہیں بھی آ رہا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان لوں گی۔ چلو تمہاری یادداشت کو داؤس لانے کے لیے اتنا بتا دیجی ہوں کہ میرے نام کے آخر میں این اے آتا ہے یعنی..... نا۔“

”اوہ.....!“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”کیا تم ڈیٹینا ہو؟..... لیکن یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے۔ کیا تم دانستہ لہجہ بدل کر بات کر رہی ہو.....؟“

اس نے میرے اضطرابی سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ لائن بے جان ہو چکی ہے۔ اس نے سیلوار رابطہ موقوف کر دیا تھا۔

”کیا ڈیٹینا کراچی پہنچ گئی ہے؟“ میں نے خودکلامی کی۔ اس تصور نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مندر گیت سناؤ اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں



خود کردہ

سلیم انور

”خود پہ آئی... دوسروں پہ گنوائی“ یہ محاورہ اگرچہ پرانا ہے مگر ہر دور میں اس کی تفسیر جابجا نظر آتی ہے۔ وہ بھی خود کو اتنا ہی ذہین سمجھ رہا تھا مگر ساری ذہانت اس کی متانت کو لے ڈوبی جب نقاب ہٹانے والوں نے اس کی اصل حقیقت کو جانچ لیا۔

تفتیشی اقدامات میں ساتھ ساتھ رہنے والے خطا کار کی چالاک

دروازے کے نیچے ایک تو لیا اڑسا ہوا تھا، اسی اپنے پیچھے آنے والے آدمیوں سے کہا اور دروازے کو لے اسے وکیل کرکھولنے کے لیے ضرورت سے کچھ زیادہ دھکیلتا ہوا بیڈروم میں داخل ہونے لگا۔ اس کے مین پیچھے ہیرامیڈکس کی ایک ٹیم تھی۔ وہ لوگ ہی کوشش کرنا پڑی۔

”اپنی سائیں روکے رہو۔“ سارجنٹ ولسن نے لپک کر اس شخص کے پاس پہنچے جو کیس کے آتش دان کے

انہیں اپنے عقب میں کمرے کے دروازے کی جانب سے یہ آواز سنائی دی۔

اس تمام پہلے کے دوران وہ لوگ مرنے والے کے ان دو عزیزوں کو فراموش کر بیٹھے تھے جو اس وقت مکان میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک بین ہنٹر کا بیٹا ڈوگ ہنٹر تھا جو اپنے باپ کے بے جان جسم پر نظر کر جمائے ہوئے تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بہت زیادہ نفوذ ہو گئے تھے اور انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ میں گھر پر موجود نہیں ہوں گا۔ میں نے اپنے گھر وائس میل پر کال کی تو مجھے پیغام ملا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی!“

”بین کے ساتھ کچھ محنت کے مسائل بھی تھے۔“ بین کی بیوی کارلا ہنٹر گویا ہوئی۔ ”اور وہ ڈپریشن کا شکار بھی تھا۔ کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی؟“ کارلا نے ہنٹر سے علیحدگی اختیار کی ہوئی تھی اور وہ عمر میں اس سے دس سال چھوٹی تھی۔

”یہ ظاہر تو ایسا دکھائی نہیں دے رہا۔“ سارجنٹ ولسن نے کہا۔ ”بیوی ہونے کے ناتے اس کی جائداد کی وارث تم ہی ہوگی، کیا یہ درست ہے؟“

”اب سبجائی کیا ہے!“ کارلا نے کہا۔ ”وہ کاروباری طور پر پچھلے سال ہی دالیا ہوا تھا۔ اگر تم لوگ جواز جاننے کے لیے کسی کو تلاش کر رہے ہو تو ڈوگ سے پوچھو۔ بین نے اپنے پیسے کا وصیت نامہ تبدیل کر کے اپنے مرنے کے بعد میری رقم کی وصولی کا ہمارا اپنے بیٹے ڈوگ کو قرار دے دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر بین کی موت نکل ہونے یا تصدیق وجہ سے واقع ہوئی ہے تو بیمہ پالیسی کے مطابق رقم کی ادائیگی ہوگی۔“

”یہ سچ ہے۔“ ڈوگ نے اقرار کیا۔ ”لیکن آج میں صبح سے دن بھر اپنے کام پر تھا۔ تم میرے پلانٹ پر میرے سپردا کر رہے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہو۔“

شرمین نے سر ہلادیا۔ وہ ایسی صورت حال میں کسی حد تک نروس ہو جاتا تھا لیکن کمرے میں بسی ہوئی گیس کی بو اسے کچھ زیادہ ہی نروس کر رہی تھی۔

”کیا تمہارے پاس وہ وائس میل پیغام موجود ہے جو تمہارے باپ نے تمہارے لیے چھوڑا تھا؟“

ڈوگ ہنٹر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”میں اسے سننا چاہتا ہوں۔“

”یقیناً۔“ ڈوگ ہنٹر نے کہا پھر اس نے اپنے سیل فون کا فلیپ اٹھایا اور کئی ایک نمبروں کے بین دبانے کے

قریب پڑا ہوا تھا۔ سارجنٹ ولسن نے گیس کا والو بند کر دیا اور پھر دوڑ کر کمرے کی تمام کھڑکیاں باری باری کھول دیں۔ ان تمام مراحل کے دوران شرمین ہومز ہال وے میں اپنی سانسوں پر قابو پائے وہیں کھڑا رہا۔

پیرامیڈیکل اسٹاف کے دونوں ممبرز کئی منٹ تک اپنی سی پوری کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے ہار مان لی۔ ”یہ مر چکا ہے!“ انہوں نے فرش پر پڑے آدمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سارجنٹ ولسن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے ان کی بات کی تصدیق کر دی۔ ”تم اب اندر آ سکتے ہو، شرمین..... اور معمول کے مطابق سانس بھی لے سکتے ہو۔“

شرمین اس چھوٹے سے پُر آسائش بیڈ روم میں داخل ہو گیا اور اس کا بھرپور جائزہ لینے لگا۔ لاش کے نزدیک ہی ایک بیس بال کا پلا پڑا ہوا تھا اور بے کے دستے پر ایک تو لیا بھی لپٹا ہوا تھا تاکہ بے کے دستے پر اٹھکیوں کے نشانات پائے جانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

کمرے میں ایک اور دروازہ بھی تھا جو ایک پرائیویٹ ہاتھ روم میں کھلتا تھا۔ سارجنٹ ولسن نے اس کے دروازے کا تالا کھول کر اس میں موجود کھڑکی بھی کھول دی اور ایگراسٹ فین چلا دیا تاکہ یہاں اگر کوئی گیس ہو تو وہ بھی باہر نکل جائے۔

شرمین نے بین ہنٹر کی بائیں کتیشی پر چوٹ کے نشان کو دیکھا، پھر دم گھٹنے سے نیلے پڑ جانے والے ہونٹوں کا جائزہ لیا اور آخر میں اس کھلے ہوئے سیل فون کو دیکھا جو اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ ”اگر اس نے اپنے بیٹے کے گھروں کرنے کے بجائے پولیس کو فون کر دیا ہوتا تو شاید اب بھی زندہ ہوتا۔“

”ہو سکتا تھا اور نہیں بھی۔“ سارجنٹ ولسن نے کہا۔

”میرا اندازہ ہے کہ قاتل نے اس کو بیس بال کے بے کے سے ضرب لگائی، پھر گیس کا والو کھول دیا اور یہاں سے نکل گیا۔ معزوب میں اتنا ہوش اور طاقت باقی تھی کہ اس نے جیب میں سے اپنا سیل فون نکال لیا اور اپنے فون کے اسپڈ ڈائل کا پہلا نمبر دبا دیا۔ اسے اپنے بیٹے کو اپنا پتہ یا کوئی اور معلومات فراہم کرنے کی ضرورت نہیں تھی جو کہ پولیس کو فون کرنے کی صورت میں فراہم کرنا پڑتی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ یہ اس کی ایک اسمارٹ کوشش تھی لیکن اس کی قسمت کہ اس وقت اس کا بیٹا گھر پر موجود نہیں تھا۔“

”بھنے کے عام دنوں میں، میں بھی گھر پر نہیں ہوتا۔“

سورۃ یاسین قبر کے عذاب سے بچاتی ہے۔
سورۃ الرحمن امیر کرتی ہے۔
سورۃ واقعہ بھوک مٹاتی ہے۔
سورۃ الملک قبر میں روشنی کرتی ہے۔
سورۃ الجاثیہ زندگی میں امن لاتی ہے۔

☆☆☆

ماں باپ کا دل اور دامن پوری کائنات سے زیادہ وسیع ہوتا ہے جو کبھی اولاد کی خوشیاں مانگنے کے لیے پھیلتا ہے اور کبھی ان کے دکھ سینے کے لیے۔

☆☆☆

☆ پرانے زمانے میں شادی کی تاریخ گھر کے بڑے طے کرتے تھے۔ اب شادی ہال والے طے کرتے ہیں وہ بھی تین ماہ پہلے۔

☆ سجدوں سے رب کو اور اخلاق سے اس کے بندوں کو خوش رکھو دونوں جہان میں آسانی ہوگی۔

☆ دنیا میں سب سے ہنگامہ کیڑا آسو ہیں جس کے ایک قطرے میں 1 فیصد پانی اور 99 فیصد احساس ہوتا ہے۔

☆ کوشش کرنا کسی کے آسو بننے کی وجہ آپ کی ذات نہ ہو۔
☆ نصیحت کسی کو شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کرنی چاہیے اور نصیحت کا مقصد دستک دینا ہونا چاہیے۔ دروازہ توڑنا نہیں۔

مرسلہ: شفیق حسین۔ نیو کراچی، سندھی ہوٹل

بعد فون شرمین کو تھما دیا۔

فون سے ابھرنے والی آواز نحیف سی تھی۔ ”کسی نے مجھے ضرب لگائی ہے۔۔۔۔۔ بیڑ روم۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ نہیں معلوم وہ کون تھا۔۔۔۔۔ میں بدستور گھر میں ہوں۔۔۔۔۔ ہال میں۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔“

شرمین نے اس پیغام کو دو مرتبہ سنا پھر سیل فون ڈوگ کو واپس کر دیا۔

سارجنٹ ولسن اپنے دوست شرمین کو ایک طرف لے گیا اور ایک کھلی ہوئی گھڑکی کے پاس پہنچ کر بولا۔

”تمہارے خیال میں ان میں سے کسی ایک نے کسی کی خدمات حاصل کی ہوں گی؟ کسی کرائے کے قاتل کی؟“

شرمین نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، اصل بات اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

☆☆☆

سارجنٹ ولسن کو اپنا کام سہل ہوتا محسوس ہوا تھا لیکن

مشکل کام اپنے اس نزاعی دوست کو قائل کرنا اور پھر ڈسٹرکٹ انٹارٹی کو مطمئن کرنا تھا تا کہ وہ درست فرد پر مقدمہ دائر کر سکے۔ ”میں تفتیش کے لیے کسے لے کر آؤں؟“ اس نے شرمین سے پوچھا۔

”کسی کو بھی نہیں۔“ شرمین نے جواب دیا۔ ”یہ کام جس فرد نے سرانجام دیا ہے، تم اسے کبھی بھی حراست میں نہیں لے سکتے لیکن وہ ملزم ہونے سے کبھی بھی نہیں بچ سکتا۔“

”سنو، شرلاک ہومز!“ سارجنٹ ولسن چیخ پڑا۔ ”میں پھیلیاں بچھوانے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔“

”قتل کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، سارجنٹ۔ بس یہ انشورنس فراڈ کی ایک کوشش تھی۔“

اس سے قبل کہ سارجنٹ اپنی حیرت کا اظہار کرتا، شرمین نے اپنی بات جاری رکھی۔

”بین ہنتر نے خودکشی کی ہے۔۔۔۔۔ لیکن غیر متوقع طور پر نہیں۔۔۔۔۔ اس کے کاروبار کی ناکامی، دو ایلیا سن اور خرابی صحت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فطری ممکن بات تھی لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کی بید کی رقم اس کے بیٹے ڈوگ کو مل جائے۔ اس لیے اس نے کیس آن کی، بیس ہال کے بلے سے خود کو ضرب لگائی اور پھر اپنے بیٹے کے گھر پر فون کر دیا۔۔۔۔۔ یہ جاننے ہوئے بھی کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں ہوگا۔ اس نے پولیس کو کیا اپنے بیٹے کے سیل فون پر جان بوجھ کر فون اس لیے نہیں کیا کہ اس کے لیے مدد بہت جلدی آ جاتی۔“

”تو پھر مدد کے لیے کال کیوں کی تھی؟“

”بین نے یہ کہا تھا کہ حملہ آور باہر ہال میں کھل گیا ہے پھر بین اس کمرے کو چھوڑ کر ہال میں کس طرح گیا ہوگا؟“ شرمین نے سوال کیا۔

”دروازے کے راستے۔“ سارجنٹ ولسن نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”اس کمرے سے باہر جانے کا یہی تو ایک راستہ ہے۔“

”دوست!“ شرمین نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”تو پھر دروازے کے نیچے تو لیا محسوس طرح پھنسا یا گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بھی اندر کی جانب ہے؟“

سارجنٹ ولسن اس بات پر سوچ میں پڑ گیا۔

”ظاہر ہے۔“ شرمین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام وہی کر سکتا تھا جو کمرے اندر موجود تھا۔۔۔۔۔ اور وہ بین خود تھا۔“



تبادلہ

مظہر سلیم ہاشمی

بعض اوقات ایک باشعور انسان بڑے مزے سے اپنی عقل کے بل پر دوسرے انسان کو بے وقوف سمجھ کر باتوں کے جال میں قید کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر... بے بسی کی انتہا کہ مؤ مقابل جان بوجہ کر اس جال میں قید ہو جانے پر مجبور ہوتا ہے جیسا کہ یہاں... کیونکہ ہر خریدی ہوئی چیز واپس ہوتی البتہ تبادلہ ممکن ہو جاتا ہے مگر... بدلے میں اسے کیا ملتا ہے یہ اس کا نصیب۔

حسرداری میں خواری اٹھانے والے
ایک سادہ انسان کا قصہ



”ہیلو سر..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
”مجھے یہ الارم والی گھڑی واپس کرنی ہے.....“
”جی..... کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟“
”اس کا الارم ہی نہیں بجتا۔“
”وہ کس طرح؟“
”مطلب الارم کی آواز ہی نہیں آتی۔“
”کیا آپ نے اس کے ساتھ دیے ہوئے کتابچے سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی؟“
”ہاں جی..... کوشش تو کی تھی۔“
”تو کیا پھر بھی مسئلہ حل نہیں ہوا؟“
”نہیں.....“
”تو... کیا آپ کے پاس اس کی رسید ہے؟“
”نہیں..... بڑا تلاش کیا لیکن نہیں ملی۔“
”اوہ... پھر تو آپ کی رقم واپس نہیں ہو سکے گی۔“
”ارے نہیں..... آپ غلط سمجھے..... مجھے میسے واپس نہیں چاہئیں..... مجھے تو بدلے میں ایک ایسی گھڑی درکار ہے جس کا الارم کام کرتا ہو۔“
”ٹھیک ہے کیا آپ اس کا پینکٹ والا ڈیالائے ہیں؟“
”نہیں..... وہ تو میں نے پیسک دیا۔“
”مگر جناب ڈبے کے بغیر تو میں تبادلہ نہیں کر سکتا۔“

سکتا ہے یہ آپ نے بائیس دن پہلے خریدی ہو..... ایسی صورت حال میں آپ اگر رسید اور اصل ڈبا بھی لے آتے تو وارنٹی کلیم کر سکتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر پایا اور مزید بھی نہ کر پاؤں گا۔“

”بالکل بھی نہیں؟“

”جی بالکل..... بھی نہیں.....“

”تو اب یہ خراب گھڑی میں ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھوں گا؟“

”آپ اس کی خرابی کی شکایت کے ساتھ اس کو فیکٹری بھیج سکتے ہیں۔“

”اب میں اس کو چاہتا تو بھیجے سے رہا.....“

”پھر میں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ اس کو کسی گھڑی ساز کے پاس لے جائیں.....“

”تو وہ اتنا معاوضہ طلب کر لیتے ہیں جتنے میں نئی گھڑی آجائے.....“

”میں جانتا ہوں.....“

”کیا میں نیچر سے بات کر سکتا ہوں؟“

”وہ آج چھٹی پر ہیں.....“

”تو جو انچارج ہیں ان سے ہی میری بات کرادیں.....“

”آپ پہلے سے ہی ان سے بات کر رہے ہیں؟“

”نیچر کی کل تک دائی ہو جائے گی؟“

”نہیں.....“

”پھر کب تک آجائے گا؟“

”آجائیں گی.....“

”ادہ..... اچھا..... پھر وہ کب تک آجائیں گی؟“

”پیر کو.....“

”میں پھر پیر کے روز ہی آؤں گا.....“

”اچھی بات ہے..... میں آپ کی کسی اور چیز کی خریداری میں مدد کر سکتا ہوں؟“

”میرا نہیں خیال.....“

”ادہ..... کیا آپ اپنا اسٹور کارڈ بناواتا پسند کریں گے؟ یہ بالکل مفت ہے..... بس اپنی تفصیلات جمع کر لیں اور آپ کو اس کے بعد ہر چیز کی خریداری پر پانچ فیصد کی تینی بچت ملا کرے گی۔“

”نہیں..... شکریہ!“

”اگر آپ اپنا کارڈ آج بناواتے ہیں تو کرسمس کی خوشی میں ایک خوب صورت تحفہ بھی ساتھ میں مفت پائیں گے.....“

”تحفہ کیا ہے؟“

”الارم والی گھڑی.....“

”یہ سخت پلاسٹک والے ڈبے میں پیک تھی۔ مجھے چھری کی مدد سے کاٹ کر اسے نکالنا پڑا..... مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کو اس کے ڈبے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”ہماری پالیسی کے مطابق مصنوعات کی تبدیلی ان کے اور جنرل ڈبے کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔“

”اتنا سارا بے کار پلاسٹک تھا۔ میں اس کچرے کو کیوں سنبھال کر رکھتا؟“

”مجھے ظاہر ہے..... تبدیلی کے وقت کام آجاتا۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ گھڑی چند ہفتوں میں کام کرنا بند کر دے گی۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے.....“

”مدد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ خریداری کا کوئی ثبوت پیش کر سکیں.....“

”میں خود ثبوت ہوں..... میں آپ کو بتا تو رہا ہوں کہ میں نے اسے یہیں سے خریدا تھا..... جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے میرا مل بھی آپ ہی نے بنایا تھا۔“

”کیا آپ نے اس کا دائری نمبر آن لائن رجسٹر کیا تھا؟“

”نہیں.....“

”آہ..... یہ تو مسئلہ ہو گیا ہے نا پھر۔ آپ نے ادائیگی کیسے کی تھی..... کارڈ یا کیش؟“

”نقد.....“

”اگر آپ نے کارڈ سے ادائیگی کی ہوتی تو آپ کے بینک سے اسٹینٹ مل جاتی کہ آپ نے کس دن خریداری کی.....“

”تو..... میں نے تو نقد رقم دی تھی۔“

”دراصل مسئلہ یہ ہے کہ..... دوسرے اسٹورز بھی یہ والی گھڑی بیچتے ہیں آپ اسے کہیں اور سے بھی خرید سکتے ہیں.....“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے..... لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں نے یہ گھڑی ادھر سے ہی خریدی تھی اور اب اس کی خرابی کے بعد آپ مجھے ایک نئی گھڑی دینے کے ذمے دار ہیں.....“

”آپ نے یہ خریدی کب تھی؟“

”چند ہفتے قبل.....“

”ہماری تبدیلی کی پالیسی آکیس دن کی میعاد رکھتی ہے..... مجھے لگتا ہے آپ اس وارنٹی سے بھی نکل چکے ہیں.....“

”میں نے پچھلے ماہ کی کسی تاریخ کو لی تھی..... اب صبح دن یاد نہیں آ رہا.....“

”ہم ایسی گھڑیاں پچھلے دو سال سے بھر رہے ہیں.....“

”آپ کو لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“

”بالکل نہیں جناب..... میں بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہو



اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسنے سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعائوں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

السلام
علیہ

حضرت یوسف

رضوانہ ساجد

آخری حصہ



انہوں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور جمع ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے۔ پہلے خوشامد کی اور اس مرتبہ بھی جب صاف جواب مل گیا تو وہ دمکیوں پر اتر آئے۔
”اپنے بھائی کو لے جانے کے لیے ہم سے جو بھی ہو گا وہ کریں گے۔“
”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری بے پناہ فوج کے باوجود تم حملہ کر کے اپنے بھائی کو چھڑا کر لے جاؤ گے؟“

”ہم آپ کو صرف ایک دن دیتے ہیں۔ ہمارا بھائی ہمارے پاس پہنچ جائے ورنہ پھر ہم وہ کریں گے جو ہم نے سوچا ہے۔“
 ”میں اب بھی نہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ جلد سے جلد اپنے ملک کو لوٹ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میں سے ایک بھی واپس نہ جا سکے۔“

یہ بھائی وہاں سے ہٹ گئے لیکن محل سے کچھ دور جا کر رک گئے۔ باہم مشورے پھر شروع ہو گئے۔ آپس کے اختلافات کے باوجود یہ طے ہو گیا کہ اگر کل تک بنیامین کو ہمارے حوالے نہیں کیا گیا تو ہم حاکم مصر پر اچانک حملہ کر کے بنیامین کو رہا کرالیں گے۔ اپنی بہادری کے زعم میں وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ وہ تعداد میں صرف دس ہیں۔ مصری افواج کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ انہوں نے وہیں محل کی آخری فصیل کے قریب پڑاؤ ڈال لیا۔

مصری خبروں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فوراً اطلاع کر دی کہ دس بھائی محل پر حملہ کریں گے اور بنیامین کو چھڑا لے جائیں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ہوشیار ہو کر بنیامین کو تو محل کے اندر دینی ہے میں چھپا دیا اور اپنی چائیس ہزار سپاہ کو محل کے چاروں طرف تعین کر دیا اور انہیں حکم دے دیا کہ حملہ آوروں پر کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے بلکہ انہیں کسی ترکیب سے غیر مسلح کر کے بغاوت پر قابو پایا جائے۔

صبح ہوئی تو یہ دس بھائی محل کے سامنے پہنچے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو لاکارنے لگے۔ مصر میں جو کتنائی موجود تھے۔ وہ بھی ان کی مدد کو آ گئے۔ بہت ممکن تھا کہ ہنگامہ طول پکڑ جاتا لیکن چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے ہی باخبر ہو چکے تھے اور ضروری انتظامات کر لیے تھے اس لیے اشارہ ملتے ہی مصری سپاہ نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور ایک ایک کر کے سب کو غیر مسلح کر دیا۔

”میں جانتا تو تم میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جاتا۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ کنعان واپس چلے جاؤ۔ جو اثاثہ تمہیں ملا ہے اسے کھاؤ۔ میں تمہیں تموڑی مہلت اور دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں کنعان واپس جانا ہے یا میری قید میں دن گزارنے ہیں؟“
 تمام بھائی اپنے پرانے ٹھکانے پر چلے گئے۔ اب وہ غیر مسلح بھی تھے اور اپنی ناکامی سے دل برداشتہ بھی۔ اختلافات کی دیواریں پھر کھڑی ہوئیں۔ اس ناکامی کا الزام ایک دوسرے پر ڈالا جا رہا تھا۔
 ”آپس میں لڑنے کا کیا فائدہ۔ اب تو یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے۔“

”مصری افواج سے مقابلہ کرنا آسان نہیں جبکہ مصر میں رہنے والے تمام کنعانیوں کے ہتھیار لے لیے گئے ہیں، کوئی بھی ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔“

”ایک مرتبہ پھر حاکم مصر کو بوڑھے باپ کا واسطہ دے کر بنیامین کی رہائی پر آمادہ کیا جائے؟“
 ”کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں مانے گا۔“

”پھر ہم سب بھی یہیں رک جائیں۔“
 ”چوری بنیامین نے کی ہے، ہم کیوں سزا بھگتیں۔“

”ہم باپ سے جا کر کیا کہیں گے؟“
 ”جو بچ ہے وہ کہہ دیں گے کہ تیرے بیٹے نے چوری کی تھی پکڑا گیا۔“

”وہ ہماری بات کا یقین کر لیں گے؟“

”بہت سے کنعانیوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ گواہی دیں گے ورنہ ایک سال بعد بنیامین خود آ کر بتائے گا کہ اس سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔“

بڑا بھائی راوین مصر چھوڑنے کا سخت مخالف تھا۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہہ کر آیا تھا کہ اگر میں بنیامین کو واپس نہ لاؤں تو ہمیشہ کے لیے گمناہ گار ٹھہروں گا۔ اس لیے اب باپ کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

بھائیوں نے اس کی مخالفت کی اور بنیامین کے بغیر ہی کنعان واپس جانے کا تہیہ کر لیا۔
 (بعض نے لکھا ہے راوین مصر میں رک گیا تھا)

میدان خالی ہوا تو خبروں نے فوراً اطلاع کر دی کہ کنعان سے آئے ہوئے دس بھائیوں نے مصر چھوڑ دیا اور شمالی دروازے سے نکل کر کنعان کی طرف جا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ اس رات نہایت پرسکون نیند سوئے۔ تھوڑی دیر کو انہیں محسوس ہوا کہ وہ کتھان میں اپنے گھر میں ہیں۔ بنیامین ان کے پاس ہے اور باپ بس آتے ہی ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی سوتیلے بھائی اور ان کا رویہ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بھائیوں کا یہ جملہ کانوں میں گونج رہا تھا۔

”بنیامین نے چوری کی تو کیا تعجب۔ اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔“
انہوں نے مجھ پر یہ الزام کیوں لگایا؟ انہیں بھائیوں کے ظالمانہ رویوں سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اس الزام سے ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ بھائیوں نے جو اتنا بڑا الزام لگایا ہے اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں۔ بچپن کی یادوں میں سے ایک یاد ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی والدہ کے کہنے پر اپنے ماموں لایان کے پاس فدان آرام چلے گئے تھے۔ وہیں انہوں نے ماموں کی دو بیٹیوں لبوہ اور راحیل سے شادی کر لی تھی (اس زمانے میں وہ بیٹوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا جائز تھا) حضرت یعقوب علیہ السلام کی تمام اولادیں بنیامین کے علاوہ فدان آرام میں ہی پیدا ہوئیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ انہوں نے لایان یعنی اپنے نانا کا ایک بت چوری کر لیا تھا اور اسے توڑ دیا تھا۔ بچپن ہی سے توحید پرستی آپ کی فطرت میں داخل تھی لہذا بت کا وجود آپ کو ناگوار ہوا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اسے چوری نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ توبت پرستی کے خلاف نفرت کا اظہار تھا۔

پھر انہیں وہ واقعہ یاد آ گیا جب ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بنیامین شیر خوار تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے بھائی ان کے حسن و جمال کی وجہ سے حسد کرتے تھے تو ان کی پھوپھی انہیں اپنے گھر لے گئیں اور نہایت محبت سے ان کی پرورش کرنے لگیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں پھوپھی کے گھر بھیج تو دیا لیکن ان کا سکون اٹھ گیا۔ گھر میں ہر طرف انہیں ڈھونڈتے پھرتے تھے پھر انہیں دیکھنے پھوپھی کے گھر چلے جاتے۔ کچھ دیر کو سکون مل جاتا۔ گھر لوٹ کر آتے تو پھر وہی بے سکونی۔ پھوپھی کے گھر انہیں چھوڑنا ان کی مجبوری بھی تھی کیونکہ گھر میں انہیں اپنے بڑے بیٹوں سے ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت نے پھر ایک راستہ یہ نکالا کہ یوسف ایک ہفتہ ان کے پاس رہیں گے، ایک ہفتہ پھوپھی کے پاس۔ اس ایک ہفتے کی جدائی بھی آپ کو شاق گزرنے لگی۔ اب انہوں نے اپنی بہن سے صاف کہہ دیا کہ یوسف کو وہ ان کے پاس نہیں چھوڑ سکتے۔ اب جو وہ رہنے آئیں گے تو مستقل میرے ہی پاس رہیں گے۔ پھوپھی کو بھی ان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ وہ انہیں ہلے بھر کے لیے خود سے جدا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اب وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کے گھر مستقل قیام پر مجبور ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اشیا میں سے ایک کمر بند تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی کے پاس تھا۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو لینے آئے تو ان کی پھوپھی نے انہیں تیار کیا اور یہ یادگار کمر بند ان کے کرتے کے نیچے کمر سے باندھ دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام انہیں لے کر گھر آ گئے۔ پیچھے پیچھے ان کی بہن بھی آ گئیں۔ حضرت یعقوب انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

”تمہیں یوسف سے ایسی محبت ہو گئی ہے۔ ابھی تو میں اسے لا یا ہوں۔ تم اسے دیکھنے چلی آئیں؟“
”اس کی محبت اپنی جگہ لیکن اس وقت میں کسی اور کام سے آئی ہوں۔ واوا ابراہیم کے زمانے کا ایک ازار بند تھا جو گھر سے غائب ہو گیا ہے۔ اسی کی تلاش میں آئی ہوں۔ وہ میرے لیے بڑا قیمتی تھا۔“
”تم کیا سمجھتی ہو، کس نے لیا ہوگا؟“

”شاید آپ کے کسی نوکر نے اڑا لیا ہو۔“
”وہ متبرک ہے اس لیے ہمارے نزدیک قیمتی ہے۔ کوئی اور کیوں لینے لگا تھا۔ پھر بھی میں نوکروں کو بلاتا ہوں، تم ان سے پوچھ کچھ کرلو۔“

نوکر دوں کو بلا یا گیا۔ ایک ایک سے پوچھا۔ ہر ایک نے انکار کیا۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام ہی رہ گئے تھے۔
”مجھے بڑی شرمندگی سے کہنا پڑ رہا ہے لیکن آپ ذرا یوسف کو بلا لیں۔ میں اس سے بھی پوچھتی ہوں۔“

”آپ میرے یوسف کو چور سمجھ رہی ہیں؟“

”بچہ ہے، شاید کھیل کھیل میں چھالیا ہو۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کو بلوایا گیا۔ ان سے پوچھا گیا تو ظاہر ہے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن پھوپھی کو معلوم تھا۔ انہوں نے کڑتا اور پرازا بند برآمد ہو گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقین تھا کہ یوسف چور نہیں۔ ان کی بہن نے انہیں اپنے پاس روکنے کے لیے چال چلی ہے۔ انہوں نے بہن سے یہ نہیں کہا کہ چوری یوسف کی نہیں، تمہاری پکڑی گئی ہے۔

”ہمارے قانون میں چوری کی سزا یہ ہے کہ یوسف کو تمہاری غلامی کرنی ہوگی۔ اب میں اسے نہیں روکوں گا۔ تم اسے لے جا سکتی ہو۔ میں بھی اُسے دیکھنے آ جایا کروں گا۔“

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پھوپھی کے پاس رہنے لگے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام واپس آ گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے محل کے نرم و نازک بستر پر لیٹے سوچ رہے تھے، یہ بھی کوئی چوری تھی جو میرے بھائی مجھے چور ہونے کا طعنہ دے کر پٹے لگے۔

☆☆☆

معمر کی طرف سے آنے والی شاہراہ پر گردوغبار اڑا تو کسی نے آ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کو خبر کی کہ تمہارے بیٹے اتانج لے کر آ گئے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام جو اب تک بنیامین کی طرف سے بے فکر تھے، بیٹوں کی آمد کا سن کر بے چین ہو گئے۔ خدا کرے وہ خبریت سے ہو۔ اس کے بھائی یوسف کی طرح اسے بھی کہیں چھوڑ کر نہ آ گئے ہوں۔

دروازے پر کان لگے تھے۔ بار بار اپنے پتوں سے پوچھتے تھے، تمہارے باپ آئے؟ بیٹوں کو آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ اتانج سے لدے ہوئے اندون کو کارندوں کے حوالے کرنا تھا۔ اس کے بعد بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ باپ کے سامنے جائیں۔ آخر ہمت کر کے دبے قدموں باپ کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو آہٹ سے اندازہ ہوا کہ کوئی آیا ہے۔

”تم آ گئے ہو مگر بولتے کیوں نہیں؟“

”جو کچھ ہم بولنا چاہتے ہیں اس کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں۔“

”کیا تمہیں اتانج نہیں ملا؟“

”اتانج تو مل گیا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

اس کے بعد بیٹوں کی طرف سے پھر خاموشی ہو گئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے پھر پوچھا۔ اس مرتبہ ان کی آواز غصے سے بھاری ہوئی تھی۔

”تم بولتے کیوں نہیں..... بولو کیا جرم کر کے آئے ہو؟“

”جرم ہم نے نہیں کیا۔“

”تو کیا حاکم معمر نے تمہاری شان میں گستاخی کر دی؟“

”تمہارے بیٹے نے ہمیں رسوا کر دیا۔“

”میرے تو تم سب ہی بیٹے ہو۔ کس بیٹے نے رسوا کر دیا؟“

”آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کر دیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گا، ورنہ ہم تم سے یہ وعدہ نہیں کرتے کہ اسے ہر حال میں لے کر آئیں گے۔“

”خبردار! اگر اس کے خلاف کوئی ایسی ویسی بات کی۔ بنیامین اور چوری؟ یہ تمہارے دل میں گھڑی ہوئی کوئی بات ہے جو تمہاری زبان پر آ گئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تم پہلے جھوٹ بول چکے ہو کہ یوسف کو بھڑیا لے گیا۔“

”تمہیں تو ہماری کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا جبکہ ہم سچے ہیں اور واقعہ یہی ہے کہ حاکم مصر نے ہم سے بہت اچھا سلوک کیا تھا اور ضرورت سے زیادہ اتانج دے کر رخصت کیا تھا۔ ہم اتانج لے کر آ رہے تھے کہ شاہی کارندے دوڑتے ہوئے آئے اور ہمیں روک لیا۔ ایک کارندے نے کہا کہ ہم حاکم مصر کا قیمتی پیالہ چرائے ہیں۔ ہم نے انکار کیا۔ انہوں نے

ہماری تلاشی لی۔ ہمارے پاس سے کچھ نہیں نکالا لیکن تمہارا چہرہ بیٹا اسے چرا کر لے آیا تھا۔ اس کے سامان سے پیالہ برآمد ہو گیا۔ ہم نے حاکم مصر کو بہت دھمکیاں دیں۔ اس سے لڑنے کو تیار ہو گئے لیکن اس نے بنیامین کو تاوان کے طور پر اپنے پاس روک لیا۔ اب وہ ایک سال تک اس کی غلامی کرے گا۔“

”میں پھر کہتا ہوں، تم فرضی داستان مجھے سنار ہے ہو۔ بنیامین چوری نہیں کر سکتا۔“

”ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ معصوم ہے لیکن وہ تو اپنے بڑے بھائی سے بھی زیادہ نکلا۔“

”اے میرے بیٹو! تم یوسف کے ساتھ بھی تخلص نہیں تھے اور اب بنیامین کے ذریعے مجھے تکلیف پہنچانے پر تلے ہوئے ہو۔“

”مگر ہم میں سے کوئی یہ حرکت کرتا تو آپ کو پروا بھی نہیں ہوتی۔ یوسف کے لیے دن رات روتے رہتے ہیں اور اب بنیامین کا بھی ایسا ہی غم منائیں گے۔“

”تم جاؤ، اپنا کام کرو۔ مجھے تم سے کیا سروکار۔ میرے لیے اب مصر کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ خدائے تعالیٰ سے کیا بعید کہ وہ ایک دن ان تم سب کو مجھ سے ملا دے۔ اچھا ہوا میری آنکھیں چلی گئیں ورنہ مجھے تمہاری صورتیں دیکھنا پڑیں۔ اب مجھے رونے کے سوا کیا کام رہ گیا ہے۔“

ان کی بے نور آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا غم کیا کم تھا کہ اب بنیامین کا غم بھی اس میں شامل ہو گیا۔ انہیں ہرگز یقین نہیں تھا کہ بنیامین نے چوری کی ہوگی اور حاکم مصر نے انہیں روک لیا ہوگا۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ان کا یہ بیٹا بھی بھائیوں کے ظلم کا نشانہ بن چکا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام دن رات دونوں بیٹوں کے فراق میں تڑپتے رہتے تھے۔ دل غم کی سوزش سے جل رہا تھا، آنکھیں سپید ہو گئی تھیں۔

ان کے بیٹے اس مرتبہ اس حد تک سچے تھے کہ بنیامین کو انہوں نے غائب نہیں کیا تھا بلکہ اس پر واقعی چوری کا الزام تھا۔ وہ بے اعتبار ہو چکے تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ اب ان ناخلف بیٹوں کو ان پر رحم آنے لگا تھا لیکن اس میں بھی حسد کا جذبہ موجزن تھا یعنی ان کے رونے میں بھی یوسف اور بنیامین کی محبت ظاہر ہوتی تھی۔

ایک روز ان کے بھائیوں نے انہیں سمجھانے کے لیے یہ باب و لہجہ اختیار کیا۔

”ہم آپ کے ہر وقت کے رونے سے تنگ آ گئے ہیں۔ آپ کو یہ خوشی نہیں ہے کہ دس بیٹے موجود ہیں۔ دو کے لیے روتے رہتے ہیں۔“

”میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا۔ آخر انسان ہوں، بیٹے یاد آ ہی جاتے ہیں جبکہ ان دونوں کو میں نے تمہارے ہاتھوں سے کھوایا ہے۔“

”آپ کو اگر ہماری باتوں پر یقین نہیں آیا تو ہمیں ڈر ہے آپ اپنی جان گھالیں گے اور روتے روتے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔“

”اگر تمہیں میرے مرنے کی اتنی ہی فکر ہے تو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور میرے بیٹے بنیامین کو لے کر آؤ۔ حاکم سے کہنا اس کا یوڑا باب اندھا ہے ورنہ خود چل کر آتا۔ اگر تم سچے ہو تو ضرور جاؤ گے۔“

”حاکم مصر کے پاس جانے کا اب ہمارا منہ نہیں۔ ایک سال کے لیے مبرا کرلو۔ وہ خود آ جائے گا۔“

”مبرا ہی تو کر رہا ہوں۔ فریاد ہے تو اپنے اللہ سے کہ وہ میری فریاد ضرور سنے گا۔“

اس وقت دل سے کوئی ایسی آہ نکلی تھی کہ عرش تک مل گیا۔ اللہ نے اپنے نیک بندے کی تسلی کے لیے حضرت جبرائیل کو بھیجا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا خانہ غم خوشبوؤں سے بس گیا۔

”اللہ نے پیغام بھیجا ہے کہ یعقوب غمزدہ کیوں ہوتے ہو۔ یوسف زندہ ہیں اور بڑے مرتبے پر ہیں۔ خزانے ان کی دسترس میں ہیں۔ وہ لینے والوں میں سے نہیں دینے والوں میں سے ہیں۔ ہزاروں لونڈیاں، باندیاں ان کی خدمت پر مامور ہیں۔ اللہ نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیتا ہے۔“

”یہ پیغام تو میرا دل بھی مجھے دیتا رہا ہے۔“ حضرت یعقوب نے کہا۔ ”میں تو یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ میرا نور

نظر کب میرے سامنے ہوگا۔ میں دیکھ تو نہیں سکتا لیکن کب اس کی خوشبو سے میرے مشام جاں آباد ہوں گے۔“
 ”بس فراق کے دن ختم ہوئے۔ ملاقات جلد ہو جائے گی۔ اپنے اللہ کو راضی کر دو۔ دنیاوی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اس سے بھی فریاد کرتے رہو۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ ان کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے اپنے احکام جاری کر رہا تھا۔ اللہ نے بھائیوں کے دلوں میں ڈالاکہ وہ باپ کی طرف سے ایک خط حاکم مصر کے لیے لے کر جائیں اور اپنی طرف سے بھی اس کی خوشامد کریں۔ شاید اس کے دل میں رحم آجائے اور وہ بنیامین کو ہمارے ساتھ آنے دے۔
 یہ سب بھائی مل کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
 ”اے باپ! ہمیں اجازت دے کہ ہم تیسری مرتبہ مصر جائیں اور بنیامین کو لانے کی کوشش کریں۔ قحط بھی شدید ہے، ہمیں اناج کی بھی ضرورت ہوئی۔“

”اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی ناامید نہیں ہوتا۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کا نام لیا تو بیٹوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔
 ”ہمیں تو بنیامین سے سروکار ہے کہ وہ زندہ ہے۔ آپ یوسف کا نام کیوں لیتے ہیں۔ اسے تو بھیڑ یا کھا چکا۔ اس کا سراغ ہمیں کہاں ملے گا۔“

”یوسف کا نام میں نے اس لیے لیا کہ میں جو کچھ جانتا ہوں، تم اس سے بے خبر ہو۔“
 ”آپ کو کسی کھانی نے بہکا دیا ہے کہ یوسف زندہ ہے۔“
 ”تم مصر جانے سے اسی لیے ڈرتے ہو کہ یوسف نہیں تمہارا کوئی راز دہاں دفن ہے۔ تم مصر جاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام کی باتوں سے بیٹوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔
 ”بھائیو! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والد کو یوسف کا سراغ مل گیا ہے۔ اتنے مطمئن وہ کبھی نہیں تھے جتنے آج نظر آ رہے تھے۔“

”پڑوس میں ایک بوڑھا رہتا ہے جو یہ دعویٰ کرتا رہتا ہے کہ وہ مصر میں یوسف سے مل چکا ہے۔ اسی نے اباجان کے کان بھرے ہوں گے۔“

”اباجان اس سے کیوں نہیں کہتے کہ جائے اور یوسف کو لے آئے۔“
 ”وہ کہتا ہے بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، مصر تک جانے کی سکت نہیں۔“
 ”اس فضول بحث کو تو چھوڑو۔ اس وقت تو یہ کوشش کرو کہ حاکم مصر کے نام خط لکھوا لیا جائے تاکہ ہم اناج لاسکیں اور کوشش کریں گے کہ بنیامین بھی ہمارے ساتھ آجائے۔ اباجان کے خط کا شاید کوئی اثر ہو۔“
 حضرت یعقوب علیہ السلام نے حاکم مصر کے نام خط لکھوا دیا۔

”میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرا ایک بیٹا جسے میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، غائب ہو چکا۔ میری کمرٹ گئی۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ بنیامین میرا سہارا تھا۔ اُدھی جان اسی سے میرے جسم میں تھی۔ وہ بھی مجھ سے دور ہو گیا۔ اس کی خطائیں معاف کر کے اسے میرے پاس لوٹا دو تاکہ میں آسانی سے مر سکوں۔“
 ”مجھے میرے خدا نے بشارت دی ہے کہ میرا بیٹا یوسف زندہ ہے اور مصر میں ہے۔ آپ حاکم ہیں۔ اسے تلاش کر کے میری آنکھوں کی روشنی مجھے لوٹا دیں۔ اللہ آپ کا اقدار دراز کرے۔“

تمام بھائی مصر جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہوں نے خط کھول کر پڑھا تو ان کے اندیشے سامنے آ گئے۔
 ”ہم نے اباجان سے کہا تھا کہ وہ خط میں یوسف کا ذکر نہ کریں لیکن انہوں نے یہی کیا اور ہمیں پھسنے کا پورا سامان کر لیا۔ اگر حاکم مصر نے یوسف کو تلاش کر لیا تو ساری حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یہ کوئی نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ یوسف زندہ ہے۔ اگر مل گیا تو وہ سب کچھ بتا دے گا۔“
 ”اس خط کو لے جانا خطرناک ہے۔“ بیوہ نے کہا۔ ”ہم اس خط کو حاکم تک نہیں پہنچے دیں گے۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہوگا،

زبانی کہیں گے تاکہ اس کے دل میں رحم آئے اور وہ ہمیں اتانج دے۔ بنیامین کو چھوڑنا ہے تو چھوڑ دے ورنہ ہمیں کوئی ایسی جلدی بھی نہیں۔“

بیٹوں کے چل جانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی کوشھری کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

”اے اللہ! یہ عاجز و ناتواں بندہ تجھ سے مدد کا طالب ہے۔ میرا صبر اب میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ دیکھ میری آنکھیں چلی گئیں۔ صدموں سے میری کمر دہری ہو گئی۔ میرا امتحان ختم کر۔ میرے دونوں بیٹے مجھے لوٹا دئے میری خطا میں بخش دے۔ میرا امتحان ختم کر۔ میرا یوسف مجھے لوٹا دے۔ میرا بنیامین مجھے دے دے۔ میرے بیٹے انہیں ڈھونڈنے کے حاکم مصر کے دربار میں گئے ہیں۔ حاکم کے دل میں رحم ڈال۔“

اس فریاد نے سفر طے کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب برادران یوسف، حضرت یوسف علیہ السلام کے دربار میں کھڑے فریاد کناں تھے۔

”اے عزیز! (یوسف علیہ السلام) ہم نے تجھ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ بنیامین کی جدائی نے اسے اور بھی بے حال کر دیا ہے۔ اس کی جان کا خیال کر اور بنیامین کو اس سے ملا دے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو تجھے اپنے فیصلوں پر اختیار ہے۔“

”ہم تجھ سے تیری فیاضی کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ ہم کو اور ہمارے گھروالوں کو قحط نے سخت پریشانی اور تکلیف میں ڈال دیا ہے۔ اس مرتبہ تو ہمارے پاس پوچھنی بھی بہت کم ہے۔ اب معاملہ خرید و فروخت کا نہیں ہے۔ ہم سے قیت ادا نہیں ہو سکتی اس لیے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ ازراہ کرم ہمارے قحطوں سے سرمائے کے عوض ہم کو غلے کی پوری تول دیجیے اور ہمیں ضرورت مند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمائیے۔ اللہ صدقہ خیرات کرنے والوں کو نیک بدلہ دیتا ہے۔“

بھائیوں کی یہ دردمند تقریر سنی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی آنکھوں میں باپ کا سراپا گھوم گیا جو یہاں سے دور کھان میں بیٹھا بیٹوں کی راہ تک رہا ہوگا کہ اتانج لے کر آئیں گے۔ کب سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس امید موموم میں زندہ ہوں گے کہ یوسف شاید زندہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی فریادی بھائیوں کے وہ مظالم آنکھوں کے سامنے گھوم گئے جو انہوں نے ان کے ساتھ کیے تھے۔

خدا نے ان کے دل میں ڈالی کہ اب وہ اپنا راز ظاہر کر دیں۔ انہوں نے بھائیوں سے پوچھا۔

”تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جب تم جہالت میں سرشار تھے۔“

جب بھائیوں نے یہ غیر متوقع گفتگو سنی تو چونک کر کسی اور خیال سے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف دیکھا۔ لب و لہجہ پر غور کیا صورت شکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو دوسری نیت سے دیکھا تو حضرت یوسف علیہ السلام کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی۔

بے اختیار چیخ اٹھے۔ ”کیا تم واقعی یوسف ہو؟“

حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یوسف ہوں۔ تمہارا بھائی یوسف جس کو تم نے بیچ کر مصر پہنچوایا اور اس بات سے کہ تم نے مجھے بیچ کر یہاں پہنچوایا، نہ تو ممکن ہو اور نہ اپنے دل میں پریشان ہو کیونکہ خدا نے جانوں کو بچانے کے لیے مجھے تم سے آگے بھیجا۔ اس لیے کہ اب دوسرے سے ملک میں کال ہے اور ابھی پانچ سال اور ایسے ہیں جن میں نہ تو غل چلے گا اور نہ فصل کٹے گی اور خدا نے مجھے تمہارے آگے بھیجا تاکہ تمہیں زمین پر سلامت رکھے اور تم کو بڑی رہائی کے وسیلے سے زندہ رکھے۔ پس تم نے نہیں بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے فرعون کا باپ اور اس کے سارے گھر کا خداوند اور سارے ملک مصر کا حاکم بنایا۔“

اب برادران یوسف کے پاس ندامت، شرمساری اور اعتراف و خطا و جرم کے سوا کیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تمام نقشہ گھوم گیا۔ جسے وہ کنوئیں میں بھیج کر آئے تھے، آج وہ مصر کے تاج و تخت کا مالک ہے۔

سر جھکا کر کہنے لگے۔ ”قسم خدا کی! اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر برتری اور بلندی بخشی، بلاشبہ ہم سرتاپا خطا کار و قصور وار تھے۔“ (سورۃ یوسف)

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو ان کی اخلاقی برتری اور پیغمبر اندر رحمت اس کو برداشت نہ کر سکی اور غصہ و درگزر سے کہنے لگے۔

”آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے۔“

بھائیوں نے معافی کی نوید سنی تو بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

بچپن کا دیکھا ہوا خواب پورا ہوا تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ وہ ستارے یہ بھائی تھے۔

بھائیوں کی خطا بخش دینے پر بنیامین بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی تعظیم اور شکرگزاری کے لیے سجدے میں گر گیا تھا۔
وہ تھے اور گیارہ عوام بنیامین۔

بھائیوں کی خفت مٹانے اور شرمندگی دور کرنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں مہمان بنایا اور ہر طرح سے ان کی دیکھ بھال کی۔

حاکم مصر کا عہدہ تخت قدموں میں۔ سپاہ مصر اشارۃً برد پر تیار۔ دشمن سامنے۔ کوئی اور ہوتا تو بھائیوں کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ بد بختو تمہاری وجہ سے میرا گھر بار چھوٹا بلکہ فرمایا تو یہ.....

”جو کچھ ہوتا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہیے۔ میں درگاہ الہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری غلطی کو معاف فرمادے۔ اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیارا بن لیتے جاؤ۔ یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ انشاء اللہ یسوع یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان کو مصر لے کر آؤ۔ میں یہاں اتنا اقتدار رکھتا ہوں کہ تمہارے لیے اچھی رہائش کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“

ان بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ملنے کی خوشی تو کیا ہوئی ہوگی لیکن انہیں یہ خوشی ضرور تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حاکم ہوتے ہوئے اور طاقت رکھتے ہوئے ان سے بدلہ نہیں لیا اور نہ وہ کہیں کے نہ رہتے۔ یہ خوشی بھی کمی کی کہ وہ اب باپ کے پاس سرخرو ہو کر جا سکیں گے، یوسف نے ہمیں معاف کر دیا تو وہ بھی ہمیں ضرور معاف کر دے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں گاڑیاں دیں۔ وافر مقدار میں زادِ راہ بھی دیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے دس گدھے جو مصر کی اچھی چیزوں سے لدے ہوئے تھے اور دس گدھیاں جو باپ کے راستے کے لیے روٹی اور زادِ راہ سے لدی ہوئی تھیں ان کے ساتھ کہیں کہ جب سب کو مصر لاؤ گے تو ان کی ضرورت پڑے گی۔

”ابا جان کے پاس جا کر ان سے میری شان و شوکت بیان کرنا تاکہ انہیں خوشی ہو اور وہ فراق کا صدمہ بھول جائیں۔ انہیں بتانا کہ تیرے بیٹے یوسف کو جہان کے مالک نے مصر کا مالک کر دیا ہے اور اس سے کہنا دیر نہ کر میرے پاس چلا آ۔ اب ہمارا خاندان مصر میں رہے گا اور میں اس کی پرورش کروں گا۔“

”اور دیکھنا کہیں تم راستے میں جھکنا نہ کرنا۔ میں باپ کی تسلی کے لیے بنیامین کو بھی تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اسے تم بھڑتاؤ۔“

”ہمارے آنکھوں سے جہالت کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ اب ہم بنیامین کو جان سے زیادہ عزیز رکھیں گے۔“ تمام بھائیوں نے عہد کیا اور ملک کنعان کی طرف چل دیے۔

واپسی کا یہ سفر بھی عجیب تھا۔ شرمندگی اور خوشی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کسی بھائی کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سب پر گہرا اسکوٹ ماری تھا۔ اگر فکر بھی تو یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انہیں معاف کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر درمیان میں کوئی اور بات کرتے تب بھی تھے تو یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کرتے تھے تاکہ بنیامین خوش ہو جائے۔

اسی خاموشی اور کبھی کبھی کی گفتگو میں سفر کٹ گیا اور وہ کنعان تک پہنچ گئے۔ اتنی جلدی باپ کے پاس جانے کی کبھی نہیں ہوئی تھی جیسی اب ہو رہی تھی۔

ابھی وہ گھر تک نہیں پہنچے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام.... کو دوجی الہی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو سے مہکا دیا۔ فرمانے لگے۔

”اے خاندان یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں میری عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے۔ باہر جا کر دیکھو شاید یوسف کے بھائی آگئے ہیں اور ان کے ساتھ یوسف بھی ہے۔“

خاندان کے لوگ دانے ہی سمجھے کہ ان کی عقل ماری گئی ہے۔
”بجدا تم تو اپنے اسی پرانے خط میں پڑے ہو۔ یوسف کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا اور تمہیں یوسف ہی کی رٹ لگی

”میں کہہ چکا ہوں۔ کسی کوشا ہراہ پر بھیجو۔ قافلہ آ رہا ہوگا۔“
کسی نے پردا بھی نہیں کی، یہاں تک کہ سارے بھائی گھر کے سامنے پہنچ گئے اور اتنے ساز و سامان کے ساتھ جیسے کسی بادشاہ کی سواری آئی ہو۔

جب یہ بھائی حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پہنچے تو شمیم یوسف بھی بالکل قریب پہنچ گئی۔
”تم لوگ آگئے۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ یوسف بھی تمہارے ساتھ ہے؟ خدا کی قسم! مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے۔“
”اباجان! یوسف ہمارے ساتھ تو نہیں لیکن ہم یہ خوش خبری لائے ہیں کہ یوسف اب تک جیتا ہے اور وہی سارے ملک مصر کا حاکم ہے۔ ہم اب تک اسی کا دیا ہوا کھاتے رہے ہیں۔“
حضرت یوسف علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ان بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا پیراہن حضرت یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا۔ اللہ کی قدرت سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔ بیٹائی لوٹ آئی۔
بیٹائی کا لوٹ آنا انبیاء کے معجزات میں سے تھا۔

”میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“
برادران یوسف کے لیے یہ وقت بہت کھن تھا۔ شرم و ندامت میں سر جھکائے ہوئے بولے۔
”اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیے کہ ہم نے آپ سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ یوسف کو بھیڑ پالے گیا جبکہ ہم نے اسے ایک قافلے کے ہاتھ بیچ کر مصر بھجوا دیا تھا۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔ ”عقرب میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا۔“
مفسرین کہتے ہیں کہ برادران یوسف نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دعا کی استدعا کی تھی اور کھٹان پہنچ کر حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اسی وقت ان کی بات منظور کر لی مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں کہا بلکہ صرف توفیق دلائی اور عقرب کا لفظ استعمال کیا۔ یہ اس لیے کہ برادران یوسف کی تمام خطا کاروں کا معاملہ براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بالواسطہ اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی وقت ان کا اطمینان کروایا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملے کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے اس لیے اس کی مرضی بھی معلوم کر لیتا ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نو جوان تھے اس لیے ان کے کریمانہ وصف میں احتیاط کا پہلو نہ تھا۔ انہوں نے فوراً معاف کر دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حیرت و حیرت میں تھے اور پھر باپ تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ پہلے بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کی ندامت کا اظہار واقعی اور ہنگامی ہے یا ان کی طبیعت میں دائمی شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔
ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو سحر کے وقت کی امید دلائی تھی کہ اس وقت دعا کروں گا۔

ابن جریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ مسجد میں تشریف لارہے تھے کہ کسی انسان کو یہ دعا کرتے سنا۔ ”اے اللہ! آپ نے مجھے پکارا۔ میں نے جواب دیا۔ آپ نے مجھے حکم دیا، میں نے اطاعت کی اور یہ سحر کا وقت ہے لہذا میری مغفرت کرو دیجیے۔“

حضرت عمرؓ نے توجہ دی تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے گھر سے آواز آ رہی ہے تو آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے عرض کیا۔ ”حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے سحر کے اوقات تک کی مہلت لی تھی کہ میں اس وقت دعا کروں گا۔“
اللہ تعالیٰ خود بھی نیک بندوں کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”اور وہ سحر کے اوقات میں مغفرت طلب کرتے ہیں۔“ (آل عمران)۔

تمام بیٹوں نے اب حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ پیغام پہنچایا کہ ہمیں یوسف کی ہدایت کے مطابق مصر پہنچنا ہے جہاں مصر کی زرخیز زمین اور بہت سی اچھی اچھی چیزیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔ ”کنعان میرے آباء کی سرزمین ہے۔ اسے چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن میرا بیٹا یوسف اب تک جیتا ہے۔ میں اپنے مرنے سے پیشتر جا کر اسے دیکھ تو لوں۔ میرے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی مصر سے کنعان آئے تھے اور میں کنعان سے مصر جاؤں گا۔“

توریت میں اس کی تفصیل یوں دی گئی ہے۔

”اور اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) اپنا سب کچھ لے کر چلا اور ہیرسبع میں آ کر اپنے باپ اسحاق کے خدا کے لیے قربانیاں گزرا رکیں اور خدا نے رات کو روایاں اسرائیل سے باتیں کیں۔ اس نے کہا میں خدا تیرے باپ کا خدا ہوں۔ مصر میں جانے سے ڈر کیونکہ میں وہاں تجھ سے ایک بڑی قوم پیدا کر دوں گا۔ میں تیرے ساتھ مصر کو جاؤں گا اور پھر تجھے ضرور لوٹا بھی لاؤں گا اور یوسف اپنا ہاتھ تیری آنکھوں پر لگائے گا۔“

تب یعقوب ہیرسبع سے روانہ ہوا اور اسرائیل کے بیٹے اپنے باپ یعقوب کو اور اپنے بال بچوں اور اپنی بیویوں کو ان گاڑیوں پر لے گئے جو فرعون نے ان کے لائے کو کبھی نہیں اور وہ اپنے چوپایوں اور سارے مال و اسباب کو جو انہوں نے ملک کنعان میں جمع کیا تھا، لے کر مصر میں آئے اور یعقوب کے ساتھ اس کی ساری اولاد بھی۔ وہ اپنے بیٹوں اور پوتوں کو اپنی غرض اپنی کل نسل کو اپنے ساتھ مصر میں لے آیا۔ یعقوب کے گھرانے کے جو لوگ مصر میں آئے، ہتر جانیں تھیں۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع پہنچی کہ ان کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لحظہ جگر کو دیکھا تو سینے سے چٹا لیا۔ آنسو اس وقت بھی ان کی آنکھوں میں تھے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی بچوں کی طرح باپ سے لپٹے ہوئے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افرام اور منشی پہلی مرتبہ اپنے دادا کو دیکھ رہے تھے۔ جب مسرت افزا اور رقت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے نہایت احترام سے اس کا قلعہ کو دارالسلطنت ”رعیمس“ میں داخل کیا جو ”جشن کا شہر“ کہلاتا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام والد ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کروفر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اتارا۔

جب ان تمام باتوں سے فراغت پائی اور باپ کو اچھی طرح دیکھ لیا تو دربار آراستہ کیا تاکہ عوام و خواص مصریوں کا بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے کیونکہ شہر میں بھی جشن برپا تھا اور ہر شخص حاکم مصر کے خاندان کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ دربار منعقد ہوا اور تمام لوگ اپنی اپنی مندرہ شستوں پر بیٹھ گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے والدین یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت لویہ کو تختہ شاہی پر جگہ دی گئی (حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا) باقی تمام خاندان نے حسب مراتب نیچے جگہ پائی۔

جب یہ اختیارات مکمل ہو چکے تو حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تختہ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان کے بیٹھے ہی تمام درباری دستور کے مطابق تخت کے سامنے تنظیم کے لیے سجدے میں گر پڑے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر تمام خاندان یوسف نے بھی یہی عمل کیا۔

(تعظیم کا یہ طریقہ شاید اس وقت جائز ہوتا ہی اکریم علیہ السلام نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی امت کے لیے حرام قرار دیا اور اس کو صرف ذات الہی کے لیے مخصوص بتایا) (ترمذی ابوداؤد)۔

یہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو فوراً اپنے بچپن کا خواب یاد آ گیا۔ گیارہ ستارے سجدہ کر چکے تھے۔ اب سورج اور چاند بھی سجدہ کر رہے تھے۔ اپنے والد سے کہنے لگے۔

”اور..... یوسف علیہ السلام نے کہا اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچا ثابت کر دیا۔ یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی۔ تم سب کو مصر اسے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا۔ بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کے لیے جو وہ کرنا چاہے، بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔“ (سورہ یوسف)

جب دربار ختم ہوا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خلوت میں جا کر خدا کی کرشمہ ساز یوں کا شکر ادا کیا۔
 ”اے پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسمان اور زمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو یہ بھی سمجھو کہ دینا سے جاؤں تو تیری فرماں برداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔“ (سورۃ یوسف)
 اب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اپنے خاندان کو کس جاگیر پر بٹھرایا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ سب لوگ ان سے قریب ”جشن کے شہر“ ہی میں آ کر ٹھہریں۔ یہ فرعون کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے بھائیوں اور والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ فرعون کے سامنے پہنچ کر انہیں کیا کہنا ہے۔
 ”میں ابھی جا کر فرعون کو خبر کر دوں گا کہ میرے بھائی اور میرے باپ کے گھرانے کے لوگ جو ملک کنعان میں تھے، میرے پاس آ گئے ہیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کو یہ خوش خبری سنائی اور اپنے بھائیوں میں سے پانچ کو فرعون کے سامنے حاضر کر دیا۔
 فرعون نے پوچھا۔ ”تمہارا پیش کیا ہے؟“

بھائیوں نے جواب دیا۔ ”تیرے خادم چوپان ہیں جیسے کہ ہمارے باپ دادا تھے۔ ہم اس ملک میں مسافرانہ طور پر رہنے آئے ہیں کیونکہ ملک کنعان میں سخت کال ہونے کی وجہ سے تیرے خادموں کے چوپایوں کی چرائی نہیں ہو رہی تھی لہذا کرم کر کے ہمیں جشن کے علاقے میں رہنے دے کہ یہ سب سے سرسبز علاقہ ہے۔“
 فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا۔ ”مصر کا ملک تیرے آگے بڑا ہے۔ ان کو جشن کے علاقے میں ہی رہنے دے۔“ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کامیابی کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرعون کے سامنے پیش کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرعون کو دعائی اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اچھی طرح رکھنے پر اس کا شکر یہ ادا کیا۔
 ”آپ کی عمر کتنی ہو گی؟“ فرعون نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا۔

”میری مسافرت کے برس ایک سو تیس ہیں۔ میری زندگی کے ایام نمودرے اور دکھ سے بھرے ہوئے رہے ہیں اور ابھی یہ اتنے بھی نہیں ہوئے جتنے میرے باپ دادا کی زندگی کے ایام ان کے دور مسافرت میں ہوئے۔“ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا اور فرعون کو دعائے کرام کے پاس سے ہٹ گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کے حکم کے مطابق ”رعیس“ کے علاقے کو جو ملک مصر کا نہایت زرخیز خطہ ہے، ان کی جاگیر ٹھہرایا۔

قطعا ابھی تک پوری شدت سے جاری تھا۔ سارے ملک میں کھانے کو کچھ نہ رہا۔ مصر اور کنعان دونوں تباہ ہو گئے۔ جتنا روپیہ ملک مصر اور ملک کنعان میں تھا، وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس غلے کے بدلے جسے لوگ خریدتے تھے، لے کر جمع کر لیا اور ساری دولت فرعون کے محل میں پہنچادی۔

فرعون آپ کے اس حسن انتظام سے بہت خوش تھا۔ ان کے اس حسن انتظام کی بدولت ایک موت بھی بھوک سے واقع نہیں ہوئی۔

اب ایک اور سخت مشکل سامنے تھی۔ وہ سارا روپیہ جو مصر اور کنعان میں تھا، خرچ ہو گیا اور خطا ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ مصریوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ روپیہ تو اب ہمارے پاس رہا نہیں۔ ہمیں مفت میں اناج دے تاکہ ہم اپنے بچوں کو کھلائیں۔ تیرے ہوتے ہوئے ہم کیوں مریں۔
 حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اگر نقدی نہیں تو اپنے چوپائے دواور میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تم کو اناج دوں گا۔“

لوگ اپنے چوپائے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس لانے لگے اور گھوڑوں، بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کے عوض انہیں اناج ملنے لگا۔

ایک سال اور گزر گیا۔ اب مصریوں کے پاس نہ نقدی تھی نہ چوپائے باقی رہے تھے۔ یہ لوگ پھر حضرت یوسف علیہ

السلام کے پاس آئے۔
 ”اے خداوند! ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ نقدی بھی ختم ہوگئی۔ ہمارے چھ پاؤں کا مالک بھی تو ہو گیا۔ اب تو ایک ہی صورت ہے کہ تو اناج کے بدلے ہماری زمین خرید لے۔“
 قحط سے تنگ آئے لوگوں نے اپنے کھیت بچ ڈالے۔ ساری زمین فرعون کی ہوگئی۔ تب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا۔

”میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے نام پر خرید لیا ہے۔ سو تم اپنے لیے مجھ سے بیج لو اور کھیتوں میں ڈال دو۔ فصل پر پانچواں حصہ فرعون کو دے دینا اور باقی چار تمہارے رہے تاکہ کھیتی کے لیے بیج کے بھی کام آئیں اور تمہارے اور گھر کے آدمیوں اور بال بچوں کے لیے کھانے کو بھی ہوں۔“

”خداوند! تو نے ہماری جان بچائی۔ ہم فرعون کے غلام بنے رہیں گے۔“ لوگوں نے کہا۔
 قحط کے دن گزر گئے۔ فرعون کے خواب کی تعبیر کے مطابق خوشحالی کے دن آ گئے۔ بارشوں نے زمین کا سبزہ نرم کر دیا۔ کوئلیں بھوننے لگیں۔ کھیت لہلہانے لگے۔ آئین کے مطابق مصری اپنی پیداوار کا پانچواں حصہ فرعون کو دیتے رہے۔
 حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا خاندان جشن کے شہر میں بدستور آباد تھا۔ انہوں نے اپنی جائیدادیں کھڑی کر لیں اور وہ بڑے اور بہت زیادہ ہو گئے۔ بیٹی اللہ کا ان سے وعدہ تھا۔
 خوشحالی کے ان دنوں کو سترہ سال گزر گئے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بیمار ہوئے۔ یہ بیماری آہستہ آہستہ ان کی موت کو ان کے قریب لانی رہی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نہایت تندی سے ان کی تیمارداری میں مشغول تھے۔ تمام دنیاوی مشاغل موجود تھے جو وہ والد کی بیماری کو ٹالنے کے لیے استعمال کر رہے تھے لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دن پورے کر لیے تھے۔
 ایک دن جب حضرت یوسف علیہ السلام ان سے ملاقات کے لیے پہنچے تو انہوں نے عہد لینے کے لیے فرمایا۔ ”اپنا ہاتھ میری ران کے نیچے رکھ۔ دیکھ اب میرا وقت آ گیا ہے۔ میں اپنے لوگوں میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں۔ مجھ کو مصر میں دفن نہ کرنا بلکہ جب میں اپنے باپ دادا کے ساتھ سو جاؤں تو مجھے مصر سے لے جا کر کنعان میں دفن کرنا۔ اسی کوستان میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ دفن ہیں۔“
 حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

”مجھے تو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ تیرا منہ دیکھوں گا لیکن خدا نے تیری اولاد بھی مجھے دکھائی۔ خدائے قادر مطلق مجھے دکھائی دیا ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں تجھے برآمد کروں گا اور بڑھاؤں گا اور تجھ سے قوموں کا ظہور کروں گا اور تیرے بعد یہ زمین تیری نسل کو دوں گا تاکہ یہ ان کی دائمی ملکیت ہو جائے۔“ اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے لیے یہ دعائیہ الفاظ ادا کیے۔

”خدا جس کے سامنے میرے باپ ابراہیم اور اسحاقؑ نے اپنا دھن پورا کیا۔

وہ خدا جس نے ساری عمر آج کے دن تک میری پاسبانی کی۔

اور وہ فرشتہ جس نے مجھے سب بلاؤں سے بچایا۔

ان لڑکوں کو برکت دے۔

اور جو میرا اور میرے باپ دادا کا نام ہے۔

اسی سے یہ تاحر ہوں۔

اور زمین پر نہایت کثرت سے بڑھ پائیں۔“

اس کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ان میں سے ایک ایک کی عادت کے مطابق انہیں برکت دی اور انہیں بتایا کہ آئندہ زمانوں میں ان کے ساتھ کیا ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے پاؤں بچھونے پر سمیٹ لیے اور دم چھوڑ دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اٹھے اور باپ کا منہ جو ما اور طیبیوں کو حکم دیا کہ لاش میں خوشبو بھریں تاکہ یہ محفوظ رہے کیونکہ میں وصیت کے مطابق اس لاش کو کنعان لے کر جاؤں گا۔

اس عمل میں چالیس دن لگتے ہیں۔ اس دوران مصر میں ماتم ہوتا رہا۔ جب لاش میں خوشبو بھری جا چکی اور اس کے خراب ہونے کا احتمال جاتا رہا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تمام خادموں اور مصر کے درباریوں اور اپنے تمام خاندان کو ساتھ لیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدفین کے لیے چلے۔ یہ سفر بھی عجیب تھا۔ ایک وہ دور تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام پابہ زنجیران راستوں سے گزرتے ہوئے مصر پہنچے تھے اور اب یہ شان کے شاندار گھر میں بیٹھے ہوئے ایک بڑے قافلے کے ساتھ جا رہے تھے۔ ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ آپ اللہ کی کرم نوازی کا شکر ادا کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اچانک ایک مقام پر آپ نے رتھ بان کو رکنے کا حکم دیا۔ یہ کنعان کے قریب افرات کا مقام تھا۔ ان کے بھائی جو ان کے رتھ کے اوروں کے ساتھ باندھے چل رہے تھے، رتھ کے قریب آئے۔

”کیا بات ہے یوسف..... یہاں کیوں رک گئے؟“

”تم شاید بھول گئے ہو لیکن مجھے یاد ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں میری ماں کی قبر ہے۔ پھر نہ جانے کب میرا یہاں آنا ہو۔ میں اپنی ماں کو بتا دوں کہ تیرا بیٹا کنعان سے تیرے پاس آیا ہے۔“

راہ بین آگے بڑھا۔ ”مجھے وہ مقام معلوم ہے۔ میں بڑا ہونے کی حیثیت سے باپ کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے معلوم ہے۔“

”آیا تو میں بھی تھا لیکن میری عمر اس وقت محض پانچ سال تھی۔ مجھے یقین ہے میرے دل کی آنکھیں اس مقام کو پہچان لیں گی جہاں میری ماں دفن ہے۔“

انہوں نے بنیامین کو ساتھ لیا۔ دوسرے بھائی بھی ساتھ تھے اور واقعی انہوں نے وہ جگہ پہچان لی۔ قبر کا وحنہ لاسناٹان باقی تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام دو زانو بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک سر جھکائے رہے۔ ماں کی بخشش کی دعا کی اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے بعد وہ سب کو لے کر اس گھر پر پہنچے جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں ان کے بھائیوں نے ان سے بے وفائی کی تھی، جہاں ان کے والد ان کی یاد میں روتے رہے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام ایک ایک چیز کو دیکھتے تھے اور اپنا بچپن یاد کرتے تھے۔ ان کے بھائی ان کے آگے شرمندہ کھڑے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ جب سب کچھ یاد آ رہا ہے تو یہ بھی یاد آ رہا ہوگا کہ کس طرح ہم اسے بہلا پھسلا کر جنگل میں لے گئے تھے اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ باتیں یقیناً یاد آئی ہوں گی لیکن ان کی اعلیٰ طرفی کہ انہوں نے کسی بھائی سے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

کنعان کے وہ پرانے لوگ جو اب تک زندہ تھے حضرت یوسف علیہ السلام کا دیدار کرنے آئے۔ دیکھتے تھے اور خدا کی شان کریم کی قصیدے پڑھتے تھے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے کیسا اعزاز عطا فرمایا ہے۔

جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انتقال فرما چکے ہیں تو ان لوگوں نے سات دن تک ان کا ماتم کیا اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے جنازے کو اس قبرستان کی طرف لے کر چلے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خرید کر اپنی ملکیت بنالیا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو وہاں ان کی وصیت کے مطابق دفن کر دیا گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدفین کے بعد یہ قافلہ مصر کو لوٹ آیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے وہی کام تمام راستہ خوف اور اندیشوں کے سائے میں کاٹا۔ راستے بھر یہی باتیں کرتے چلے آئے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد یوسف ہم سے بدلہ ضرور لیں گے۔ کچھ نہیں تو یہی ہوگا کہ وہ ہمیں مصر سے نکال دے اور ہمیں پھر کنعان میں آکر آباد ہونا پڑے۔

یہی باتیں کرتے ہوئے جب وہ مصر پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باپ کے حوالے سے چند باتیں ان سے کہیں۔

”مرنے سے پہلے تمہارے اور ہمارے باپ نے ایک پیغام تمہارے نام دیا تھا۔ وہ یہ کہ تم یوسف سے کہنا کہ اپنے

بھائیوں کی خطا اور ان کا گناہ اب بخش دے کیونکہ انہوں نے تجھ سے بدی کی۔ سو اب تو اپنے باپ کے خدا کے بندوں کی خطا بخش دے۔“

”ہم خود بھی تجھ سے معافی کے طلب گار ہیں۔ تو ہمیں مصر سے نکال اور ہمیں رہنے دے۔“

”بھائی! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں تم سے بدلہ لوں گا اور تمہیں مصر سے نکال دوں گا۔ مجھ سے کیوں ڈرتے ہو، کیا میں خدا کی جگہ پر ہوں۔ تم نے تو مجھ سے بدی کا ارادہ کیا تھا لیکن خدا نے اسی سے نیکی کا قصہ کیا تاکہ بہت سے لوگوں کی جان بچائے چنانچہ آج کے دن ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اس لیے تم مت ڈرو۔ میں تمہاری اور تمہارے بال بچوں کی پرورش کرتا رہوں گا۔“

بھائیوں نے اطمینان کا سانس لیا اور وہیں رہتے رہے۔ اللہ نے ان کے بھائیوں کی نسل میں برکت دی اور بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ نسل مصر پر چھاتی چلی گئی۔

فراعین تبدیل ہوتے رہے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام بدستور حاکم مصر رہے۔ بعض کے نزدیک اسی سال مصر پر حکومت کی۔

اس عرصہ دراز میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کی اولاد دیں اور ان کی اولادیں مصر کے مختلف علاقوں میں پھیل چکی تھیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے طویل عمر پائی اور اپنے بیٹے افرائیم کی اولاد تیسری پشت تک دیکھی اور دوسرے بیٹے منشی کے بیٹے میر کی اولاد کو بھی اپنے گھنٹوں پر رکھ لیا۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کا وقت وصال قریب آیا تو آپ نے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا۔

”جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا تو کیا دین سے پھر جاؤ گے۔ مجھے بتاؤ تم کس کی عبادت کرو گے؟“

”آپ کے معبود اور آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب کی عبادت کریں گے جو معبود یکساں ہے اور ہم اس کے شکم بردار ہیں۔“

”مجھے دفن کہاں کرو گے؟“

”جہاں آپ کی وصیت ہوگی۔“

”دیکھو، تمہاری نسل سے ایک عظیم پیغمبر پیدا ہوگا (موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ تھا) اور وہ تم کو اس ملک سے نکال کر اس ملک میں پہنچائے گا جس کے دینے کی قسم میرے پروردگار نے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب سے کھائی تھی۔ سو تم ضرور میری ہڈیوں کو یہاں سے لے جانا اور میرے آباء کے ساتھ مجھے دفن کرنا۔“

جب حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ہوا تو ان کی لاش میں خوشبو بھر کے مصر ہی میں دفن کر دیا گیا۔

آپ کی وصیت نسل و نسل چلتی رہی یہاں تک کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ایک بھائی لاوی کی نسل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

یہ وصیت اس وقت بھی سفر میں تھی چنانچہ جب مصریوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے تابوت کو بھی ساتھ لے کر گئے۔

”اور موسیٰ، یوسف کی ہڈیوں کو بھی ساتھ لیتا گیا کیونکہ اس نے بنی اسرائیل سے یہ کہہ کر خدا ضرور تمہاری خبر لے گا اس بات کی سخت قسم لے لی تھی کہ تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لیتے جانا۔“ (توریت)

کہتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر بلاط میں ہے جو فلسطین کے علاقے نابلس کا ایک گاؤں ہے۔

بعض کہتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک سو دس سال کی عمر پائی بعض نے ایک سو تیس سال بتائی ہے۔

(ختم شد)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک



سُ لگتے چنار

فتح راعوان

اس میں جانے کیسا بھید چھپا ہے کہ حسن ہمیشہ افسردگی میں گھرا یا آنسوئوں میں ڈوبا ہوا مزید دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ شاید... اسی لیے کشمیر کی جنت نظیر وادی آزادی کے متوالوں کے لہو میں ڈوبی رہی ہے۔ اس کی فضاؤں میں بے فکری کے قبضے اور آزادی کے پھول جانے کب کھلیں گے... محض اپنوں کا درد سہنے کی تعزیر میں انہیں بھی ایک ذرا اسی نیکی کی اتنی بڑی قیمت چکانا پڑی کہ زندگی نے ان پر اپنے دروازے ہی بند کر لیے۔

سُ لگتی راکھ..... کبھی بھڑکتے شعلوں کے درمیان

زندہ رہنے والوں کا حوصلہ

کے ساتھ بارش کی ہلکی سی پھوار پڑنے لگی۔ ریاض علی نے اپنا چہرہ آسان کی جانب اٹھا کر یونندوں کا استقبال کیا۔ انیس سالہ ریاض علی گاؤں ’کھنجر‘ کا رہائشی تھا جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ بڑے بڑے اور لمبے

موسم بہت خوبصورت تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھوکے جسم کو سرسراتے ہوئے گزرتے اور مزاج میں تریگ پیدا کر رہے تھے۔ فضا میں اس وقت بانسری کی مدھر میٹھی تانیں بکھری تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوا کے پیکے ہوئے جھوکوں

ریاض علی نے مسکراتے ہوئے اپنی بانسری ہونے سے لگائی اور ایک مقامی دھن بجائی شروع کر دی۔ موسم خوبصورتی میں اس مہر موسیقی کے ملاپ نے جاذب اور نوش بالکل بے خود کر دیا۔

”نعم لا جواب ہو میرے دوست! کاش یہ فن میں کسی طرح کیلکھ سکتا۔“ جاذب نے اسے محبت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی اللہ بخشے ہمارے دادا جی کہا کرتے تھے بانسری تو کشمیر کی شفاف ہے۔“ وہ ان دونوں سے بڑا تھا اور اسے داوامرحم کے ساتھ سب سے زیادہ دقت بھی اسی نے بتایا تھا۔ ”اب تو حالات بھی دیئے نہیں رہے۔ کرب اور دکھ لہر ہی ہر وقت اس داوی کو اپنی لپیٹ میں لیے رہتی ہے۔ جاذب نے کہا۔

”ہاں! اب تو ہندوستانی فوج نے یہاں ظلم کا بازار گر کر رکھا ہے۔ کسی کی بھی جان نال اور آبرو محفوظ نہیں۔“ نوش نے ہونٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

”حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کشمیریوں کی نسل کشی کا پورا پلان تیار ہو چکا ہے۔ ابھی پھیلنے چکا مہر دین اور اس کا خاندان ہجرت کر کے پار آزاد کشمیر چلے گئے ہیں۔ ایسے ہی جانے کتنے خاندان اپنی عزتیں محفوظ رکھنے کے لیے ایسی ہجرتیں کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔“ ریاض علی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیا ایسا اچھا ہوتا کہ جب ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ہوئی تھی ریاست جوں کشمیر کی آزادی اور الگ شخص کو بھی اسی وقت تسلیم کر لیا جاتا۔ یہ صدیوں پرانی ریاست ہے لیکن اسے رائے شماری کا بھی حق ہی نہیں دیا گیا۔“ نوشی نے کہا۔

”جب پاکستان بنا اس وقت بھی ہم نے بہت سی قربانیاں دیں ایک سال بعد ہونے والی جنگ میں بھی ہمارے آباد اعداد نے بہت خون بہایا لیکن عالمی نا انصافی ہر موڑ پر ہمیں برباد کرتی رہی۔ لائن آف کنٹرول کے نام پر ہمارے درمیان ایک خونی کبیر بچھ دی گئی ہے۔ جن کے خاندان پار کی طرف ہیں وہ آج بھی اپنے عزیز و اقارب کی یاد میں خون کے آنسو بہاتے ہیں اور جانے کب تک بہاتے رہیں گے۔“ ریاض نے غمناک آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

ماحول پر مزید اداسی چھا گئی۔ جاذب اور نوشی کی آنکھیں بھی بھرا آئیں۔ ریاض نے فوراً خود کو سنبھالا اور انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

”ہرات کے بعد ایک روشن سویرا ہوتا ہے۔ مجھے

کھیتوں میں مکئی کاشت کی جاتی اور انہی کھیتوں کی وجہ سے اسے کھیت کا نام دیا گیا تھا۔ ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی ایک دھواں کی جانب اکٹھا ہو کر نشیب کی طرف بہتا رہتا۔

گاؤں کے چاروں طرف گھنا جنگل بھی آباد تھا جہاں مقامی لوگ اپنے مویشی چرایا کرتے۔ آبادی تقریباً پچاس گھروں پر مشتمل تھی۔ کچے کچے گھروں پر ٹین کی پینیں تھیں۔ ایک چھوٹی سی عمارت بیک وقت پرائمری اسکول اور دوادخانہ کے لیے استعمال ہوا کرتی۔ دیہاتی شریف انفس، صلح جو اور رنجت تھے۔ یہ چھوٹی سی جگہ کشمیر جنت نظیر میں تھی۔

ریاض علی بانسری بہت اچھی بجاتا تھا۔ پہاڑی کے نزدیک ہی اس کا جگہی ٹی ہے بنا گھر تھا جہاں وہ اپنے والدین کے ساتھ بہت خوش و خرم زندگی گزارتا تھا۔ اس کے والد کے پاس چند مویشی موجود تھے جنہیں چرانے کے لیے وہ جنگل میں لے آیا کرتا اور چنار کے درخت سے پشت لکائے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگا کر مہر نغے ہوا میں بکھیرتا رہتا۔

بارش کی پھوار تھوڑی تیز ہوتی تو اسے ایک جانب سے جاذب کی آواز سنائی دی۔

”رک جاؤ ریاض علی! میرے ساتھ ہی چلنا واپس۔“ ریاض علی نے دائیں جانب مڑ کر دیکھا تو اس کا چچا زاد بھائی اپنے گنے چنے مویشیوں کے ساتھ اسی جانب چلا آ رہا تھا۔ جاذب گاؤں میں اس کا واحد بہترین دوست تھا۔ اس نے خود کو ارانداز میں ہاتھ ملایا اور وہ کچھ ہی لمحوں بعد نشیب کی طرف بڑھ گئے۔

پھوار اب تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے غلٹ میں اپنے مویشی مخصوص جگہ پر باندھے اور گھر کے عقب میں موجود درختوں کے جھنڈ میں جا بیٹھے۔ ریاض علی کے مزاج میں آج کچھ خاموشی اور افسردگی کا عنصر غالب تھا۔

”کیا بات ہے ریاض علی! اتنے افسردہ کیوں ہو؟“ اسے اپنی بائیں جانب سے کسی کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کی تایا زاد بہن نوشین عرف نوشی جی جو غیر مضابطہ طور پر جاذب کی میٹھی تہمتی تھی۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چیتی ہوئی ادھر چلی آئی تھی۔

”نہیں۔ افسردہ تو نہیں ہوں۔“ ریاض علی نے ٹالا۔ وہ تینوں بچپن سے اکٹھے پلے بڑھے تھے، اس لیے ایک دوسرے کے خاصے مزاج آشنا بھی تھے۔

”تو پھر تمہاری بانسری کیوں خاموش ہے؟ تمہیں پتا ہے ناکہ ہمیں اس کی تان کس قدر پسند ہے۔“ جاذب نے اسے شہوکا دیا۔

”لیکن ہمارا تصور کیا ہے؟ ہم تو وادی سے نقل مکانی کر رہے ہیں۔ کس جرم کی سزا دے رہے ہو ہمیں؟“ ایک خاتون کی کرہٹاک آواز آئی۔
 نوشی کچھ سہم سی گئی۔ اس کے منہ سے دہی دہی سسکیاں برآمد ہونے لگیں۔

”ڈرو مت! میں ہوں نا۔۔۔ تمہارے ساتھ۔ کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ بس خاموشی سے یہیں بیٹھی رہو۔“ جاذب نے اسے لٹی دی۔
 وہ دونوں بزدل ہرگز نہیں تھے لیکن نہتے ضرور تھے۔ ارد گرد سے آنے والی صداؤں سے جھپکتے کرب نے انہیں بہت دھکی کر دیا تھا۔ جاذب نے کچھ دیر بعد جھاڑی کی اوٹ سے سر نکالا اور پہاڑی کی ڈھلوان کی جانب صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں دکھائی دینے والا منظر اس کے لبو میں ابال پیدا کرنے لگا۔

”جنگل کی طرف اسے چند عورتیں بچے اور مرد دکھائی دے رہے تھے جنہیں بھارتی فوجیوں نے اپنے نرنے میں لے لکھا تھا۔ فوجیوں کی پوزیشن اس طرح تھی کہ وہ یہاں ان کی نظروں میں آسکتا تھا۔ جاذب بے آواز طریقے سے دوبارہ پیچھے کھسک گیا۔

”کیپٹن! ہمارے مخبر کے مطابق یہ وہی خاندان ہے جس کے دلوں کے مجاہدین کی ٹریننگ لے رہے ہیں۔“ ایک کرخت آواز سنائی دی۔

”آئی سی۔۔۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی بھاگنے نہ پائے۔ اگر کوئی ہلنے کی کوشش بھی کرے تو فوراً بھون دینا۔“ کیپٹن نے حقارت سے کہا اور ایک توقف سے پھر دہاڑا۔

”مہیش! تم کہاں سرگئے ہو؟“
 ”آئی ایم ہیئر سر! حکم کریں۔“ مہیش ایک اوٹ سے برآمد ہوا۔

”اس خاندان میں کتنی تو جوان لڑکیاں ہیں؟“
 مہیش نے فوری طور پر خواتین کے چہروں سے چادریں اور نقاب ہٹائے اور سرعت سے بولا۔

”تین لڑکیاں ہیں سر!“
 ”ٹھیک ہے! انہیں کیمپ میں لے چلو۔ آج وہیں دعوت اڑاتے ہیں۔ اس کے اشارے پر بانی ہلکاروں نے انہیں بالوں سے پکڑ کر گھنٹا شروع کر دیا۔

دیگر خواتین اور عمر رسیدہ افراد ان کی راہ میں حائل ہو گئے اور اپنی پوری قوت سے انہیں روکنے کی کوششیں کرنے لگے۔ ایک بوڑھی عورت ان سے التجا کرتے ہوئے بولی۔
 ”تم بھلے ہماری جان لے لو لیکن انہیں چھوڑ دو۔ یہ ظلم

یقین ہے کہ ہماری اس جنتِ نظیر وادی میں بھی وہ روشن سویرا ضرور آئے گا۔“

ان دونوں نے بھی ایک عزم سے سر ہلایا اور موسم کے تیزور دیکھتے ہوئے گھر کی جانب بڑھ گئے۔
 ☆☆☆

کھیتیر میں روزمرہ کی سرگرمیاں اپنے معمول کے مطابق جاری تھیں۔ آئے روز ہونے والے واقعات ان کا عزم جوان کر دیتے تھے۔ وہ تینوں اکثر سہ پہر کے بعد موبیوں کی واپسی کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر بات چیت ضرور کرتے تھے لیکن ایک روز ریاض علی کو وہاں موجود نہ پا کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے اور پھر اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔
 ”پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا! ریاض! اپنے ڈھور ڈگر یہاں لے کر نہ آئے۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“ نوشی نے کہا۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ ورنہ اس کی بارسری کی آواز خود ہی اس کا سراغ دے دیا کرتی ہے۔“ جاذب نے تائید کی۔

”اب کیا کریں؟ گھر پہنچ کر کسی کو اطلاع دیتے ہیں۔“
 ”نہیں! وہ سب بھی خوا مخواہ پریشان ہو جائیں گے۔ ہم خود ہی اسے ڈھونڈ لیں گے۔“ جاذب نے ٹوکا۔

انہوں نے پہاڑی کے دامن سے جنگل میں اترنے والی میڈنڈی کی راہ لی اور زیر لب آیات کا درد کرتے ہوئے ریاض علی کی سلامتی کی دعاں بھی کرنے لگے۔

کچھ دور جانے کے بعد انہیں فضا میں نامانوس آوازیوں کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ کتوں کے بھونکنے کی دھشانیہ صداؤں نے ان کے قدم دھیں ساکت کر دیے۔ جاذب نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور فوراً ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔

”خاموش رہنا بالکل۔۔۔۔۔ یہاں ضرور کچھ بہت بڑی گڑبڑ ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

نوشی وہیں دیک گئی۔ وہ دونوں دم سادھے آوازوں کا ماخذ جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لمحوں بعد ہوا کے دوش پر انہیں چند مزید فقرات سنائی دیے۔

”بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ کوئی تو مدد کرو میری۔ خدا کے واسطے! کوئی تو مدد کرو۔“

اس کے فوری بعد ایک مرد کی آواز سنائی دینے لگی۔
 ”اب کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو زباںیں گدی سے کھینچ لوں گا۔“ وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

”نہ کر دو۔“

”میں غصہ ناک ہو کر آگے بڑھا اور بندوق کا کنڈا اسے مار کر پیچھے ہٹا دیا۔“
”اب کوئی اور آگے بڑھا تو میں اسے ایک ہل میں نرک میں پہنچا دوں گا۔“

”ہم یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ ایک اور عمر رسیدہ شخص نے بات کا آغاز کیا یہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر زور وار طمانچہ کر دیا۔

”میں تمہارا جرم ہے بڑھے! یہاں سے جاتے ہی تمہارے یہ بچے مجاہدین کے ساتھ مل کر ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔“

بوڑھا آدمی تورا کر بچے کو ترمیش نے اس کے جسم پر برسٹ چلا دیا۔ اس نے لڑکھائی زبان سے کلمہ شہادت پڑھا اور بے نورنگہ ہوں سے آسمان کی دستوں میں اپنے لیے رحم و کرم کی بھیک مانگنے لگا۔

بچوں کے چہرے خوف اور وحشت سے سپید پڑ گئے۔ ان میں سے کئی افراد نے ہسٹریائی انداز میں چیخا شروع کر دیا۔ عورتوں کے تین اور انسودیکہ کر چنار کے درخت بھی سلکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

میں نے ایک برسٹ ہوا میں چلایا اور ہاؤز کر بولا۔
”ان لڑکیوں کو کیپٹن کے کمپ میں لے چلو! آج ان کی مدد کے لیے یہاں کوئی نہیں آنے والا۔ انہیں تڑپا تڑپا کر مارتا ہے۔ ان کی آتما میں اگلے کئی جنموں تک بے کل رہیں گی۔“

کیپٹن شرما ایک جانب اپنی جیب سے چھٹی سی بوتل نکال کر رے نوشی میں مکن تھا۔ فوجی الہکار انہیں بال کھینٹے ہوئے لے جا رہے تھے۔ لڑکیوں کے چہرے پر اب کسی قسم کا کوئی خوف نہ تھا۔ آنے والے وقت کے تصور نے ان کے ذہن میں پھیل کر پرا کر دی تھی۔ الہکار ان کی بے بسی سے مکمل لطف اندوز ہوتے چٹکیاں بھرنے سے باز ہی نہیں آ رہے تھے۔

”اپنے غلیظ ہاتھ مجھ سے دوڑ کر کوڑھیل انسان!“ ایک لڑکی چلا کر بولی۔

اس الہکار نے ایک بھیا نک قہقہہ لگایا اور ڈرا دیر کے لیے اس کے بال چھوڑ کر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ اسے ٹھوکروں کی زد میں دیکھ کر ایک بوڑھی عورت بے اختیار تڑپ کر بولی۔

”آمنہ! میری بچی!“

آمنہ نے ایک نظر مڑ کر اس عورت کو دیکھا اور بجلی کی سی

تیزی سے اپنے لباس سے چاقو نکال کر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ فوجی الہکار بگا بگا رہ گئے۔ اس کا خون آلود جسم زمین پر جاں کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ کیپٹن کے لیے یہ نظارہ اس کے منہ پر زور وار طمانچے کے مترادف تھا۔ اس کا ذہن پہلے ہی شراب کے زیر اثر تھا اور اب تو وہ بالکل ہی اپنے حواس کھو بیٹھا۔

”میں! اس لڑکی کو سامنے چنار کے درخت کے ساتھ باندھ دو اور اس کے تمام کپڑے اتار دو۔“ وہ چلا یا۔

میں نے اسی چاقو سے آمنہ کا لباس چاک کیا اور اسے گھسیٹا ہوا درختوں کی جانب لے گیا۔ ایک جانب ساکت کھڑے اس خاندان میں پھل ہوئی اور ایک دس سالہ بچہ بہن کو پکارتا ہوا ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر ترمیش پر ہل پڑا۔ دیو قامت ترمیش نے اسے ہاتھوں سے اچھال کر دوسری جانب پھینک دیا۔

”مار دو اس سالے کو! زندہ رہا تو یہ بھی مجاہد ہی بنے گا۔“ کیپٹن نے نفرت سے کہا۔

ایک فوجی الہکار آگے بڑھا اور اسے دوبارہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر زور وار طریقے سے اچھال دیا۔ وہ بچہ حاذب اور نوشی سے چند قدم کی دوری پر جماڑیوں کے پاس آ کر گر ا۔ اسی لمحے ایک خوفناک برسٹ چلا اور بچے کا جسم کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ نوشی کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی لیکن حاذب نے فوراً اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔
”شش..... خاموش۔“

آمنہ کی والدہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بچے کی جانب بڑھی لیکن ایک اور فوجی الہکار کی بندوق سے نکلنے والے شعلوں نے اس کے سر میں کئی روشتہ ان بنا دیے۔ فضا میں موت کا گہرا سناٹا تھا۔ چنار کے درخت بھی انسانیت کی اس تذلیل پر اٹھک بہاے محسوس ہو رہے تھے۔ باقی ماندہ افراد کے چہروں پر زور دی گھنڈی تھی۔

فوجی الہکار ایک بار پھر آمنہ کی جانب متوجہ ہو گئے جو اس جاں کنی کے عالم میں بھی اپنا آپ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اسے گھسیٹا ہوا لے جا رہا تھا۔

”اس سالی نے یہ چاقو میرے دل میں اتارا ہے۔ میں اسے اس کے کیے کی سزا تو ضرور دوں گا۔ اگر کوئی جوان اپنی بھوک مٹاتا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ نوج ڈالو اسے!“ کیپٹن چلا یا۔

”پچھلے ماہ ان مجاہدوں نے میرے بھائی کی ہتھکی تھی۔ اس کے شعلے میرے سینے میں اب بھی پھل رہے ہیں۔ میں اس کا وہ حال کر دوں گا کہ آئندہ کوئی بھی لڑکی

بڑی کوشا نہ بنایا اور سر دلچھ میں بولا۔

”معافی مانگ کے کیپٹن!“

”تم بہت پچھتاؤ گے لڑکے! تمہاری ساری بستی کو میں آگ لگوا دوں گا۔“

جاذب نے اس کے بائیں شانے اور پھر رانوں پر بھی فائر کھول دیے۔ کیپٹن کی ہمت اب جواب دینے لگی تھی۔

”م..... مجھے چھوڑ دو..... کہیں منہ مائی قیمت دینے کو تیار ہوں۔“ اس کا لہجہ ڈوبنے لگا۔

”ان عورتوں سے معافی مانگ۔“

کیپٹن نے مشکل اپنا وجود کھینچا، وہ ان کی طرف بڑھا اور ان کے قدموں میں گر کر بولا۔

”تم لوگ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ مگر اس لڑکے سے میری جان بچا کر دو۔“ وہ سنسنایا۔

عورتوں نے نفرت اور حقارت سے اس کے منہ پر تموک دیا۔ اتنے میں نوشی بھی جھار کی اوٹ سے نکل کر وہاں پہنچ چکی تھی۔

”جس وقت تم ان معصوم اور بے گناہ لوگوں پر ظلم کر رہے تھے تب تمہاری فرعونیت عروج پر تھی۔ اب موت سامنے دیکھ کر پینا کیوں آگیا؟“ وہ جلال میں آگئی۔

”ان کی بہادری صرف تہتے لوگوں تک ہی محدود ہوتی ہے۔“ جاذب نے واحد بچے ہوئے سپاہی کو بھی نشانے پر لیا۔

”میں اسے بالکل معاف نہیں کروں گی۔ اس معصوم لڑکی کی پکار پھول سے بچنے کی لاش اور ماما کی بے حرمتی کا انتقام نہ لیا تو بسکی سکون سے جی نہ سکوں گی۔“ نوشی نے کچھ دور

پڑے ایک پتھر کو اٹھا یا اور وحشیانہ انداز میں کیپٹن کی کھوپڑی پر تازہ توڑ جھلے کر دیے۔ جاذب کا دھیان بھی وقتی طور پر اس

سپاہی سے ہٹ گیا۔ اس نے اس غفلت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور جاذب کی بندوق کو ٹھوکرے سے ایک طرف پیچیک کر ڈھلوان

کی جانب چھلانگ لگا دی۔

”یہ بہت غلط ہوا۔ کہیں یہ مکہ نہ لے آئے۔“ نوشی نے تاسف سے سر ہلایا۔

”اب یہاں رکتنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔“ جاذب نے دکھ اور اہم

کی تصویر بنے ان افراد سے کہا۔

ان سب نے آمنہ اور دیگر دونوں افراد کی لاشیں اٹھائیں اور خاموشی سے جاذب کے ساتھ اس کے گاؤں کی طرف چل دیے۔

گاؤں والوں کو ان کی پتا کا علم ہوا تو سب کے دل دکھ

اپنے باپ بھائی کو اس راہ پر چلنے ہی نہ دے گی۔“ ہمیش نے اپنی بندوق ایک جانب رکھتے ہوئے آمنہ کو بھوکی نظروں سے دیکھا۔

”گڈا پھرٹ جوان! گو آہیڈ!“ کیپٹن ایک بار پھر شراب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میش پر پوری طرح شیطان حاوی ہو چکا تھا۔ آمنہ کی اذیت ناک کراہیں جاذب کے دل پر تیزاب کے جھینٹے ڈال رہی تھیں۔ اس نے کچھ لمبے سوچ بچار کی اور چوہا یوں کی طرح

ریختا ہوا جھازیوں ہی سے چٹارے درختوں کی جانب چل دیا۔ میٹھ کے اس غیر انسانی تماشا میں دیگر فوجی بھی پوری

طرح شہک ہو چکے تھے۔ جاذب نے بے آواز طریقے سے میٹھ کی بندوق تھامی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان سب پر

فائر کھول دیے۔ نفس کی لذت میں غرق بھارتی فوجیوں کے سنبھلنے سے قبل ہی وہ انہیں موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

کیپٹن بھی اس ساری صورت حال پر بوکھلا کر رہ گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے ہوسٹر سے ریو اور

ٹکائے کی کوشش کی لیکن جاذب نے فوراً آگے بڑھ کر اس کی کلائی پر زوردار ٹھوکرہ دیا اور بندوق کا کندا اس کے چہرے

پر مار کر کہا۔

”غیبت انسان! اگر ذرا سی بھی حرکت کی تو اس بندوق کا سارا میسج تیرے جسم میں اتار دوں گا۔“

”تو نے میرے جوانوں کو مار کر اپنے خاندان کے لیے بڑی دردناک موت چن لی ہے لڑکے! میں تیرے خاندان کو زک میں پہنچا دوں گا۔“

جاذب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ آمنہ کی لڑکھائی آواز میں لکھی ادا نیکی نے اسے گنگ کر دیا۔ اس کی

روح پر داز کر چکی تھی۔ جاذب کے وجود میں انگارے دیکنے لگے۔ اس کے اشارے پر ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر آمنہ

کے بے جان وجود کو اپنی چادر سے ڈھانپ دیا۔ جاذب نے طیش کے عالم میں کیپٹن کے بازو کوشا نہ بنایا اور چلا کر بولا۔

”تیرے ناپاک وجود سے آج میں اس دھرتی کو پاک کر دوں گا۔“ مجھے آسان موت ہرگز نہیں ملنی چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کے دونوں بازوؤں اور دائیں ٹانگ پر فائر کھول دیے۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔

”ان سب سے معافی مانگو!“ جاذب نے اسے ٹھوکر ماری۔

”نہیں! میں معافی نہیں مانگوں گا۔“ جاذب نے اس کے بائیں کھٹنے اور دائیں شانے کی

سے بھر گئے۔ بزرگوں نے فوری طور پر میچوں کو ختم دلوا کر
دفتانے کا انتظام کیا اور نہایت خلوص سے انہیں بارڈر کراس
کرنے کا مشورہ دے کر زائرہ بھی ہمراہ کر دیا۔

ان کی روگائی کے بعد جاذب نے خود پر بیٹنے والے
واقعات بھی بلا کم و کاست سنا دیے۔ ان کی پیشانیوں پر
تفکرات کی گہری لکیریں ابھر آئیں۔

”بھاری فوجی بہت متمم مزاج ہوتے ہیں پٹنا زندہ رہ
جانے والا فوجی اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لیے ہر قسم
گاؤں میں تم لوگوں کو شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈتا پھرے
گا۔“ ایک بزرگ نے کہا۔

”اب ہمارے لیے کیا حکم ہے چچا جان؟“ جاذب
نے پوچھا۔

”حکم کیا کروں بیٹا! بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی فوری
طور پر یہ علاقہ چھوڑ دو۔“

”ہاں! اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔“ خاندان
کے ایک اور بزرگ نے کہا۔ ”اس فوجی نے تم دونوں کو اچھی
طرح دیکھ لیا ہے اور اب تک تو تمہاری تلاش بھی شروع ہو چکی
ہوگی۔“

جاذب ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ کہنے
کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ ایک اور بزرگ نے ہاتھ اٹھا
کر بولنے سے منع کیا اور کہنے لگے۔

”بہتر یہی ہے کہ ان دونوں کا ابھی نکاح پڑھوا کر اسی
قافلے کے پیچھے روانہ کر دیا جائے۔ آزاد علاقے میں ہمارے
بہت سے رشتے دار موجود ہیں۔ یہ وہیں قیام کر سکتے ہیں۔“

جاذب ان کے الفاظ سن کر سکتے میں رہ گیا اور بے چینی
سے بولا۔

”لیکن چچا جان!“

”یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے بیٹا! یہاں رہنے میں بہت
سے خطرات ہیں اس لیے ایک محرم رشتے میں بندھ کر ہی اپنا سفر
جاری رکھنا ہوگا۔“

انہوں نے خاندان کے دیگر لوگوں کو نکاح کے
انتظامات کرنے کا حکم دیا۔ جاذب کے ہوش و حواس سلب ہو
چکے تھے۔ نوشی بھی اس اچانک صورت حال پر رنگ لگئی۔

ان کے ذہنوں پر جیسے دھند طاری تھی۔ شام کے سائے
گہرے ہوتے ہی ایجاب قبول کے تمام مراحل طے ہو
گئے۔ جاذب کو تو ہوش اس وقت آیا جب ریاض نے آگے
بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

”بہت مبارک ہو میرے دوست! اللہ پاک تمہاری

زندگی کا یہ نیا سفر کامیاب کرے۔“

”تم کہاں چلے گئے تھے..... ہم تمہیں ڈھونڈنے
ہوئے.....“ جاذب نے تیزی سے کہا۔

”مجھے سب مل گیا ہے..... میرا ایک نیل گم کیا تھا
جسے ڈھونڈتے ہوئے میں بہت دور نکل گیا تھا۔“

”وہاں انڈین آری نے ان لوگوں کے ساتھ بہت ظلم کیا۔“
”ایک لحاظ سے تمہارا وہاں اچانک پہنچنا ان کے حق

میں بہت اچھا ثابت ہو گیا۔ یہ سب تو قدرت کی طرف سے
ملے تھا۔ اب تم کوئی فکر نہ کرو اور مستقبل کی سوچو۔“ ریاض علی
نے اسے تسلی دی۔

”ہاں! ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ اگر میں وہاں نہ پہنچتا تو
جانے وہ بھیڑ پئے اور کیا کرتے؟“

ریاض علی نے اسے ایک بار پھر گلے لگا کر خوب تشفی
دی۔ چٹاروں کے اس دیس میں رات اتر آئی تھی۔ خاندان
کے بزرگوں نے دعاؤں کے سائے میں جاذب اور نوشی کو کچھ

زائرہ دے کر رخصت کر دیا۔
اس انوکھی رخصتی پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔

☆☆☆☆

وہ دونوں بغیر رکے چلنے جا رہے تھے۔

گاؤں کی سرحد پار کرنے سے قبل ایک بار انہوں نے
گرد و پیش کی ہر چیز کو تم آنکھوں سے خوب یادوں میں
اتارا۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں زیادہ دیر رکنا بھی ان کے لیے

بہت بڑا خطرہ ہوگا اس لیے دل پر پتھر رکھے وہ اونچے نیچے
رستوں پر ہوار انداز میں قدم بڑھاتے رہے۔ رستہ اب بہت
دشوار ہونے لگا تھا لیکن وہ بچپن ہی سے ان کٹھنائیوں کے
عادی تھے اس لیے انہیں کوئی بھی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی۔ آسمان پر چاند بھی
گہرے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ وہ جنگل میں کافی دور نکل
آئے تھے۔ یہاں سے رستہ انجینی تھا اور اب اس اندھیرے

میں مزید سفر ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ رستہ
بھول جانے کا اندیشہ بھی سر پر منڈلا رہا تھا۔

”کچھ دیر آرام کر لیں جاذب؟“ نوشی نے کہا۔
”کیا تھک گئی ہو؟“

”ہاں! اب مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے۔“ اس نے
گہری سانس لی۔

”ٹھیک ہے۔ کوئی جگہ تلاش کر لیتے ہیں۔“ جاذب کی
آنکھیں اندھیرے سے کافی مانوس ہو چکی تھیں۔ اس نے
تموڑی ہی دیر بعد ایک غار تلاش کر لیا اور نوشی کا ہاتھ پکڑے

مغبوط قدموں سے اندر چلا گیا۔

غار کا اندرونی حصہ کافی کشادہ تھا۔ جاذب نے روائی سے پہلے انڈین فوجیوں سے حاصل کی گئی بندوق بھی اپنے ہمراہ لے لی تھی۔ اس نے بندوق کو احتیاط سے تھا اور غار میں کسی جانور کی موجودگی کا اندیشہ ذہن میں رکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم بڑھانے لگا۔ خوش قسمتی سے انہیں کسی بھی خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

غار کا فرش بالکل ہموار تھا اور وہاں یہ آسانی لینا جا سکتا تھا۔ جاذب نے اپنے سامان سے ایک چادر نکالی اور فرش پر بچھا دی۔ نوشی نے بھی اپنا سامان وہیں رکھ دیا اور دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھی۔ کئی لمبے پونہی خاموشی سے سرک گئے۔

”نوشی!“ کچھ دیر بعد جاذب نے پکارا۔

”جی؟“

”کیا تم روری ہو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر اتنی اداس کیوں ہو؟ کیا میرے ساتھ آنے کی تمہیں کوئی خوشی نہیں!“

”مجھے تمہارے ساتھ آنے سے بہت خوشی ہے جاذب لیکن میں سب گھروالوں کو یاد کر کے دھمی ہو رہی ہوں۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟“

”ہمارے ہتھیار جب سے بھارتی فوج نے اپنے قبضے میں لے لیے ہیں ہم بے بسی کی انتہا پر پہنچ چکے ہیں۔ نتے ان سے لڑیں بھی تو کیسے؟“

”پروردگار! ان سب کو اپنے حفظ دامان میں رکھنا۔“ نوشی گڑگڑائی۔

”اللہ بہتر کرے گا۔“ جاذب نے خلوص سے کہا۔

ایک بار پھر ان دونوں کے مابین گہری خاموشی حاکم ہو گئی۔ وہ اپنی اپنی سوچوں میں کم موجودہ حالات پر غور کرنے لگے۔ بچپن کی نسبت کے باعث ان میں ایک گہری انسیت کا رشتہ قائم تھا جو شعور کی وادی میں قدم رکھتے ہی ایک بے عنوان سی محبت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ انہوں نے باہمی زندگی کے ساتھ گزارنے کے بہت سے خواب دیکھے تھے لیکن جن حالات میں یہ ناکج ہوا تھا اور انہوں سے فاصلے پیدا ہوئے تھے وہ دونوں ملول ہو گئے تھے۔

خوشی اور مسرت کا کوئی لمحہ ان کے علاقے میں کم ہی راس آ یا کرتا تھا۔ کسی بھی تہوار یا یاد شدیہ کے موقع پر بھارتی فوجی اپنی درندگی دکھانے سے نہ چوکے اور نو عمر لڑکیوں کی کٹی پچٹی لائیں اکثر جنگل یا پہاڑوں پر جنگی جانوروں کی خوراک

بن جایا کرتیں۔

نوشی ان لحاظات کا تصور کر کے تھرا اٹھی اور جاذب کی زندگی و سلامتی کے لیے بھی دعا گو ہو گئی۔ کچھ ہی لمحوں میں تھکاوٹ سے چور ہو کر وہ نیند کی وادی میں کھو گئے۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ جاذب کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر تو وہ اپنے ارد گرد ماحول کا ادراک ہی نہ کر پایا۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہوا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس طرح غفلت کی نیند ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

اس نے ٹٹول کر اپنی بندوق اٹھائی۔ نوشی کی مدھم سانسوں کی آواز بھی اس کی سماعت میں پڑ رہی تھی۔ وہ اندازے سے چلتا ہوا غار کے دہانے پر آ کر بیٹھ گیا۔ دور کہیں کوئی پرندہ کوک رہا تھا۔ جنگل کے مہیب ستائے میں جاذب کو یہ آواز بہت عجیب محسوس ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نایاب نسل پرندہ قدرتی طور پر فجر سے پہلے بیدار ہوا کرتا ہے اور اپنی مخصوص آواز میں راگ الاپتا ہے۔ ٹھوڑی ہی دیر میں جنگل مزید پرندوں کی آواز سے بھی گونج اٹھا۔ انہی خوشنما آوازوں میں ہوا کے دوش پر لہرائی ایک بھابھک آواز بھی اس کی سماعت سے دور نہ رہ سکی۔ کسی شکاری کتے کی آواز اسے بہت قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

جاذب ایک ہی لمبے میں ساری صورت حال سمجھ گیا۔ بھارتی فوجی ضرور کتوں کے ذریعے انہیں تلاش کرتے ہوئے جنگل میں پہنچ چکے تھے اور اب یہاں مزید ٹھہرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ وہ ایک جست میں اندر پہنچا اور نوشی کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

”سک..... سک..... کیا ہوا؟“ وہ ہڑبڑا گئی۔

”ہندوستانی فوجی کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والے ہیں..... ان کے پاس شکاری کتے ہیں جن سے انسانی جسم کی بو چھپی نہیں رہ سکتی۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ وہ دانستہ بلند آواز میں بولا تا کہ نوشی کے حواس جلد بحال ہو سکیں۔

نوشی نے بھی تیزی سے سامان سمیٹا اور اس کا ہاتھ تھامے باہر آ گئی۔ چاند اب بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ اس لیے راستے کے نشان اجنبی نہیں رہے۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتے مخالف سمت میں تیزی سے چلنے لگے۔ مختصر نیند نے انہیں کافی حد تک تازہ دم کر دیا تھا اور جان بچانے کی جبلی خواہش بھی ارادوں کو کمزیر نہیں کر رہی تھی۔

مج صادق کی روٹی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی۔ وہ

بغیر رکے چلتے جا رہے تھے۔ ایک جگہ پانی کا چشمہ نظر آتے ہی بے اختیار ٹھٹک کر رک گئے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے دونوں نے نماز ادا کی اور اپنے سامان سے مٹی کی روٹی نکال کر پیٹ کے ایندھن کو سرد کیا۔ اوک سے جی بھر کر ٹھنڈا پانی پینے کے بعد انہوں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ اپنے عقب میں دھوپ دھوپ کی آوازوں کے بعد ایک اور کرخت آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”مینڈ زاپ! آخر وار حرکت کی تو بھون کے رکھ دیں گے۔“
جاذب اور نوشی کے ذہنوں میں بیک وقت ایک ہی خیال سرسرایا کہ انہیں ٹریس کر لیا گیا ہے۔ وہ دو افراد تھے۔ ان کی بزمی ہوئی شیو، آنکھوں میں سرخی اور منہ سے اٹھتے بدبو کے بھپکوں سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔
”کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ان میں سے ایک نے زنجلی سے پوچھا۔

جاذب بے سوال سن کر چونک گیا۔ یہ کوئی انجان الہکار معلوم ہوتے تھے۔ اس نے انہیں پکڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔
”صاحب جی! ہم دونوں پر مٹی ہیں۔ ہمارے بڑے بہاؤ کے لیے نہیں مانتے تھے تو ہم گھر سے بھاگ آئے ہیں۔ غلطی ہو گئی جی۔ رستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں۔“ جاذب نے اپنی اداکاری میں رنگ بھرنے کے لیے کالوں کو ہاتھ لگا کر ہاتھ بھی جوڑ دیے۔

”بہت ٹھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ ادھر تھوڑی دور ہی ہمارا کیمپ ہے۔ آرام کر لو پھر جہاں کہو گے پہنچا دیں گے۔“ دوسرے سپاہی نے ہوس ناک نظروں سے نوشی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جاذب کسی بھی طرح اپنے سامان کے پیچہ دہلی بندوق نکالنا چاہتا تھا لیکن ان الہکاروں کی نظر سے بچنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے نوشی کو بازو سے پکڑ کر آگے گھسیٹا۔ اس کا پاؤں بے اختیار پھسلا اور وہ کراہتی ہوئی نیچے گر گئی۔ جاذب اس کی چال سمجھ گیا۔ دونوں الہکاروں کا دھیان نوشی کی جانب ہی تھا۔ اس نے سرعت سے ایک الہکار سے بندوق چھینی اور ان دونوں پر فائر کھول دیے۔

جنگل میں دھماکوں کی اس زوردار آواز سے پرندوں نے بھی احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں اب ہر طرف سے خطرے میں گھر چکے تھے۔ جاذب جانتا تھا کہ یہ الہکار کسی قریبی چوکی سے یہاں آئے ہوں گے اور اسے یہ بھی علم تھا کہ ہر چوکی پر ایک افسر کے علاوہ دو ماتحت تعینات ہوتے ہیں۔ دو افراد کے جنم داصل ہونے کا سکون اپنی جگہ لیکن تیسرا

نادیدہ دشمن بھی اپنی موجودگی سے ان کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ فائرنگ کی یہ آواز تعاقب کرنے والی ٹیم کو بھی خود بخود ان کا سراغ دے دیتی۔

یہ سبھی خیالات ایک لمحے میں جاذب کے ذہن میں گردش کر گئے اور اس نے فوراً وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں فوجیوں کی بندوق اور اضافی گولیوں پر قبضہ جما کر وہ سامنے کی سمت میں نظر آتی پہاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر وہ دوسری طرف مڑ جانا چاہتے تھے جہاں ان کی معلومات کے مطابق آزاد کشمیر کا علاقہ واقع تھا۔ چڑھائی بہت دشوار تھی لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور ہانپتے کانپتے وہ فاصلہ طے کرتے گئے۔ کافی بلندی پر پہنچنے کے بعد نوشی نے اس کا بازو ہاتھ مارا اور التجائیہ انداز میں بولی۔
”مجھ سے اب مزید نہیں چلا جا رہا۔ تھوڑی دیر یہیں رک جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ تم وہاں درخت کے سائے میں چلو۔ میں ذرا درگردگدی خبر لے لوں۔“ اس نے نوشی کا سر تھپتھپایا۔
ایک درخت کی شاخ پر چڑھ کر اس نے نیچے کاجاڑہ لیا تو اس کے اندازے کے عین مطابق تیسرا الہکار ان کی راہ پر لگ چکا تھا۔ جاذب گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اب فائرنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے دائیں جانب موجود جھاڑیوں کی اوٹ میں دب گیا۔ اس الہکار کو یہاں سے لازمی گزرنا تھا۔

انتظار اور سستی کی کیفیت میں اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک سوکھی لکڑی چٹختے کی آواز آئی۔ وہ فوراً چونکا ہوا گیا۔ الہکار کے وزنی جوتوں تلے کوئی شاخ ٹوٹی تھی۔ جاذب نے بندوق کوال سے تھما اور قریب آتے ہی اس کے سر پر پے در پے کئی دھار کر دیے۔ کھوپڑی چٹختے کی مخصوص آواز کے بعد وہ فوجی الہکار تھوڑا کر نیچے گر گیا۔

سورج اب کافی بلند ہو گیا تھا۔ ہلکی سنہری دھوپ نے اپنے پڑ پھیلالیے۔ ذرا پہلے سستانے کے بعد حرکت میں آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ نوشی کسی گہری سوچ میں تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ جاذب نے محبت سے پوچھا۔
”ہم رستہ بھٹک گئے ہیں۔ وہ قافلہ تو ہمیں کہیں نہیں ملے گا۔“
”شاید وہ لوگ کسی دوسرے رستے سے واقف ہوں گے۔“
”اب کیا ہوگا جاذب؟“ وہ بے اختیار پریشان ہوئی۔
”فکر نہ کرو۔ ہم ضرور بازو کر اس کریں گے اور انہیں کھیر گاؤں کے حالات سے آگاہ کر کے مدد طلب کریں

گے۔ اس نے تسلی دی۔
وہ جانتا تھا کہ نوشی کا کبھی ایسے حالات سے واسطہ نہیں

”یہ غلامی جانے کب تک اندھیروں کی طرح ہمارا
مقدور رہی رہے گی؟ آزادی کا سورج لیے روشن صبح کب طلوع
ہوگی؟“ اس کی آنکھوں میں نمی جھلکی۔

وہ کافی دیر تک کھوہ سے باہر نظر آنے والے اندھیرے
میں امید کے جگنو تلخاڑی رہی اور پھر اپنی تھکاوٹ اور نیند کے
سامنے سرنگوں ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے
آس پاس ایک تیز سرسراہٹ کے علاوہ چہرے پر شدید نمی بھی
محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تو اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کہاں موجود
ہے لیکن جب آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اپنے وائیں
جانب دوسرخ آنکھوں کو دیکھ کر ہسٹریائی انداز میں چیخ اٹھی۔

اس کے بالکل قریب ایک بھیڑیا موجود تھا جس کی
تھوٹھی سے لپکنے والا مادہ اس کا چہرہ چھپ رہا تھا۔

”کیا ہوا نوشی؟ تم تھک تو ہو؟“ جاذب کی آنکھ بھی کھل گئی۔
نوشی نے بے اختیار اس کا بازو دبوچ لیا۔ جاذب کی نظر

بھی بھیڑیے پر پڑ چکی تھی۔ اس نے لپک کر اپنی بندوق تھامی
لیکن بھیڑیا ایک جست لگا کر تارکی میں غائب ہو گیا۔ اب
نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں کھوہ کے
وہانے میں بیٹھ کر سوتے ہوئے کا انتظار کرنے لگے۔

بھوک ان کے معدوں کو اپنے تیز پنجوں سے نوج رہی
تھی لیکن پانی کے سوا کچھ بھی میسر نہیں تھا۔ چنار اور چنڑ کے
درختوں سے ہوا سرسراہٹ ہوئی گزرتی تو شاخوں کی آواز سے
بھی ان کے دل دھڑک اٹھتے۔ وقت سست رفتاری سے ہی آگئی
لیکن گزرتا چلا گیا۔ پرندوں کی مخصوص آوازیں فضا میں پھیلیں
تو وہ ایک بار پھر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

سورج اب سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ جانے کتنی مسافت
طر کر چکے تھے۔ ایک مقام پر بندروں کی ٹولی دیکھ کر وہ ٹھٹھک
کر رک گئے۔ ان کی یہاں موجودگی کا واضح مطلب تھا کہ
قریب ہی کہیں جنگلی پھل یا میوے موجود ہیں۔ جاذب نے
بے تابی سے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں اور پھر کچھ ہی دور اسے
ایک پھل دار درخت نظر آ گیا۔ یہ ایک مقامی پھل تھا جو
چھوٹے بیروں کی شکل میں دستیاب ہوتا تھا۔

”نوشی! تم یہ سامان پکڑو۔ بھوک مٹانے کا انتظام ہو گیا
ہے۔“ وہ پتہ جوش ہوا۔

”یہ پھل لینے جاؤ۔ پھل اس میں ڈال دینا۔“ نوشی نے
کپڑے کی بنی ہوئی تھمائی جس میں لمبی کی میٹھی روٹیاں تھیں۔

انہوں نے اپنی جھاگل سے تھوڑا پانی پیا اور ایک بار
پھر سفر شروع کر دیا۔ اب وہ پہاڑی کی دوسری جانب نشیب
میں گامزن تھے۔ اس طرف کا علاقہ ان کے لیے مکمل اجنبی
تھا۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ اس پار کے لوگ ’آزادی‘
جیسی عظیم دولت سے مالا مال ہیں۔ وہ کھلے عام نماز پڑھتے
ہیں، نہوار مانتے ہیں شادیاں کرتے ہیں اور بھی اسلامی رسوم
درواز پر آڑاؤ نہ عمل کرتے ہیں۔ اس آزادی اور ان تیشات
کی وہ بخش تہنای کر سکتے تھے۔

دوسری جانب نشیب میں پھر جنگل کا سامنا تھا۔ چنار
کے بلند درخت انہیں چیرائی سے تک رہے تھے۔ وہ بغیر کے
شام تک چلے رہے لیکن اب بھی انہیں کوئی گاؤں یا رہائشی
علاقہ نظر نہ آیا تھا۔ وہ ابھی تک مقبوضہ علاقے میں ہی تھے اور
اس وقت گوار کی دھار پر سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ایک جگہ رک کر انہوں نے باقی ماندہ کچی کی روٹی سے
پیٹ پوچا کی۔ کھانا اب ختم ہو چکا تھا البتہ پانی جا بجا چشموں
سے انہیں مل جاتا تھا جسے وہ اپنی جھاگل میں بھر لیتے۔ شام
کے سائے گہرے ہونے لگے۔ انہیں رات گزرنے کے لیے
کسی محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی جو خوش قسمتی سے کچھ دور
جاتے ہی مل گیا۔

یہ ایک قدرتی کھوہ تھی۔ جاذب نے نوشی کا ہاتھ تھاما اور
وہانے سے چھاڑیاں ہٹا کر اندر چلا گیا۔ اندرونی جانب بالکل
کشادگی نہیں تھی۔ دو افراد کے بیٹھنے کے لیے یہ ہی مشکل جگہ
تھی۔ انہوں نے گہری سانس لے کر سامان رکھ دیا۔

”نوشی! تم کافی تھکی ہوئی ہو اس لیے تھوڑی دیر آرام
کرو۔ ہم دونوں میں سے ایک کے لیے بیداری بہت ضروری
ہے۔ میں کچھ دیر بعد تمہیں جگا دوں گا۔“

”مجھے نیند بالکل نہیں آئے گی۔ پہلے تم سو جاؤ۔ میں
تمہیں جگا دوں گی۔“ نوشی نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ جاذب شخص
اس کی وجہ سے اپنی تھکاوٹ کا اظہار نہیں کر رہا اور اگر وہ سو گئی
تو اس کے آرام کی خاطر جاذب اسے بالکل نہیں جگاے گا۔

جاذب نے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ کیا اور اپنا جسم
موڑ کر ایک پتھر پر سر رکھے تھوڑی ہی دیر میں سو گیا۔ نوشی
خاموشی سے اس کے نقوش اور وجود پر طاری جامد خاموشی کو

دوسری شاخ پر چھوڑ رہے تھے۔ کیا ہم ایسا کوئی طریقہ نہیں اپنا سکتے؟“ نوشی کی تجویز سن کر اس کی آنکھیں چمکے نکلیں۔
 ”بالکل۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔ مجھے تو خیال ہی نہ آیا۔ کمال کی تجویز دی ہے تم نے۔“ اس کے والدہا نے انداز پر نوشی کے رخسار تھما رکھے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس اوپر مڑتے ہوئے پنسل تارچ کی روٹی میں درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک ایسا درخت مل گیا جس کے ساتھ خاردار تاریں گزر رہی تھیں۔ یہ بھی چٹاری کا درخت تھا جس کی شاخیں قدرتی طور پر کئی میٹر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہی شاخیں انہیں اپنے مقصد میں کامیاب کر سکتی تھیں۔

وہ خوشی سے جھومتا ہوا نوشی کے پاس آیا اور اسے اپنی دریافت کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ بھی پرجوش ہو گئی۔ آزاد فضا میں سانس لینے کا تصور انہیں بھی کبھی گہرائی میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک عزم سے آگے بڑھے اور درخت کے پاس پہنچ گئے۔ جاذب نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور نوشی کو ایک شاخ پکڑ کر دوسری طرف کودنے کا اشارہ کیا۔ اس کے آگے بڑھتے ہی اس نے ایک نسبتاً اونچی شاخ تھامی اور اپنا جسم چوس کر لیا۔

اسی لمحے ہوا میں ایک زوردار برسات کی آواز گونجی اور جاذب نے نوشی کے وجود کو گہرا کر دوسری جانب گرتے ہوئے دیکھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پا تا، اسے اپنی پشت میں بھی انگارے دھستے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسی لمحے میں وہ ساری صورت حال سمجھ گیا کہ یہ بھی ان کے حیادوں کا لگایا ہوا ایک پھندا تھا جس میں وہ بھی پھنس گئے تھے۔

اس کے خون آلود ہاتھوں سے شاخ پھسل کر وہ بھی نوشی ہی کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ بارودی سیسہ سنگناخ زمین سے ٹکرانے کی خراشوں کی اذیت سے بڑھ کر اس وقت وہ کسک اور تشنگی بھی جوتانہوں نے لب بام محسوس کی۔

”نوشی.....“ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے پکارا۔ دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ اس کا دل کسی نے یک گھٹ مٹھی میں پیچھ لیا۔ اس نے تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر کھلے کا اور دکھایا اور آزاد سرزمین کی مٹی کی چٹکی اٹھا کر اپنے چہرے پر ملی۔ انہیں دردندوں سے آزادی نہیں مل سکی تھی مگر اس نوبیا ہوتا جوڑے نے آزادی کی خواہش صرف خواہش اور کوشش کی پوری قیمت اپنے لبوں سے ادا کر دی تھی!

جاذب تیزی سے درختوں کے جھنڈ میں گیا اور وہ اگلے نصف گھنٹے میں قبیل کے علاوہ اپنے دامن میں بھی ڈھیروں پھل بھر لایا۔ انہوں نے سیر ہو کر پھل کھایا اور پانی پنی کر رب کا خصوصی ٹکڑا ادا کیا۔ اب ایک بار پھر وہی سفر تھا اور وہی مٹنا جنگل۔
 ”مزید کتنا سفر ہو گیا ہے جاذب؟“ نوشی نے پوچھا۔
 ”میرے اندازے کے مطابق تو اب تک سرحد آ جانی چاہیے۔“ اس نے پیشانی مسلی۔

”کیا تمہیں اس کی کوئی نشانی یاد ہے؟“
 ”ہاں۔ ایک ٹالا بہتا ہے جو دوسری طرف دریائے نیلم میں جا گرتا ہے۔“

”اگر آج رات بھی کسی کھوہ یا غار میں بسر کرنی پڑی تو.....“ نوشی گزشتہ رات کا منظر یاد کر کے ایک بار پھر تھرا گئی۔
 ”فکر کیوں کرتی ہو؟ ہم اس وقت ایک نیک مقصد کے لیے حالت سفر میں ہیں۔ قدرت ہماری مدد ضرور کرے گی۔“
 شام کے سامنے تیزی سے پھیلنے لگے۔ اب وہ مایوسی کا شکار ہونے لگے تھے لیکن یکدم پانی بہنے کی ہلکی سی آواز ان کے لیے حیات نو کی نوید ثابت ہوئی۔ منزل قریب تر نظر آنے لگی تو قدرتی طور پر ان کی رفتار تیز ہو گئی۔ دس منٹ کی مسافت کے بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں سے خاردار تاریں اور سرحدی علاقہ واضح نظر آنے لگا تھا۔

”اب خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔ ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“ جاذب نے سر گونگی کی۔
 ”وہ کیوں بھلا؟ اب تو منزل پاس ہے۔“

”یہاں بھارتی فوجیوں نے ہر جانب نا دیدہ جال اور بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی ہیں۔ ایک قدم بھی غلط جگہ پر پڑا تو ہمارے جیتنے سے اڑ جائیں گے۔“

خاردار تاروں کو پھلنا ایک ناممکن امر تھا۔ اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ جاذب نے بھارتی فوجی سے حاصل کی گئی ایک پنسل تارچ نکالی جو ایسے ہی کسی موقع کے لیے اس نے اب تک استعمال نہیں کی تھی۔ تارچ کی مدد سے روشنی میں بھی دوسری جانب جانے کے سبھی امکانات منظر نظر آتے تھے بلکہ اب تو وہ دہرے خطرے کا شکار تھے۔ سرحد پار ہو جی بھی انہیں دشمن سمجھ کر ہی نشانہ بنا سکتے تھے۔ اس کشمکش میں گمراہہ بے چینی سے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

”جاذب! وہ درخت نظر آ رہے ہیں تمہیں؟“ نوشی نے اس کا کندھا ہلا کر اشارہ کیا۔

”ہاں..... کیوں کیا ہوا؟“ وہ بے دھیانی سے بولا۔
 ”آج بندروں کو نہیں دیکھا تھا جو ایک شاخ سے

کا اظہار سراغ رساں یوریکا کلبرن سے کیا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا مطلب ہے حالیہ دنوں میں؟“
دن میں پڑنے والی شدید گرمی کی وجہ سے شہر ویران ہو چکا تھا لیکن طوفان کی وجہ سے ہونے والا بلیک آؤٹ ختم

فلوریڈا کے ساحلی شہر ساراسوتا میں طوفان کا زور ٹوٹا تو لوگ معمولات زندگی بحال کرنے میں مصروف ہو گئے۔
بکلی کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ اس لیے لوگ دن کے مقابلے میں زیادہ تر رات کو باہر نکلتے۔ پولیس آفیسر میٹر جارج نے اس

تحفہ

شاہ زین رضوان

مجرم چاہے کتنا ہی بڑا شاطر ہو مگر قانون کے آگے ایسا ہی نادان بچہ ثابت ہوتا ہے جو قدم قدم پر لڑکھڑاہٹ کے خوف میں مبتلا ہو۔ اس نے بھی بہت چالاکی سے بازی تو کھیلی مگر... اندھے قانون کی تیز نگاہوں سے پھر بھی بچ نہ سکی۔

جرم کو چھپانے کے لیے اداکارانہ راز اختیار کرنے والی حسین کی مکاری



گئی تھی۔

”کیا اسے کسی مرد کی وجہ سے پریشانی ہے؟“ یوریکا نے پوچھا۔

یوریکا کے انداز میں بے اعتنائی تھی۔ ہیکٹر نے اسے غصے سے دیکھا۔ ان دنوں ہر ایک کا ماضی مشکوک لگتا تھا چاہے وہ ہیکٹر کی طرح جوان ہی کیوں نہ ہو۔

”اس نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ اس پر ظلم کرتا ہے، بد قسمتی سے وہ اس پر انحصار کرتی ہے۔“

”اور اسے تمہاری مدد چاہیے؟“

”نہیں۔ دراصل وہ تمہاری مدد چاہتی ہے۔“

”واقعی؟“ یوریکا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ میرے بجائے تمہاری مدد کو ترجیح دے گی اور شاید وہ میری مدد لیتا پسند نہ کرے۔“

”وہ چاہتی ہے کہ آج رات میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں تاکہ وہ تم سے ملاقات کر سکے۔“

”اس سے کہو کہ پولیس اسٹیشن آجائے۔“

”یہ اس کے لیے مشکل ہوگا۔ وہ صرف رات میں ہی باہر نکل سکتی ہے۔ اسے کچھ غیر معمولی تجربات ہوئے ہیں۔ معاشی حالات کی وجہ سے اسے کچھ قابل اعتراض معاملات پر مجبور ہونا پڑا۔“

”قابل اعتراض۔ یہ تو سننے میں ہی برا لگتا ہے۔“

”جوانی میں اسے کچھ ایسے سفر کرنا پڑے جو نہیں کرنا چاہیے تھے۔“

”مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی۔“

”بعض اوقات آپ کو کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”اور آپ کوئی ایک راستہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اگے کیا ہوگا۔ یہ بات تو تم بھی سمجھتی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”آج رات میں مون بار جاؤں گی۔“

”کیا تم وردی میں وہاں جاؤ گی؟“ ہیکٹر نے پوچھا۔

”اس کی ضرورت نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”وہ تمہیں وردی میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح اسے تحفظ کا احساس ہوگا۔“

سراخ رساں یوریکا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس معاملے کا وردی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ایک شہری عورت اسے کیوں وردی میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ

ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سمندر کے پانی نے ٹرانسفارمر تباہ کر دیے اور تاریں زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں بنا سکتا تھا کہ بجلی کا نظام کب ٹھیک ہوگا۔

”تمہیں اگر میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو خود چل کر دیکھ لو۔ تمام بار بھرے ہوئے ہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔

”بہت دلچسپ بات ہے۔“ یوریکا بولی۔

طوفان گزرنے کے دو دن بعد ہیکٹر پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہ بھوکا تھا اور اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اس نے پانی میں گھرے ہوئے میاں سے اپنا سفر شروع کیا اور تباہ شدہ گتے اور ٹماٹر کے کھیتوں سے گزرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچا۔ ایک کھیت میں اس نے ٹوٹا پھوٹا احاطہ اور دوسرے میں منہدم شدہ گودام دیکھا جس میں رکھی ہوئی سیکڑوں ٹن چینی سیلابی پانی میں بہہ گئی تھی۔

اس خوفناک سفر کے باوجود وہ خاصا خوش لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی گھرے ہوئے درخت کو سوسکڑوں میں کاٹا ہو۔ یوریکا نے اس کے لیے فوراً ہی خوراک اور لباس کا بندوبست کیا تاکہ وہ اپنے فرائض اجتماعی سے انجام دے سکے۔ یوریکا کو یہ جان کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ ہیکٹر نے رات کو گوشت کرنا شروع کر دیا ہے۔

”میں مون بار میں کچھ غیر معتبر لوگوں سے ملا ہوں۔“

ہیکٹر نے کہا۔ ”مون بار صرف ان راتوں میں کھلتا تھا جب چاند نکلا ہوا ہوتا تھا۔“

”میری پناہ گزینوں، موسیقاروں اور بجلی کے ستارے ہوئے لوگوں سے بات ہوتی ہے۔ دن کی روشنی میں طاقتور لوگ کمزوروں کا شکار کر لیتے ہیں لیکن رات کے اندھیرے میں یہی کمزور لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ حفاظت چلے جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”میں کسی وقت مون بار جاؤں گی۔“

”ہاں۔ وہاں کئی عورتیں آئی ہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔

یوریکا جانتی تھی کہ عورتیں ہیکٹر کو پسند کرتی ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ خوش رہتا ہے۔ وہ انہیں خوش کرنے کے لیے عمدہ لباس پہنتا تھا۔ اس نے اپنی وردی کی خاک کی پتلون اور سفید قمیض بھی جدید انداز میں سلوائی تھی اور اس کے بال ہمیشہ خوب صورتی سے ترشے ہوئے ہوتے۔

”میری گزشتہ شب ایک ایسی عورت سے ملاقات ہوئی جو بہت مشکل میں ہے۔“

وہ ویسے بھی بہت زیادہ خیال رکھنے والا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کی ماں سیلاب میں بہہ

باس کے علاوہ کبھی کسی نے اسے وردی میں دیکھا چاہا ہو۔
 ”تم اس عورت کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟“
 ”کچھ زیادہ نہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”اور جو جانتا
 ہوں اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“

اس رات بھی بہت سے لوگ گھروں سے باہر نکلے
 ہوئے تھے لیکن یورپا کے یہاں کبھی کسی نے کیا ان کی تعداد
 کی نسبت زیادہ تھی۔ شاید پورے چاند کی وجہ سے اس تعداد
 میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یورپا نے اپنی اسکوڈ کار نکالی اور
 تاسیما ٹریل پیچ گئی جو مون بارے ایک ہلاک کے فاصلے پر
 تھا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک ہوٹل کے نیون سائن کے
 قریب پارک کی جو سڑک پر گر پڑا تھا۔ اس کے لوہے کے
 ستون بنی کھا کر درمیان سے ٹوٹ چکے تھے اور بڑے سائز
 کا سائن بورڈ امید بھری نظروں سے راہ گیروں کو کھدہ ہا تھا۔
 جب وہ بار کے ارد گرد کا علاقہ چیک کر رہی تھی تو اسے محسوس
 ہوا کہ اس کی نیند غائب ہو چکی ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کسی
 خفیہ آپریشن کے پروٹوکول پر عمل کر رہی ہے۔ عام طور پر وہ
 کبھی کسی بار میں ڈرنک کے لیے نہیں جاتی تھی۔

اس نے ہر جگہ لوگوں کو خرید و فروخت میں مصروف
 دیکھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت چھوڑے پر سبزیاں فروخت
 کر رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر ایک شخص کرسی پر بیٹھا اپنے بال
 ترشوار ہا تھا۔ وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں مون
 بار میں داخل ہوئی۔ اس کی لمبائی کم اور چوڑائی زیادہ تھی
 اور سڑک کی جانب والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی شکل ڈائننگ
 ہال جیسی تھی جس میں کاؤنٹر کی جگہ بار بنا دیا گیا تھا۔ چند مرتبہ
 طوفان باد و باران آنے کے بعد مالک نے موسم تیزیوں کا
 استعمال شروع کر دیا تھا اور دوبارہ بجلی استعمال نہیں کی۔ اس
 کے مقابلے میں چاند کی روشنی ایک مستحکم اور قابل
 اعتبار روشنی کا ذریعہ تھی۔

اس کمرے میں ایک بار کاؤنٹر اور اس کے عقب میں
 دیوار گیر الماری میں مشروب کی بوتلیں ترتیب سے رکھی ہوئی
 تھیں جبکہ بار اور بار اسٹولوں پر مختلف تصویروں بنی ہوئی
 تھیں ان کے سامنے فٹ پاتھ پر چھوٹی میزیں رکھی ہوئی
 تھیں۔ ہر میز کے ساتھ ایک یاد دہی دینے والے لوہے کی کرسیاں
 رکھی ہوئی تھیں۔ چاندنی نے کچھ حصوں پر دو دو حیاروشی بکھیر
 رکھی تھی لیکن بیشتر ستارہ کی میں ڈوبا ہوا تھا۔

یورپا کی نظر جارج پر گئی جو وہاں پہلے سے ایک میز
 پر بیٹھا ہوا تھا۔

”تمہاری دوست نظر نہیں آ رہی؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ ابھی نہیں آئی۔“ ہیکٹر نے جواب دیا۔ اس کی
 میز پر مشروب کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں
 چیزوں کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس نے بوتل یورپا کی
 طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“
 ”شکریہ۔“ وہ بولی۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ تر
 مشروب کی بوتلوں پر جعلی لیبل لگے ہوئے ہیں۔ جنہیں
 انٹرنیٹ سے کاپی کر کے چسپاں کیا جاتا ہے اور یہ جگہ بھی شہر
 کے دوسرے بارے مختلف نہ تھی۔

”تم نے بار کے آخری سرے پر جیکٹ میں ملبوس
 اس شخص کو دیکھا؟“ ہیکٹر نے پوچھا۔
 ”میں جانتی ہوں کہ تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟“
 یورپا نے اپنی آنکھیں گھمائے بغیر احتیاط سے کہا۔ اس نے
 فوراً ہی اس کا ٹوٹ لیا۔ سارا سوتا میں ہر شخص دن کے وقت
 سفید یا ہلکے رنگوں کا لباس پہنتا تاکہ سورج کی روشنی منعکس
 ہو سکے۔ مون بار میں لوگوں کی بڑی تعداد سیاہ کپڑوں میں
 ملبوس تھی۔ بار کے آخری کونے پر کھڑا ہوا شخص بھی سیاہ ملبوس
 پہنے ہوئے تھا۔ اس کی جیکٹ ڈھکی اور اوپر سے کھلی ہوئی تھی
 جس میں سے اس کی دی گئے والی ٹی شرٹ صاف نظر آ رہی
 تھی۔ اس کے شانے چوڑے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ
 کوئی معمولی جیکٹ اس کے لیے موزوں نہ ہوئی۔ وہ اسے نہ
 پہچان سکی۔ ویسے بھی چاندنی میں اتنے فاصلے سے کسی کو
 پہچاننا مشکل تھا۔

”اس نے ہارٹینڈر سے کہہ کر یہ مشروب یہاں بھیجے
 تھے۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ یہ کون ہے؟“
 یورپا نے مڑ کر اس سیاہ جیکٹ والے کی طرف
 دیکھا۔ مشروب کی بوتل اٹھائی اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔
 جواب میں اس نے بھی اپنا سر ہلا دیا۔ تاہم اس کا کافی روشنی
 میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنا مشکل تھے۔

”تمہارا خیال ہے کہ یہ شخص تمہاری دوست کا شوہر
 ہو سکتا ہے جس سے وہ خوفزدہ ہے؟“ یورپا نے پوچھا اس کی
 نظریں اب بھی اس جیکٹ والے پر تھیں گو کہ وہ براہ راست
 اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے۔ میں بھی اس کے شوہر سے نہیں ملا۔“
 ”یہ یقیناً قرب و جوار کا رہنے والا نہیں ہے۔“ یورپا
 نے کہا۔

”اس طرح کا لباس سما می میں پہنا جاتا ہے۔“ ہیکٹر
 نے کہا۔ ”اس نے میرے لیے ڈرنک کیوں خریدی؟“
 ”تمہیں زہر دینے کے لیے۔“ یورپا نے سنجیدگی سے کہا۔

آہستگی سے تاریک شہر کی جانب بڑھ رہے ہوں گے اور ان کی رفتار پچیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ سڑک کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ رفتار پر چلنا ناممکن نہ تھا۔ انہیں سڑک پر موجود گڑبڑوں سے بچنے کے لیے بار بار رکتا پڑ رہا ہوگا۔ ان میں سے کئی ایک اس میز سے بھی زیادہ بڑے تھے جس پر وہ اور میکیئر بیٹھے ہوئے تھے۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ ان ٹرکوں میں کیا چیز ہو سکتی ہے؟“ وہ بولی۔

”فحشیات“، میکیئر نے کہا۔ ”بہت بڑی تعداد میں۔ ان کی مختلف اقسام اور قیمتیں ہیں۔“

”آج کل ان میں سے کئی ایک قانونی ہو چکی ہیں۔ اس لیے کوئی غیر قانونی اشیا کو نہیں پوچھے گا۔“

”پناہ گزینوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں نے نہیں سنا کہ کوئی انہیں جنوبی فلوریڈا سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو پھر یہ انسانی اسٹینک ہوگی۔ لڑکیوں کی تجارت؟“

”کچھ بھی ممکن ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”لیکن وہ ہمیشہ پرانی دین استعمال کرتے ہیں۔“ میکیئر سوچنے لگا کہ بیشتر آبادی محفوظ مقامات پر منتقل ہو چکی ہے اور ان میں سے کوئی بھی واپس لوٹ کر نہیں آیا جس کی وجہ سے دین اور ٹرکوں کے ذریعے تجارت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔

اچانک ہی میکیئر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوٹے قد کی دہلی پتلی عورت سفید شرت اور سیاہ پینٹ میں ملبوس بار میں داخل ہو رہی تھی۔ یوریکا کو معلوم نہیں تھا کہ یہی میکیئر کی دوست ہے جب تک کہ اس نے تعارف نہیں کر دیا۔ وہ

عورت میکیئر سے عمر میں بہت بڑی تھی اور نرم یا زخم خوردہ نہیں لگ رہی تھی۔ ہاں بے چین ضرور تھی لیکن اس کا چہرہ کسی

مانسک کی طرح ہموار اور مضبوط لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھیل جیسی گہرائی تھی اور اس نے بالوں کو پیچھے کی طرف

مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔ لیکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح اس سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی ہوں لیکن وہ مصیبت میں مبتلا عورت نہیں تھی۔

سراخ رساں یوریکا نے فوراً ہی فرض کر لیا کہ اس عورت کا جینٹ دالے سے کوئی تعلق ہے کہ وہ دونوں پارکی

مخالف اطراف میں تھے اور ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی بھی اس جگہ ایسے نئے

خوب صورت کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھا اور شہر کے جو حالات

”باریئڈر نے میرا گلاس بھرا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شخص مجھے کیسے جانتا ہے؟“

”شاید اسے پولیس والے پسند ہیں۔“

بار میں زیادہ لوگ نہیں تھے جو انہیں وردی میں دیکھ کر حیران ہوتے۔ ممکن ہے کہ میکیئر کی دوست یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ اس نے اپنے تحفظ کا بندوبست کر لیا ہے۔

سراخ رساں یوریکا نے اپنے کورفون پر رنگ کی آواز سنی۔ اس پر ایک پرانے اور تجربہ کار آفیسر کٹ کا میوکا پیغام آ رہا تھا جس کا متن کچھ یوں تھا۔

”دوبلیک باکس ٹرک وارلبرینڈ سے ٹریل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔“ ٹریل سے اس کی مراد تائیامی ٹریل تھی جو

مرکزی شمال اور جنوب کو ملانے والی سڑک تھی جو درختوں اور جھاڑیوں کی بھرمار سے جنگل جیسی ہو گئی تھی کیونکہ شہر کے

لوگ موسم کی شدت سے گھبرا کر سارا سوتا سے شمال کی طرف جا رہے تھے۔

کٹ کا پیغام عموماً مکمل الفاظ اور مخفف کا مجموعہ ہوتا تھا۔ سراخ رساں یوریکا کے لیے یہ انداز اجنبی نہیں تھا

کیونکہ وہ اسے تب سے جانتی تھی جب اس نے نو برس پہلے پولیس میں شمولیت اختیار کی تھی جبکہ دوسری جانب وہ میکیئر

جارج کو صرف چند ہفتوں سے جانتی تھی۔

”واقعی آج رات لوگ گھروں سے باہر ہیں۔“

یوریکا نے کہا۔ ”گاڑیاں چلا رہے ہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ میکیئر بولا۔

”کاریں نہیں۔“ یوریکا نے کہا۔ ”ان دنوں کار چلانا خطرناک ہے۔ پیٹلز مہنگا ہے اور کچھ کاریں سیلاب میں بہہ

گئی ہیں۔ البتہ ٹرک سڑکوں پر نظر آ رہے ہیں۔ کٹ نے دو ٹرک تائیامی والے راستے کی طرف آتے ہوئے دیکھے ہیں۔“

”لیکن کس لیے؟“ وہ بولا۔

”یہاں بھی کبھی ٹرک آتے رہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ پیٹلز یا دہلی فلوریڈا سے آتے ہیں لیکن عموماً

تاریکی میں سفر نہیں کرتے کیونکہ سڑکیں بہت خراب ہیں۔“

”سڑک پر اسٹریٹ لائٹس تو ہیں۔“ حالانکہ ان میں

سے صرف چند ہی کام کر رہی تھیں۔ یوریکا کو حیرت ہوئی کہ میکیئر نے یہ بات کیسے کہہ دی لیکن فوراً ہی اس کے ذہن میں

بھاری سیاہ ٹرکوں کا تصور ابھرنے لگا۔ اس نے اپنے قدم مضبوطی سے سیٹ کر فرش پر جمالے۔ وہ جانتی تھی کہ ان

ٹرکوں کا رنگ پہلے سفید تھا لیکن ان پر سیاہ رنگ کر دیا گیا تاکہ رات کی تاریکی کا حصہ بن جائیں۔ وہ یقیناً بڑی

راز کی باتیں

☆ مرد خواہ کنہائی آزاد خیال ہو یہی ہمیشہ

باپردہ اور باجیا ہی پسند کرے گا۔

☆ دوسروں کی مثال دینے سے پہلے سوچ لو کہ

آپ کا تذکرہ کس طرح کی مثال میں دیا جاتا ہے۔

☆ جس طرح گھوڑے کی لگام کو چران کے

ہاتھ میں محفوظ ہے، اس طرح جوانی کی لگام

والدین کے ہاتھ میں بہتر ہے۔

☆ اگر اپنے لیے محبت تلاش کرنے نکلے تو

نا کام رہو گے اس لیے خود محبت دینے کی کوشش کرو۔

☆ وقت اور جوانی بڑی تیزی سے گزرتے

ہیں اس لیے انہیں اچھے کاموں میں صرف کرد۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ محل ہزارہ

دے سکتی۔“ یوریکا نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہر کام جرم نہیں ہوتا۔“ لولو بولی۔ ”حالانکہ میں

جانتی ہوں کہ شاید پولیس والوں کو وہ جرم ہی نظر آئے۔“

”شاید۔“

لولو نے اپنی توہین محسوس کی جس کی پرچھائیں اس

کے چہرے پر نظر آنے لگی۔

”مجھے یقین نہیں کہ ہم یہاں کوئی بات کر سکیں گے۔“ یوریکا

نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارا اور اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔

”میں تمہاری پاس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی

ہوں۔“ لولو نے ہیکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”میں بار کے عقب میں موجود رہوں گا۔“ اس کا

اشارہ اس حصے کی جانب تھا جسے مرد ٹوائٹ کے طور پر

استعمال کرتے تھے۔

دونوں عورتیں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

یوریکا نے محسوس کیا کہ سیاہ جیکٹ والا بھی ہیکٹر کو دیکھ رہا تھا۔

”ہیکٹر کا کہنا ہے کہ تم اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کر

ہو۔“ لولو نے کہا۔

”وہ ایک اچھا افسر ہے۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ وہ ایک مہربان اور پیارا

لڑکا اور محنتی کارکن ہے۔“

”اس کا کہنا ہے کہ تم کسی مشکل میں ہو۔“

”ہاں بھی اور نہیں بھی۔“ لولو نے کہا۔ اس نے اپنے

بیگ میں سے ایک چھوٹی سی ٹھیلی نکالی اور اسے میز پر رکھتے

تھے، ان میں شاید کسی کے لیے یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر ان

میں سے کسی ایک پر کچھ گزری ہو تو یہ پرانی بات تھی۔

”تم کیسی ہو؟“ یوریکا نے پولیس آفیسر کے انداز

میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وردی کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف طریقوں سے ہوتا

ہے گو کہ لولو نے یہ کہا تھا کہ پولیس آفیسر سے وردی میں مل کر

اسے تحفظ کا احساس ہو گا لیکن اب وہ اسے بڑی ہوشیاری

سے دیکھ رہی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ کوئی معمولی

عورت نہیں تھی۔

”میں نے سنا ہے کہ اگر کچھ لوگ تمہارے ساتھ ہیں

تو کچھ خلاف بھی ہیں۔“ لولو نے کہا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ یوریکا بولی۔ ”ایسا

برجگہ ہوتا ہے۔“

”یہ بہت اہم بات ہے۔“

”میں سمجھ گئی۔“ یوریکا بولی۔ ”بتاؤ میں تمہارے لیے

کیا کر سکتی ہوں؟“

یہ سن کر لولو کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی۔ وہ بولی۔

”میں جانتا چاہتی ہوں کہ تم ہیکٹر کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟“

”میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس پر بھروسہ

کر سکتی ہو۔“ ہیکٹر نے کہا۔

”کیا اس بات کا تعلق اس شخص سے ہے جو بار کی

دوسری جانب موجود ہے؟“ سراخ رساں یوریکا نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟“

لولو نے بلند آواز میں کہا لیکن اس جانب دیکھنے کی زحمت

گوارا نہیں کی۔

یوریکا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے

ابھی اسے دیکھا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح گھر سے باہر گھوم

رہا ہے۔“

”اس نے میرے لیے ڈرک بھی خریدی۔“ ہیکٹر

نے کہا۔

”بہت سے لوگ پولیس والوں کے لیے مشروب

خریدتے ہیں۔“

ہیکٹر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا پھر بھی اس نے

یوریکا سے کہا۔ ”تم اسے بتا کیوں نہیں دیتیں کہ یہ تم پر

بھروسہ کر سکتی ہے۔“

اس نے مشروب کا گلاس اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ

لینے لگا۔ وہ عادی بلا نوش نہیں تھا۔

”میں لوگوں کو اس شہر میں جرائم کرنے کی اجازت نہیں

ہوئے بولی۔

”میں تمہیں ایک اور بات بتاتی ہوں جو میں نے سیکھی ہے۔ سب سے بہترین ہتھیار انسان کی اپنی فطرت ہے۔ تم اسے معلوم کر کے اسی کے خلاف استعمال کر سکتی ہو۔ میں ہیکٹر کو بہت کچھ سکھا سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں چاہا۔ وہ دوسروں سے بہت مختلف، اسارت اور بہتر ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ بہت زیادہ پریشان رہتا ہے۔“

”ممکن ہے کہ پریشانی کی کوئی وجہ ہو۔“ یوریکا نے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تم کون ہو؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ یہ کہہ کر اس نے تھیلی الٹ دی اور اس میں سے نصف درجن نوٹوں کی گڈیاں باہر آئیں جنہیں سپر بینڈ سے باندھا گیا تھا۔ یہ کسی انسور کاشین نہیں تھا جس میں ایک اور پانچ کے نوٹ ہوتے ہیں بلکہ یہ بالکل نئے بیس بیس کے نوٹ تھے جو بینکوں سے ملتے ہیں گوکہ اب سارا سوتا میں کوئی بیک باقی نہیں بچا تھا لیکن پہلے وہاں کئی بیک تھے۔

”کیا تم چاہتی ہو کہ سب لوگ انہیں دیکھیں؟“ یوریکا نے کہا۔ براہِ روالی میز پر بیٹھا ہوا جوڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈیٹ پر آئے تھے۔ مرد نے بھی سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی نظریں اسی جانب تھیں۔

”یہ رقم ہیکٹر کے لیے ہے۔“ لولو نے کہا۔ ”اسے بتا دینا کہ یہ محفوظ ہے۔“

”محفوظ؟“ یوریکا نے پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ جائز طریقے سے سنبھالی جا رہی ہے؟“

”یقیناً تم سمجھ جاؤ کہ میں اس کے لیے کبھی ایسا کام نہیں کروں گی جس سے وہ مشکل میں پڑ جائے۔“

”کم از کم تمہیں اس کو وضاحت تو کرنا ہوگی کہ یہ رقم کس لیے دی جا رہی ہے۔“

”وہ جان جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ پہلے جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ یوریکا اسے پکڑنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ رقم کی حفاظت کرتی۔

لولو اس سڑک پر چل دی جو ہیکٹر کی مخالف سمت میں تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے دمِ روشنی میں گم ہو گئی۔ ہیکٹر تقریباً اسی وقت آگیا اور میز پر پڑی ہوئی رقم دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ کیا ہے؟“

”اس نے کہا ہے کہ وہ تم سے دوبارہ ملے گی۔“

”لیکن یہ رقم؟“

”یہ تمہارے لیے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ ہے۔“

”محفوظ؟“ ہیکٹر نے اپنے آپ سے کہا۔

”تم دیکھ رہے تھے؟“

”بالکل۔“

یوریکا نے وہ رقم دوبارہ بیگ میں رکھی اور اس دوران میں اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے بارشیزر کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ سیاہ جیکٹ والا شخص جا چکا تھا۔

جب وہ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی اسکو اڈا کار کی طرف واپس آئی تو اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اسے سیاہ جیکٹ والے شخص، لولو یا ہیکٹر کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔

اس نے رقم ثبوت والے شیف میں متغل کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر پھر ہیکٹر کو پیغام بھیج کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اگر ہیکٹر نہ آتا تب بھی وہ ان ٹرکوں کو دیکھنے ضرور جاتی۔

وہ ٹرک دور سے ہی بڑے دکھائی دے رہے تھے اور وہ محسوس کر سکتی تھی کہ ان میں کوئی غیر معمولی چیز ہے۔ اس خفیہ سامان کا تصور کرتے ہی اس کے بدن میں سستی دوڑ گئی۔

اس نے اپنی گاڑی سڑک کے دائیں جانب کھڑی کی۔ موٹر کے گھرے ہوئے سائین بورڈ کی وجہ سے وہ کسی حد تک نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے لیے آسان تھا کہ وہ سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے ٹرکوں کے کسی قافلے کا تعاقب کرتی لیکن لگتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ سڑک پر چند گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے انہیں نظر آ جاتی۔ شاید وہ ٹرکوں کا تعاقب کرنے کے بجائے انہیں کسی جگہ روک لیتی لیکن اس کے پاس وارنٹ نہیں تھا بلکہ جائز یا ناجائز حکم بھی نہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات تھی کہ اس کے ذہن میں ان ٹرکوں کی ایسی تصویر بن رہی تھی جو اس نے بھی نہیں دیکھے۔

پھر اسے ہیکٹر جارج اور لولو کی طرف سے دیے گئے ناقابلِ فہم تحفے کا خیال آیا جو وہ اس کے لیے لائی تھی۔ اس کے ذہن میں اور بھی کئی باتیں گھوم رہی تھیں اور یہ تاثر پختہ ہو رہا تھا کہ اس رات میں ہونے والے واقعات اور ٹرکوں کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ اگر ہیکٹر کسی جائز کاروبار میں حصہ دار ہوتا تو وہ یوریکا کو ضرور بتاتا..... تو کیا وہ کوئی غلط کام کر رہا تھا؟ یہ تصور ہی ممکنہ خیر تھا لیکن اسے مسترد کرنا ممکن نہیں تھا۔

وہ ٹرک اس کی چھاتی پر ایک بوجھ کے مانند تھے۔

اس نے اپنا کورفون نکالا، وہ جاننا چاہتی تھی کہ انہیں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔ کٹ نے پیغام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ جلد آنے والے ہیں۔

اسے یقین نہیں تھا کہ ہیکٹر ان ٹرکوں پر لدے ہوئے سامان کے بارے میں جانتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ان میں نشیات، پناہ گزین یا لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔ یہ بات اس نے اپنے اندازے کی بنیاد پر کہی تھی شاید۔ اس میں اس کے تجربے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

دیجی ہیکٹر اس کے برابر دلی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہو تو اسے کس طرح ہولا جاتا ہے۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ یوریکا نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”وہ عورت کون ہے؟“

”میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تم اس سے گزشتہ شب نہیں ملے تھے بلکہ ایک طویل عرصے سے اسے جانتے ہو۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی ایسی عورت ہے جس نے ماں کے مرنے کے بعد تمہاری دیکھ بھال کی ہو۔ بہن، آنٹی، کزن یا فیملی فرینڈ کے طور پر۔“

اب وہ کار کے دروازے پر اٹھیں تو ڈرم بجار ہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”میں اس کا ہر احسان مانتا ہوں۔ ہاں وہ میری بہن ہے۔ وہ کبھی ایک عام لڑکی ہوا کرتی تھی، میک بنائی اور گٹار پر لوک دھنیں سنا کرتی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت زیادہ ہونے کے باوجود کسی بھی دوسری لڑکی کی طرح احمق تھی پھر اچانک ہماری ماں کا انتقال ہو گیا اور لولو نے ہی ہر بات کا خیال رکھا۔ اس سے بڑھ کر اسے ہماری حفاظت کرنا تھی، ورنہ ہم زندہ نہ رہتے۔ صدف بھی ہمیں اس نے کوشش کی بلکہ اس نے اپنا ذہن بنایا کہ اسے ہر قیمت پر یہ کرنا ہے۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے اور اس نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔ حالات واقعی بہت سخت تھے لیکن اس نے ان کا مقابلہ کیا اور اس کے لیے اسے کچھ خطرناک کام بھی کرنا پڑے۔“

”کیا وہ گزشتہ رات ہی مون بار پر آئی تھی؟“

”میں نے ہی اس سے وہاں ملنے کے لیے کہا تھا۔“

اس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ وہ شہر میں ہے۔

”وہ رقم کہاں سے آئی؟“

”کیا وہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں۔“

”کیا میں اسے دوبارہ دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم نہیں دیکھی۔“

”اس کا کہنا ہے کہ تم اس رقم کے بارے میں جانتے ہو۔“

”اس نے ہمیشہ مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے کچھ کرے گی لیکن اسے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ابی بارے میں بات کر رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ میرا پولیس آفیسر بننا بڑی بات ہے۔ وہ اس میں بہت دلچسپی لے رہی تھی اور اس نے اس بارے میں بہت سے سوالات بھی کیے۔“ وہ کچھ ہنچکچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ عام نوعیت کے سوالات تھے، میں نے اسے کوئی ایسی بات نہیں بتائی جو نہیں بتانی چاہیے تھی۔“

یوریکا نے تا کواری سے سر ہلایا۔

”اس طرح کی ملازمت حاصل کرنا ایک معجزہ ہے اور وہ یہ بات جانتی ہے۔“ ہیکٹر نے وضاحت کی۔ ”اب تو معمولی ملازمت بھی نہیں ملتی۔“

”کیا واقعی اس نے تم سے یہ کہا تھا کہ وہ کسی مشکل میں ہے؟“ یوریکا نے پوچھا۔

”ہاں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کیا مسئلہ ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کا تعلق اس کے نئے دوست سے ہے۔ اس کا نام البرٹ ہے اور میرے میاں چھوٹنے کی یہی وجہ ہے۔ طوفان کی وجہ سے مجھے کھنکھانے کا بہانہ مل گیا۔“

”تمہیں اس سے کیا شکایت تھی؟“ یوریکا نے پوچھا۔

”وہ ایک کاروباری شخص ہے۔ لولو نے قسم کھا کر بتایا کہ اس کا کاروبار قانونی ہے۔ آہستہ آہستہ بائیں کھٹنے لگیں۔ بالآخر اس نے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ وہ لوگوں سے غیر قانونی کام کرواتا اور انہیں کم معاوضہ دیتا۔ انہیں ناقص خوراک دی جاتی اور اس کے پیسے بھی ان کی تنخواہ سے کاٹ لیتا۔“

”کیا وہ میاں میں رہتا ہے؟“

”ہاں لیکن تم جانتے ہو کہ اس کا وہاں رہنا کتنا برا ہے۔ اس نے سب کو خرید لیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا کاروبار ہے جس میں اپنے کارکنوں کو اچھی تنخواہ دینے کے بجائے سیاست دانوں کے ایک گروہ کو خرید لیا جائے۔“

”تم سمجھتے ہو کہ بار کے سرے پر سیاہ جیکٹ میں لمبوس شخص وہی ہو سکتا ہے؟“

”میرا یہی خیال ہے۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”غالباً میں نے کبھی میاں میں اس کی شکل غور سے نہیں دیکھی۔ شروع

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ کسی لالچی شخص کو بے وقوف بنانا آسان ہے لیکن میں ذاتی طور پر کسی لالچی انسان کو نہیں جانتا۔“
یوریکا نے کئی برسوں میں پہلی بار اپنی اسکوڈ کار کا سائرن اور چھت پرگلی ہوئی لائٹ آن کی اور بولی۔ ”اب ہم انہیں ہائے، کہنے والے ہیں۔“

پہلا ٹرک ابھی اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ اس کا راستہ روکنے کے لیے آسانی سے اپنی کار کو روکے درجے کے زاویے پر کھانسی تھی۔ وہ اور مییکر جلدی سے اترے اور کار کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ ٹرک ڈرائیور شاید کار کے قریب آ کر رک جاتا لیکن وہ کبھی سڑک سے نیچے نہ اترتا جو کافی خطرناک تھا۔

جیسے ہی ٹرک قریب آیا تو یوریکا نے بریکوں کی آواز سنی۔ دونوں پولیس والے پیچھے کی طرف بڑے لیکن ٹرک ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر وہ اسکوڈ کار سے چند گز کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ خطرناک حد تک قریب آ چکا تھا اور اگر ڈرائیور سے تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو اس کا کار سے ٹکرانا یقینی تھا۔

”دوسرے ٹرک پر بھی نظر رکھو۔“ اس نے مییکر سے کہا حالانکہ وہ ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

ٹرک ڈرائیور نے تھوڑا سا دروازہ کھولا جیسے وہ کسی ٹریفک سگنل پر رکا ہو۔ اس نے ڈرائیور سے لائسنس مانگا اور دیکھ کر واپس کر دیا۔

”ہم صرف تمہاری حفاظت کے لیے چیکنگ کر رہے ہیں۔“ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”میں پچھلا حصہ بھی دیکھنا چاہوں گی۔“

ڈرائیور نے نیچے اترتے وقت انجن بند نہیں کیا۔ شاید اسے احساس تھا کہ وہ اسے دوبارہ اسٹارٹ نہیں کر سکے گا۔ سیلاب سے ٹرک کو بھی نقصان پہنچا تھا اور اس کے کچھ حصے زنگ آلود ہو چکے تھے۔

ڈرائیور نے کچھ کہے بغیر پیچھے کا دروازہ کھول دیا لیکن اندر کی لائسنس خود کار طریقے سے آن نہ ہو سکیں۔ شاید وہ خراب ہو چکی تھیں۔ یوریکا نے ٹارچ کی مدد سے ایک آلہ دریافت کیا جو چینی صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑی مشین رکھی ہوئی تھی جسے چا پر کہا جاتا ہے اور یہ گنے کے کھیتوں میں کٹائی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ وہاں اور بھی کئی دھاتی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ پچھلے حصے میں بڑی غلت میں سامان رکھا گیا تھا۔ تمام آلات کو تیل لگانے اور صفائی کی ضرورت تھی، ورنہ تک کی وجہ سے سب خراب

میں لو لو اس نے ڈینک کر کے بہت پرجوش تھی۔ اس نے بتایا کہ مجھے اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔ اس کے پاس اتنا پیسا ہے کہ وہ مجھے کال بھیج سکتا ہے۔ جب اسے اس کے بارے میں مزید معلوم ہوا تو وہ مجھے اس سے دور رکھنے کے بہانے تلاش کرنے لگی لیکن اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اسے اس کی دولت کا مزہ لگ گیا تھا۔“

”تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ یہ پیسا کہاں سے آیا؟“
”یہ لو لو کا پیسا نہیں ہے۔“ مییکر نے کہا۔ ”اس کے پاس کچھ نہیں۔ یہ البرٹ کی رقم ہے۔“

”یقیناً ایسا ہی لگتا ہے۔“ یوریکا نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن لو لو جانتی تھی کہ وہ بار میں موجود ہے، ورنہ وہ اس سمت میں ضرور دھمکتی جب میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے رقم دیتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے یہ سب ایک منصوبے کے تحت کیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟“

”میں نہیں جانتا لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ لو لو بری عورت نہیں ہے۔ اس نے یہ رقم نہیں سے نہیں چرائی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ کام کرنے کے لیے کوئی خوفناک حرکت نہیں کی ہوگی۔“

یوریکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”اور میں نے بھی کچھ نہیں کیا۔“ مییکر مشتعل ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں تو بھی اس شخص سے ملا بھی نہیں۔ وہ ایک بار گھر آیا تھا لیکن لو لو نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔“

”گو یا وہ تمہیں نہیں پہچان سکتا؟“
”میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کی جھک دیکھی ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، اس نے کبھی مجھے نہیں دیکھا۔“
”گو یا ہم اس کے لیے صرف پولیس والے ہیں۔“
”ہاں بالکل۔ صرف پولیس والے۔“ اس نے دہراتے ہوئے کہا۔

اس کی کار کے عقبی شیشے میں ایک ٹرک نمودار ہوا جو اس کے تصور سے بھی بڑا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔
”ٹرک یہاں پہنچ گئے۔“ یوریکا نے کہا۔

”ٹرک۔“ مییکر چوکتے ہوئے بولا جیسے وہ انہیں بھول چکا ہو۔ اس نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر پیچھے آنے والے ٹرک کو دیکھا جو کچھ فاصلے پر تھا۔

”لو لو کتنی ہے کہ کسی سے لڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی فطرت کو اسی کے خلاف استعمال کرو۔“ یوریکا نے کہا۔

ہو جاتے۔

جارج..... دوسرے ٹرک کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس میں نسبتاً زیادہ سامان اور چینی کے ڈبوں کا ڈھیر تھا جو خراب ہونے سے بچ گیا تھا۔ ان ڈبوں کا گمنا خراب ہونے کے باوجود خشک تھا۔

”ہم اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ تم شہر سے... یہ حفاظت گزر جاؤ۔“ سراغ رساں یوریکا نے کہا۔

جب وہ واپس اپنی کار میں آئے تو ہیکٹر نے سکون کا سانس لیا۔ یوریکا اس سے متفق نہیں تھی۔ اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی تھی اور اس کے ذہن میں شک سرا بھار رہا تھا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی کہ گتے کے ڈبوں میں چینی کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

”وہ روانہ ہو رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ساری چینی خراب ہو چکی ہے۔ اسے خشک کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ سیلابی پانی میں موجود نمک نے اسے زہریلا کر دیا ہے۔“

”البرٹ یقیناً شمال کی طرف جا رہا ہوگا۔“ ہیکٹر نے کہا۔

ٹرک اسٹارٹ ہو چکے تھے۔ یوریکا نے اپنی کار ایک طرف کر کے انہیں راستہ دے دیا اور ان کے پیچھے چل پڑی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لولو نے البرٹ میں کیا خوبی دیکھی کہ ایک بار پھر اس کے لیے کام کرنے پر تیار ہو گئی۔“ یوریکا نے پوچھا۔

”لا لاج..... لیکن البرٹ جیسے آدمی کو کسی جعلی سودے کے ذریعے بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا۔“

”لا لاج کی ہموک کبھی ختم نہیں ہوتی اور لا لاجی شخص دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم بھی لا لاجی ہیں۔“

”کیا لطیفہ ہے۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”لیکن میں تمہاری بات سمجھ گیا۔ اس نے البرٹ کو بتایا ہوگا کہ وہ ہمیں رشوت دے رہی ہے۔“

”وہ ضرور یہی سوچ کر گزشتہ شب آئی تھی اور اس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنایا۔ شاید تم رقم لینے سے انکار کر دیتے۔ اس کے لیے اس نے مجھے استعمال کیا۔ اسے احساس تھا کہ البرٹ اس رقم کو بطور تحفہ دینے پر رضامند نہیں ہوگا لیکن کاروبار کی قیمت ادا کرنے پر تیار ہو گیا۔“

آگے جانے والے ٹرکوں کی رفتار کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔

”لولو نے مجھ سے ٹریفک کے بارے میں کچھ سوالات کیے تھے۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”مجھے جان لینا چاہیے

تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔“

”اس نے ضرور البرٹ سے کہا ہوگا کہ ان ٹرکوں کو شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دینے کے لیے اسے کچھ دینا ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ ہم انہیں ہر اسان نہیں کریں گے۔ اسے امید تھی کہ ٹرک کے حفاظت گزر جائے گا لیکن پھر مجھے جس ہوا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں انہیں شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دے رہی تھی کیونکہ انہوں نے اسی مقصد کے لیے ادائیگی کی تھی۔“

آگے جانے والے دونوں ٹرک ویران اتر پورٹ کے موڑ پر رک گئے۔ تاریکی میں سے دوسرے نمودار ہوئے۔ ان میں ایک بھاری جسامت اور دوسرا بلا بتاتا تھا۔

چاند کی روشنی میں دونوں کی سفید قمیصیں نظر آ رہی تھیں۔

بھاری جسامت والے نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔

ہیکٹر نے سوالیہ نظروں سے یوریکا کو دیکھا تو جواب میں اس نے سر ہلادیا۔ انہوں نے چھوٹے سائے کو ٹرک کے اگلے حصے میں سوار ہوتے دیکھا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی۔

یوریکا انہیں جانتی تھی کہ اس نے ذرا دیر پہلے جو فیملہ کیا تھا وہ صحیح تھا یا غلط اور کیا آگے چل کر وہ اس کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ لولو شاید سوچ رہی ہوگی کہ اس نے اپنے

بوائے فرینڈ پر احسان کیا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ہیکٹر کے لیے رقم وصول کر کے غلطی کی۔ کئی لوگوں نے اسے دیکھا ہوگا۔ اس کی ساکھ متاثر ہو سکتی تھی۔

ٹرک دوبارہ اسٹارٹ ہوئے اور انہوں نے اتر پورٹ کا موڑ کاٹ کر شمال کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

یوریکا وہیں کھڑی رہی۔

”تم اس رقم کا کیا کر دگی؟“ ہیکٹر نے پوچھا۔

”وہ رقم میری نہیں تمہاری ہے۔“ یوریکا نے کہا۔

”اسے پولیس اسٹیشن پر رکھنا، جہاں وہ محفوظ رہے گی۔ وقت آنے پر تم جان جاؤ گے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔“

ہیکٹر نے اپنا سر زینست کی پشت سے ٹکادیا اور جھٹکے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے لولو کو ہاتھ

ہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

یوریکا نے تائید کی۔ ”میں نے بھی۔“ لیکن اس نے ہیکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے صرف شہر سے گزرنے کا محفوظ

راستہ دیا تھا۔ اس سے آگے کی ذمہ داری اس کی نہیں تھی۔

آگے کٹ ان ٹرکوں کے استقبال کے لیے موجود ہوگا جسے وہ ہیکٹر کی نظر بچا کر ٹیلی فون پر اطلاع دے چکی تھی۔ چینی کی

آڑ میں منشیات کی اسٹگنٹ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔



قدم پر شکست کمانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح..... ٹوٹے ہوئے

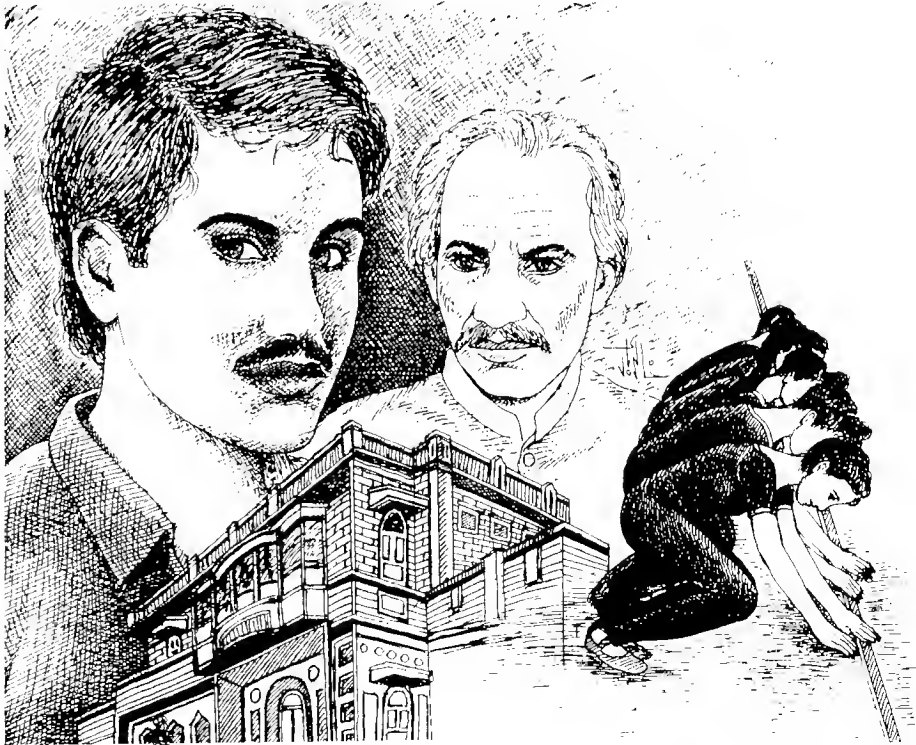
دل سے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑنے والی حسینہ کی پرنگرد داستان

شکست کی فتح

طاہر جاوید معمل

دوسرا اور آخری حصہ

زندگی کی بساط پر ایک ایسا اسرار چھپا ہے جسے کوئی چاہے یا نہ چاہے... کھیلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کھلاڑی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور ان اناڑی بازی مات کر لیتے ہیں... یہ بھی ایک ایسی اسرار بھری گرہ ہے جسے شاید کھولنا آسان نہیں۔ جو جتنا بڑا ہے ایمان... اتنا ہی بڑا فنکار۔ وہ بھی اپنے پرائیوٹ کے درمیان دوڑتے دوڑتے ہار گئی... اگرچہ انسان کے تصورات اور بلند خیالات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مگر... معاشرے میں رہنے اور ماحول سے مطابقت رکھنے کے لیے کچھ حدود و قیود کا نفاذ از حد ضروری ہوتا ہے البتہ... حدود اور قید میں کچھ فرق بھی ہونا ضروری ہے ورنہ انسان پنجرے میں قید طائر کے مانند بے بسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے ماحول سے بغاوت کی جسارت کر ڈالی اور بلند پرواز کی خواہش میں اپنے مسکن سے جدا ہو گئی... لیکن یہ عارضی جدائی نہ صرف اسے بلکہ اس کے خون کے رشتوں کو بھی زندگی کی باریکیاں سمجھا گئی کہ ہر ایک کی زندگی کا مقصد جدا اور انفرادی ہوتا ہے جسے ہر حال میں اسے پورا کرنا ہوتا ہے... چاہے کوئی مانے نہ مانے اسے حق دینا پڑتا ہے اور جب کوئی نہ دے تو چھین لینے کی جسارت بھی ضروری ہے کیونکہ حق کے لیے اڑ جانا بغاوت نہیں سعادت ہے۔





نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنی لیڈر برقرار رکھے گی۔ تماشا نویس کے شور سے پورا اسٹیڈیم کوچ رہا تھا..... اور پھر ایک زمین و آسمان نوری نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ اس کے ایک گھٹنے میں ایسی شدید فٹنس اٹھی تھی جیسے کسی نے ٹانگ میں دھکا ہوا نیزہ اتار دیا پھر شاید وہ ایک دوئیں کی پٹلیاں کھانسی تھی۔ وہ فٹس لائن سے پچیس تیس میٹر پہلے ہی گر چکی تھی۔ کئی سینکڑ تک تو اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ دل و دماغ یقین نہیں کر رہے تھے مگر نگاہوں کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ وہ اسپرٹرز کو عقب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ فٹس لائن پار کر چکی تھیں۔ نشوونگی کے دونوں بازو بے ساختہ فضا میں اٹھ گئے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں اور اپنی انگلیوں سے کوئٹری کا نشان بنارہی تھی۔ بھائی چلی جاری تھی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

نور اپنی جگہ بڑی رہی، وہ کیسے اٹھتی؟ مروے بھی کہیں اٹھتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ مُردہ ہی تو تھی۔ انتقامیہ کے چند مرد وزن اس کی طرف لپکے۔ فی میل و درگز نے اسے بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح تھی۔ وہیں ٹریک پر بیٹھی رہی۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے بری طرح پھل گئے تھے۔ ان میں آگ بھری ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر اپنے گھٹنوں میں گھسٹ لیا۔ وہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی، کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ آسمان لوگوں کو نکل لیتا ہے، یازمین پھٹ جاتی ہے اور وہ اس میں سنا جاتے ہیں۔ شاید وہ بھی کسی ایسی ہی انہونی کی منتظر تھی۔ اس وقت جس منظر کی وید کا خوف اسے سب سے زیادہ ”ہانت“ کر رہا تھا، وہ تاتیا جان کے ہلدی رنگ چہرے کا منظر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مزید مضبوطی سے جھنجھکی لیں۔

☆☆☆

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، محنت کا صلہ ملتا ہے۔ عمل بہیم رانگاں نہیں جاتا..... کہاں تھے ان محاوروں کے خالق، کیوں بنائے گئے یہ محاورے؟ کیوں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے امید کی شان میں تعیدے کیے اور اسے زندگی کی بقا کی بنیاد قرار دیا۔ وہ رات دن سوچتی تھی اور سوچتی چلی جارہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کمرے میں بند ہو گئی تھی، نہ کسی سے مل رہی تھی، نہ کسی کی بات سن رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے تین دن گزرنے کے باوجود تاتیا جان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا پھر مہرین

وہ اپنی فٹنس کے حوالے سے مطمئن نہیں تھی مگر اپنی ہیڈ کوچ میڈم فرحانہ کو بتا بھی نہیں رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے اس حوالے سے میڈم فرحانہ سے تفصیلات کی تو ہوسکتا ہے کہ معاملہ خراب ہو جائے۔ نتیجہ یہ نکلے کہ اسے اپونٹ میں حصہ لینے سے ہی روک دیا جائے۔ وہ فٹنس حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ شہب روز دعا کو بھی تھی۔

بالآخر فیملے کا دن آن پہنچا۔ توقع کے عین مطابق ٹاپ کی بانجھ چھ اسپرٹرز آسانی سے فاصل تک پہنچ گئیں۔ ان میں نشوونگی، نور اور اپنی سن کا لُج کی ارم بھی شامل تھیں۔ ہر کسی کو فاصل ریس کا نہایت شدت سے انتظار تھا۔ اسٹیڈیم تماشا نویس سے کچھ بچا بھرا ہوا تھا۔ کیمروں کی فلیش لائنس چمک رہی تھیں۔ ٹی وی کمرے اور عام ویڈیو کمرے بھی چمکراتے دکھائی دے رہے تھے۔ دل دھڑک رہے تھے اور سانسوں کے زیر و بم میں تیزی آ چکی تھی۔ اس کے کرن مہرین، شرجیل، عثمان وغیرہ بھی یہاں موجود تھے..... اور تاتیا جان کی موجودگی تو ہمیشہ لازمی ہوتی تھی۔ ہاں بس وہ اس وقت نہیں آسکتی تھی لیکن یقیناً وہ بھی نہیں نہ کہیں کی دی کے سامنے موجود تھی۔

رنرز نے ٹریک پر پوزیشن لی۔ اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے۔ آگے جبکہ کر اسٹارٹنگ لائن کو چھو اور فائر ہوتے ہی اپنے سپنرز کی تعبیر کی طرف دوڑے۔ ان لمحوں میں نور نے اپنے فٹنس کے پرابلم کو قطعی طور پر ذہن سے نکال باہر کیا تھا۔ بس ایک ہی بات اس کے ذہن میں تھی، اس نے جیتنا ہے اور ہر صورت جیتنا ہے۔ اس نے اپنی اس حریف کو بچھا دکھانا ہے جس نے اسے ہرانے کے لیے بدترین حربے اختیار کیے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ اس لڑکی سے قانونی طور پر نہیں لے سکتی تھی مگر کھیل کے میدان میں تو لے سکتی ہے اور وہ ضرور لے گی..... ایک دوسرا تصور جو اس کے حوصلے کو ہمیز کر رہا تھا، وہ اس کے تاتیا جان کا تصور تھا۔ انہوں نے بہت انتظار کیا تھا۔ آج وہ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنا چاہتی تھی..... خوشی اور فتح کی چمک۔

وہ فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے دوڑی اور اپنی تمام تر ذہنی و جسمانی توانائیاں صرف کر دیں۔ وہ آغاز میں ہی دفاعی چیمپئن نشو سے تین چار فٹ آگے نکل گئی..... نشو نے چالیس میٹر طے کرنے کے بعد پورا زور لگایا اور نور کے برابر آ گئی۔ وہ آج پھر آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر آج نور

خدیجہ کے بعد سخیہ نظر آ رہی تھی۔ نور کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کافی دیر سے یہاں مہرین کے پاس موجود تھی اور دونوں میں نور کی چوٹ وغیرہ کے حوالے سے نفسیاتی بات ہوئی رہی ہے۔ نور کو مہرین پر تھوڑا سا غصہ بھی آیا کہ اس نے کیوں خدیجہ سے اس معاملے پر بات کی مگر پھر یہ سوچ کر اسے اپنا غصہ ماند پڑا محسوس ہوا کہ اس کی ہار کی وجہ اور اس کی چوٹ کے بارے میں تو اب ہر کسی کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا اور پھر جب سب کو معلوم ہو چکا ہے تو خدیجہ کو بھی سہی۔

رسمی کلمات کے بعد خدیجہ نے کہا۔ ”میں کل کے اخبار میں تمہارے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر رضوان کا مختصر انٹرویو تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تمہارے کھنکے کی چوٹ سے آگاہ تھے اور انہوں نے تمہیں اور تمہاری ہیڈ کوچ کو مشورہ بھی دیا تھا کہ تمہارا ایونٹ میں حصہ نہ لیتا بہتر ہے۔“

”لیکن میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کر سکتی ہوں مگر جو میری قسمت میں تھا۔“

”میں سمجھتی ہوں نور کہ جو تمہاری قسمت میں تھا وہ تمہیں نہیں ملنے دیا گیا اور اس کی تصور وار صرف اور صرف نشو ہے۔ وہ مدت سے تمہارے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور آخر اپنا کام دکھا گئی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ سارے ثبوت ہونے کے باوجود ہم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔۔۔۔۔ اور اس لیے نہیں بگاڑ سکے کہ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ طاقتور لوگ ہیں۔ کوئی باہر کا ملک ہوتا تو تمہارا کیریئر واؤ پر لگانے والی اس خبیث کوئٹل کی سلاخوں کے پیچھے کر دیا جاتا۔“

”چھوڑیں خدیجہ! خود کو پریشان نہ کریں، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب میں یہ سب بھول جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر لہجہ کی تہ میں جو غیر معمولی کرب تھا، وہ چھپائے نہیں چھپا تھا۔

خدیجہ نے جیسے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ایسے مت بولو نور! سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف ایک ایونٹ کی بات ہے، تم بھلی چٹکی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر رضوان نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ کا مکمل آرام تمہیں پھر سے فٹ کر سکتا ہے، اس کے علاوہ۔۔۔۔۔“

”پلیز خدیجہ! آپ یہ ذکر نہ ہی کریں، مجھے اب گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ویسے بھی میں کچھ دن کے لیے ذرا تنہائی میں رہنا چاہتی ہوں۔ اب بھی۔۔۔۔۔ سکون کی کوئی کھائی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ چھوڑی دیر سونا چاہ رہی تھی۔“ وہ کہتے کہتے کھدی ہوئی۔

یہ اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ وہ زیادہ دیر خدیجہ کے

کی مدد سے آواز ابھری۔ ”دردازہ کھولو نور! یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیوں بھوکوں مرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں مروں گی بھوک۔“ وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ ”بسکٹ ہیں اندر اور دو دھبے بھی ہے فریج میں۔ جاؤ تم۔ میں کھا لوں گی۔“

”لیکن یہ کیا یہ قوتی ہے نور! تم تو متاثر بنا رہی ہو اپنے آپ کو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اپنے حواس ٹھکانے پر کرو۔ اگر کھنکے کا مسئلہ زیادہ ہے تو اس کو بھی ٹریٹ منٹ کی فوری ضرورت ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے گھٹنا میرا۔“ وہ لہجہ کی تلخی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”دیکھو نور! تمہیں ابا جان کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا؟ لیکن وہ تو کل شام ہی چھوٹ چلے گئے تھے۔“ (ابا جان سے مہرین کی مراد اپنے ابا جان تھے)۔

”گھر میں اور کون ہے؟“ نور نے مری مری آواز میں پوچھا۔

”بس میں اور امی۔ وہ بھی بازار گئی ہیں۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد نور نے ایک جی سانس لی اور دردازہ کھول دیا۔ مہرین اندر آ گئی۔ نور جیسے سسک کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنسوؤں کے بغیر کیسے روایا جاسکتا ہے؟

”کوئی بات نہیں نور۔ ہر کام میں اللہ کی بہتری ہوتی ہے۔ تم نے کوشش تو پوری کی۔ کوئی کسر نہیں اٹھا رہی۔ اب جو اللہ کو منظور۔ کل اباجی بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔“ وہ نور کو دلاسا دینے لگی۔

نور بالکل سمجھ گئی تھی۔ کوئی دلاسا کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کہیں چلے جانا چاہتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے ہر ایک سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ مگر کہاں جاتی؟

اچانک اس کی نگاہ خدیجہ پر پڑی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ یقیناً نور کو حوصلہ سہلی دینے کے لیے ہی آئی تھی۔ نور کے قدم جیسے بے ساختہ خدیجہ کی طرف اٹھ گئے۔ اس سے بات کر کے نور کو بہت اچھا لگا کرتا تھا مگر پھر یکایک وہ ٹھنک سی گئی۔ اسے خدیجہ کے ساتھ اس گھر میں اپنی آخری ملاقات یاد آ گئی تھی۔ خدیجہ کا بھائی اسی کے ساتھ آیا تھا اور وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ ذوالقرنین کا خیال آتے ہی نور کے اندر کچھ سمجھ سا گیا۔ خدیجہ کے حوالے سے اس کی ساری جاہت ایک دم گہنا گئی۔ وہ دھیمے قدموں سے خدیجہ کے پاس پہنچی اور عام سے انداز میں اس سے ملی۔

رہے گی؟“

”نہیں، اس بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یقین کرو ذوالقرنین! آج اسے دیکھ کر بڑا ترس آیا ہے مجھے۔ اپنے تایا اور والد کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے بڑی جان ماری تھی اس نے مگر.....“

ذوالقرنین ذرا توقف سے بولا..... ”چلو تم اس سے ملتی رہو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ زندگی میں ایک ہی جیت نہیں ہے اور ایک ہی میدان نہیں ہے۔ بندہ ایک جگہ کامیابی حاصل نہ کر سکے تو کسی اور شعبے میں نام کما سکتا ہے۔“

”تمہیں کہا تھا نا ذوالقرنین! یہ جو کھلاڑی اور آرٹسٹ ہوتے ہیں نا، یہ دھن کے بڑے بچے ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی بھی نہیں کی جاسکتی۔“

خدیجہ نے بھائی سے یہ بات چھپائی کہ نور اس سے بڑی سردمہری سے ملی ہے۔

اگلے روز ذوالقرنین عمر کی نماز پڑھ کر دکان پر پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسورٹ اٹھایا۔ دوسری طرف خدیجہ کی ایک دوست تبسم تھی۔ وہ بیچانی لہجے میں بولی۔

”ذوالقرنین بھائی! خدیجہ زخمی ہو گئی ہے۔ صحت زید اسپتال میں ہے۔ آپ جلدی آئیں۔“

”ہوا کیا ہے؟“ ذوالقرنین چلا کر بولا۔

”فیڈریشن کے آفس میں لڑائی ہوئی ہے۔ نشو اور اس کی دوستوں نے خدیجہ کو بری طرح مارا ہے۔ اس کی..... کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور بھی کئی زخم ہیں۔“

ذوالقرنین اپنی ایف ایف پر آندھی کی رفتار سے شیخ زید اسپتال پہنچا۔ خدیجہ ابھی ایمرجنسی میں ہی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی پر عارضی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ اس کے سر، کندھے اور پاؤں کی انگلیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تنظیم کی کئی ممبران بھی وہاں موجود تھیں۔ زخمی ہونے کے باوجود خدیجہ پریشان نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ سی روشن تھی۔ ذوالقرنین نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔ پھر تبسم سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟

اس نے بتایا کہ فیڈریشن کے آفس میں نشو کے اعزاز میں ایک فنکشن تھا۔ خدیجہ اکیلی وہاں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اسٹیج پر آ کر اور ڈانکس کے سامنے نشو کے خوب لٹے لیے۔ اسی پر لڑائی ہو گئی۔

ایک دوسری لڑکی بولی۔ ”خدیجہ باجی نے غلطی کی، اگر ایسا کچھ کرنا تھا تو کم از کم ہم میں سے دو چار کو انعام کر دیتیں۔“

پاس بیٹھنا نہیں چاہتی۔ نور کی یہ بے رخی محسوس کرنے کے باوجود خدیجہ کی تندرہ پیشانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ کو چھپتھپایا..... ”نم آگھوں کے ساتھ اس کے سر کو چوما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔“ اچھا تم آرام کرو۔ اگر موڈ اچھا ہو اور کسی وقت بات کرنے کو دل چاہے تو فون ضرور کرنا۔“

☆☆☆

وہ کسی صورت اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اس کا خیال تھا۔ شادی کی تقریب کا وہ منظر جیسے ذوالقرنین کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا..... اس نے اپنا ڈھیلا۔ کراف کھول کر پھر باندھا تھا۔ ستاروں کے درمیان جیسے ایک چاند چکا تھا اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ کئی گھنٹیاں ایسی ہی کا یا پلٹ ہوتی ہیں۔ وہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہیں۔ کہنے کو تو بس چند سیکنڈ لیکن جھیلنے کو ساری زندگی۔

تین دن پہلے اسے پتا چلا تھا کہ نور ایک بار پھر ٹائسل جینتے میں ناکام رہی ہے اور بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ آدھے راستے کے فوراً بعد ٹریک پر گر گئی تھی اور دور تک لڑھکی تھی۔ اس کی یہ تصویر کئی اخباروں میں چھپی تھی اور پانی دی پر بھی یہ منظر دکھایا گیا تھا۔

ذوالقرنین کا دل غم سے بھرا ہوا تھا، اتنے میں اس کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ذوالقرنین کے کہنے پر ہی نور سے ملنے لگی۔

خدیجہ بالکل کم مسم تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ”وہ بہت خاموش ہے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں ذوالقرنین..... دانشوروں نے شاید درست ہی کہا ہے کہ ظلم کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے مگر نا انصافی کی نہیں۔ یہاں دو طرح کا انصاف ہے۔ ایک غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے، دوسرا امیر اور اثر رسوخ والوں کے لیے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”نور کی ناکا کی وجہ وہی چوٹ ہے جو اس کیمین نشو نے اسے کالج والے ایونٹ میں لگوائی تھی۔ اس کا گھٹنا پوری طرح فٹ نہیں تھا پھر بھی اس نے ریس میں حصہ لیا اور کھلت کھائی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہ نشو کہیں میرے سامنے آئے اور میں اسے گولی مار دوں۔ سنا ہے آج کل وہ لاہور آئی ہوئی ہے، اس کے اعزاز میں تقریرات ہو رہی ہیں۔“

”اب کیا کہتی ہے نور..... کیا اب بھی اپنی ضد پر

جاری تھی۔

”خدیجہ اچھی بھلی سمجھ دار ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کیوں میرے لیے لڑائی مول لے رہی ہیں۔“

”کبھی کبھی اس طرح کی بات اپنے بس میں نہیں رہتی نور! صبر کا پتہ نہ لیریز ہو جائے تو پھر زیادہ ہی چھلک جاتا ہے۔ میں نے اس دن نوٹ کر لیا تھا کہ تمہیں دیکھ کر خدیجہ بہت پریشان ہو گئی ہیں۔“

تین دن بعد کی بات ہے، نور اور مہرین نے خدیجہ کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ خدیجہ کا آپریشن کامیابی سے ہو چکا تھا۔ نور چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اسپتال پہنچیں جب خدیجہ کا بجائی ڈوالٹرین آس پاس موجود نہ ہو۔

خدیجہ پر اینیوٹ روم میں تھی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو وہ روم میں ایلی کی بیوی تھی۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں، ایک خوبصورت ”مکے“ اس کے سر ہانے رکھ دیا۔ رکی کلمات کے بعد نور نے کہا۔ ”آپ نے ایسا کیوں کیا خدیجہ۔۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ لڑائی مول لی۔ آپ تو مجھے سمجھاتی تھیں کہ ان باتوں میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

”پتا نہیں نور کہ کیسے ہو گیا۔ جب میں تم سے مل کر آئی تو میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے میں بھی وہاں پہنچ گئی۔ آئی ایم سوری لیکن ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔“

”آپ جانتی ہیں خدیجہ! یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہ آپ کے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔“

”نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوگی انشاء اللہ! انہیں پتا تھا کہ اگر وہ پولیس تک گئے تو پھر بات آگے تک جائے گی۔ کل صلح صفائی کی بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں صاف بتایا ہے کہ وہاں فیڈریشن کے دفتر میں جو کچھ بھی ہوا، اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔“

”مگر اس سے فائدہ کیا ہوا خدیجہ؟“ نور نے جربز ہو کر کہا۔

”بہت فائدہ ہوا ہے نور! کم از کم ان لوگوں کو ایک جواب تو ملا ہے۔ اب آئندہ کوئی حرکت کرنے سے پہلے وہ کئی بار سوچیں گے۔ تمہیں پتا چلا ہی ہوگا، وہ ماڈرن غنڈی تو اس بچے سے کر کر کچھ دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔“

مہرین بولی۔ ”مگر آپ کو بھی تو قیمت چکانا پڑی خدیجہ آئی آپ اسپتال میں پڑی ہیں۔“

”کوئی قیمت نہیں۔“ وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

واقعات کی جو تفصیل معلوم ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔ خدیجہ کے اندر نشو کے لیے مسلسل غصہ مل رہا تھا۔ آج اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔ وہ فیڈریشن کے آفس پہنچ گئی۔ وہاں نشو اور اپجی سن کا بج کی ارم کو نقد انعامات دیے جانے والے تھے۔ جب نشو ڈاکس پر آئی تو خدیجہ نے وہاں پہنچ کر مالک کے سامنے بولنا شروع کر دیا۔ نشو کی چیخ پٹن شب کو فز اور فرادیا۔۔۔۔۔۔ اور بتایا کہ اس نے کس طرح ”پری پلانٹ“ اصل حق دار نور کو ایونٹ سے باہر کیا ہے۔ وہاں اتفاقاً وہ ہٹی کٹی لڑکی بھی موجود تھی جس نے نور کی ٹانگ پر کرسی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگائی تھیں۔ وہ حاضرین میں سے نکل کر خدیجہ پر جھپٹ پڑی۔ خدیجہ نے اس کی بھی ٹھکانی کر دی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ نشو بجلی پہلے تو سستہ زدہ کھڑی رہی مگر پھر خدیجہ پر جھپٹی۔ خدیجہ نے اسے ایک یادگار طمانچہ رسید کیا۔ بعد میں تقریباً اسے بھی طمانچے پڑے اور وہ زرد گوب بھی ہو گئی مگر وہ پہلا طمانچہ درجنوی کیسروں میں ریکارڈ ہو گیا۔

☆☆☆

مہرین نے نور کو زبردستی بیٹھ پر نیم دراز کر رکھا تھا اور اس کو گھٹنے کی مختلف ورزشیں کر رہی تھی۔ اسی دوران میں اپنی سی ایل فون کی گھنٹی بجی۔ مہرین نے کال ریسپونڈ کی اور اس کے تاثرات میں ہلچل مچ گئی۔ دوسری طرف سے کسی جھگڑے کی بات ہو رہی تھی۔ فون سننے کے بعد مہرین نے نور سے کہا۔ ”اچھی خبر نہیں، خدیجہ اور نشو کی لڑائی ہوئی ہے۔ خدیجہ کا بازو فزیکل ہو گیا ہے، اسپتال میں اس کا آپریشن ہوگا۔“

”ادھ گاڈ۔“ نور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”کس نے بتایا ہے؟“

”میری کو لیک ہے۔۔۔۔۔۔ وہ بھی شیخ زید کے فزیو تھراپی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔“

”لیکن معاملہ کیا تھا۔۔۔۔۔۔ کوئی اپنی بھی دھنی ہے ان کی؟“

”نہیں بھئی۔ تمہاری والی دشمنی ہی ہے۔ ایک فنکشن میں خدیجہ ڈاکس پر پہنچ گئیں اور خطاب فرماتی ہوئی نشو کا اچھا خاصا ریمارکس لیا۔ کافی ہنگامہ ہوا ہے۔“

آدھ پون گھنٹے میں نور اور مہرین کو اس واقعے کی ساری تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ چند دن پہلے نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی سلطانہ اس لڑائی میں اس بچے سے گر کر تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ نشو کے درجہ پر چڑھ کر وہ بھی درج کر دیتے مگر چونکہ خدیجہ کو بھی سخت چوٹ لگی تھی اس لیے ابھی تک پولیس کو انفرام نہیں کیا گیا تھا اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی

”بھلی چنگی ہوگئی ہوں، کل تک شاید چھٹی بھی مل جائے۔“
 ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ داش روم کا دروازہ
 کھلا اور ذوالقرنین تو لیے سے بازو صاف کرتا ہوا باہر نکلا۔
 اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں پانی کے قطرے چمک
 رہے تھے۔ ذوالقرنین کو دیکھ کر نور کا دل دھک سے رہ گیا۔
 وہ بھی ذرا ٹھکا پھر اس نے شائستگی سے ”السلام علیکم“ کہا۔
 نگاہیں حسبِ معمول جھکی ہوئی تھیں۔ نور اور مہرین نے
 جواب دیا۔ وہ شاید وضو کر کے نکلا تھا۔ بولا۔ ”خدیجہ! نماز کا
 ٹائم ہو رہا ہے۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ مہرین نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔ ”یہ
 کون تھے خدیجہ آئی؟“
 ”میرا بھائی ذوالقرنین۔“

”اچھا، آپ انہی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں؟“
 خدیجہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بہت زیادہ خیال
 رکھتا ہے میرا۔ چار دن سے مسلسل یہاں میرے پاس ہے۔“
 اسی دوران میں مہرین کی وہ دوست آگئی جو اسی
 اسپتال میں فزیو تھراپسٹ تھی۔ مہرین اس کے ساتھ باتیں
 کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں
 ایک بوہٹل خاموشی طاری ہوگئی۔ نور کے علاوہ جیسے خدیجہ بھی
 کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہیں پار ہی تھی۔ آخر نور نے ہی اس
 خاموشی کو توڑا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اس کا
 مطلب ہے کہ آپ پہلے سے جانتی ہیں؟“
 ”کیا؟“ خدیجہ نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ”یہی کہ میں وہی ہوں
 جس کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے آپ کے بھائی کے رشتے کی
 بات چلی تھی؟“

خدیجہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور نکیلے سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے
 ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہاں نور..... میں جانتی تھی..... مگر
 میں نے تمہیں بتایا نہیں..... مجھے ڈر تھا کہ تمہیں پتا چل گیا تو
 ہماری دوستی شروع میں ہی ختم ہو جائے گی لیکن یہ نہ سمجھا کہ
 میرے اور تمہارے ملنے میں کوئی پلاننگ تھی۔ ظاہر ہے کہ
 ہم ایک ہی کالج میں تھیں، جو کچھ ہوتا یا خود بخود ہوتا رہا۔“
 ”..... آپ میرے لیے صرف خدیجہ ہی رہیں تو
 بہت اچھا ہوتا۔“ نور مکھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ میں
 تمہیں یقین دلانی ہوں ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی
 نہیں آئے گا۔“

اس سے پہلے کہ خدیجہ مزید کچھ کہتی، مہرین اور اس کی

دست داہیں آگئیں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نور اب
 جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ خدیجہ سے رخصت ہو کر
 وہ دونوں کمرے سے باہر آگئیں۔ جب وہ سیڑھیاں
 اتر رہی تھیں تو ان کی ملاقات پھر ذوالقرنین سے ہوگئی۔ وہ
 کولڈ ڈرنکس اور اسٹیکس وغیرہ لے کر ادر آ رہا تھا۔
 ”آپ جارہی ہیں؟“ وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔
 ”جی ہاں۔ گھر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔“ مہرین نے
 جواب دیا۔

”آپ پانی تو پی لیتیں۔“

”شکریہ۔ دیر ہو رہی ہے۔“ مہرین نے کہا۔

وہ دونوں سلام لیتے ہوئے نیچے اتر آئیں۔

راستے میں مہرین نے گہری نظروں سے نور کو دیکھا
 اور جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”ویسے نور! بندہ اتنا برا
 بھی نہیں لگتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”سیانے کہتے ہیں تاکہ شکلوں پر نہیں جانا چاہیے۔

شکل صورت سے یہ ذرا سخت مزاج اور کم صدم سا ہے مگر جب
 بات کرتا ہے تو ادر طرح کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔“

”اچھا، تم زیادہ مردم شناس نہ بنو۔“ نور نے چڑ کر کہا۔

”یار! میں تو ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔“

”نہیں میرے لیے یہ عام نہیں ہے مہرین! میں اس

طرح کے کسی بندے کو اپنی زندگی میں لانے کا سوچ بھی
 نہیں سکتی۔“

”کوئی آئیڈیل؟“ مہرین دہلی دہلی شوخی سے بولی۔

”نہیں۔ کوئی آئیڈیل نہیں مگر یہ قاری ذوالقرنین بھی نہیں۔“

نور کا موڈ دیکھتے ہوئے مہرین نے خاموش رہنا

مناسب سمجھا۔

..... چندہرے بیس روز گزر گئے۔ انہوں نے دوبارہ

خدیجہ کی خیر خیریت دریافت نہیں کی حالانکہ انہیں چاہیے تھا

کہ کم از کم ایک بار تو اسے فون کر لیں۔ (نور نے مہرین کو

بتا دیا تھا کہ خدیجہ اور اس کے درمیان ذوالقرنین والی بات

کھل چکی ہے) آخر ایک روز مہرین نے خدیجہ کو فون کر رہی

دیا۔ حال احوال پوچھا۔ نور نے بھی تھوڑی سی بات کی۔

گفتگو کے آخر میں خدیجہ نے نور سے کہا۔ ”نورا تمہارے

پاس اور کون ہے؟“

”کوئی نہیں۔ مہرین تھی، باہر چلی گئی ہے۔“

خدیجہ بولی۔ ”تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو لو؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے کبھی خفا



پاکیزہ

نیا شمارہ 17 نومبر 2017 کا پُر کیف شمارہ

پاکیزہ

ماہنامہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قلم کے جوہر..... قسط دار ناول کی صورت

سیما رضا ردا کا خوب صورت مٹی ناول..... ہم کو عبث بدنام کیا کا منطقی انجام.....

رفاقت جاوید نے کھلائے محبت کے رنگ..... فصل محبت میں.....

بچوں اور ان کی پرورش کے حوالے سے

ماؤں کی ذمے داریاں شائستہ زریں

کے تحقیقی سروے میں.....

اختر شجاعت اور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے ایمان افروز مضامین.....

رائٹرز کی کہکشاں..... رخ چوہدری کے شوخ قلم سے احوالِ تقریب

سمیرا یونس ہارون کا پر لطف مکمل ناول..... کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا

دردانہ نوشین خان کی حیرت انگیز تحریر..... خواب گزیدہ.....

شہناز وسیم، صبا بخاری اور نصرت یوسف کی میوزک کاوشیں.....

لوگوں کی علامت

اُمّ ایمان، شگفتہ شاہ، ساجدہ ریحان، سیما بنت عاصم، شمیم فضل
خالق، ناہید چوہدری، ریحانہ آفتاب دیگر مشاق تحریر نگاروں کی وکاش کاوشیں.....

اس کے ساتھ ساتھ معلوماتی تراشے، مٹاثر کن مستقل سلسلے اور دل پزیر شاعری اور بہت کچھ آپ کی اہلی ذوق کی نذر.....

نہیں ہو سکتی۔ میرے دل میں آپ کا ایک مقام بن چکا ہے۔ بس تھوڑا سا افسوس ضرور ہے۔
”کس بات کا؟“

”یہی کہ ماضی کی ایک بات ہمارے درمیان آگئی ہے۔ ہم پہلے کی طرح آزادانہ نہیں مل سکتیں لیکن کچھ بھی ہے خدیجہ! آپ دور دراز کر بھی میرے قریب ہی رہیں گی۔“

دوسری طرف کچھ دیر بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر خدیجہ نے غصہ بے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”نور! اس دن اپنا تال میں، میں نے تم سے ایک فقرہ کہا تھا، اپنے اور تمہارے تعلق کے بارے میں..... تمہیں یاد ہے؟“

نور نے کہا۔ ”ہاں، آپ نے کیا تھا، میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ تمہیں یقین دلائی ہوں کہ ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا۔“

”میں اپنی اس بات پر قائم ہوں نور۔ بس تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ یہ پہلی اور آخری بات ہوگی۔ اس کے بعد میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔ اس موضوع کا صفحہ ہماری گفتگو کے باب میں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو جائے گا۔“

”آپ..... کیا..... کہنا چاہتی ہیں؟“
”نور! ہر بہن کو اپنا بھائی پیارا ہی ہوتا ہے لیکن میں

جو بات کہنے جا رہی ہوں، یہ بالکل بے لاگ ہے..... وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے نور! اس کی محبت میں اتنی گہرائی ہے کہ کبھی بھی میں ڈر جاتی ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو جب تم دونوں کے رشتے کی بات ختم ہوئی تو وہ کئی دن اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔ اب کافی عرصہ گزر چکا ہے، وہ گھر والوں پر ظاہر تو کچھ نہیں کرتا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں کئی موقعے ایسے آئے جب ابھی جگہ اس کا رشتہ ہو سکتا تھا مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں نور.....“

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ شاید خدیجہ منتظر تھی کہ نور ہنکارا بھرے گی مگر وہ چپ رہی۔ خدیجہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”نور! ہم بچپن سے ایک دوسرے کے راز داراں تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ مگر ابی اگٹھ کھاتے اور ہمیں پیار بھی اگٹھا ہی ملتا تھا۔ میں اسے مذاق میں اخروٹ کہا کرتی تھی۔ جب وہ غصہ کرتا تو میں کہتی، ذوالقرنین! میں تمہاری تعریف کر رہی ہوں۔ اخروٹ اوپر سے سخت لیکن اندر سے کتنا نرم

ہوتا ہے۔ وہ کہتا کہ پھر تم خرمانی ہو، اوپر سے نرم لیکن اندر سے سخت۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس ہیں نور۔ وہ جتنا سنجیدہ اور کم گو ہے، اندر سے اتنا ہی خوش مزاج ہے۔ وہ تمہیں بہت پیار دے سکتا ہے نور..... تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ دقی جذبہ نہیں ہوگا۔ اس میں اتنی پائیداری ہوگی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم میری بات سن رہی ہو؟“

نور ذرا توقف سے بولی۔ ”میں زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتی..... صرف یہی گزارش ہے کہ..... آپ..... اپنے وعدے پر قائم رہے گا..... میرا مطلب ہے..... آپ جو کہنا چاہتی تھیں آپ نے کہہ دیا..... اور میں نے سن لیا۔ اب اگر ہم..... کبھی کوئی بات چیت کریں گے تو اس میں یہ موضوع نہیں آئے گا۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ سنانا سار ہا پھر خدیجہ کی بوجھل آواز ابھری۔ ”ٹھیک ہے نور! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں لیکن تم اس بارے میں ایک بار سوچنا ضرور۔“
رکی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ابھی وہ ریسیور رکھ ہی رہی تھی کہ تائی جان آگئیں۔ آج کل ان کے روپے میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ اب بھی ان کی پیشانی پر ہلکا سا مائل موجود تھا۔ بولیں۔ ”کس سے بات کر رہی تھیں؟“

”خدیجہ تھیں۔ ان کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔“
تائی بولیں۔ ”دیکھو اب جبکہ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ خدیجہ، اسی ذوالقرنین کی بہن ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔“

”آپ اس بارے میں بے فکر رہیں تائی ای۔ اب بھی میں نے فون نہیں کیا تھا۔ مہرین نے حال چال پوچھنے کے لیے کال ملائی تھی۔“

تائی جان نے نور کی جانب پر سوچ انداز میں دیکھا پھر اس کے قریب ہو گئیں۔ نرم لہجہ میں بولیں۔ ”دو پہر کو جب تم سو رہی تھیں تو تمہاری کوچ میڈم فرحانہ کا فون بھی آیا تھا۔ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
نور خاموش بیٹھی رہی۔

تائی راحت نے دلار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔ ”نور! کئی کاموں میں اللہ کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ ہم کتنی بھی کوشش کر لیں وہ کام ہو نہیں پاتے۔ تم نے اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے مہل کے میدان میں۔ کوئی کسرا ٹھانئیں

تو اس کے سامنے ایک دیواری کھڑی ہو جاتی تھی۔ یہ کیسی دیواری تھی؟ کیا یہ اتنی دیواری تھی؟ کیا یہ اس عزم کی دیواری تھی کہ اس نے کچھ بن کر دکھانا ہے اور تائیا بابا کا سر لوگوں کے سامنے جھکنے نہیں دینا؟ کیا اس دیواری تعمیر اس کے اندر کے جنون سے ہوئی تھی، وہ جنون جو سو میٹر کے ٹریک سے وابستہ تھا؟

اگرچہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ ابا جان اپنے نظریات پر بالکل درست ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی ناراضگی بھی بجا ہے اور وہ دل سے جانتی تھی کہ ابا جان اس سے راضی ہو جائیں۔ اس کا مقصد ہرگز بھی ان کے نظریات و خیالات سے ٹکرائیں تھا مگر وہ اپنے انداز زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاری تھی۔

وہ بہت دیر سوچتی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدلنے لگے، ذہن تھک سا گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ سوتے جاتے کی درمیانی کیفیت میں تھی۔ اس نے تصور میں دیکھا۔ اسے دہن بتایا گیا ہے۔ بھاری بھر کم جھپٹے پڑے، زیورات، چوڑیاں، بنکس، ٹاک میں تھکی، چہرے پر میک اپ کی تہ۔ وہ سکڑی سٹی ٹیٹی ہے..... جس طرح اس کے گاؤں مورائ والی کی لڑکیاں دہن بن کر بیٹھتی تھیں۔ ایک ہیولا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کا دلہا ہے، شاید ذوالقرنین ہے۔ ہاں ذوالقرنین ہی ہے۔ وہ اسے دیوتا ہے، سہمی پر گراتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چاہر (برجھا) ہے۔ وہ کہتا ہے..... چلو ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تم کو کھونا نہیں چاہتا۔ لہذا اب سے پہلے ہم اس جھٹلے کو ختم کرتے ہیں جو ہماری ازدواجی زندگی میں زہر معمول سکتا ہے۔ وہ بے دردی سے چاہر چلاتا ہے اور نور کے دونوں پاؤں تختوں کے پاس سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ لرزتے ہوئے سفید پاؤں کمرے کے گھائی قالین پر پڑے ہیں۔

نور جیسے تڑپ کر اپنے تصور سے باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس روم میں چلی گئی۔ چہرے پر خندے پانی کے جھینے مارے، اپنی گردن کو جھگو یا اور باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک دیوار پر فلورنس کی تصویر آویزاں تھی۔ امریکا کی وہی فلورنس جس نے 10.49 سینکڑ کا عالمی ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ اس تصویر میں وہ برقی رفتار سے فٹس لائن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہزاروں نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی، پھر ایک گہری لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر پھر تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ دو رکٹیں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ پر کسی گیت کے

رکھی۔ تمہارے تائیا بابا نے بھی اپنی حیثیت اور ہمت سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں ذرا دوسرے انداز میں سوچنا چاہیے۔ میری بات کا برا نہ مانا۔ لڑکیوں کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ تین چار سال کا ایک دور ہوتا ہے جس میں ان کا گھر بس جانا چاہیے، ورنہ شکلیں بڑھ جاتی ہیں۔“

”آپ..... کیا کہنا چاہتی ہیں تائی امی؟“ نور ان کی طرف دیکھ کر بغیر بولی۔

”تم ہمیں بہت پیاری ہو نور..... جس طرح یہ مہرین کا گھر ہے اسی طرح تمہارا بھی ہے لیکن ایک دن تو مہرین کو بھی جانا ہی ہے۔ میرا مشورہ ہے نور کہ اب تم گھر گھڑستی کے بارے میں سوچو، ماشاء اللہ کوئی کمی نہیں ہے تم میں۔ اچھے سے اچھا ریشٹل جائے گا۔“

نور نے تائی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیا تائیا بابا نے یہ کہا ہے؟“

”انہوں نے کہا تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں وہ رات دن تمہاری بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہارے ابا جی کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ تمہارے کاموں میں تمہارے والد کی مرضی شامل ہو۔ اسی میں خیر ہے اور اسی میں دین و دنیا کی بھلائی بھی ہے۔“

”میں نے تو ہر طرح کوشش کر کے دیکھی ہے تائی امی۔ ان کی ناراضگی دینی طور پر کچھ کم تو ہو جاتی ہے مگر درنہیں ہوتی۔“

وہ عینک درست کرتے ہوئے بولیں۔ ”اور اس کی وجہ بھی تم بھی طرح جانتی ہو جب تک تم یہ بھاگ دوڑ والا کام چھوڑ دو گی نہیں، ان کا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہوگا۔ میرا تو مشورہ یہی ہے نور! اب تم میڈم فرحانہ سے صاف صاف بات کرلو۔ انہیں بتا دو کہ تم کلب میں نہیں آؤ گی۔ سائنے کہتے ہیں کہ باپ کی بدو عادتیں لگتی چاہیے۔ وہ بڑی سخت ہوتی ہے۔ کبھی بھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم کسی ایسی ہی سختی کی لپیٹ میں نہ آ جاؤ۔ پلیز نور..... پلیز۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ دایا اور بچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی نظروں سے دیوار کو گھورتی رہی۔ تائی راحت کچھ دیر انتظار کرتی رہیں پھر جزیسی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

نور نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر ڈھسے سی گئی..... ”میں کیا کروں میرے خدا..... کس طرف جاؤں؟“ وہ دل ہی دل میں پکاری۔

پتا نہیں کیوں جب وہ رنگ سے پیچھے ہٹنے کا سوچتی تھی اور ابا جان کی نصیحتوں کے سامنے سر جھکانے کا سوچتی تھی

بول گونج رہے تھے۔ مگر مگر کے مصیبت میں سنبھلتے ہی رہیں گے..... جل جائیں مگر آگ پہ جلتے ہی رہیں گے۔
وہ ذرا ہنک گئی اور اپنے گھٹنے کا جائزہ لینے کے لیے آہستہ آہستہ ٹانگ کو اوپر نیچے حرکت دینے لگی۔ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ صبح ہوتی تھی، شام ہوتی تھی۔ دن کا اجالا اور رات کا اندھیرا ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے..... گھڑی کی سوئیاں متحرک رہیں..... اسی طرح چارہ گزر گئے۔ نور ابھی تک تاپا ابا کے گھر میں تھی۔ تائی راحت کے روپے میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر تاپا ابا بدستور اس کے ساتھ جم کر کھڑے تھے۔ وہ ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتے۔ انہوں نے کبھی اسے رنگ سے دور جانے کا مشورہ نہیں دیا..... ہاں کسی وقت اتنا ضرور کہتے کہ وہ دیگر معاملات پر بھی توجہ دے اور اپنے والد سے اپنا فاصلہ گھٹانے کی کوشش کرے۔ وہ جیسے، نور سے خفا ہوتا یا اس کی بات کو رد کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔
دو ڈھائی ماہ کے ملل آرام کے بعد نور ایک بار پھر رنگ میں حصہ لینا شروع کر چکی تھی۔ اب گھٹنا اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ وہ اپنی پہلی فارم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پہلے والی فارم حاصل ہو تو جائے گی مگر آسانی سے نہیں۔ وہ اب گاہے بگاہے ٹریڈنگ سینٹر (ایف اے ایس) بھی جاتی تھی۔ تاپا ابا اسے چھوڑ کر آتے تھے اور واپس بھی لاتے تھے۔ وہ کسی عذر کو اس معمول کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے.....
بسمہ کو تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا تھا اور وہ کئی جگہ جیتی بھی تھی۔ ابا جان کی غیر موجودگی میں دونوں بہنیں آپس میں مل بھی لیتی تھیں..... اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتی تھیں۔

خدیجہ یا اس کے بھائی ذوالقرنین کے ساتھ پھر کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ایک بار نور کا دل چاہا کہ وہ کم از کم فون کر لے اور خدیجہ کی خیریت دریافت کرے مگر پھر وہ فون کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ ایسے موقعوں پر عجیب سی کشمکش اس کے اندر نمودار ہو جاتی تھی۔

اور پھر ایک دن نور کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس واقعے نے اسے اپنے والد سے کچھ اور دور کر دیا ہے۔ نور چھت پر بیٹھی ہجرت کی تیاری کر رہی تھی کہ تائی راحت اس کے پاس آئیں۔ ان کا انداز دیکھ کر ہی نور کو

اندازہ ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”نور! تمہیں کچھ بتانا ہے، اشفاق کے بارے میں؟“
”کیوں، کیا ہوا ہے ابا جان کو؟“ وہ چونک گئی۔
”وہ شادی کر رہے ہیں..... میرا مطلب ہے، نکاح کر رہے ہیں۔“

وہ لگتی دیر سنائے میں رہی..... پھر بہ مشکل بولی۔
”آپ سے کس نے کہا ہے؟“

”کہنے کی بات نہیں ہے۔ یہ کام ایک دو روز میں ہونے والا ہے۔ کوئی بیوہ عورت ہے۔ بچہ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ امام مسجد صاحب کی کوئی عزیزہ ہے۔ انہوں نے ہی بات طے کرائی ہے۔“

”مگر..... وہ.....“ نور کچھ بول نہ سکی۔ گڑبڑا کر رہ گئی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

تائی راحت نے کھبرے لکھے میں کہا۔ ”ذرا عیب تو لگتا ہے مگر شرعی طور پر اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ تمہاری اسی کے انتقال کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ڈھائی تین سال بیماری کے بھی کاٹے۔ شاید اشفاق کو دکھ سکھ کے لیے کسی ساسی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ تم بہنوں نے تو بیاہ کر اپنے گھر دل کو چلے جانا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں نمی آئی۔ تو قف سے بولی۔

”شاید اسی لیے ابا جان کو ہمیں بیاہ دینے کی جلدی تھی۔“

”نہیں نور! ہر بات کو سنی انداز میں نہیں لیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے تمہارے رشتے کی بات چلانے میں بہت جلدی کی..... اور شاید دھڑکا تمہارے جوڑ کا بھی نہیں تھا مگر نیت تو ان کی ٹھیک ہی رہی ہوگی۔ وہ دراصل تمہاری مصروفیات سے بھی ڈرے ہوئے تھے اور..... دیکھا جائے تو ان مصروفیات نے تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں دیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر.....“ پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ غالباً انہیں محسوس ہوا تھا کہ اس موقع پر یہ نیا موضوع چھیڑنا مناسب نہیں۔

انہوں نے نور کو بتایا کہ وہ خود بھی اس خاتون سے ملی ہیں۔ لہذا اور اچھے مزاج کی لگتی ہیں۔ تم تینوں بہنوں کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہی تھیں۔ تمہارے بارے میں تو پہلے سے ہی تھوڑا بہت جانتی ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ کسی اخبار میں تمہاری تصویر بھی دیکھی تھی۔

تائی راحت باتیں کر رہی تھیں اور نور کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں اسے عجیب سی شرمساری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے والد دوسری شادی کر رہے تھے۔

ہی اس کھوج میں رہتی تھی کہ میری کوئی بات آپ کو بھا جائے، آپ آپنی بول اور ہمسہ سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھیں۔ جب آپ نہیں دیکھتے تھے تو میں اور سہارے ڈھونڈتی تھی، شاید تاپا جان کی مہربان آغوش میں بھی آپ کی محبت ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی۔ میری یہ حسرت میرے ساتھ ہی جوان ہوتی رہی ہے اب! آپ کو کیا پتا میں نے آپ کی توجہ پانے کے لیے کیا کیا جتن کیے لیکن میرا ہر جتن مجھے آپ سے دور ہی لے گیا۔ میں جاہت کی نگاہ کو ترستی تھی لیکن آپ نے تو مجھی مجھ پر رحم کی نگاہ بھی نہ ڈالی۔

دو دیر تک اسی انداز میں سسکتی رہی پھر سوسنی۔ اس کی نئی امی زلفت نے دو تین ہفتے ہی میں گھر میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ نور اور بول سمیت ہر ایک کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ نور کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کے اور ابا جان کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک روز وہ نور کو زبردستی گھر لے گئیں۔ وہ شام تک وہاں رہی پھر ایک دن جب تاپا ابا کی طبیعت کچھ تاسا تھی، وہ ان کی عیادت کے لیے آ گئیں۔ ابا جان بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ کوشش کرتی رہیں کہ نور کے ابا جان، نور سے بھی بات کریں اور ان دونوں کے درمیان جو ایک دیواری کھڑی ہو چکی ہے، وہ مسمار ہو۔ اس دن ہلکی بار نور نے خود پر جبر کر کے ان کو ”چھوٹی امی“ بھی کہا۔

ایک روز جب تاپا جان اپنے کام کے سلسلے میں سحرات گئے ہوئے تھے اور مہربان کالج میں تھی، چھوٹی امی ان کے گھر آئیں۔ انہوں نے اکیلے میں نور کو کھینچا تے ہوئے کہا۔ ”نور! اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ تمہارے ابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس تمہاری طرف سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے اور یہ انہیں ہر وقت دکھ رہتی ہے۔“

”کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ ٹھیس پہنچنے میں میرا تصور ہے؟ کیا آپ جانتی ہیں کہ جس وقت میرے رشتے کی بات چلائی گئی اس وقت میری عمر کیا تھی؟“

”مجھے سب پتا ہے بیٹی! اور میں مانتی ہوں کہ اس معاملے میں ان سے ذرا جلدی ہوئی ہے مگر اب تو ان باتوں کو باعہرہ گزر چکا ہے۔“

”لبا عہرہ گزر چکا ہے پر مجھے معلوم ہے کہ ابا جان کے دل سے نکلا کچھ نہیں۔ وہ آج بھی یہی کہیں گے کہ میں مولیٰ کی چادر اوڑھ کر اور گھونٹ نکال کر گھر میں بیٹھ جاؤں اور چپ چاپ اسی جگہ شادی کر لوں جہاں وہ کہتے تھے۔“

”اس جگہ شادی دالی بات تو میں بھی نہیں مانتی۔“

یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ آیا اور گزر گیا۔ ابا جان چند افراد کے ساتھ گئے اور زلفت نامی اس خاتون کے ساتھ نکاح کر کے اسے گھر لے آئے۔ پچھوہا جہ کے علاوہ تاپا ابا بھی بوجھل دل کے ساتھ اس مختصر تقریب میں شریک ہوئے۔ ماموؤں نے شرکت نہیں کی۔ نور بھی اس وقت شریک ہوئی جب اس کی نئی امی گھر آ چکی تھیں۔ چھریے جسم کی دراز قد نشیمری خاتون تھیں۔ عمر 35 اور 40 کے درمیان رہی ہوگی۔ اپنی اس ”نئی والدہ“ سے مل کر نور کو اتنا برائیں لگا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ بیگم زلفت نے اسے پیار کیا، اپنے پاس بٹھایا اور محبت آمیز باتیں کرتی رہیں۔ پھر بھی کوشش کے باوجود نور زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھ سکی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مرحومہ والدہ جنہوں نے ساری عمر ابا جان کی جھڑکیاں سکی ہیں، کہیں آس پاس ہی موجود ہیں اور غم آغموں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

دو ڈھائی سال بعد یہ پہلا موقع تھا جب ابا جان نے اس کے سر پر پیار دیا اور نازل انداز میں چند باتیں بھی کہیں مگر نور جانتی تھی کہ یہ عارضی تبدیلی ہے۔ ابا جان کے اندر جو ناراضی جڑ پکڑ چکی ہے وہ اپنی جگہ قائم ہے۔ ایک عجیب سی دیوار حائل تھی باپ اور بیٹی کے درمیان۔

”میں مانتی ہوں ابا جان آپ اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔۔۔۔۔ شاید میں ہی غلط ہوں۔۔۔۔۔ مگر یہ کیسی جنگ میرے اندر ہوتی رہتی ہے۔ مجھے جو بھی ملاحتیں ملی ہیں وہ بھی تو اللہ کی طرف سے جتن ہے میرے لیے۔ میں نے تو مجھی کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہا۔ ہمیشہ اللہ کی نیک بندی اور آپ کی فرماں برداری میں ہی گزارنا چاہا۔۔۔۔۔ معلوم نہیں قدرت کو مجھ سے کیا کام لینا ہے۔۔۔۔۔ میرے پیارے ابا جان۔۔۔۔۔ بس مجھے زندگی میں اس ایک لمحے کا انتظار ہے۔ جب میں آپ کے سامنے سرخ رو ہو جاؤں گی۔“

اس دن گھر آ کر نور دیر تک روئی۔ اس کا رونا آنسوؤں کی صورت میں نہیں ہوتا تھا، بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہتے تھے۔ دل میں ایک دھواں سا بھر جاتا تھا اور یہ دھواں آنکھوں تک آ کر شدیدلن میں بدلتا رہتا تھا۔

وہ نکلے میں چہرہ گھسا کر جیسے خیالوں ہی خیالوں میں یہ زبان خاموشی اپنے ابا جان سے مخاطب ہوتی۔۔۔۔۔ ابو! میں تیسری تھی نا۔۔۔۔۔ اُن جاہلی تھی نا۔۔۔۔۔ آپ نے ہمیشہ مجھے خود سے کچھ فاصلے پر رکھا لیکن میں تو آپ کے بہت قریب تھی۔ ہر وقت آپ کی انہوں میں سائے رہنا چاہتی تھی۔ میں نے ہمیشہ آپ کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنا چاہی۔ بچپن سے

امریکیوں، یہودیوں کے ایجنڈے نہیں چلیں گے۔

تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ریلی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئی اور اس کے عقب میں رستہ کی ہوئی ٹریفک دکھائی دینے لگی۔ مہرین نے کہا۔ ”بھئی! یہ تو وہی ہے خدیجہ کا بھائی..... اس وقت تو پورا پورا ایڈرلگ رہا تھا۔“

”چلو پورا پورا ایڈر ہو یا آدھا آدھا، ہمیں کیا۔“ وہ سوپ کا کچھ لیتے ہوئے بولی۔

”ہمیں ہے نا بھئی۔ ریلی تو گزرنی مگر ٹریفک پھنس گئی۔ ابھی ہم نکلیں گے تو کچھ نہ کچھ ٹھکنا پڑے گا۔“

”بھگت لیں گے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر چند لمحوں وقف کر کے کہا۔ ”خدیجہ سے تو بات نہیں ہوئی دوبارہ؟“

”تم نے ہی روک دیا تھا، میرا تو دل چاہ رہا تھا۔“

”دراصل دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ ایک عجیب سی انیسیت محسوس ہوتی ہے ان سے لیکن وہ کیا کہتی ہیں کہ گلاب کے ساتھ کتنا بھی ہو تو گلاب کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“

”لیکن کتنا بھی تو گلاب کا بھائی ہی ہے نا۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنا کتنا بھی نہ ہو۔ جب تک بندے کو پرکھا نہ جائے اس کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

اب دیکھو..... وہ جو اسپورٹس صحافی فرہاد تھا شکل سے کیسا لگتا تھا، مگر کتنا کیا؟“

اس موضوع نے نور کو بد مزہ کر دیا۔ اس نے براسمانہ بنایا۔

مہرین بولی۔ ”لگتا ہے کہ فرہاد کے ذکر نے تمہارا منہ گڑوا کر دیا ہے۔ کوئی تضحیٰ چیز منگواتے ہیں۔“ اس نے دیر کر بولا۔

نور نے کرسی کی پشت سے فیک لگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں ٹریفک رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ جن دو کم سن لڑکیوں نے نور سے آؤگراف لیے تھے، وہ دو دریا کی کرسی پر بیٹھی اشتیاق سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کے لیے بڑی اہم تھی۔ شاید ایک اسٹار کی حیثیت رکھتی ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اسٹار کن کالے بادلوں کی زد میں ہے۔ پتا نہیں کیوں اب کبھی بھی باپوسی بھی اس پر طاری ہونے لگتی تھی۔ محنت اور محنت محنت مگر وہ صلہ نہیں تھا جس کی وہ آرزو مند تھی۔ پھر تیا بابا کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ نور کی ایک ہار کے موقع پر انہوں نے کہا تھا..... خدا کے گھر میں دیر ہوئی ہے اندھیر نہیں۔

اس شام جب وہ بازار سے گھر پہنچیں تو بی بی آئن تھا۔ ان دنوں بی بی وی کے علاوہ بس دو چار چمٹلر ہی اور ہوتے تھے جن میں سی این این اور این بی این وغیرہ کے

لیکن نور! جہاں تک مکمل والی بات ہے..... شاید اب تم بھی محسوس کرتی ہو گی کہ..... یہ شراب کافی لبا ہو گیا ہے۔ تم نے ماشاء اللہ کافی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اس معاملے پر پھر غور کرو۔“

نور نے ذرا بے رخی سے کہا۔ ”چھوٹی امی! اگر آپ مجھے یہی سب کچھ سمجھانے آئی ہیں تو پلیز..... نہ سمجھائیں۔ آخر ایک دن تو مجھے کھیل چھوڑنا ہی ہے لیکن کب چھوڑوں گی، اس کا فیصلہ میں نے خود کرنا ہے۔“

”اچھا..... تم اپنے اندازے کے مطابق کوئی ٹائم بتا دو کہ کب تک یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا؟ میں تمہارے ابو کو مطمئن کر لوں گی۔“

”اگر انہوں نے اس شرط پر مطمئن ہونا ہے تو بے شک نہ ہوں۔“ وہ بھلا کر بولی۔ شاید اٹھ ہی کھڑی ہوئی مگر چھوٹی امی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پچکارنے لگیں پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور سر جو، بولیں۔

”میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ تمہیں بھی اسی طرح تمہارے ابا جان سے باتیں کرتے دیکھوں جس طرح بتول اور بسہہ کرتی ہیں۔ اللہ وہ دن جلدی لائے۔“

وہ اس سے بڑی بہن بتول اور اس کے شوہر کی باتیں کرنے لگیں اور بتانے لگیں کہ کس طرح وہ بتول کے شوہر غیاث کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے نور کی دادی کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ دراخت مزاج تو ہیں لیکن دل کی بہت اچھی ہیں اور وہ بھی نور کو پھر سے اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ نور اور مہرین بازار گئیں۔ کچھ شاپنگ کرنا تھی، سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ شاہراہ قائد اعظم کے ایک ریستوران میں جا کر سوپ پینے لگیں۔ دونو عمر لڑکیوں نے نور کو پہچان لیا اور اس سے ایٹھ لاکھوں کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران میں نور کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ پرچوش افراہ کی ایک ریلی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور کتے لہرا رہے تھے۔ نور دیکھ کر چونگی، ریلی میں سب سے آگے دو افریقین نظر آ رہا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی دھول میں اٹی ہوئی تھی اور بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

وہ بلند بھاری آواز میں پکارا۔ ”پاکستان کا مطلب کیا؟“

نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ غالباً اسی تنظیم اصلاح معاشرے کی ریلی تھی۔ کتے اور بھینز پرچہ اس قسم کے تھے..... فحاشی دعویٰ یا نا منظور۔

ایک بار پھر بتایا ابا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے..... اللہ کے گھر میں دیرے اندر نہیں۔
ہاں یہاں بھی شاید دیر تو ہوتی تھی مگر مکافات کا قانون حرکت میں آیا تھا۔ اس نے نیم دراز ہو کر تکیے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگی..... کیا اس کی مسلسل محنت، جانفشانی اور غیر مشروط کٹ منٹ کے حوالے سے بھی کوئی قانون قدرت حرکت میں آئے گا بلے اور اس کے تایا ابا کو کوئی صلہ ملے گا؟

اگلے روز تایا ابا سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ انہوں نے کہیں اخبار میں یہ خبر دیکھی تھی۔ بولے۔ ”نورا! تمہیں پتا چلا ہے اس فرہاد کے بارے میں؟“
نور نے اثبات میں جواب دیا اور ٹی وی کی نیوز کا ذکر کیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”بندے کی اصلیت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اس کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لڑکے نے کلینک کے سلسلے میں مجھے بہت دھوکا دیا۔ پچیس تیس ہزار روپے بھی لے گیا مگر زیادہ تکلیف اس ذہنی پریشانی کی ہے جو اس کی وجہ سے ہوئی۔“

نور اب تایا ابا کو کیا بتاتی کہ وہ جس دھوکے کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس کا عشرِ شیر بھی نہیں جو اس شخص نے خود اسے دیا تھا، اپنے مطلب کے لیے اسے کھلوٹا بنا ڈالا تھا۔ تایا ابا نے اسے سوچ میں گم کر دیکھ کر موضوع بدلا۔ ”تمہیں پتا ہے، امنا لے کا میلا آنے والا ہے؟“
”کب؟“ وہ بے ساختہ بولی۔

انہوں نے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور حساب لگا کر بولے۔ ”بس تین ہفتے رہ گئے ہیں تقریباً۔ میں تو کہتا ہوں پروگرام بنالو۔ پچھلی دفعہ بھی اچھا وقت گزرا تھا تم لوگوں کا۔“
امنا لے کا ذکر ہی ایسا تھا کہ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادوں کو ہاتھ کر دل و دماغ کے باڑے میں لے آتا تھا۔ یادوں کے اس احاطے میں سربا کی سنہری دھوپ ہوتی تھی، ڈھول کی تھاپ، گھوڑوں کے رقص، جمولے، نمائش، پکوانوں کی مہک، کشتیاں، کڈیاں، رنگین آئینل، دلنشین گیت..... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

نورا تازہ اور پشمرم کی عجیب دور سے گزر رہی تھی (اس کی نوکری کی بنیاد اچھٹیلٹس پرچی اور کسی وقت یہ نوکری بھی خطرے میں محسوس ہوتی تھی)۔ امنا لے کے نام پر اس کا دل دھڑکا اور سینے میں امگ سی جاگی۔ اس نے کہا۔ ”تایا ابا! دل تو چاہتا ہے لیکن.....“
”لیکن لیکن کچھ نہیں۔ بس تم پروگرام بناؤ، سب حوصلہ شکن شکست سے دو چار کیا تھا۔“

علاوہ ایک اسپورٹ چیمپل بھی تھا۔ وہاں ایک نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کا سرکہہ رہا تھا..... ”مسٹر فرہاد کا تعلق اسپورٹس نیوز کے شعبے سے ہے۔ وہ ایک بڑے میگزین کے اسپورٹس انچارج ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔“

اس کے ساتھ ہی ایک ویڈیو کلپ چلا گیا جس میں ایک اسٹریچر کو تیزی سے کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل کیا جا رہا تھا۔ نیم بے ہوش فرہاد صاف پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے سر، دونوں بازوؤں اور ایک پاؤں پر پٹیاں تھیں۔ نیوز کا سرکہہ رہا تھا۔ ”میاں بیوی کے درمیان خلع کے کیس کی خبر دو دن پہلے آئی تھی۔ ایقتلیٹ شاہینہ کے والد کی طرف سے فرہاد پر کیس کیے جانے کا ذکر بھی آیا تھا لیکن آج جو واقعہ ہوا وہ زیادہ غیر متوقع ہے۔ شاہینہ کے بھائیوں کی طرف سے فرہاد کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ گاڑی پر سوار ہیل روڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی روک کر اسے اور اس کے وکیل دوست کو باہر کھینٹا گیا اور فرہاد کو سرک پر لٹا کر بے دریغ مارا گیا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے ہیں۔ اس سے گاڑی بھی چھین لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہنڈا گاڑی بھی اسے سسرال کی طرف سے ہی ملی ہوئی تھی اور بیوی کے نام رجسٹرڈ تھی۔“

نور اور میرین حیرت میں گم یہ سب کچھ سنتی رہیں۔ آج ہی ان کی گفتگو میں فرہاد کا ذکر آیا تھا اور آج ہی یہ خبر سننے میں آگئی تھی۔ رات تک اس بارے میں مزید تفصیل کا پتا بھی مختلف ذریعوں سے چلا۔ معلوم ہوا کہ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی شاہینہ اور فرہاد میں اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ فرہاد کی نگاہ سراسر شاہینہ کے والد کے روپے پیسے پر تھی۔ اس کے علاوہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار کی تنبیہ اور وارننگ کے باوجود اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بالآخر خسر تہجہ خلع کے مطالبے، دیگر کیسز اور فرہاد کی شدید درگت کی صورت میں لٹکا۔

کمرے میں بند نور دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے کافی عرصے بعد بالآخر اس کے نہایت شدید اور توہین آمیز دکھ کا مداوا ہو گیا ہے۔ فرہاد نے جس طرح اسے اپنے میل کا حصہ بنایا اور مطلب نکلنے کے بعد منہ پھیرا، وہ سب نور کے لیے ایک کربناک تجربہ تھا اور یہی کربناک تھی جس نے اسے اپنے کیریئر کے نہایت اہم دور میں ایک حوصلہ شکن شکست سے دو چار کیا تھا۔

سوچتا ہے..... تمہارے حوالے سے کسی اچھے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

”تو ان کے علاج کی بات ہی تو کر رہا ہوں میں.....
دیکھنا میلے پر جانے کے لیے وہ کیسے بستر سے اٹھتی ہیں اور
تیاری کرتی ہیں۔“

نور نے ایک آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ خدیجہ کی باتوں کے حوالے سے وہ بھی کبھی بے چین سی ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی واقعی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی آس لگائے بیٹھا ہے، اس کی نسبت سے کسی انہونی کی راہ دکھ رہا ہے۔

وہ کیوں کر ہاتھ اٹایا؟ کیوں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا؟ نور کو اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ جیسے اندر سے جھنجھلائی گئی۔ وہ کیوں یہ بات سمجھ نہیں جاتا کہ نور کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور مختلف سوچوں کے انسان ہیں۔ وہ نہیں مل سکتے..... اور انہیں ملنا بھی نہیں چاہیے۔

پتا نہیں کیوں نور کا دل چاہا کہ وہ ایک بار اس سے بات کرے..... ٹیلی فون پر یہی سہی مگر اس سے رابطہ کرے۔ اسے سمجھائے کہ وہ کسی انہونی کی آس نہ لگائے۔ جو وہ سوچ رہا ہے سہی نہیں ہوگا۔ اس کے والدین اور اس کی بہن جلد از جلد اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ان کا دل نہ دکھائے۔

یہ عصر کا وقت تھا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسٹالے کے میلے پر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسے بھی اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنے اہنی کا لونگی کی مارکیٹ تک جانا تھا۔ اس نے گرم شال لی۔ اونٹنی پہنی اور شولڈر بیگ لے کر قریبی مارکیٹ کو چل پڑی۔ اس کے پاس ذوالقرنین کی دکان کا نمبر موجود تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس وقت وہ دکان پر ہی ہوگا۔ وہ ایک بی بی سی او باکس کے اندر چلی گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ٹھوس بے پلک لہجے میں وہ سب کچھ کہہ دے گی جو اس نے سوچ رکھا ہے اور بات کو مزید طول دیے بغیر فون بند کر دے گی۔

اس نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف کھنی بجنا شروع ہوئی پھر فون اٹھایا گیا۔ اردو بازار کا شور کانوں میں گونجا، تب ذوالقرنین کی بھاری مگر ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔ ”ہیلو.....ہیلو.....کون؟“

پتا نہیں یہ کیسے لمحے تھے۔ نور کو شش کے باوجود بول نہیں سکی۔ وہ جو نہایت روکھے چھیکے لہجے میں ذواقرنین کی مکمل حوصلہ شکنی کا ارادہ رکھتی تھی، ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد آواز دو بارہ ابھری۔

پتا نہیں کیوں نومبر دسمبر کے مہینے ہمیشہ سے نور کے لیے کچھ اداسی لے کر آتے تھے۔ سردی بڑھ جاتی تھی۔ شا میں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ لوگ دیر تک کمرؤں میں بند رہتے تھے، کہرا مناظر کو ڈھانپتا تھا اور درخت بے لباس نظر آتے تھے۔ آج کل بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ کئی دن سے آسمان پر بن بارش کے بادل تھے۔ سورج شعل نہیں دکھارہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آج اسے پریکٹس کے لیے جانا تھا مگر دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ مکمل اوڑھ کر کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ادا کیا۔ باہر باغیچے میں حسین - بودے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کیا ریوں میں گیندے اور چائنا روز کے پھول بھی جیسے سردی سے سڑے سٹے تھے۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جو دو دن پہلے اس نے اور مہر کن نے شاہراہ قائد اعظم کے رستوران میں بیٹھ دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا جلوس جو نعرے لگاتا اور کتبہ لہراتا کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس میں سے سب آگے وہ تھا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تھمرا ہوا تھا۔ وہ بار بار اپنا مکافضا میں لہراتا اور نعرہ بلند کرتا تھا..... پاکستان کا مطلب کیا؟ آواز میں ٹھہراؤ تھا اور وہ سچائی تھی جو اپنے موقف کے حوالے سے اس کے اندر موجو تھی۔ اپنی تمام تر سخت گیری کے باوجود وہ کھرا شخص دکھائی دیتا تھا..... اور اس کی بہن خدیجہ نے کہا تھا کہ وہ اندر سے اخروٹ کے مغز کی طرح نرم ہے۔ یہ ایک بہن کے تاثرات ایک بھائی کے بارے میں تھے اور ابھی تا یا ابا نے کہا تھا..... حقیقت کا پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب کسی انسان سے مستقل طور پر واسطہ پڑتا ہے۔

خدیجہ کی کہی ہوئی باتیں نور کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلی اور آخری بار کہے گی اور واقعی تب سے اب تک اس نے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی مگر اتفاق یہ ہوا تھا کہ اب تک ان کی بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ خدیجہ نے کہا تھا..... نور، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ کوئی عارضی یا سطحی جذبہ نہیں ہے۔ میں اس کی رنگ رنگ سے واقف ہوں۔ وہ دن رات تمہیں

ایک تھی۔ باقی واللہ علم بالصواب۔“ تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ ”خدیجہ، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ایک بار اور اس سے مل لو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔“

”نہیں ذوالقرنین، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس حوالے سے پہلی اور آخری بار اس سے بات کر رہی ہوں۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ ویسے بھی ذوالقرنین! سب سے پہلے ہمیں کہتے ہیں کہ عجب کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے، بغیر شرط کے۔۔۔۔۔ بغیر کسی بندھن کے۔۔۔۔۔ اگر وہ واقعی محبت ہوگی تو کسی نہ کسی طور آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ ہم نے اس سے جو بھی کہنا ہے کہہ دیا ہے۔ اب انگریزی کے محاورے کے مطابق لیکس اس کی کورٹ میں ہے۔“

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر فون پر اس نوع کی مزید گفتگو مناسب نہیں تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے خدیجہ نے کہا۔ ”آج کیا تاریخ ہے؟“ ذوالقرنین نے بتایا کہ گیارہ ہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”کچھ یاد آیا تمہیں؟ آٹھ دن پس بعد امنالے کا میلہ آنے والا ہے۔ پچھلے سال نور کے اباجی نے تمہیں میلہ دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ میں تو کہتی ہوں اس بار ہو آؤ وہاں سے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اچھی بات ہو جائے۔“

”میرے خیال میں تو یہ بے کاری کا تہیں ہیں۔۔۔۔۔“ شاید وہ اور بھی کچھ کہتا مگر لائن میں شور اور کھڑکڑاہٹ شروع ہو گئی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ دل میں ایک بے قراری سی تھی۔ اگر وہ واقعی نور یا مہرین کی کال تھی تو ہو سکتا تھا کہ دوبارہ کال آتی کل یا پرسوں۔۔۔۔۔ یا ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد۔ اس نے سیاہ رنگ کے فون سیٹ کا ریسیور اچھی طرح کرڈیل پر جمایا اور جیسے منتظر لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کیوں اسے بھول نہیں پاتا؟ کیوں ہر گھڑی اس کا انتظار رہتا ہے؟ وہ کوئی عاشق مزاج کا لجیٹ لڑکا نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ اس کی ایک پہچان تھی۔ اس کے گھرانے کی پہچان تھی۔ لوگ ان کی نجات کی مثالیں دیتے تھے اور جو کچھ ہوا اس میں ذوالقرنین کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ نور اس کی سوچوں اور نظروں میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور وہ بھی صرف اس لیے آئی تھی کہ اس کے والدین نے اسے ذوالقرنین کے لیے پسند کیا تھا۔ نور اس کو دکھائی گئی تھی۔ اس کی باتیں اسے بتاتی گئی تھیں۔

ذوالقرنین کے دل میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی اور جب بھی کچھ لگا ہوں والے خاموش طبع ذوالقرنین کے دل میں اس کی جگہ بن گئی تھی تو سب الٹ پلٹ ہو گیا تھا اور اب وہ بے پناہ کوشش کے باوجود اس کی سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ بے شک وہ اس کے مزاج کی نہیں تھی، بے شک اس کی مصروفیات ذوالقرنین کو پسند نہیں تھیں لیکن وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت ایسی ہی بے دلیل اور منہ زور ہوتی ہے۔ وہ اپنے راستے اور اپنے اصول ضابطے خود مقرر کرتی ہے۔

ایک ماہ کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ ”بیٹا ذوالقرنین! میرا امام زین العابدین ہوگی آپ کے پاس؟“ یہ ایک قریبی مدرسے کے استاد تھے اور ذوالقرنین کے پرانے کسٹر۔

”جی سر! ایک کالی موجود ہے۔ اوپر پڑی ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ ذوالقرنین نے کہا اور سیرنگی چڑھ کر دکان کے بالائی حصے کی طرف گیا۔ ابھی وہ پانچ سیرنگیاں ہی چڑھا رہا تھا کہ کون کی کھنٹی بھرنے لگی۔ وہ بڑا بائبل نوجوان تھا مگر کھنٹی کا بجنا اور نور کا خیال ذہن میں آنا اتنا ہی ہیجان خیز تھا کہ وہ جلدی سے پلٹا۔ شلوار کے پانچے میں اس کا پاؤں الجھا اور وہ چار پانچ زینوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے سر پر ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی اور ناک سے خون رسنے لگا۔ کہنوں پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے قریبی کلینک میں پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور سلی دی۔ اس کی ایک آنکھ خون کی طرح سرخ ہوئی تھی۔ پیشانی پر پٹی بندھوا کر اور انجکشن وغیرہ لگوا کر وہ دوبارہ دکان پر آ گیا۔

ارڈر کے دکاندار حال احوال پوچھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ایک نے کہا۔ ”یار! تم تو ہمارے بازار کے سب سے رکھ رکھاؤ والے دکاندار ہو، دکان میں دو سیکڑے موجود تھے پھر خود کیوں سیرنگی چڑھ گئے اور اگر چڑھ ہی گئے تھے تو پھر جھلاٹ کیوں لگا دی؟“

دوسرے نے کہا۔ ”کوئی ضروری فون آ گیا تھا۔ جناب پلے تو کر گئے۔“

ایک بے تکلف ہمسائے نے کہا۔ ”کوئی اور ہوتا تو اس بات کا بھی بیخود جتنا کہ ایسا کون سا ضروری فون تھا مگر بھئی، تم پر شک کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی میاں مٹھو پر شک کیا جائے کہ وہ رات کو سرخ کی طرح اذان دیتا ہے۔“

دوست ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے اور وہ اپنے اندر ہی اندر بے پناہ غل ہو رہا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں بتایا گیا

دوسری پارٹی نہیں مانی۔ وہ لڑکی بہت چھوٹی تھی مشکل سے چودہ پندرہ سال کی۔“
”تو پھر؟“

”بھڑکھڑ پارٹی نے آخر کی کہ ہم لڑکے کی چھوٹی چھوٹی چاندی کا رشتہ دے دیتے ہیں۔ چاندی بھی اچھی شکل کی قطعی ٹکڑی کو پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی، بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ اس بار مدی پارٹی نہیں مانی۔ انہوں نے کہا ہمیں کنواری کے بدلے کنواری چاہیے۔ اندازہ لگاؤ ان لوگوں کی جاہلیت کا۔ مرد عورت کا رشتہ کتنا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ اسے بدلے کی آگ سے گھٹاؤنا اور مکروہ بنا دیتے ہیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“ نور نے پوچھا۔

”دبھی سووے بازی۔ معتبر لوگوں کے بیچ میں پڑنے سے مدی پارٹی چاندی کے رشتے پر مان تو گئی مگر ساتھ میں دو بھینسوں اور نقد رقم کی صورت میں بہت سا جرمنا بھی وصول کیا۔ اب یہ بے چاری اپنے سے دو گنا عمر کے شوہر کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ وہ پکا جواری ہے، بہت کچھ ہار چکا ہے۔ اب گھر میں پڑا بیٹھتا ہے۔ یہ بے چاری گھروں میں کام کرتی ہے۔“

”یعنی اپنے بیٹے کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے؟“

”بالکل۔ ایسی کہانیاں ہمارے دیہاتوں اور ٹوٹنوں میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں نور..... کنواری کے بدلے کنواری۔ بیاہتا کے بدلے بیاہتا۔ یا ایک کنواری کے بدلے دو بیاہتا..... سن کر اور کچھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم پتھر کے زمانے میں بیٹے ہیں اور ہم پر جنگل کے قانون لاگو ہوتے ہیں۔“

”ایسا قانون جس میں مردوں کے کیے ہوئے کی سزائیں بھی صرف عورتوں کو ہی ملتی ہیں۔“ نور نے تائیدی انداز میں کہا۔

”بالکل..... اب یہی چاندی والا معاملہ ہی دیکھو۔ اس کا کیا قصور تھا؟ یہ بیٹی بھائی اس گھر سے میں آگئی۔ لڑکے کی بچپن کی حیثیت سے اسے قربانی دینا پڑی۔ اچھی صورت کی تھی، جوان تھی، بھگائے جانے والی لڑکی کا کوئی جوان بھائی یا چچا وغیرہ ہوتا تو اس کے لیے باندھ دی جاتی۔ کوئی ایسا نہیں تھا اس لیے لڑکی کے کھوسٹ باپ نے یہ جرمانہ وصول کیا اور اسے اپنے گھر ڈال لیا۔“

نور آہ بھر کر رہ گئی۔

اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی تھنٹی بجنے لگی۔

تھا۔ اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو اس نے ایک پڑوسی دکاندار کو ساتھ لیا اور اپنی ایف ایکس خود ہی ڈرائیو کر کے گھر چلا گیا۔

..... اگلے روز رات کو اسے خاصا تیز بخار ہو گیا۔ تسلی کے لیے سی ٹی اسکین وغیرہ بھی کرایا گیا۔ اوکے رپورٹ ملی۔ ڈاکٹر نے کہا دو تین دن تک بخار چلے گا..... اگلے روز بخار نسبتاً کم تھا مگر غنودگی بدستور تھی۔ رات کو ڈو اٹرین کے کمرے میں خدیجہ بیمار داری کے لیے موجود تھی۔ رات گئے بخار کی مدد ہوئی میں ڈو اٹرین نے دو تین بار کچھ کھا۔ خدیجہ نے اٹھ کر سنا۔ اس کا بھائی بہت مدھم آواز میں دلفگار لہجے میں ”نور“ کا نام لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس نے نور سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب بھی اس سے اپنے بھائی کے حوالے سے بات نہیں کرے گی اور وعدہ ایفا کرنا خدیجہ کی خوشی لیکن وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ مہرین کو فون کرنی اور اسے ڈو اٹرین کی چوٹ کے بارے میں بتاتی۔ وہ جانتی تھی کہ مہرین رات کو در تک جاگتی ہے۔ اس کو فون کرنے کے لیے وہ فون سیٹ کے پاس آن بیٹھی۔ دل و داغ میں کشمکش سی تھی۔ کافی دیر تک فون کے پاس بیٹھنے اور سوچنے کے بعد وہ ٹی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ کچھ باتوں کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

نور کمرے میں گم مسمی بیٹھی تھی۔ نئی ملازمہ بھی ابھی کمرے میں صفائی کر کے گئی تھی۔ چاندی نام تھا۔ بہ مشکل پچیس پچیس سال کی رہی ہوگی۔ قبول صورت لیکن بڑی بچی بھی اور ڈری ڈری سی۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا، تھوڑا سا لکڑاتی بھی تھی۔ کل تائی ائی نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر پچیس سال سے زیادہ عمر کا ہے اور اس کو بہت مارتا بیٹتا ہے۔

تائی ائی کمرے میں آئیں تو نور نے پوچھا کہ یہ کیوں اس کی مار کھاتی ہے؟

تائی بولیں۔ ”دور دراز علاقے کے رہنے والے ہیں۔ راجن پور کے آس پاس۔ اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔“

”وہ کیوں؟“

”کوئی لمبا چکر تھا۔ اس کے بیٹے نے کسی لڑکی کو بھگا یا تھا۔ لڑکی والوں نے پچایت بلائی۔ ایسی چغلیوں میں بڑے بڑے منکوس فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ملزم لڑکے کی بہن کی شادی لڑکی کے باپ سے کروایا جائے لیکن

نور نے دیکھا، یہ فون انہی چھوٹی لڑکیوں کی طرف سے تھا جن سے ایک دن رستوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ انہوں نے ایجنسی کے حوالے سے ہی بات کرنا تھی۔ آج کل نور کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موضوع پر بات کرے یا اس بارے میں سوچے۔

اس نے فون نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد پھر تیل ہونے لگی۔ تیسری بار تیل ہوئی تو نور نے کال ریسیو کر لی۔ بچیوں کی والدہ بول رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو دباتے ہوئے نور نے خوش خلقی سے بات کی۔

بچیوں کی والدہ صبا بتا رہی تھی۔ ”نور! تم میری بچیوں کی آئیڈیل ہو۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی لے رہی ہیں رنگ میں۔ اس حوالے سے میں تم سے دو منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں ایک بڑی بہن کی طرح تم سے آزادانہ بات کر سکتی ہوں۔ تمہاری طرح ہم بھی ایک دینی رجحان والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے نور کہ بچیاں پُر وقا طریقے سے اور اپنے حجاب کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی محنت مند تقریحات میں حصہ لے سکیں؟“

”یہ تو بڑا لمبا موضوع ہے صبا تم صاحبہ لیکن جو کچھ میری ادنیٰ سمجھ میں آیا تھا، وہ میں نے ایک اخباری انٹرویو میں بھی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ آپ.....“

”ہاں۔ وہ انٹرویو میں نے بھی پڑھا تھا۔“ صبا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تمہاری حکم باتیں ابھی تک میرے ذہن میں ہیں۔ اس میں تم نے ایک لباس کا آئیڈیا بھی پیش کیا تھا جو لڑکیاں اور خواتین رنگ کے وقت پہن سکتی ہیں۔ ظاہر ہے نور، خواتین کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جنہیں کسی بھی طرح نمایاں نہیں ہونا چاہیے اور مردوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔“

”جی ہاں۔ اس لباس میں، میں نے یہی چیز مد نظر رکھی تھی۔ بہت سی لڑکیوں نے اسے اپنایا ہے اور مفید پایا ہے۔“

”نیکر کے بجائے غالباً ٹراؤزر قسم کی چیز تھی۔“

صبا نے کہا۔

”ہاں لیکن زیادہ کھلا ٹراؤزر نہیں اور کپڑا بھی ہلکا پھلکا لچکدار اور ملائم ہو۔ جو سامنے سے ہوا کی مزاحمت نہ کرے۔ لباس کا اپر کولہوں سے نیچے تک جاتا ہے اور بھاگتے ہوئے بھی آپ کے جسم کے ساتھ رہتا ہے، سامنے کی طرف دو ایک جگہ ہلکی پھلکی پیکنگ ہے جو باڈی کی شپ کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ آپ کہیں تو میں آپ کو

انٹرویو کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا دوں گی۔ تفصیل سے دیکھ لیجئے گا.....“ اب وہ پچھا چڑھانے کے موڈ میں تھی۔

بہتر ہوا کہ دوسری طرف کوئی پھر رونے چلانے لگا اور صبا نے کہا۔ ”اچھا نور! چھوٹا بیٹا رو رہا ہے، پھر بات کریں گے۔“

نور کو یہ ساری گفتگو بوجھ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا، عجیب کیفیت تھی اس کی۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے، سہ پہر اور شام کے درمیان ایک کمزوری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

نور کمرے میں بیٹھی تھی۔ مہرین لپکتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ”مبارک ہو بھئی۔ کوئی منٹاں وغیرہ ہونی چاہیے۔“ نور کا دل دھوکا اٹھا۔ اسے لگا جیسے شاید اس کے حوالے سے کوئی اچھی خبر ہے۔ واپڈ ادائی نوکری خطرے میں دیکھ کر اس نے دو تین اور جگہوں پر ٹرائل دے رکھے تھے۔ اس نے سمجھا شاید کہیں سے کوئی لیئر آیا ہے مگر مہرین کی مبارک دوسرے حوالے سے تھی، اس نے کہا۔ ”آل پنچاب تقریری مقابلے میں گولڈ میڈل جیتا ہے بسمہ نے..... تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہوئی؟“

بسمہ کی کامیابی کا سن کر نور کا دل ہلچل گیا، مہرین کہہ رہی تھی۔ ”مجھے تو دوپہر ایک بجے ہی پتا چل گیا تھا، میں نے سمجھا تم تک بھی خبر پہنچ چکی ہوگی۔“

خوشی کے اس موقع پر نور کو اپنے سینے میں کچوکا سا محسوس ہوا۔ شام ہونے کو آئی تھی اور وہ ابھی تک اپنی بہتر کی اتنی اہم کامیابی سے بے خبر تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی، ابا جان نے جو پابندیاں لگا رکھی تھیں، ان کے سبب دونوں گھروں میں اطلاعات کا تبادلہ کم ہی ہوتا تھا۔ ابا جان نے ابھی تک ٹیلی فون بھی نہیں لگوا یا تھا۔

ابھی نور اور مہرین باتیں ہی کر رہی تھیں کہ فون کی تھننی بج اٹھی۔ دوسری طرف بسمہ تھی، کسی پٹی سی او سے بات کر رہی تھی۔ ”نور! میں نے گولڈ میڈل جیت لیا۔“ وہ چھوٹے ہی بولی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

”ہاں..... مجھے ابھی پتا چلا ہے مہرین سے۔ بہت بہت مبارک ہو۔“ وہ بولی۔

نور کے لیجے میں اداسی کی جھلک کو بسمہ نے فوراً نوٹ کیا۔ بولی۔ ”دوبری سوری نور! میں تمہیں دوپہر کو ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی مگر ابا جان اور چھوٹی امی ساتھ تھیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔“

”اچھا یہ دہی ہیں جو ریس وغیرہ میں بھی حصہ لیتی ہیں۔“ انکل نے اپنی نیم سفید ریش میں اٹھیاں چلا کر ذرا چبھتے لہجے میں کہا۔

”ایک مرتبہ..... شاید اگر بھی گئی تھیں، تصویریں وغیرہ آئی تھیں۔“ ایک لڑکی کے ساختہ بول بھی۔

تایا ابا نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کو بس مگر تباہ کر دیا، کچھ اور یاد نہیں آیا۔ یہ صوبائی اور قومی سطح کے مقابلوں میں کئی بار دکنری اسٹینڈنگ پنچ چلی ہے۔ اس کا کمر ایوارڈز اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا ہے۔“

بسمہ کے ہونے والے دیور نے کہا۔ ”دراصل انکل! کرکٹ کا کھیل باقی سب کھیلوں کو کھانا گیا ہے، ان بے چارے ہاکی دالوں کو بھی دیکھ لیں۔ قومی ٹیم میں آکر ریٹائرڈ بھی ہو جاتے ہیں لیکن ہم انہیں شکلوں سے نہیں پہچانتے۔ کچھ کے تو نام بھی معلوم نہیں ہوتے اور جب ہاکی جیسے قومی کھیل کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا ہو جاتا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ تایا ابا نے دفاع کیا۔ ”بے شک کرکٹ بہت حادی ہو چکی ہے مگر دیگر کھیلوں کے پرستار بھی موجود ہیں۔“

”چلیں جی۔ آپ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں۔ دیے بھی لڑکی دالوں سے ہمارا بحث کرنا تو بتائی نہیں ہے۔“ بسمہ کے ہونے والے سر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

نور کو یہاں بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی وہ اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید اس کا اٹھنا ہی بہتر تھا کیونکہ ابا جان کو بھی اس کی موجودگی زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے نئے رشتے داروں سے اسے اور اس کے شوق کو چھپانا چاہتے ہیں۔

وہ دیر تک بسمہ کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں کھانا کھائے بغیر ہی واپس آیا ابا کے گھر آ گئی۔

تایا ابا کو ساری صورت حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بے شک بسمہ نے اہم کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کامیابی کو جس طرح سلیپر ہٹ کیا گیا تھا، اس میں ایک طرح کی مسابقت بھی شامل تھی۔ تایا ابا کو اس بات پر بھی رنج تھا کہ اشفاق نے اس گیت نو گیدر کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اور ان لوگوں کو بالکل آخر وقت میں اطلاع دی تھی۔ اس کا جواب دینے کا موقع بھی تایا ابا کو جلد ہی مل گیا۔

مہرین فریو تھراپی کے دوسرے سال میں تھی، اس نے فریو تھراپی میں نئے رجحانات اور اسپورٹس میں ان کے

”چلو کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو تمہارا فون نہیں آیا تو میں نے یہی سمجھا کہ فائل آج نہیں ہوگا۔“

”بس اب جلدی سے گھر آ جاؤ۔ اکٹھے“ سلیپر ہٹ“

کریں گے، آئی بول بھی آئی ہوئی ہے۔“

”ابا جان کا موڈ کیسا ہے؟“ نور نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ نہ بھی ہوتو چھوٹی ای ہیں تا مود ٹھیک کرنے کے لیے۔ وہ بھی کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ نور اور مہرین کو بلا لو۔“

اسی دوران میں رابطہ منقطع ہو گیا۔ بہر حال ضروری بات ہوئی تھی۔ نور کو امید تھی کہ ابھی پچھو یا چھوٹی ای میں سے کوئی آئے گا اور نور کو اپنے ساتھ لے جانے کا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رات گزر گئی، اٹھارہ بج رہی تھیں۔ اگلے روز شام کو تایا ابا گھر آئے تو انہوں نے نور کو بتایا۔ ”بھئی آج دعوت پر چلنا ہے۔“

”کہاں؟“ نور نے پوچھا۔

”تمہارے گھر اور کہاں؟ بسمہ کی کامیابی پر تمہارے ابا جان نے کافی بڑا فنکشن کر ڈالا ہے۔ پاس کے سارے رشتے دار آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے جہاں بسمہ کے رشتے کی بات ہوئی ہے، وہ لوگ بھی آئیں گے۔“

”ہمس تو کسی نے نہیں بتایا۔“ مہرین نے کہا۔

”چلو اب میں جو تیار ہا ہوں، تیار ہو جاؤ۔ نو بجے تک پہنچنا ہے۔“

نور کو سینے میں جیسن سی محسوس ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ ابا جان کی طرف سے بسمہ کی کامیابی پر خوشی کا یہ غیر معمولی اظہار اسے دکھانے کے لیے بھی ہے۔ جیسے وہ اسے بتانا چاہتے ہوں اور تایا ابا کو بھی بتانا چاہتے ہوں کہ یہ ہوتی ہے کامیابی اور یوں ملتا ہے والدین کی فرمانبرداری کا صلہ۔ یہ بات نہیں تھی کہ نور اپنی بہن کی کامیابی پر خوش نہیں تھی۔ اس کی کامیابی کا سن کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائی سے خوشی کے سوتے پھوٹے تھے مگر ابا جان اور دیگر اہل خانہ کے روپے نے اسے تھوڑا سا افسردہ کیا تھا۔

تقریب میں کافی مہمان تھے۔ بسمہ کے ہونے والے سرائی بھی آئے تھے۔ باقاعدہ کیک کاٹا گیا اور بسمہ کی کامیابی کو سلیپر ہٹ کیا گیا۔ بسمہ کے متوقع سسرالیوں سے ابھی تک نور کی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک انکل نے نور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بچی کون ہے؟“

دادی نے کہا۔ ”چھوٹی پوتی ہے میری۔ پچھلی دفعہ کہیں گئی ہوئی تھی، آپ سے نہیں ملی ہوگی۔“

اطلاق کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون نہ صرف پاکستان میں بلکہ انگلینڈ کے ایک اچھے میڈیکل میگزین میں بھی شائع ہوا اور اسے طبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ انگلش جریدے کی طرف سے مہرین کو معقول معاوضہ اور تقریبی... سرٹیفکیٹ بھی موصول ہوا۔ تاہم ٹیکل نے بھی نامعقول اشتقاق کو جواب دینے کے لیے فوراً ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ یہ تقریب بھی گھر میں ہوئی اور اس میں کافی مہمان شریک ہوئے۔ اپنی دونوں بہنوں کی کامیابی پر نور دل کی گہرائی سے خوش بھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ دونوں تقاریب اس کے لیے بوجھل ثابت ہوئیں۔ اس نے خود کو بالکل سائنڈ لائن پر محسوس کیا۔ اب بھی بھی اسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ شاید اس نے واقعی اپنے لیے ایک غلط لائن منتخب کر لی تھی۔ یہ اس کا میدان ہی نہیں تھا یا پھر میدان تو تھا لیکن وہ درست طور پر اس میں داخل نہیں ہوئی تھی، جب وہ داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک بدو عاصی اور یہ بد دعا کی اور نے نہیں اس کے والد نے دی تھی۔

دو تین روز بعد جب نور ایف اے ایس میں پریکٹس کے بعد گھر واپس آئی تو اسے ایک اور دھچکا لگا، ایک لیٹر اس کا منتظر تھا۔ اس ٹھکانی لیٹر میں بڑے خطاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے نور کو نوکری سے جواب دے دیا گیا تھا۔ اسے ہمت نہیں ہوئی کہ تاپا ابا کو بتاتی تاہم اس نے مہرین کو بتا دیا۔ ”یہ سراسر نا انصافی ہے۔“ مہرین نے تڑخ کر کہا۔ ”مجھے شک ہے کہ اس سلسلے میں بھی نشوونما کا گروپ کام کر رہا ہے۔“

”نہیں بھئی، ہمیں ہر معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔“

”تو پھر اور کیا وجہ ہو سکتی ہے نور! تم اب فٹ ہو، باقاعدگی سے رنگ بھی کر رہی ہو۔ میڈم فرحانہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری بھی روٹین رہے تو تم دو تین ماہ میں پہلے والی فارم حاصل کر سکتی ہو۔“

وہ بے دمی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی اور جو تے اتار کر دور پھینک دیے۔ بال سیٹھ ہوئے بولی۔ ”کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ میں کسی اور سے نہیں اپنی قسمت سے لڑ رہی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ مہرین جواب میں کچھ کہتی تاپا ابا کی آواز آئی۔ ”کہاں ہو لڑکیو! میں ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔“

نور نے جلدی سے کہا۔ ”تاپا ابا کو جواب کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔“

مہرین نے اثبات میں سر ہلایا۔

تاپا ابا کے ہاتھوں میں کچھ کپڑے تھے جو وہ درزی سے لے کر آئے تھے۔ یہ نور اور مہرین کے دو دوست تھے جو انہوں نے امنالے کے سیلے پر لے کر جانے تھے۔ ایک زرق برق سوٹ تائی امی کا بھی تھا۔ وہ ہمیشہ سے خوش لباس تھیں اور دادی اماں کے طعنے ان کی خوش لباسی پر بھی کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی (پڑھی لکھی ہونے کے باوجود) امنالے کے میلے کا شدت سے انتظار کرتی تھیں۔

تاپا ابا نے کہا۔ ”پر صبح سویرے روانگی ہے، جو کام نمٹانے ہیں آج نمٹالو۔ میں ذرا گھڑی کا تیل فلٹر بدلوانے جا رہا ہوں۔“

وہ چلے گئے نور اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مہرین نے بے تکلفی سے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”باجی جان! موڈ ٹھیک کر۔ بس اپنا زندگی میں اونچ نیچ چلتی رہتی ہے کبھی کے دن بڑے بھی کی راتیں۔ سب اچھا ہو جائے گا، آپ بس تیاری فرمائیں۔“

”پتا نہیں کیوں دل مجھ سا گیا ہے مہرین۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تیاری فرمائیں۔ چند دن کے لیے آپ وہاں تبدیل ہوگی، ماحول تبدیل ہوگا تو جناب کے دماغ میں جھاڑو پھرے گا اور کافی کچرا اچھر اکل جائے گا۔“

وہ دیر تک نور کو قائل کرتی رہی اور آخر کار حد تک کامیاب ہو گئی، یقیناً ابا جان بھی جارہے تھے اور یہ آس ہمیشہ نور کے دل میں موجود رہتی تھی کہ شاید ابا جان کے قریب رہنے سے کسی وقت کوئی ایسا موقع بھی مل جائے جو ان کی دیریاں ختم کر دے۔ اتنا اور بیگانگی کی وہ بلند دیوار گر جائے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

اگلے روز نور اور مہرین بھی دیگر لڑکیوں کے ساتھ

روانگی کی تیاری میں لگ گئیں۔ نور اور مہرین نہیں جانتی تھیں..... بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ ان کا یہ سفر

کتنا تھلکہ خیز ثابت ہونے والا ہے۔ کچھ حالات ”ماحول کے ہم رنگ سانپوں“ کی طرح ہوتے ہیں، مدتوں گھمات لگائے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ان کے اندر ہر ہینٹا رہتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا انتظار کرتے رہتے ہیں..... اور آخر

جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ سانپ موجود تھے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔

☆☆☆

امنالے کا میلا تو خوشی کا باعث ہوتا ہی تھا۔ اس کی

بہت سے شامیانے لگ چکے تھے۔ کچھ لگائے جا رہے تھے۔ جھولوں کی تنصیب ہو چکی تھی۔ سرکس اور تھیٹر کی تزئین و آرائش کا کام تیزی سے جاری تھا۔ مٹھائیوں، سموں اور کھلموں کی جانی بچانی خوشبودار ہی سے ان سب کے فنتوں میں گھسنے لگی۔ گاؤں میں بھی سب کو معلوم ہو گیا کہ مہرا گھر انے کے لوگ بھی پہنچ گئے ہیں۔ اہل دیہہ کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا۔

گاؤں والی رہائش گاہ تو اب مکمل طور پر فروخت ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کا قیام اس پرانی حویلی میں تھا جو گاؤں سے کچھ فاصلے پر بارشی نالے کے کنارے واقع تھی۔ دریا بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حویلی تک جانے کے لیے ایک نیم پتھر رست بنادیا گیا تھا۔ اشفاق مہرا اور ظیل مہرا کی آمد سے پہلے ہی اس حویلی کو بالکل تیار کر دیا گیا تھا۔ رنگ و روغن ہوا تھا۔ لان اور درختوں کی تراش خراش کی گئی تھی۔ کچن کا سامان بھرا گیا تھا اور دیگر ضروریات فراہم کی گئی تھیں۔ موراں والی سے آگے ایک زمیندار کے ڈیرے تک ٹیلیفون کی لائن آچکی تھی۔ وہاں سے آگے قریب ایک کلومیٹر تک ٹیلیفون مہرانے اپنے خرچے پر فون لائن کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس مرتبہ حویلی میں جزیئر کی سہولت بھی مہیا تھی۔ مہرا ٹیلی کے پرانے ملازم اور ملازمین بھی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے حویلی میں موجود تھے اور خدمت کے لیے کمر بستہ نظر آتے تھے۔

نور کے تایا ابا خلیل مہرانے پرانے ملازم فدا حسین سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے اس دفعہ چودھری طفرل سے ملاقات نہیں ہوئی؟“

فدا حسین بولا۔ ”شاید آپ کو پتا نہیں چلا، پچھلی جمعرات چودھری صاحب کی والدہ فوت ہو گئی ہے۔“

”اللہ وانا الیہ راجعون۔“ ظیل مہرا اور اشفاق مہرا نے ایک ساتھ کہا۔ پھر ظیل مہرا ذرا رہی سے بولے۔ ”فدا حسین! تم لوگوں کو کسی طرح اطلاع تو کرنی چاہیے تھی۔“

”جی میں نے اپنے پتر کو پچھالیا۔ بیجا تھا تاکہ آپ کو فون کر سکے مگر آپ کا فون ملا ہی نہیں۔ وہ خود لاہور جا کر آپ کو بتا دیں پھر بتا لیں۔“ پہلیا جاتا تھا۔ صبح چار بجے وہ فوت ہوئی۔ پچھلی (ظہر) کے بعد جنازہ بھی ہو گیا۔“

”اوہو۔ ہمیں افسوس کے لیے جانا چاہیے۔“ نور کے ابا اشفاق مہرا نے کہا اور تھکاوٹ کے باوجود دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

..... کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ٹویونا کار پر سوار تین

تیاریاں بھی خوشی و شادمانی کے زمرے میں آتی تھیں۔۔۔۔۔ تیاری مکمل تھی اور اب سفر درپیش تھا۔ ایک اسٹیشن وین اور تین گاڑیاں لاہور سے گجرات کی طرف روانہ ہو رہی تھیں۔ شریل، عثمان، مہربین اور نور اسٹیشن وین میں تھے۔ ابا جان کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی تھی مگر مہربین، بسہ کو بھیج تان کر اسٹیشن وین میں لے آئی تھی۔ اس نے اپنی بول کو بھی آنے کا کہا تھا مگر وہ ابا جان اور چھوٹی امی زلفت کے ساتھ ٹویونا گاڑی میں رہی تھیں۔ خوشی کے موقع پر نور بھی سب میں کھل مل جایا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو دوسروں میں کس نہیں کر پا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار اس کا دھیان چار پانچ روز پہلے والے واقعے کی طرف چلا جاتا تھا۔ آخر وہ ذوالقرنین سے بات کیوں نہیں کر پائی تھی؟ کیوں اس کی غلط فہمیاں دور کرنے میں ناکام رہی تھی؟ کیا وہ واقعی غلط فہمیاں ہی تھیں؟ یہ سوال اسے اندر سے لرزاتا تھا۔ وہ جس شخص کو پسند ہی نہیں کرتی تھی اس سے دو ٹوک بات کرنے میں کیا چیز مانع آگئی تھی؟ اسے جیسے اپنی ہی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اس کی پڑمردگی کی دوسری وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ اس کی ڈیپارٹمنٹل جاب ختم ہو گئی تھی اور اپنی پرنٹس وغیرہ جاری رکھنے کے لیے اس پر اضافی بوجھ پڑنے والا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے شاید وہ مستقبل میں پوری تندی کے ساتھ رنگ پرینٹس جاری ہی نہ رکھ سکے۔ ان باتوں کے علاوہ ابا جان کا رویہ بھی اسے مسلسل غمیں پہنچا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں معافی یا رحم کی کوئی رفق اسے نظر نہیں آتی تھی۔

داوی اماں علیحدہ گاڑی میں پیچھو جا جڑہ اور خالہ عرفہ کے ساتھ موجود تھیں۔ یہ گاڑی ماموں مراد ڈرائیو کر رہے تھے۔ داوی اماں پچھلی نشست پر نیچے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ ان کی دواؤں والا شا پر بھی ان کے سر ہانے رکھا تھا اور پچھلا سٹاپر کی حفاظت پر مامور تھیں۔

سفر بھی خوشی کنٹا۔ گجرات سے آگے چھالیہ کے نواح میں دوپہر کا کھانا ایک آب جو کے کنارے کھایا گیا۔ سردیوں کی سنہری دھوپ، ہلکی ہوا میں دور تک جھونتی ہوئی فصلیں اور درختوں کے تالیاں بجاتے ہوئے تھیں۔ یہ ان لوگوں کا پہلا اہوا ماحول تھا اور اس ماحول میں اگر وہ سب عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

موراں والی گاؤں پہنچنے پہنچنے انہیں شام ہو گئی۔ میلے کے آثار گاؤں کے نواح سے ہی شروع ہو جاتے تھے۔

کلومیٹر دور گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ سیدھے چودھری طفزل کی حویلی میں پہنچے۔ میلے کے دنوں میں چودھری طفزل کی حویلی میں سسکل چراغاں کیا جاتا تھا مگر اس بار صورت حال مختلف تھی۔

چودھری طفزل کے ملازموں نے غلیل مہرا اور مولوی اشفاق مہرا کو حویلی کی وسیع بیٹھک میں بٹھا دیا۔ قریباً دس منٹ بعد چودھری طفزل اندر داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کلف لگے..... کھڑکھڑاتے ہوئے باواہی رنگ کے شلوار قمیض میں تھا۔ سر پر اسی رنگ کی طرے دار پگڑی تھی۔

غلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے گلے مل کر افسوس کا اظہار کیا اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ غلیل مہرا بولے۔ ”اس بات کا بھی بہت افسوس ہے کہ ہمیں بروقت اطلاع نہ مل سکی، ورنہ ہر صورت جنازے میں شریک ہوتے۔“

اشفاق مہرا نے کہا۔ ”آپ ہی ہمیں اطلاع کر دیتے۔ سچے سات گھنٹے کا راستہ تھا، ہم پہنچ ہی جاتے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر اطلاع ملی ہے۔ ابھی ہم نے ماں جی کو نہیں بتایا۔ ان کو بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ وہ تو یہاں آتی ہی وڈی اماں جی سے ملنے کے لیے تھیں۔“

”چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو دعا ہی کی جاسکتی ہے۔“ چودھری طفزل نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

مولوی اشفاق مہرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چودھری طفزل اور غلیل مہرا نے بھی اٹھالے۔ دعا کے بعد غلیل مہرا نے چودھری طفزل سے اس کے بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ”ابدال اور وارث کہاں ہیں؟“

”کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈیرے پر گئے ہیں۔“ چودھری نے مختصر جواب دیا۔

مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ وڈی اماں کی بخشش کرے اور ان کے ورے بلند کرے۔ ہماری والدہ سے ان کی دوستی بڑی گہری تھی اور کئی طرح کی اونچ نیچ دیکھنے کے باوجود یہ برقرار رہی رہی۔“

چودھری طفزل نے لمبی سانس لی اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، وڈی اماں نے کئی دکھ بھی سہے پر یہ دوستی نبھاتی رہیں۔ کافی احسان ہیں ان کے تم لوگوں پر۔“

چودھری طفزل کے آخری الفاظ نے دونوں بھائیوں کو چونکا یا پھر غلیل مہرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بے شک..... بے شک وہ بڑی مہربان عورت تھیں۔ سب کے لیے مہربان تھیں۔“

چودھری اسی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”کچھ احسانوں کا

تو لوگوں کو پتا ہے اور کچھ کا پتا بھی نہیں۔ بہر حال اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔“

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے کھٹکھارنے اور بولنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ غلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے پہچان لیا۔ یہ چودھری طفزل کے بڑے بیٹے ابدال ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید کی ملازم سے بات کر رہا تھا اور طفزل نے کہا تھا کہ ابدال اور وارث گھر میں نہیں ہیں۔

شاید ابدال وغیرہ ان سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ چودھری طفزل کا رو بہ بھی واضح طور پر بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس رویت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید اس میں والدہ کی موت کا دکھ بھی شامل تھا۔ یا پھر یہ بات کہ وہ لوگ آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

حویلی واپس آ کر غلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے اپنی بیمار والدہ کو ان کی پرانی سکیلی وڈی اماں کی رحلت کی خبر سنائی۔ وہ کافی دیر کم مہرہیں پھر اپنی اوڑھنی سے غم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ خود ان کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ”ماں جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سفر کی تھکاوٹ بھی ہے۔ کل یا پھر سو کسی وقت چلے جائیں گے۔“

وہ دن بعد وڈی اماں کا دواں تھا۔ دسویں تک تو میلے کی تیاری کچھ سست رہی مگر پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مہرا نہیں جاتا اور اکثر اوقات سوگ کی کیفیت میں بھی لوگ خوشی کے مواقع مکمل طور پر ضائع نہیں ہونے دیتے اور پھر وڈی اماں تو ویسے بھی پچانوے سال سے اسے اوپر کی ہو کر گزری تھی۔ اس کے جنازے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنجابی میں اسے وڈا کرنا کہتے ہیں۔ بعض برادر یوں میں تو ایسے موقعوں پر بابے تک بجائے جاتے ہیں اور خیر خیرات کے علاوہ شیرینی وغیرہ بھی ہانپی جاتی ہے۔ خیر یہاں بابے تو نہیں بجائے گئے تھے مگر ٹیٹھے جاول کی دیکھیں پٹی تھیں اور کچھ دیگر رسومات بھی ادا ہوئی تھیں۔

دسویں کے بعد امتنان والے کا میلا پور سے جو بن پر آ گیا۔ وہ ساری مصروفیات اور تقریبات شروع ہو گئیں جو اس میلے کا خاصہ تھیں۔ بارشی تالے کے ساتھ ساتھ میویشیوں کی منڈی لگ گئی۔ میلے کی دکانیں سچے سنورے لگیں۔ سرس اور تھیرپو کی رونقوں میں اضافہ ہو گیا۔ جھولوں کی گردش بڑھ گئی..... اور پھر وہ دن آیا جب قدیم رسم کے مطابق علاقے کے لوگ اپنے اپنے تھہیاں رخصت کا راندہ طور پر مزار کے سامنے جمع کرادیے تھے..... اور سات دن کے لیے قرب و جوار

لوڈ شیڈنگ

ایک انگریز نے پاکستان آکر اردو سیکھی۔ جب واپس گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا بولنا سیکھا تو اس نے کہا۔ ”لائٹ چلی گئی ہے۔ لائٹ آگئی ہے۔ لائٹ جانے والی ہے۔ لائٹ آنے والی ہے۔ لائٹ نہیں آئی۔ لائٹ نہیں گئی۔ لائٹ جا بھی سکتی ہے۔ لائٹ آ بھی سکتی ہے۔ لائٹ ڈم آ رہی ہے۔ لائٹ تیز آ رہی ہے۔ لائٹ آ کیوں نہیں رہی۔ لائٹ جا کیوں نہیں رہی۔ لائٹ ابھی تو آئی تھی لو پھر چلی گئی۔“

مدرسہ: کاشف قیوم، کراچی

طریقہ ہے۔ جس طرح مردوں کی کبڑی ہوتی ہے، اسی طرح ہم عورتوں کی بھی کبڑی رکھ لیں۔“

سب ہنسنے لگیں..... نور کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر اپنی ماں کی عمر کی عورت کو جواب دینا اس نے مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر اور میز ہاں اتر کر بیٹھ چلی گئی..... اور بات صرف اس ایک عورت کی ہی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر عورتیں اسے تنقیدی نظر سے ہی دیکھتی تھیں۔ خاص طور سے بڑی عمر کی عورتوں کی نگاہوں میں تو اس کے لیے واضح بیگانگی اور تنقیدی نظر آتی تھی۔ یہ بات ان کے لیے کسی طور پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک لڑکی مردوں کی طرح بھاگ دوڑ کرے اور مقابلوں میں حصہ لے..... اور لڑکی بھی کوئی عام نہیں، مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی..... گھر کے وسیع صحن میں موجودہ مالک مکان حاجی اکرام صاحب کے بچے جھنڈیاں وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ وہ برآمدے میں سے گزری۔ ایک کمرے سے ابا جان کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمرے میں اکرام صاحب کے اہل خانہ موجود تھے اور وہ ان میں بیٹھے بسمہ کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کامیابی کا ذکر ہو رہا تھا جو بسمہ کو چند دن پہلے تقریری مقابلوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس بارے میں بات کرتے ہوئے ابا جان کے لب و لہجے میں ایک سرشاری سی بھر جاتی تھی۔

نور ایک طویل سانس لیتی ہوئی صحن کی طرف بڑھی اور اسے عبور کر کے ڈیوڑھی کی طرف آگئی۔ یہ سب وہی درود یار تھے جن میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ چپے چپے پر

میں مکمل امن و امان کی فضا قائم ہو جاتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھتے تھے۔ مہر گھرانے کی عورتیں بھی یہ رسم دیکھنے کے لیے، تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اپنی پرانی حویلی سے گاؤں میں آگئی تھیں۔ وہ اپنے فروخت شدہ گھر کی چھت پر موجود تھیں اور مزار کے سامنے اہل دیہہ کی طویل قطار دیکھ رہی تھیں۔ جہاز کی سائز کی سات بڑی بڑی چار پائیاں تھیں جن پر ہر طرح کا لائسنس اسلحہ ڈھیر کیا جا رہا تھا۔ بارودی پولیس اہلکار موجود تھے اور اسلحہ جمع کرانے والوں کو سید نما کوپن دے رہے تھے۔ اسلحے سے بھی کوپنیں مشک کے جا رہے تھے۔

قطار میں سے ایک شخص آگے بڑھا، اپنا ہتھیار جمع کرنا، کوپن حاصل کرنا اور پھر مزار کی طرف رخ کر کے ادب سے سلام کرتا۔ اس کے بعد اگلے قدموں پیچھے پلٹ جاتا۔ اس عمل کے مکمل ہونے تک قریباً ساتوں چار پائیاں مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے آتشیں اسلحے سے لگدگیں۔ دوسرا مرحلہ رات کو تھا۔ اس میں ناجائز اسلحہ بھی اس قدیم کوشٹری میں جمع ہو جانا تھا جہاں تا تک چندی اینٹوں کی دیواروں میں بے شمار خانے بنے ہوئے تھے اور تالے لگے ہوئے تھے۔

یہ رسم اور اس طرح کی ساری رسمیں اہل علاقہ کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں۔ مثلاً آج ہی کے روز شام کے بعد گھروں میں ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی رسم بھی ادا ہو جاتی۔ یہ ترنجن سے ملتی چلتی تقریب تھی۔ انٹیمٹیاں دہکائی جاتی تھیں، گڑ اور باداموں والا طوبانیایا جاتا تھا۔ علامتی طور پر ایک آدھ ترنجن چرخ بھی پاس رکھ لیا جاتا تھا اور سہائیں اور کنواریاں ملن اور جدائی کے گیت گاتی تھیں۔

بتول نے کہا۔ ”نور! آج رات تو یہیں رہیں گے۔“

نور بولی۔ ”آبی..... آپ کو پتا بھی ہے، مجھے یہ ڈھولک شوک اچھی نہیں لگتی۔“

چھوٹی امی زلفت نے کہا۔ ”تومت ڈھولک بجانا تم سن تو سکتی ہوتا۔“

”نہیں چھوٹی امی! میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ میں ابا جان کے ساتھ حویلی چلی جاؤں گی۔ صبح پھر آ جاؤں گی۔“ ایک عورت نے بسمہ سے مخاطب ہو کر ذرا تکیے لہجے میں کہا۔ ”بسمہ! تمہاری یہ بہن شروے سے ہی دھکرے ٹاپک کی ہے۔ اس کو تو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ایک ہی

میں یہاں آگئی ہوں۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

ایک کمرے سے دادی اماں کی ہائے سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی وقت تکلیف میں ہوتی تھیں اور کسی وقت نہیں بھی ہوتی تھیں مگر عاداتاً ہائے کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی پچھو جاڑہ اور ایک ملازمان کے پاس موجود تھیں اور ان کی منجھی چاٹی کر رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نور بستر پر گر گئی اور ذوالقرنین کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا وہ اکیلا تھا یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا؟ یوں تو شرجیل اور عثمان کے کچھ دوست بھی لاہور سے میلا دیکھنے کے لیے آئے تھے اور ویسے بھی لاہور سے لوگ یہاں پہنچتے تھے مگر ذوالقرنین کا یہاں نظر آنا نور کے لیے اہم اور پریشان کن تھا۔ اس کے ماتھے پر کوئی چوٹ وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پچھو یا شرجیل سے اس بارے میں کچھ پوچھے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ خیالوں میں الجھی ہوئی وہ سو گئی۔

یوں تو لاہور میں اچھی سے اچھی چوڑیاں اور مہندی وغیرہ مل جاتی تھی مگر یہ بھی میلے کا ”کریر“ تھا کہ دوسرے دن شام کے وقت عورتیں میلے سے چوڑیاں، مہندی اور خوشبو وغیرہ خریدتی تھیں۔ مہرین اور دو داموں زاد بہنیں نور کو بھی بھیج کر اس شاپنگ کے لیے لے گئیں۔

نور نے ابھی تک مہرین کو بھی کل والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی مہرین نے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ یہاں ذوالقرنین کی موجودگی سے آگاہ ہے۔ لڑکیاں ایک ریڑھی والے کے پاس کھڑی گول گپے کھا رہی تھیں جب اچانک مہرین نے اس کے بازو پر چٹکی لی اور سرگوشی میں بولی۔ ”وہ دائیں طرف دیکھو..... کر اکر کی دکان کے پاس۔“

نور نے اس رخ پر دیکھا اور اس کے جسم پر چوہنٹاں سی ریگ گئیں۔ وہاں لوگوں کے درمیان ذوالقرنین کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسب معمول شلوار قمیض میں تھا اور ایک موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خدیجہ کا بھائی ہے نا؟“ مہرین نے تیز سرگوشی کی۔

نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ ذات شریف یہاں کیسے؟“ مہرین بولی۔

ذوالقرنین کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس نے شاید اپنی چوٹ چھپانے کے لیے اور گردوغبار سے بچنے کے لیے سر پر ڈبی دار و مال لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جس موٹر سائیکل کو

یادیں نقش تھیں مگر اب یہ سب کچھ کسی اور کی ملکیت تھا۔ مہرین کی جیٹیت یہاں ایک دودن کے مہمان بھیجی تھی۔ اس نے اسکا رف درست کیا۔ اور صحنی اچھی طرح لپٹی اور باہر آگئی۔ سامنے ہی پرالی کے ڈھیر لگے تھے اور کالی سیاہ بھیئیں کھری میں منہ مار رہی تھیں۔ تانیا زاد عثمان کاڑی کے پاس کھڑا بچپن کے کسی ہم جونی سے گپ شپ کر رہا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ چونکا اور پاس آگیا۔ ”کیا بات ہے نور؟“

”عثمان بھائی! طبیعت ذرا بو جھل سی ہو رہی ہے۔ پلیز مجھے حویلی چھوڑ آئیں۔“

”لیکن آج تو یہاں ڈھولک کا پروگرام تھا۔“

”نہیں بھائی۔ یہ نہ ہو پیار پڑ جاؤں۔ آرام کر لوں گی تو کل تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”کسی دوا وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟“ عثمان نے

اپنا ہت سے پوچھا۔ نور نے نفی میں جواب دیا۔

وہ عثمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور حویلی چل دی۔

دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام کے

سائے لیے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ میلے کی رونق کے

درمیان سے ہو کر گزرے۔ شامیانوں اور عارضی دکانوں

کے آس پاس لوگوں کا جھم تھا۔ جگہ جگہ پختیاں میوزک بھی

لے لے ہو رہا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں ہلکا گڑا کر رہی تھیں۔

ایک ایک وہ چونگی۔ اسے ایک جانا پچھتا چہرہ نظر آیا۔ ہاں، یہ

وہی تھا..... یہ وہی تھا۔ اس کے سر پر شاید پٹی بندھی ہوئی

تھی۔ اس نے کالی گرم چادر کی بکلی مار رکھی تھی۔ وہ گاڑی کی

طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کے لیے ان دونوں کی

نگاہیں بھی ملی تھیں۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی اور اس کی شکل

اوجھل ہو گئی۔ شے کی کنجائش نہیں تھی۔ یہ ذوالقرنین ہی تھا۔

اس کی ایک جھلک کل شام بھی اس نے حاجی اکرام صاحب

کے گھر سے باہر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ مین دروازے پر

کھڑا ابا جان اور تایا جان سے علیک سلیک کر رہا تھا۔ تب نور

کی طرف اس کی پشت تھی۔ نور کو بس شک سا ہوا تھا کہ یہ

ذوالقرنین ہے لیکن آج تو اس نے اسے صاف دیکھا تھا۔

عثمان پوری توجہ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پتا

ہی نہیں چلا کہ نور کسی کو دیکھ کر بری طرح چونگی ہے۔ نور کا دل

تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کیا عام لوگوں

کی طرح صرف میلا دیکھنے آیا تھا؟ یا پھر عام لوگوں کی طرح

نہیں آیا تھا؟

حویلی کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ کر عثمان نے نور کو

ڈراپ کر دیا۔ وہ بولی۔ ”عثمان بھائی! تانیا امی کو بتا دینا کہ

دھاڑنے لگا۔ بہت سے لوگ اس کی دھاڑ دیکھنے اور سننے کے لیے سرسک کے شامیانوں کی طرف بھاگے۔ نور نے دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور ذوالقرنین کو بھی کھینچتا ہوا سرسک کی طرف لے گیا۔ ذوالقرنین جیسے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے دو تین بار مڑ کر نور اور مہرین کی جانب دیکھا، پھر اسے ہجوم نے چھپالیا۔

گول گئے کھانے کے بعد گروپ کی چند لڑکیاں بھی شیروں کو دیکھنے کے لیے سرسک کے شامیانوں کی طرف چلی گئیں مگر نور دگر لڑکیوں کے ساتھ میلے کے دوسرے حصے کی طرف روانہ ہو گئی، وہ اپ سیٹ تھی۔

☆☆☆

رات کو مہرین اور نور اپنے اپنے پلنگ پر لیاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں انہیں بھی دیکر رہی تھی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی مگر جزیئر کا انتظام موجود تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی بخ بستہ دھند..... جامن، مالے اور بیری کے ٹنڈ منڈ درختوں کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

مہرین نے کہا۔ ”میں نے پھوپھو جارج سے تعویذ سی سن گئی ہیں۔“ انہیں بھی پتا نہیں کہ خدیجہ کا بھائی یہاں آیا ہوا ہے۔ ہاں یہ کہہ رہی تھیں کہ لاہور سے اردو بازار کے تین چار دکاندار بھی میلاد دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔“

”وہ کیوں کر رہا ہے ایسا؟“ نور نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ وہ خاص تمہارے لیے نہ آیا ہو۔“

”نہیں مہرین۔“ نور نے اپنی سبز جزی کی آستینیں اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو خود کو دھوکے میں رکھنے والی بات ہے۔“

”کیا تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا کہ پرسوں وہ ابا جان اور چچا جان سے بات کر رہا تھا؟“

”ہاں بھئی۔“ سہی تھا لیکن تب مجھے صرف شک ہوا تھا۔ اگلے روز تصدیق ہو گئی۔“

دونوں خاموش ہو گئیں۔ باہر تاریکی میں کہیں کوئی رات کا برندہ چبکارا۔ نور کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ وہ اسے کچھ نہیں دے سکتی تھی، پھر اس کی آنکھوں میں سوال کیوں تھے؟ وہ کیوں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا برا انسان نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اچھا انسان ہو لیکن نور کے ذہن میں جیون سماجی کا جو تصور تھا، وہ اس سے بہت مختلف تھا۔

خاموشی کے وقفے کے بعد وہ دونوں پھر باتیں کرنے

لکس مار رہا تھا، وہ ایک عمر رسیدہ شخص کی تھی جو پاس ہی کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی۔ عمر رسیدہ شخص خوش ہو گیا..... اور ذوالقرنین کے لیے غالباً شکریے کے الفاظ استعمال کئے۔

موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔ ذوالقرنین کے دونوں ہاتھ سیاہ ہو رہے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے وہ موٹر سائیکل کے پلگ وغیرہ سے پھینٹ چھا کر تار رہا تھا۔ ہاتھ دھوئے کے لیے اس نے ارد گرد دیکھا اور پھر گول گئے والی ریڑھی کی طرف بڑھا، جہاں بالٹی میں پانی نظر آ رہا تھا اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ نور وغیرہ پر پڑی۔ درمیانی فاصلہ میں پچیس قدم کے قریب تھا۔ پھر بھی ذوالقرنین نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ریڑھی کی طرف آتے آتے ذرا ٹھٹکا اور پھر رخ پھیر کر ایک شامیانے کی طرف بڑھ گیا جہاں چائے خانے کے باہر ٹنکا نظر آ رہا تھا۔ اس نے وہاں جا کر ہاتھ دھوئے۔ اس عمل کے دوران میں اس نے ایک دو بار اچتی نظروں سے نور اور مہرین کی طرف بھی دیکھا۔

مہرین نے کہا۔ ”یہ اصلاح معاشرہ یہاں بھی موجود ہے۔“

”ہاں۔ مجھے بھی کل شک ہوا تھا حویلی جاتے ہوئے۔“ نور نے پوری وضاحت نہیں کی۔

”بھئی! منالے کی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی ہے۔ پر پتا نہیں یہ منالے کی کشش ہے بھی یا نہیں۔“

مہرین نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔

وہ اب ہاتھ دھو کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور قدرے دراز قد ہونے کی وجہ سے ہجوم میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ شانے کشادہ اور سر اوڑھنی کے بال ہموار تھے۔ چائے خانے والے لڑکے نے اسے ہاتھ پونچھنے کے لیے ایک تولیا رد مال دے دیا۔ وہ شکر یہ ادا کرنے کے بعد ہاتھ پونچھنے لگا۔ نگاہیں بدستور تھکی ہوئی تھیں لیکن تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نور اور مہرین کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا ہے۔

نور نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گول مپا واپس تھالی میں رکھ دیا تھا۔ چہرے پر اسکا رف درست کرتے ہوئے اس نے مہرین سے سرگوشی کی۔ ”چلو چلیں۔“

”بھئی! یہ دو تین گول گئے مجھے بدعائیں دیں گے۔ انہیں تو ننگل لو۔“ اس نے پورا گول مپا منہ میں ڈالنے سے پہلے کہا۔

نور تھوڑا سا رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اسی دوران میں کہیں پاس ہی موجود سرسک کا شیر اپنے پنجرے میں

لگیں۔ اس مرتبہ موضوع ابا جان کی ناراضگی تھی، جن کو لڑکیوں کا ڈھولک بجانا اور حاجی اکرام صاحب کے گھر رہنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اتنے میں دادی جان کی لالچی کی تنک تنک سنائی دی پھر انہوں نے لالچی سے ہی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”اولڑکیو! کیا چوں چوں لگا رکھی ہے، آدھی رات ہونے والی ہے، سو جاؤ اب۔“

”اچھا دادی۔“ مہرین نے ناگواری سے کہا اور لحاف میں منہ گھسایا۔ ”دس بجے کو آدھی رات کہہ رہی ہیں۔“ وہ بڑبڑائی۔

دادی نے کمرے میں جھانکا۔ دروازے کے پاس ہی نور کے جوگر پڑے تھے۔ انہوں نے لالچی سے ہی انہیں ایک طرف ہٹایا۔ جیسے وہ جوگر نہ ہوں، کوئی پلید بدودار شے ہو۔ نور پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور بڑبڑکی بولیں۔ ”کہا بھی ہے کہ جلدی سو جایا کرو۔ بند کرو دلائٹ۔“

”ابھی کر دیتی ہوں۔ داش روم میں جاتا ہے۔“ نور نے کہا۔

”بات ماننی ساری زندگی نہیں آئے گی تجھے۔ بات ماننے والی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ ساری کی ساری ماں پر ہے۔“ ان کی آواز میں زخمی کرنے والی کاٹ بھی۔ وہ باہر نکل گئیں۔

نور کا دل چاہا کہ وہ چلا کر دادی سے کہے کہ اب تو وہ عرصے سے منوں مٹی کے پیچھے سوئی ہوئی ہیں..... وہ اب تو انہیں معاف کر دیں مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور ایک نہایت طویل، نہایت تنگ سا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بے طرح جلنا شروع ہو گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دکھ آمیز جھلاہٹ کے ساتھ اُچی اور لائٹ آف کرنے کے بعد مہرین کی طرح لحاف میں منہ گھسایا۔

☆☆☆

اگلے روز موسم ابر آلود تھا۔ رات کو تھوڑے سے چھیننے بھی پڑے تھے۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خواتین نے طوا پوری، چنوں اور دودھ پتی کا ناشا کیا۔ نور چکنائی والی خوراک سے ذرا دور ہی رہتی تھی۔ اس نے دو تین سلاکس، انڈے اور اورنج جوس سے کام چلایا۔

ابا جان، تایا جان اور ماموں مراد صبح سویرے ہی گاڑی پر نہیں نکل گئے تھے۔ نور نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ پریشان بھی ہیں۔ چودھری طفعل کے گھرانے کی عورتیں بھی کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ کل چوڑیوں کی خریداری کے موقع پر ابدال کی دو بیئیں نظر آئی تھیں مگر

انہوں نے آنکھ نہیں ملائی تھی۔ نور اور مہرین نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید طفعل گھرانے کے ساتھ کوئی تنگ ترش بات ہوئی ہے۔ تائی امی، چھوٹی امی زلفت اور چھوٹا جابرہ وغیرہ کا بھی یہی خیال تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد مہرین اس کے سر پر سوار ہو گئی۔ ”چلو بھی چلیں۔ اس مرتبہ بڑا زبردست آسانی جھولا آیا ہے۔ مزہ آ جائے گا۔ دو دروڑنیک سارا علاقہ نظر آئے گا۔“

”مہرین! آج نہیں۔ طبیعت بالکل بھی نہیں چاہ رہی۔“

”یار چھوڑو۔ دادی جان کی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرو۔ تمہیں تو پتا ہے وہ جیسی ہیں۔“

وہ چپ رہی۔ وہ اسے کیا بتاتی، بات صرف دادی جان ہی کی نہیں تھی، یہاں کون تھا جو اسے اپنایت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت جیسے بے مہر اجنبیوں کے حصار میں رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، اُتتے بٹھتے وہ ان گنت سوالیہ نگاہوں کی جبین اپنے جسم پر محسوس کرتی تھی..... دیکھو اس لڑکی کو..... یہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی ہے۔ یہ بتول اور بسمہ کی بہن ہے۔ یہ اپنے بڑوں کی نافرمان ہے۔ اسے باپ نے دھکتا رہا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا کام کرتی ہے جو عورتوں کے لیے باعث تنگ ہے۔

مہرین نے اپنی انگلی سے نور کے پہلو میں پکوکا دیا۔ ”کیا مایوس صورت بنائی ہوئی ہے۔ بھئی، ہم کسی جہلم میں نہیں، میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد اس میلے سے دور ہوں گے اور ہر طرح کے کھیلنے سے قریب ہوں گے۔ چلو اٹھو، میں آج تمہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔“

چھوٹی امی بھی آئیں۔ وہ پہلی مرتبہ اس میلے میں آئی تھیں اور بہت انجوائے کر رہی تھیں۔ اس میلے کی انوکھی رسموں ریتوں نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

چھوٹی امی اور مہرین کے زور دینے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ براؤن شلوار قمیص کے اوپر اس نے گہری براؤن جرسی پہنی اور بکلی شال کے ساتھ اسکاٹف پھین کر تیار ہو گئی۔ میلے کی گہما گہمی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بارش کے اندیشے کے پیش نظر خیمہ زن لوگوں نے اپنے خیموں پر بڑے بڑے پلاسٹک منڈھ دیے تھے اور دیگر احتیاطی تدابیر کی تھیں۔ کسی قریبی میدان میں آج کشتیوں کے مقابلے بھی ہو رہے تھے تاہم وہ ایونٹ شام کا تھا۔ ابھی تو لوگ دیگر تفریحات سے لطف لے رہے تھے۔ آبی بتول بسمہ اور مامیوں سمیت مہرا فیملی کی اکثر عورتیں رقبوں میں تھیں۔ جو نہیں تھیں، انہوں نے بھی چہرے حجاب یا نقاب

نگاہ دور نے بچے ایک منظر پر پڑی۔ اس نے چودھری طفرل کے چوڑے چکلے بیٹے ابدال کو دیکھا۔ وہ جھیلے شلوار کرتے اور واسٹ میں تھا۔ کندھوں پر چودھریوں کے انداز میں تہ شدہ گرم شال ڈال رکھی تھی۔ (یہ وہی تھا جس کے لیے پہلے آئی بٹول اور پھر بسہہ کا رشتہ مانگا گیا تھا) ابدال کے پاس ہی ابا جان کا پرانا ملازم خدا بخش تھا۔ کافی فاصلہ تھا، پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ ابدال بڑے سخت لہجے میں خدا بخش سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کسی طرح کی تپ کلائی تھی، پھر دو تین بندے آگے آئے اور انہوں نے صاف صفائی کا کردار ادا کیا۔

”یہ کیا چکر ہے؟“ مہرین انہیں سے بولی۔
 ”گلتا ہے کہ دو تین دن سے کچھ گڑبڑ ہے۔ کل ماموں مراد بھی بڑے غصے میں نظر آ رہے تھے۔“
 ”کہیں وہ پرانا معاملہ ہی تو پھر اٹھ کھڑا نہیں ہوا۔“
 مہرین نے ذرا توشیش لے لیا۔

”یہ تو بڑے ہی بتا سکتے ہیں۔ تم جا کر ابا یا تایا جان سے پوچھنا۔“

اس منظر نے مہرین کا مزہ کر کر کر دیا تھا۔ اس کا تفریحی موڈ ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گرم شال کو مضبوطی سے اپنے گداز شانوں پر لپیٹ کر بولی۔ ”پتا نہیں کب چلے گا جھولا؟“

”تمہیں تو بلندی اچھی لگ رہی تھی؟“ نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ (وہ بے دھجی پریشان تھی)۔

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر سردی بھی بڑی ہے۔“
 ”بلندی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ ارد گرد کے منظر اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ بلندی صرف اتنا کرتی ہے کہ ہمیں زیادہ کچھ دکھا دیتی ہے اور تفصیل سے۔“

”اچھا زیادہ فلسفہ نہ بکھاؤ۔ دعا کرو کہ یہ آسمانی چرخہ چل پڑے۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔“ مہرین نے اپنے مرمریں ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں میں ہیسرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں جزیئر کی آواز بلند ہوئی اور جھولا حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور مینہ تو اتار سے برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ جزیئر کل سے کام نہیں کر رہا تھا۔ حویلی میں لائٹیں اور کیسے کیسے روشن کر دیے گئے۔ حویلی سے تقریباً تین کلومیٹر دور مورال دلی میں بھی یقیناً میلے کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ حویلی سے باہر چاروں طرف وہی خاموشی اور یکسانیت تھی جو

میں چھپا رکھے تھے۔
 اچانک نور نے محسوس کیا کہ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں..... ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ وہ اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر آئے..... یا وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر نہ آئے؟ نہیں، وہ اسے دیکھنے کے لیے تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کیوں دیکھنا چاہے گی؟ وہ شاید لاشعوری طور پر چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو۔ اس کا ارد گرد نظر نہ آتا ہی نور کے لیے اچھا تھا۔ ہاں اسی لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

سب لڑکیاں آسمانی جھولے پر بیٹھیں اور دو تین بار بیٹھیں، جب بلند و بالا جھولا اوپر جاتا تھا تو ارد گرد کا علاقہ دور تک دکھائی دیتا تھا۔ پورا مورال دلی گاؤں، اس کی گلیاں، اس کے بیچ و خم اور پھر آگے مویشی منڈی، خریداروں کا ہجوم، بائیں طرف ڈھائی تین کلومیٹر کے فاصلے پر بارشی نالے کا نیلا پانی اور اس پانی کے کنارے پرکھوں کی پرانی حویلی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ حویلی کے باہر کھڑی ان کی دو گڈیاں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس نالے کے پار آگے تک درختوں، جھاڑیوں اور سرکندوں کے سلسلے تھے اور اس کی دوسری جانب پولیس چوکی کی چھت خاکستری دھبے کی طرح دکھائی دیتی تھی.....

اس چھت پر شاید پولیس والوں کی وردیاں سوکھ رہی تھیں۔ دائیں کنارے پر ایک چنیل میدان تھا جہاں سیم خور کی سفیدی تھی۔ اس میدان کی ایک جانب مورال دلی گاؤں کے کھیت شروع ہو جاتے تھے، جن میں سے کچھ پر ٹریکٹر چلائے گئے تھے اور کچھ پر کھاد، مکئی اور سروسوں کے کھیت لپہلہا رہے تھے۔ ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور گزرگاہیں تھیں۔ دور ایک ڈیرے پر نیوب دیل کے پانی کی موٹی دھار چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ اس کے ارد گرد بچے دوڑتے تھے اور چند عورتیں کپڑے دھوئی تھیں۔

جھولا ابھی رکا ہوا تھا۔ اس کی ڈولی بلندی پر تھی۔ مہرین نے کہا۔ ”اوپر سے چیز دو کو دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔“
 ”ہوں۔“ نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

مہرین بولی۔ ”آج تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔“
 ”اللہ کرے نہ ہی آئے۔“
 ”بچ کہہ رہی ہو؟“ وہ مسکرائی۔

”جب اس طرح بات کرتی ہو تو زہر لگتی ہو۔“ وہ چڑ کر بولی۔

وہ دونوں اس ڈولی میں اکیلے تھیں۔ اچانک نور کی

متواتر برستی بارش میں ماحول کا حصہ ہوتی ہے۔ سردیوں کی طویل رات سر پر بھی اور صبح بہت دور بھی۔

نور، مہرین، ہمسہ اور بتول ایک ہی کمرے میں بیٹھی آگے پیچھے پڑا ہوا تھپ رہی تھیں۔ رشتے میں ان کے ایک چچا تھے جو انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ملتان میں رہتے تھے۔ ملتان سے میلاد کیلئے یہاں پہنچے تھے اور اچھی کواٹھی کا ملتان کی سوہن حلوا بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ سوہن حلوا سامنے پڑا تھا مگر لڑکیوں نے بس جھکنے پر اکتفا کیا تھا۔ کیس لیپ کی روشنی نے ماحول کو غنودہ سا کر رکھا تھا۔ کچن میں ملازمائیں کھانا تیار کر رہی تھیں اور بلاؤ اور بالک گوشت کی خوشبو اونچی چھتوں والے کمروں میں چکر اڑی تھی۔

نور نے چھوٹے ٹیشوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے سے آگے حویلی کے چونی گیٹ کے پاس دو پہریدار حسب معمول ایک ٹیڈ کے نیچے کھڑکی کے اسٹولوں پر بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ ان کے ہتھیرا تو ملے کے آغاز میں ہی جمع ہو چکے تھے، اب وہ بس لاشیوں سے سج تھے۔ نور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ابا جان اور تایا ابا بھی تنگ نہیں آئے۔ اللہ خیر کرے۔“

”بارش کی وجہ سے رک گئے ہوں گے۔“ ہمسہ خود کو تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

”انہوں نے کون سا پیدل آنا تھا۔“ بتول نے اپنی شیرخوار بچی کو چھاتی سے لگا کر اس پر اپنی گرم شال پھیلاتے ہوئے کہا۔

”سائی امی نے کچھ نہیں بتایا؟“ نور نے مہرین سے پوچھا۔ ”انہیں بھی کچھ زیادہ پتا نہیں۔ بس یہی کہہ رہی تھیں، شاید کوئی لین دین کا جھگڑا ہے۔“

”مگر ماموں مراد تو بڑے غصے میں لگ رہے تھے اور وہ چھوٹی موٹی بات پر غصے میں نہیں آتے۔“

اسی دوران میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ”شاید ابا جان آگئے ہیں۔“ ہمسہ بولی اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والے ابا جان اور تایا ابا ہی تھے۔ دو ملازم چھتیاں تان کر ان کو براؤنر کے تک لے آئے۔ ان کی شیردانہ پر بارش کے چھینٹے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ ان کے موڈ سخت خراب ہیں۔ لڑکیوں میں سے کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے کوئی سوال کرتی۔ رات کا کھانا بھی بے دلی سے کھایا گیا۔ خلاف معمول نور کے ابا جان اور تایا ابا سمیت سب مردوں کا کھانا

مردانے میں ہی پہنچ دیا گیا۔

نور کا پیٹ کھکی ہوئی تھی۔ دادی اماں کی بات کی وجہ سے کل رات اسے بارہ ایک بجے تک نیند نہیں آئی تھی۔ صبح سویرے مہرین نے جگا کر بٹھا دیا تھا۔ اب وہ جلدی سونا چاہتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہوئی اور وہیں آڑی ترچھی پڑی سوئی۔

وہ کھانسی کی وجہ سے جاگی تھی، وہ خوش خوراک ضرور تھی لیکن پرہیزی کا کھانا کھاتی تھی۔ کل دوسری لڑکیوں کے ساتھ چند گول گپے کھا کر اس کا کلا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، مہرین اور ہمسہ بھی ایک ہی پلنگ پر ڈبل لحاف کے نیچے سوئی بڑی تھیں۔ کیس لیپ کی روشنی کچھ مدھم ہو گئی تھی اور اگلی بیٹھی تقریباً جگہ جگہ تھی۔ پاپر بادل گر بن رہے تھے اور بارش کبھی آہستہ بھی تیز ہو جاتی تھی۔ اس نے الماری سے کھانسی کا سیرپ نکالا اور ڈیڑھ ڈھکن پیا۔ بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے اور ہیز پن اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے نو بجے تھے مگر لگتا تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ لحاف میں گھسنے سے پہلے وہ دروازے کو بوٹ کرنے کے لیے آگے بڑھی تو اسے مدھم آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے ابا جان، تایا خلیل اور ماموں مراد کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ وہ مردانے حصے میں تھے اس لیے آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس گونج جی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

نور میں تجسس تو پہلے سے ہی جاگا ہوا تھا۔ اس نے شال اوڑھی، منہ بست چل پھری اور باہر نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے میں، چھوٹی امی زلفت، آئی بتول کی بڑی بیٹی حنا کو اپنے ساتھ لگائے لحاف کے نیچے اوتھ رہی تھیں۔ باقی لوگ بھی سو چکے تھے۔ فقط کاسن روم میں سے دادی جان کے کھانسنے اور بڑبڑانے کی صدا آ رہی تھی۔

نور بے پاؤں چلتی نیم روشن راہداریوں سے گزری اور ایک بند دروازے کی چوٹی بہت آہستہ سے اتار کر مردانے حصے میں آگئی۔ آوازیں اب واضح سنائی دینے لگی تھیں مگر الفاظ اب بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بڑی بیٹھک کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور سننے لگی۔ ابا جان کی سخت آواز ابھری۔ ”میں پھر کہتا ہوں۔ مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ سویرا ہوتے ہی نکل جائیں۔“

”ایسی بھی لٹ نہیں پڑی ہوئی بھائی جان! ان کی

گی..... ساتھ ہی اس نے ماں جی سے یہ بھی کہا کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو وہ اپنے بیٹوں اور پوتیوں کو لے کر یہاں سے چلی جائے.....“
تایا ابا کے اگلے ایک دو جیلے نور کی سمجھ میں نہیں آئے کیونکہ بادل زور سے گرجے تھے اور درود پوار جیسے لرز گئے تھے۔

تب تایا ابا کی آواز دوبارہ نور کے کانوں تک پہنچی..... ”خدا جانے اس عورت نے اپنے بیٹے طفل اور پوتروں ابدال وغیرہ کو کس طرح ان کے ننھوں ارادوں سے باز رکھا اور وہ کس طرح باز آئے۔ بہر حال یہ کام ہو گیا.....“
اس موقع پر چھوٹے ناموں مراد نے ہچکچاہٹ۔ چونکہ وہ دور بیٹھے تھے اس لیے الفاظ نور کی سمجھ میں نہیں آئے۔ یہی اندازہ ہوا کہ انہوں نے کہا پریوں کی کمینگی کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔

نور کو ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اسے یہاں دروازے سے لگا دیکھ نہ لے۔ اندر ہونے والی گفتگو کے اثرات سے اس کا دل بے طرح دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

اچانک احاطے کی طرف سے ایک بلند آواز نور کی ساعت تک پہنچی۔ پہلے تو وہ اسے چوکیدار کا آواز بھی لگتا پھر پتا چلا کہ یہ آواز حویلی کے باہر سے آئی ہے۔ بیٹھک کے اندر سے کسی نے کھڑکی کھولی۔ شاید آواز کا ماخذ جاننے کی کوشش کی تھی۔

نور کا بول سنا تھا۔ وہ اٹھنے قدموں واپس مزی اور اسی طرح بی کی چال چلتی ہوئی واپس کورڈر میں اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو اسے یوں لگا، جیسے حویلی کے چھانکے سے باہر کسی افراد موجود ہیں اور بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ سرد ہوا سویوں کی طرح چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی نور پر انکشاف ہوا کہ حویلی سے باہر کافی زیادہ لوگ جمع ہیں اور غالباً ان کی ٹارچوں اور الٹینوں وغیرہ کی روشنی بھی جو بلند چادر یواری کے پار دکھائی دے رہی تھی۔

ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے کھڑکی کا پت بند کر دیا۔

یہ کون لوگ تھے؟

اس وقت اس خراب موسم میں یہاں کیوں آئے تھے؟

اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں ہم۔ مگر اندر کی بات کا تو پتا چلے کہ اچانک یہ کیا پلٹ ہوئی کیوں ہے؟“ یہ چھوٹے چچا احسان کی آواز گئی جو ایک ماہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان آئے تھے۔

”میں تمہیں بتاتا ہوں احسان۔“ تایا ظلیل کی پاٹ دار آواز نور کے کانوں تک پہنچی۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ”سارا معاملہ چودھری طفل کی ماں کے مرنے کے بعد خراب ہوا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دراصل چودھری طفل اور اس کا گھرانہ اپنی ضد سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں ان لوگوں کی تین نسلیں کو جانتا ہوں۔ ان کی طبیعت کتے کی اس دم جیسی ہے جو سو سال قحط کی نال میں رہ کر بھی میڑھی کی میڑھی رہتی ہے۔“

”تو پھر وہ صلہ صفائی کیا تھی۔ ان لوگوں نے تیسری پنچایت میں خود کہا تھا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔“

”نہیں احسان! معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوا۔ زہران کے اندر پلٹا رہا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بول کا رشتہ مانگا۔ پنچایت کا فیصلہ ہمارے حق میں آیا اور ہم نے فوراً بول کی شادی کر دی۔ اسی دوران میں ابدال کا چچا سکندر ایم بی اے بن گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی ضد کی باسی کڑی میں ابالادیا۔ اسی کے کہنے پر ان لوگوں نے بول کے بعد بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع کر دیا۔ تم سب کو یاد ہوگا اس مرتبہ پنچایت نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان دنوں حالات بڑے خراب ہو گئے تھے۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید بسمہ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا۔ بہر حال اللہ نے کرم کیا۔ ایک روز ماں جی (نور کی دادی) خاموشی کے ساتھ اپنی سیمٹی ڈوئی اماں (طفل کی ماں) کے پاس گئیں۔ کسی زمانے میں یہ دونوں عورتیں دو پٹا بدل بہنیں بھی بنی تھیں۔ دو پٹا بدلی کی یہ رسم امتناؤں والے کے مزار پر ہوتی تھی۔ ماں جی نے اس روز دہی تیس سال پرانا دو پٹا طفل کی ماں کے قدموں میں رکھ دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس دوپٹے کے صدمے اس کی پوتی بسمہ کو معاف کر دے۔ ڈوئی اماں بھی اپنے زمانے کی مانی ہوئی بہت دھرم تھی۔ پر کچھ ویلے ایسے ہوتے ہیں جب بندہ نرم پڑ جاتا ہے۔ پتا نہیں اس دن دونوں عورتوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح ہوئیں۔ آخر ڈوئی اماں نے وہ دو پٹا دوبارہ ہماری ماں کے سر پر رکھ دیا..... اور اس سے کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کرے

کہیں یہ؟..... کہیں یہ.....؟

وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکی۔ اس نے بے تاب ہو کر دوبارہ کھڑکی کھولی۔ اس کے روکنے کھڑے ہو گئے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ دس بیس یا چالیس پچاس لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت زیادہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں اور قہر ناک آوازوں میں لگا کر رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے گہرے بالوں میں سے چاند تے ایک جھلک دکھائی اور دوبارہ اوجھل ہو گیا۔ ہوا کے بیچ بستہ تھیمڑوں نے کمرے کی رہی سہی حرارت بھی ختم کر دی۔ ہسمہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دراز پر شیشی پال بکھریے ہوئے تھے اور جسم پر ویلوٹ کی لگائی قمیص بے ترتیب تھی۔ ”کیا ہوا نور؟“ اس نے ہراساں آواز میں کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ شاید کچھ لوگ ہیں باہر۔“ نور نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔ اس کا منہ خشک ہوتا شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دیگر خواتین بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ برآمدے میں کیس لیمپس کی روشنیاں دکھائی دیں۔ نور نے دیکھا، تایا ابا احاطہ پار کر کے مین گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ملازم خدا بخش نے ان پر چھتری کا سایہ کر رکھا تھا۔ ماموں مراد، احسان اور دیگر افراد برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ نور نے ایک بار پھر کمرے کی کھڑکی تھوڑی سی کھول دی تاکہ باہر کی آوازیں سنی جاسکیں۔ چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ، تائی راحت اور دیگر خواتین بھی اس ادھ کھلی کھڑکی کے پاس آ گئیں۔ لوہے اور کھڑکی کے اس مضبوط گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ نور کے تایا ابا نے شاید یہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا مگر اسی دوران میں حویلی کا پرانا ملازم فدا حسین لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”نہیں ماما!“ وہ ہراساں آواز میں بولا۔ ”دروازہ نہ کھولیں۔ مجھے ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔“

”تو پھر؟“ تایا ابا کی آواز نور وغیرہ کے کالوں تک پہنچی۔ فدا حسین آگے بڑھا اور اس نے گیٹ میں ایک جانب موجود وہ چھوٹا سا روزن کھول دیا جس میں سے باہر جھانکا جاسکتا تھا۔

تایا ابا اس روزن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے باہر کی سے مخاطب ہو کر کہا۔ جواب میں چودھری طغزل کی بلند آواز سنائی دی۔ ”دروازہ کھولو غلیل! ہم تم سے بات

کرنے آئے ہیں۔“

”بات کرنے کا یہ کون سا وقت اور طریقہ ہے۔“ تایا غلیل نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ”یہی طریقہ ہے..... یہی طریقہ ہے۔“ ایک اور مگر جدار آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً طغزل کے بڑے بیٹے ابدال کی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا، کوئی چیز گیٹ سے ٹکرائی اور ملازم فدا حسین نے لپک کر روزن کو بند کر دیا۔ جونہی روزن بند ہوا گیٹ کو دھکیلا جانے لگا اور اس پر تھوڑے سے برسنے لگے۔ چودھری طغزل کی لگاڑ سنائی دی۔ ”دروازہ کھولو غلیل! نہیں تو تو تو دیں گے ہم۔“

اب نور کے ابا جان، ماموں مراد اور تایا زو بھائی شرنیل اور عثمان وغیرہ بھی بارش کی ہر داک کے بغیر احاطے میں نکل آئے تھے۔ رکھوالی کے کتوں نے جیسے شدید خطرے کی بو سٹھ لی تھی اور مسلسل شور مچا رہے تھے۔ حویلی کی چودہ فٹ بلند باؤنڈری وال کی دوسری جانب بیسیوں افراد کے لگاڑے سنائی دے رہے تھے۔

نور کے ابا جان نے ماموں مراد کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ”مراد! ٹیلی فون کرو..... پولیس چوکی میں فون کرو۔“

ان کی آواز یقیناً باہر بھی سنی گئی تھی۔ باہر سے چودھری طغزل کی دہاڑ سنائی دی۔

”مولوی مہرا! خیریت چاہتا ہے تو دروازہ کھلوادے۔ ورنہ آج سارے انگلے پچھلے حساب برابر ہو جائیں گے۔ ابھی اسی وقت۔“

یہی وقت تھا جب نور نے دیکھا کہ ماموں مراد کا من روم کی طرف سے گھبرائے ہوئے نکلے۔ پھپھو حاجرہ نے کھڑکی میں سے پوچھا۔ ”کیا ہوا مراد؟“

وہ دانت پیس کر بولے۔ ”حرا مزادوں نے فون کے تار کاٹ دیے ہیں۔“

”ہائے اللہ! اب کیا ہو گا؟“ پھپھو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

ماموں مراد جواب دے بغیر احاطے کی طرف چلے گئے۔

اسی دوران میں حویلی کی بالائی چھت پر سے چوکیدار گل محمد نکلا۔ ”مہرا صاحب! یہ لوگ سیرمھی لگا کر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

تب نور اور دیگر عورتوں نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا..... گیٹ کے دونوں چوکیدار لائیں سونت کر باؤنڈری وال کی طرف لپکے۔ باؤنڈری وال کے بالائی

شکست کی فتح

ہو گئے تھے۔ وہ گندی گالیاں بک رہے تھے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

زیادہ تعلق نہیں تھا مگر اس موقع پر اس کا دل بھی خزاں رسیدہ
ہوتے کی طرح لرزنے لگا۔

دوسری منزل سے وہ منٹگو واضح سنائی دینے لگی جو تاپا ابا اور چودھری ظفرؔ وغیرہ کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ منٹگو بڑی بلند آواز میں ہو رہی تھی، وجہ یہی تھی کہ چودھری ظفرؔ گیٹ کی دوسری طرف تھا۔ چودھری ظفرؔ دھاڑ رہا تھا۔ ”اوئے مہرا! دعا کیوں دے اس عورت کو جس کی وجہ سے اب تک بچے ہوئے تھے تم۔ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے تو نبی کم تھا۔“ (وہ اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا)

نور کے تایا ابا نے کہا۔ ”تو پھر اب کیا ہو گیا ہے
چوہری؟ اب کیوں کر رہے ہو یہ سب کچھ؟ کیوں طوفان
کھڑا کر رہے ہو؟“

”اب وہ نہیں رہی۔ وہ چلی گئی ہے۔ مرگئی ہے، ممبر کا گھونٹ کی کر اور اس کے ساتھ ہی وہ بات بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب ہمیں اپنی منگ چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ہم کھا پری ہیں اور کھا پری اپنی بات دیا بنے کے لیے سو سال تک بھی انتظار کرتے ہیں۔“

”فط بات نہ کرو چودھری! تم چنگی طرح جانتے ہو، کوئی مٹکی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک اڑنی اڑتی تھی جس کو تم نے بنگلہ بنایا اور اب تو وہ بات بھی ختم ہو چکی تھی..... سب کو پتا ہے کہ.....“

غلغل میں ہوتی تھی بات ختم..... نہیں ہوئی تھی۔“ غفلت
خلیل مہرا کی بات کاٹ کر دواڑا۔ ”تم مولویوں کو کیا پتا کہ ہم
نے کیا کیا باتیں سنیں ہیں لوگوں کی۔ کہاں کہاں ہماری پک
گری ہے اس رشتے کی وجہ۔۔۔ زولی، بے غیرتی کے طعنے
سنے ہیں ہم نے۔ بس اس ماں کی وجہ سے چپ تھے۔“

طغفل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سابق ایمر الحلی اے سکندر رولا۔ ”مولوی اشفاق! اب بھی ہم تیری بیٹی کو اٹھانے کے لیے نہیں دیا ہے۔“ کے لیے آئے ہیں۔ شرع کے مطابق اسے وڈی میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ اسے نوں (بہو) بنانا ہے ہم نے۔ اپنے ان غنڈوں کو باز کر جوائیں چلا رہے ہیں۔ درنہ پھر فساد ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جو ہم نہیں چاہتے۔“

زور سے بجلی چمکی اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار دور تک روشن ہو گئے۔ نور کی نگاہوں نے ایک چیراں کن منظر کی جھلک دیکھی۔ ایک سفید گھوڑی پر ایک شخص سہل

سرے پر دو انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً یہ دینی افراد تھے جو اندر گھسنے کی کوشش میں تھے۔ چوکیدار نے بے دریغ ان پر لاثمیاں برسائیں دونوں پیو لے اوجھل ہو گئے۔ اب صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کھلی لڑائی کی شکل بن گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس صورت حال میں فائرنگ یا ہوائی فائرنگ بھی شروع ۔۔۔ ہو جاتی مگر حولی میں اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا اور شاید باہر والوں کے پاس بھی نہیں تھا۔

ماموں مراد، شرجیل اور عثمان وغیرہ سراپا آتش بن گئے تھے۔ ماموں مراد نے ملازموں کو بھی ساتھ لیا اور جوہلی کی "لوروف" پر چلے گئے۔ یہاں سے وہ کسی بھی ایسے شخص کو روک سکتے تھے جو سامنے سے ہیر دنی و پوار پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ باہر سے سنائی دینے والا شور و غل بڑھتا جا رہا تھا اور پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ جوہلی کی چاروں طرف موجود ہیں۔ جوہلی میں مہراٹھی کے قریب پندرہ مرد اور بیس عورتیں تھیں۔ لاہور سے آنے والے سات آٹھ مہمان جوہلی کے مہمان خانے میں بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ جوہلی کے ملازم تھے جن میں ایک مالی، اس کے دو جوان بیٹے، خاناماں اور چوکیدار وغیرہ شامل تھے۔

تین چار منٹ کے اندر سب لوگوں کو صورت حال کی شدید جنگیں کا احساس ہو گیا۔ شرجیل کو جب پتا چلا کہ کچھ افراد دو بائیں سیزمیاں لے کر حویلی کی عقبی دیوار کی طرف گئے ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ادھر والی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے ان لوگوں پر انٹین وغیرہ برساتیں اور انہیں اور نہیں چڑھنے دیا۔

اور انہیں اپنی طرف سے کہتا تھا۔
 غمخواروں کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ دادی اماں بھی
 آگئی تھیں اور انہیں دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ انہیں دل کا
 دورہ پڑ جائے گا۔ وہ سرتاپا لرزنے لگی تھیں۔ باہر بارش بھی
 ہو گئی تھی، تاہم گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور احاطے کے مناظر
 روشن ہو جاتے تھے۔ مہرن، نور اور بسمہ زینے چڑھ کر دوسری
 منزل پر آ گئیں۔ یہاں سے منظر زیادہ وضاحت سے دکھائی
 دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نور کا دل بیٹھ گیا کہ اس تاریک سنسان
 رات میں ان کی حویلی سے باہر نہ پھرے ہوئے دیہاتوں کی
 ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کپڑاٹیاں اور
 چٹلے لوگوں والی لٹائیاں چمک رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں
 پرائی طرزی برچھیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اسلحہ تھانے میں
 جمع ہو چکا تھا ورنہ یقیناً وہ بھی موجود ہوتا۔ ان لوگوں کی
 بھڑکوں اور لٹکاردوں سے پتا چلتا تھا کہ ان میں سے کئی نئے
 میں ہیں۔ شاید خشت باری سے ان کے کچھ سامنے زخمی بھی

باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد چمکیلے کپڑوں والے کچھ لوگ براتیوں کی طرح موجود تھے۔ سہرے والا شخص یقیناً ابدال ہی تھا۔ نور کے سینے میں دل جیسے ٹھہر گیا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا۔ اس نے کن نگھیوں سے ہمسہ کی طرف دیکھا، وہ شاید یہ منظر نہیں دیکھ پائی تھی مگر مہرین کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے وہ جھلک دیکھی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے جتنی وہ سمجھ رہے ہیں۔

”یا اللہ رحم کر۔“ نور کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اشفاق مہرانے آگے بڑھ کر کہا۔ ”کچھ شرم کرو چودھری۔ کیا یہ طریقہ ہوتا ہے بیٹیوں کو بیاہنے کا۔ تمہاری دہی کی برات اس طرح آئے تو کیا تمہیں قبول ہوگی؟“

”میری دہی کی برات اس طرح نہیں آئے گی مولوی اشفاق، کیونکہ میرے منہ میں زبان ہے۔۔۔۔۔ کسی پلید جانور کا چمڑا نہیں۔ ہم نے کل بھی تمہیں سمجھایا تھا۔ اب یہ کام ہوتا ہی ہے، تم چاہو تب بھی، نہ چاہو تب بھی۔ چنگا بھی ہے کہ دروازہ کھول دو اور کڑی کو تیار کرو۔ نکاح خواں ساتھ ہے۔ ابھی سب کچھ ہوگا، ابھی اسی وقت۔“

یہی وقت تھا جب دائیں طرف سے پھر کچھ افراد نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لٹھ بردار تیار تھے، وہ لپکے اور اندھا دھند لٹھیاں برسا کر انہیں نیچے کرا دیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد گھبراؤ کرنے والوں کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے جیسے گیٹ پر ہلائی بول دیا تھا۔ انگریزوں کے دور کا یہ قدیم گیٹ کسی قلعے کے دروازے جیسا تھا۔ باؤنڈری وال کی طرح اس کے اوپر بھی نوکدار آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اوپر سے بند تھا اور اسے بھاندا نہیں جاسکتا تھا۔ درجنوں افراد ایک ساتھ مل کر اسے دھکیلنے لگے اور وزنی چیزوں سے ضربیں لگانے لگے۔ یہ دہشت ناک مناظر تھے۔

ماموں مراد بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ وہ نور سمیت تینوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ چلو نیچے چلو۔ جب تک ہم نہ کہیں کوئی کمرے سے باہر نہ نکلو۔“ وہ انہیں لے کر نیچے آگئے۔ نیچے بھی کھرام ساچا ہوا تھا۔ آبی بتول بے ہوش ہو گئی تھیں۔ چھوٹی ای ان کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”آنکھیں کھولو، بتول! ہوش کرو۔“ پھوپھا جرہ نے بے تاب ہو کر اسے جھجھوڑا۔

اس کی آنکھیں بند رہیں، تاہم وہ ہولے ہولے کرا رہے تھی۔

”اب کیا ہوگا مراد؟“ تائی راحت نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا۔۔۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔۔۔ ہمسہ کی بات کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہمسہ کے کشتے کی۔۔۔۔۔؟“

”میں دوں گا ان کو رشتہ، بڑی اچھی طرح دوں گا۔“ مراد پھنکارا اور پھر بچکن کے اندر سے ایک بڑی چھری نکال لایا۔ ”میں آستیں نکال دوں گا اس کتھر ابدال کی اور اس کے باپ کی۔ مار ڈالوں گا سب کو۔“

وہ جیسے غصے سے دیا نہ ہو کر احاطے کی طرف بڑھا۔ عورتیں ایک ساتھ چلا گئیں۔ ان کی پکار سن کر چوکیدار اور دیگر افراد مراد کی طرف متوجہ ہوئے۔ مراد کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ گیٹ کا چھوڑا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہتا ہے اور باہر نکلتے ہی ابدال کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ شرجیل چھی اس کے عقب میں تھا۔

تین چار افراد نے مراد سے لٹ کر اسے روک لیا اور سمجھ کر واپس برآمدے میں لے گئے۔ تائی غلیل نے مراد کو بری طرح ڈانٹا۔ پھر انہوں نے نور کے ابا جان سے کہا۔ ”اشفاق! تم ان لڑکوں کو لے کر اندر چلے جاؤ۔ ہم بات کر رہے ہیں۔ اس طرح کام اور خراب ہو جائے گا۔“

جھپٹ پر سے ہوئے والی خشت باری اب رک گئی تھی اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ فی الحال باہر سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش بھی نہیں ہو رہی تھی۔

نور نے دیکھا، تائی ابا اور مہمان خانے سے نکلنے والے دو بارعب افراد گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ گیٹ کا چھوٹا وزن کھلا ہوا تھا اور کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ یہ بات چیت یقیناً ٹکرا کر کی شکل میں تھی لیکن آوازیں بلند نہیں تھیں۔ حویلی کے زیادہ تر مرد اور لڑکے چھپتے پر تھے۔ اگر باہر موجود مشتعل لوگوں میں سے کوئی باؤنڈری وال کی نوکدار سلاخیں پھلانگنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے روکنے کے لیے تیار تھے۔

چند منٹ بعد تائی ابا جان اور ابا جان سے ہوئے منہ سے حویلی کے اندرونی حصے میں واپس پہنچ گئے۔ ملازم خدا بخش کے ہاتھ میں ایک گول پشتری تھی۔ تانبے کی اس منش پشتری میں قریباً ایک درجن دیے پڑے تھے۔ مٹی کے ان دیوں میں سے کچھ لٹے تھے اور کچھ سیدھے۔ خدا بخش نے دل گرفتہ انداز میں یہ پشتری میز پر رکھ دی اور بیزار سا ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ”یہ کیا ہے تائی ابا؟“ بتول نے سراپمہ

کو مانتے ہی نہیں۔“

فدا حسین نے مدھم آواز میں کہا۔ ”کناخ خواں مولوی شمس بھی ساتھ ہیں۔ وہ گواہی دے رہے ہیں کہ نیاں ہو اے۔“

”یہ سب کیا بے ہودگی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔“ شرنیل ترخ کر بولا۔ ”ایک طرف یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امن والے کا میلا ہے اور اپنے ہتھیار جمع کراتے ہیں، لڑائی جھگڑے کو بڑا گناہ سمجھتے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟“

خدا بخش مری مری آواز میں بولا۔ ”اس لیے تو یہ نیاں وغیرہ کیا ہے ان لوگوں نے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس رسم کے بعد انہیں یہ سب کچھ کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔“

مراد نے نفرت سے ایک طرف قہقہہ دیا۔

شرنیل نے کہا۔ ”پرسوں ایک متولی کہہ رہا تھا، میلے پر کبھی بارش نہیں ہوئی۔ یہ مزار والے کی کرامت ہے اور شام کو جب بارش شروع ہوئی تو وہی متولی اسے رحمت کہہ رہا تھا اور خیال ظاہر کر رہا تھا کہ اس مرتبہ اوپر والے نے زائروں کے گناہ دھوئے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”بس یہ وہم اور بے کار عقیدے ایسے ہی لمبی لمبی جڑوں والے ہوتے ہیں۔“ تایا ابانے کہا۔ ”بے شک یہ ایک اللہ والے کا مزار ہے اور وہ بلند پایہ ہستی تھے مگر ایسی پاک جگہوں پر اپنے کاروبار چکانے والے لوگ انت نئی حکایتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔“

مراد نے غصے میں فطرتی کو ہاتھ مار کر دور ہٹا دیا۔

”میں نہیں مانتا ان فالوں شالوں کو۔ یہ لوگ بس بد معاشی کر رہے ہیں۔ زور دکھا کر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ ہماری بیٹی کوئی گامروسی نہیں جو یہ اکھاڑ کر لے جائیں گے۔ ان کو ہماری لاشوں پر سے گزرتا ہوگا۔“ وہ ہمیشہ سے غصے والا تھا اور اس وقت اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

مولوی اشفاق مہرا بھی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ان کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور سانس بھولی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے تھوڑی دیر پہلے بڑے بھائی خلیل مہرا نے انہیں بھانے سے کمرے میں بھیج دیا تھا۔

خلیل مہرا نے مراد کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ”یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے، بارش ہو رہی ہے۔ نہ اس طرف کسی نے آنا ہے نہ جانا ہے۔ ہم کو یہ لوگ باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے کچھ سوچنا ہوگا۔“

لہجے میں پوچھا۔

تایا ابانہ مرم رہے پھر خدا بخش سے بولے۔ ”تم ہی بتاؤ چاہا۔“

خدا بخش کسمیرے آواز میں بولا۔ ”اس کو ”نیاں“ کی رسم کہتے ہیں جی۔ پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ کچھ لوگ مانتے ہیں کچھ نہیں سمجھتے۔“

”یہ بے کیا؟“ چھوٹی امی زلفت نے استفسار کیا۔

خدا بخش نے پریشان نظروں سے نور کی دادی اماں اور پھوپھا جاجرہ کی طرف دیکھا۔ دادی اماں کا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ تانبے کی طشتری اور دیوں کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

خدا بخش نے اکتاتے لہجے میں کہا۔ ”رشتے ناتے یا پھر لین دین کے معاملے میں جب کوئی بڑا جھگڑا ہوتا ہے تو حضرت امنان والے کی رائے جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھالی میں بارہ دیے رکھے جاتے ہیں اور رکھنے والا یہ کہتا ہے کہ اگر وہ حق پر ہے تو پھر دیے اس پر گواہی دیں۔ یہ دیے مزار کی ایک محراب میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ وہی سرخ محراب ہے جو مزار کی دائیں جانب پتھر کی جالی کے پاس نظر آتی ہے۔“

”محراب میں رکھنے سے کیا ہوتا ہے؟“ انگلیڈ پلٹ احسان نے پوچھا۔

”یہ محراب دراصل ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں ہر وقت ہوا آتی رہتی ہے۔ شام کے بعد چلنے والی ہوا اس میں سے کچھ دیے بچھا دیتی ہے اور کچھ جلنے رہتے ہیں۔ اگر زیادہ دیے جلتے رہتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیاں لینے والا حق پر ہے۔۔۔۔۔ یہاں بھی چودھری طفیل نے نیاں لیا ہے اور کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔“

”یہ دیے جو اوندھے پڑے ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟“ بیکم زلفت نے پوچھا۔

”یہ وہ ہیں جو بجھ گئے تھے۔“ خدا بخش نے جواب دیا۔

نور نے اوندھے پڑے دیے گئے، وہ چار تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چار دیے بجھے تھے اور آٹھ جلتے رہے تھے۔ یہ فال ہی کی کوئی قسم تھی۔ اس کے بارے میں اور اس طرح کی کئی رسموں کے بارے میں نور نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔

شرنیل بولا۔ ”یہ تھالی بھی تو یہ غیبت ہی لے کر آئے ہیں۔ ہمیں کیا پتا کہ کتنے جلتے اور کتنے بجھے اور آپ خود ہی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اس نیاں شیاں

رہی۔ بارش کی بو چھاڑوں ہی کی طرح کبھی لہجے مدہم اور کبھی تند و تیز ہو جاتے تھے۔ شرجیل اندر آیا تو سب عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ”کیا بات ہوئی شرجیل؟“ تانی راحت نے بیٹھے سے پوچھا۔

”بس ہو رہی ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

”کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ..... شاید..... کوئی اچھا مشورہ ہی دے دیں۔“ بیگم زلفت نے استفسار کیا۔ خالہ عریفہ نے بھی ساتھ دیا۔ سب کے رنگ زرد تھے۔

”وہ خبیث اپنی بات پڑا دے ہوئے ہیں.....“ شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر ہمسہ کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بے چاری پہلے ہی ہلدی ہو رہی تھی۔

خالہ عریفہ ہمسہ کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شرجیل نے جو کچھ بتایا اس سے ہٹا چلا کہ چوہری طفیل اور اس کے ہمنوا ہمسہ کے حوالے سے ایک اچھوتی چھپے نہیں رہے۔ وہ اسی وقت نکاح اور رخصتی چاہ رہے ہیں۔ ابا جان، چچا جان اور دیگر اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم آج رات کے لیے اس معاملے کو ٹال دیا جائے اور کل پچپاتیس میں اس کا حل نکالا جائے لیکن یہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

باہر سے ایک دم شور بلند ہوا اور ماروھاڑ کی آوازیں آئیں۔ لڑکیاں چلا آئیں۔ شرجیل بھی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں باقاعدہ لڑائی کا منظر تھا، باہر کے لوگوں نے جس جگہ سے باؤنڈری وال کی نوکدار گرل اکھاڑی تھی، اب وہاں سے کچھ افراد اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد لاشیوں اور کلہاڑیوں سے ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ بجلی چمکی اور چند ساعتوں کے لیے قرب و جوار روز روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ نور نے دیوار کا منظر دیکھا۔ یہ ایک جگہ منظر جیسا تھا، کم از کم چار پانچ افراد تھے جنہوں نے چوٹ سے بچنے کے لیے سروں پر بھاری پگڑیاں کس رکھی تھیں اور دیوار پھانڈنے کی کوشش میں تھے۔ ان پر چھت پر سے اینٹیں برس رہی تھیں اور احاطے میں موجود افراد کی لاشیوں سے انہیں بچنے کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ بات چیت ناکام ہو گئی ہے اور اب وہ لوگ ہر صورت اندر گھسنا چاہتے ہیں۔

ان کے لکارے خوفناک تھے۔ وہ گندی گالیاں دے رہے تھے اور اندر موجود عورتوں کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

مراد نے ایک بار پھر طیش بھری نظروں سے تانے کی طشتری اور اس میں سیدھے اور اوندھے پڑے مٹی کے دیوں کو دیکھا اور بولا۔ ”لیکن میں ان بے کار رسوں کو نہیں مانتا۔ یہ لوگ بس اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے ان رسوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ رسم نہ ہوئی تو کوئی اور ہوئی..... کوئی اور فال ہوئی۔ ان لوگوں نے ہم پر چڑھا لی کرنا ہی تھی۔“

عمر سیدہ ملازم خدا بخش نے کہا۔ ”بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان رسوں کے بہت سے نقصان ہیں پر کچھ فائدے بھی تو ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ اگر اسلحہ جمع کرانے کا رواج نہ ہوتا اور لوگ اس پر پورا یقین نہ رکھتے تو..... اب تک شاید یہاں بہت نقصان ہو گیا ہوتا.....“

”نقصان کیا، دونوں طرف سے کئی لاشیں گر گئی ہوتیں۔“ غلیل مہرا صاحب نے تائید کی۔

یہی وقت تھا جب احاطے کی طرف سے کچھ ٹوٹنے اور گرنے کی آواز آئی۔ رکھوالی کے کتوں نے شور مچایا اور مختلف آوازیں بھی سنائی دیں۔ چند کینڈہ بعد بوڑھا ملازم فدا حسین ہانپا ہوا اندر آیا۔ غلیل مہرا سے مخاطب ہو کر بولا۔

”مالک! انہوں نے رسے ڈال کر ایک طرف سے دیوار کا جھنگڑا گرا دیا ہے..... لگتا ہے کہ وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔“

غلیل مہرا، اشفاق مہرا، مراد اور دیگر افراد احاطے کی طرف لپکے۔ نور، مہرین اور دیگر لڑکیوں نے کھڑکی سے جھانکا، صاف طور پر تو دکھائی نہیں دیا مگر اندازہ ہوا کہ بلند باؤنڈری وال کے پالائی حصے پر لگی نوکدار سلاخوں والی باڑ کا کچھ حصہ دکھائی نہیں دے رہا۔ وہاں سے باڑ اکھاڑ دی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ موٹے آہنی تار کی مدد سے اس باڑ پر کندھائی گئی تھی اور اس کندھ کو جھکنے دے دے کر قریباً پندرہ بیس فٹ چوڑائی کا ایک کھڑا نیچے گرا دیا گیا تھا۔ اب اس حصے سے باؤنڈری وال پر چڑھنا آسان ہو گیا تھا۔ بہر حال ابھی یہاں سے چڑھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید یہ کارروائی صرف دباؤ ڈالنے کے لیے کی گئی تھی کہ اگر ان کی بات نہیں مانی گئی تو وہ ہر حد تک جائیں گے۔

گیٹ کے مختصر روزن میں سے ایک بار پھر دو طرفہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ مستقبل روزن چوڑائی میں دو فٹ کے قریب اور اونچائی میں صرف سات آٹھ انچ تھا۔ تانے کی طشتری بھی اسی خلا سے اندر بھیجی گئی تھی۔

گیٹ پر ہونے والی گفتگو قریباً دس منٹ جاری

یہ بسمہ کے لیے شادی کا جوڑا بھیجا گیا تھا۔ نور کے ابا جان نے لفافہ کھما کر دیوار پر دے مارا تھا اور بے دم سے ہو کر بسمہ کے پاس قالین پر بیٹھ گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منظر نور کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا جب اس نے چھوٹی امی زلفت کو سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ ابا جان کے پاس بیٹھے اور انہیں سمجھاتے دیکھا تھا۔ ابا جان جھلا کر بولے تھے۔ ”تو کیا کروں میں؟ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے..... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں۔ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے، اپنے پکے ٹنڈے کر لو۔“

”نہیں جی..... لیکن..... جو کچھ بھی ہو رہا ہے..... اور جو کچھ ہونے والا ہے..... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی۔“

”اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟“ اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔

”..... جو کچھ بھی ہے، وہ لوگ..... اپنی بسمہ کو بوبناتا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں..... لیکن..... اگر خدا نخواستہ..... یہ لوگ اندھس آئے اور..... دو چار موتیں ہو گئیں..... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اسی دوران میں دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ حویلی کی سبھی ہوئی عورتیں بے طرح چلا کھٹی تھیں اور مرد سیزیموں کی طرف لپک گئے تھے۔ بعد ازاں پتا چلا تھا کہ شریں، عثمان اور غیاث وغیرہ نے ملازموں کے ساتھ مل کر حویلی کی خستہ برساتی کی ایک دیوار گرا دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر دوبارہ مارا ماری کی نوبت آئے تو چھت سے خستہ باری کرنے کے لیے اینٹیں اور روڑے مہیا ہو سکیں۔

اگلے ایک گھنٹہ میں چھوٹی امی زلفت اور پھوپھو حاجرہ وغیرہ نے ابا جان اور تایا کو نیم رضامند کر لیا تھا۔ کوئی دوسری راہ بھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ مراد شہید زخمی تھا اور حالات اتنے سنگین تھے کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ حکم حاکم مرگ مفاجات والی صورت حال تھی اور پھر نور نے وہ منظر بھی دیکھا جب اشک بار چھوٹی امی اور خالہ عریفہ نے، باہر سے بلند ہونے والے مہر غضب لاکاروں کی گونج میں سیلا دو پٹاروٹی سسکتی بسمہ کے سر پر ڈالا اور اس کے لرزاں ہاتھوں پر مہندی لگانا شروع کی۔

بسمہ، بتول اور ماموں کی لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ تائی راحت سجدے میں گر گئیں اور جان آبرو کی سلامتی کے لیے گونگڑاٹے لگیں۔ واوی اماں کا برا حال تھا اور ان کو سنبھالتے سنبھالتے پھوپھو حاجرہ خود بھی نیم جان ہو رہی تھیں۔

حویلی کے مردوں نے، جن میں باہمت ملازم بھی شامل تھے، جان پر کھل کر اندر کھنسنے والوں کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کوشش میں چار پانچ افراد کو شدید زخم آئے لیکن جس کو شدید ترین چوٹ لگی وہ نور کے ماموں مراد تھے۔ باہر سے جوابی خستہ باری بھی ہوئی تھی۔ ایک اینٹ لگنے سے ان کے سر پر گہرا زخم آ گیا تھا..... اور بالائی ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھے۔

انہیں اندر لایا گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ بہر حال نور اور مہرین کی حد تک حوصلے میں رہیں۔ ایک نرپوتھراپسٹ کی حیثیت سے مہرین میڈیکل کی سوجھ بوجھ سمجھتی تھی۔ حویلی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ مہرین نے سب سے پہلے مراد کے سر سے بیٹے والا خون بند کیا اور پھر عارضی بینڈج کر دی۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”فوری خطرے کی کو تو کوئی بات نہیں..... مگر ماموں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہوگی۔“

حویلی کے سامنے ”لوروف“ پر حویلی کے آٹھ دس افراد موجود تھے۔ اگر باؤنڈری وال کے شکستہ حصے سے کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے موثر طریقے سے روکا جاسکتا تھا مگر یہ دفاع قطعی و یرتک چل سکے گا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

نور نے دیکھا، بسمہ سگری سٹی ہوئی ایک سبھی چڑیا کی طرح کونے میں جمی ہوئی تھی۔ گاہے بگاہے وہشت زدہ نظروں سے اپنے بڑوں کے چہرے دیکھتی تھی۔ اسی اثنا میں چھوٹی امی زلفت اور پھوپھو حاجرہ نے اس کے ابا جان کو اپنے ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کوئی خاص قسم کی گفتگو کر رہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد تینوں باہر آ گئے۔ ابا جان کا چہرہ بدستور کرب کی آماجگاہ تھا۔ یہی وقت تھا جب ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا تھا اور اس نے پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ ابا جان کی طرف بڑھایا تھا۔ اس لفافے میں سرخ رنگ کا کوئی کاغذ اکرپڑا جھلک دکھارہا تھا۔ خدا بخش نے نور کے ابا جان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔“

دیواری سے ملا ہوا تھا۔ کھا پر یوں کے لٹکا رہے، گالیاں، دھاڑیں، ہر آواز ان کی سماعتوں کا عذاب تھی۔ صورت حال واضح ہونے میں قریب پانچ منٹ لگے۔

☆☆☆

برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنی تھی۔ نور نے دیکھا کہ ملازمین نے کسی کا خونچکاں جسم اٹھا رکھا ہے اور اسے مردانے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھ کر کانپ مٹی۔ یہ حویلی کے سب سے پرانے ملازم فدا حسین کا بیٹا رشید تھا۔ ہاں نور کی نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں، وہ رشید ہی تھا۔ غالباً اس کے سینے پر کوئی بہت بڑا گھماؤ تھا جس نے اس کے پورے بدن کو لپورنگ کر رکھا تھا۔ یہ محسوس کر کے نور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ رشید شاید زندہ نہیں ہے۔

خواتین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جا رہا تھا لیکن نور نے اپنے تایازاد عثمان کو بیڑھیوں کے نیچے ٹھہرایا۔ ”آخر کیا چھپا رہے ہو تم؟“ وہ اس کے بازو میں اپنے ناخن گھساتے ہوئے بولی۔

اس نے گول مول بات کرنے کی کوشش کی مگر نور نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ ”آخروہ رہا کسی آواز میں بولا۔“
”ان حرامزادوں نے مار ڈالا ہے اس کو..... جان لے لی ہے اس کی۔“

نور چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی پھر ہمت کر کے بولی۔ ”مگر ہوا کیا ہے؟“

جواب میں تایازاد عثمان نے دلدوز لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا..... مہمان خانے کے عقبی کمرے باؤنڈری ڈال سے ملے ہوئے تھے۔ فدا حسین کے بیٹے رشید نے یہاں سے نکلنے اور پولیس چوکی تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ وہ دلیوری کے ساتھ مہمان خانے کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے باہر چھلانگ لگا کر اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی قسمت اچھی ہوئی تو شاید وہ نکل جاتا مگر ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھ لیا گیا۔ وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس کے پاس وہی مراد دالی چھری تھی، اس نے چھری چلا کر خود کو چھرا تاجا یا مگر..... پھرے ہوئے شرابیوں نے اسے کھانڈیوں اور چھروں سے کاٹ ڈالا۔ پھر اس کی لاش دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دی گئی۔ اب وہ دھمکیاں دے رہے تھے کہ دوسروں کا شتر بھی یہی ہوگا۔ اندر کھس آئے تو ایک ایک کو مار ڈالیں گے۔

نور نے سنا، باہر سے بلند ہونے والی آوازوں میں دھشت نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

آہ..... یہ کیسی شادی تھی..... یہ کیسا نکاح تھا؟ پنچایتوں، بیٹھکوں اور جرموں کے حکم پر یہ زنا بالجبر کے کیسے تماشے لگائے جاتے ہیں۔ جاہلیت اور انا پرستی کے حصار میں آبروریزی کے یہ کیسے کھیل، کھیلے جاتے ہیں؟ نور نے سوچا اور اس کے سر کی سیس پھٹنے لگیں۔ وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

ہاں..... اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکاکر آنکھیں بند کر لی تھیں..... اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی طویل فلم چلی تھی جو بچپن اور لڑکپن سے شروع ہوئی۔ مورال دلی گاؤں کے کئی کوچوں سے ہو کر نکلی اور لاہور پہنچی..... وہاں کی شاہراہوں، درس گاہوں اور کھیل کے میدانوں سے ہوتی ہوئی، سو میٹر کے بچان خیر ٹریک تک آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ماضی کی کھڑکی سے یادوں کا کتا بڑا ہجوم دیکھا تھا..... اور اب ایک بار پھر وہ تصور کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں موجود تھی۔ حقیقت جو دسمبر کی اس خوفناک رات میں بے حد بے رحم اور لڑہ خیر تھی۔ حویلی چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ ارد گرد دور تک کوئی مددگار نہیں تھا اور نہ کسی کو خبر تھی کہ اس برسات کی رات میں یہاں بارش نالے کے کنارے اس تنہا حویلی پر کیا کڑر رہی ہے۔ بجادو کی بس ایک ہی شکل رہ گئی تھی۔ بسہہ کوسرخ جوڑا پہنایا جاتا اور اسے ان زبردستوں کے حوالے کر دیا جاتا جو باقاعدہ برات کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ وہ اسے لے جاتے۔ بدست چودھری زادہ آج رات ہی شادی کے نام پر اسے روند ڈالتا۔

ساتھ والے کمرے سے بسہہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ چھوٹی امی، پھوپھا جہا اور تائی وغیرہ کی سرگوشیاں بھی جو اسے حوصلہ دینے میں مصروف تھیں۔ نور نے وال کلاک کی طرف دیکھا..... آہ، ابھی صرف دو بجے تھے۔ صبح بڑی دور تھی۔ قرب و جوار میں بجلی ہوئی سنسان رات نے اپنے بے مہر پنچہ گاڑ رکھے تھے۔ لٹی ووق، سنسان اور پھٹکانی ہوئی رات۔

لیکا ایک دوبارہ زبردست شور سنائی دیا۔ نور کے ابا جان، تایا ابا اور ملازمین احاطے کی طرف لپکے۔ نور کی رگوں میں خون غمزدہ ہونے لگا۔ عورتیں سسکنے لگیں۔ شور حویلی کے دائیں پہلو میں مہمان خانے کی جانب تھا۔ یہ مہمان خانہ (جو چندہ میں سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا) حویلی کی بیرونی چار

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پیکھلہری
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

کے لیے دنیا بھر کا مسٹر اور بی بی

اجمل زیدی

ملتی
ایوارڈ
بولڈر



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD

اسلام آباد



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

9- اپریل 30 تا مئی
9- اگست 30 تا ستمبر
9- دسمبر 30 تا جنوری
مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، پلاٹ G/B/1
سرگودھا (ضلعی جاک آباد اسلام آباد)
فون: (061) 2854595 - 2255880
موبائل: 0300-8566188
تھیں: 2261636



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

گلف سینٹر

14- فروری تا 27 فروری

14- جون تا 27 جون قیام

14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

ہیٹل السیج

11 تا فروری

11 تا جون قیام

11 تا اکتوبر قیام

ملتان

کراچی

ہیٹل سلیو سینگھ

12 مارچ تا 6 اپریل

28 جولائی تا 6 اگست قیام

28 نومبر تا 7 دسمبر

لیوچون سینٹر

13 مارچ تا 27 مارچ

13 جولائی تا 27 جولائی قیام

13 نومبر تا 27 نومبر

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

آگئیں۔ انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر ان کی اپنی ہی نگاہوں کو بھر دسائیں ہوا۔ کیا وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟ وہ مہمان خانے کی چھت سے نیچے پرالی کے ایک ڈھیر پر بھلا تک لگا رہی تھی..... ہاں، یہ وہی تھی..... یہ وہی نا فرماں تھی، وہی سرکش تھی.....

مہرین نے بھی بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی فلم ہوتی اور یہ منظر سلوموشن میں دیکھا جاتا تو بے حد سسٹنی خیز ہوتا۔ دیکھنے والوں کے ردِ تکتے کھڑے کر دیتا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی پرالی کے ڈھیر پر گر رہی۔ وہاں سے ابھی.....

سنبھلی..... اور بھاگی۔ ہاں..... وہ بھاگی، اس کے سامنے تھور زدہ طویل میدان تھا۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھے۔ انہوں نے لکارے بلند کیے اور اس کے پیچھے لپکے..... ابھی کچھ دیر پہلے وہ فدا حسین کے لڑکے رشید کے پیچھے بھاگے تھے اور اسے پکڑ لیا تھا..... لیکن..... یہ رشید نہیں تھا۔ یہ نور تھی۔ یہ پاکستان کی مانی ہوئی اسپر نئز میں سے ایک تھی اور وہ بھاگ رہی تھی۔ اپنی پوری رفتار کے ساتھ۔ وہ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس نے دوپٹا کس کر کر سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جو گرز تھے۔ آج اس کا اسکارف پھسل گیا تھا اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

”پکڑو..... جانے نہ پائے۔“ ایک لڑکا بلند ہوا۔
لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چمکیں۔ تعاقب کرنے والوں کے قدم برق رفتار ہوئے، وہ اسے دوہینے کے لیے پوری طاقت سے بڑھے مگر ان کے آگے نور تھی..... اور نور کی رفتار..... بہت ہوتی ہے.....

مولوی اشفاق منڈر کے آخر تک آئے اور سینے کی پوری قوت سے چلائے۔ ”بھاگو عین النور..... بھاگو..... ان کے ہاتھ نہیں آتا عین النور..... بھاگو۔“ ان کی آواز گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔

کسی نے عین النور کا جواب نہیں سنا..... مگر مولوی اشفاق نے سنا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا..... میں آپ کی بیٹی ہوں ابا جان! آپ کی ناکارہ ترین بیٹی۔ آپ کو بہت دکھ دینے والی، مایوس کرنے والی لیکن آج میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی..... ہاں، میں نہیں کروں گی کیونکہ یہ میرا میدان ہے، یہ میرا راستہ ہے۔

”بھاگو عین النور..... بھاگو۔“ مولوی اشفاق پھر پوری طاقت سے پکارے اور یہ وہی مولوی اشفاق تھے، جنہوں نے ہمیشہ کہا تھا..... مت بھاگو عین النور۔
”رن فاسٹ..... نور! رن فاسٹ۔“ مہرین بھی چلائی۔

مولوی اشفاق مہرا اور غلیل مہرا نے مشورہ کیا۔ انہیں اب بالائی منزل، چلی منزل سے زیادہ محفوظ لگ رہی تھی۔ لڑکوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مولوی اشفاق عورتوں کو لے کر دوسری منزل پر آگئے۔ ان کی ہدایت پر نور کی دادی اماں کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور شربیل، عثمان، غیاث وغیرہ کرسی اٹھا کر دوسری منزل پر لے گئے۔ سیزمیاں چڑھتے وقت دادی اماں کو رونے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو مولوی اشفاق نے انہیں گول مول سا جواب دیا۔

یہ آوازیں دراصل فدا حسین اور اس کی بیوی کی تھیں۔ اپنے بچے کی دردناک موت نے انہیں نوحہ کناس کر رکھا تھا۔

اشفاق صاحب بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ وہ دکھ اور تشویش کی انتہا پر تھے۔ ایک طرف بے گناہ بیٹی اور اس پر ہونے والے ظلم و ستم کا تصور تھا، دوسری طرف اپنے پورے خاندان کے لیے جان اور آبرو تھی۔ وہ کچھ فیصلے نہیں کر پاتا تھا۔ بسمہ کو اس کی پچھو جاجرہ اور چھوٹی اسی نے سرخ جوڑا تک پہنچا دیا تھا مگر حتیٰ فیصلے کی ہمت ابھی تک کوئی نہیں کر پاتا تھا۔

اشفاق صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ لرزتی کانپتی بسمہ ان کی بائیں جانب اور بتول دائیں جانب تھی۔ مہرین اور ماموں زاد سلیہ ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ اشفاق صاحب نے بسمہ اور بتول کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔
”ارے نور کہاں ہے؟“ پچھو جاجرہ نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ ”نور..... نور!“ انہوں نے آوازیں دیں۔

اشفاق صاحب کی بیگم زلفت بھی اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”کہاں گئی وہ؟“ بتول نے بھی بے قراری سے کہا۔
اشفاق صاحب کچھ بڑبڑائے اور اٹھ کر برآمدے میں آگئے۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ بادل پھٹے تھے اور پوری رات کا چاند بھانکنے لگا تھا۔ اشفاق صاحب نور کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے، مہرین بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مہمان خانے کا سنگل اسٹوری پورشن دکھائی دے رہا تھا۔ چھت پر لگا ہوائی دی ائینا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اچانک ایک منظر نے اشفاق صاحب کو جکڑ لیا۔ ان کی ساری حیات جیسے سمٹ کر ان کی آنکھوں میں

تمام تر مہارت کے ساتھ فٹس لائن کی طرف بڑھ رہی تھی اور آج اس کی فٹس لائن یقیناً وہ بارش نالا تھا جس کی دوسری جانب جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھٹا سلسلہ تھا۔
ٹوپوٹا گاڑی کسی گڑھے میں پھنس کر گھوم گئی اور ڈھیروں مٹی اڑانے لگی۔ دوڑنے والوں میں بہت سے لوگ ہمت ہار کر ست پڑ چکے تھے مگر کھاپری برادری کے چند تیز طرار لڑکے اب بھی بھیڑیوں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے۔ اس تک پہنچنے کی سعی کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس دوڑ کے لیے ایک نہایت غلط حریف جن بیٹھے ہیں۔ بے شک کمزور، بے شک لڑکی۔۔۔۔۔ لیکن بے شمار اپوش کی فائز، پروفیشنل رنز۔ اس نے ایک بار پھر اپنا رخ ٹھوڑا سا پھیرا اور بھاگتی ہوئی اس بارش نالے میں اتر گئی جہاں پانی اس کی کمر سے اوپر آ رہا تھا۔ وہ جس رفتار سے دوڑی تھی، اسی ہمت سے اس نے نالے کو پار کیا اور دوسرے کنارے سے نکل آئی۔ اس کے پیچھے نالے میں کودنے والے نو جوان کھاپریوں کو ابھی کنارے تک پہنچنے میں کم از کم ایک منٹ درکار تھا۔ یہ ایک منٹ نور کے لیے بہت زیادہ تھا۔

☆☆☆

نور نے نالے کے میالے سرد پانی میں سے نکل کر کنارے پر چڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، چاندنی میں ان کھاپریوں کے ہولے صاف نظر آ رہے تھے جنہوں نے اس کے پیچھے برساتی نالے میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ وہ ابھی نصف پاٹ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ انہیں نور تک پہنچنے کے لیے کم دیش ایک منٹ درکار تھا۔۔۔۔۔ اور ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔ وہ جب بے دلی کے ساتھ بھی بھاگتی تھی تو بارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ میں سو میٹر طے کر لیتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ صانع کیے بغیر پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ اندھا دھند نہیں بھاگ رہی تھی مگر پھر بھی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس کے ارد گرد اب خود رو جھاڑیاں تھیں اور دس بارہ فٹ بلند سرکنڈے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ شاید آج اسے کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ آج اس کے کانوں میں اس کے ابا جان کی آواز پڑی تھی۔ یقیناً وہ اس کے ابا جان کی آواز ہی تھی۔ جب اس نے چاول کی چھال کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور اپنے پاؤں کو پوری رفتار سے حرکت دی تھی، اس نے مہمان خانے کی چھت سے یہ آواز سنی تھی۔ انہوں نے پکار کر اسے

اور وہ بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ چھریے بدن کی ایک لڑکی اور۔۔۔۔۔ اس کے عقب میں موت کے ہر کارے، درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم کے قریب۔ تعاقب کرنے والوں میں بڑی عمر کے لوگ بھی تھے، کڑیل جوان بھی اور بالکل نوجوان چودھری زادے بھی۔ انہیں یقین تھا، وہ حصار توڑنے والی اس لڑکی کو بارش نالے تک نہیں پہنچنے دیں گے کیونکہ بارش نالے کے پار جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھٹا سلسلہ تھا اور پھر اس سے آگے وہ راستہ تھا جو سیدھا پولیس چوکی تک پہنچتا تھا اور وہ شاید اسی رخ پر جا رہی تھی۔ وہ اس لڑکی سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کرنے میں ناکام ہوئے تو بھاگتے بھاگتے اس کی طرف چھوٹے دستے کی کلبڑیاں اور لائیاں وغیرہ پھینکنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ ان کی جھلاہٹ دیدی تھی۔ ایک لڑکی، ایک کمزور لڑکی۔۔۔۔۔ ان کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔

ہاں، قدرت ایسے ہی بارکویت میں بدلا کرتی ہے۔ ایسے ہی جاں گسل مشقتوں کا صلہ دیا کرتی ہے۔ ایک طرح سے نہ سبکی دوسری طرح سے۔۔۔۔۔ دوسری طرح سے نہ سبکی، تیسری طرح سے۔ بے شک محنتیں رائگاں نہیں جاتیں۔ جاں سوزیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ آخر صلے مل کر رہتے ہیں۔ مولوی اشفاق اپنی بیٹی کی جیت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ منڈیر کے آخری سرے تک پہنچ چکے تھے۔۔۔۔۔ ”بھاگ جاؤ نور۔۔۔۔۔ پولیس تک پہنچ جاؤ۔“ وہ بار بار کہتے تھے۔ انہوں نے مٹھیاں پہنچ رہی تھیں، ان کی آواز بیڑہ رہی تھی۔

اب ہسمہ، بٹول، سلیمہ، جھوٹی امی، پھو جا رہے اور بہت سے دیگر لوگ اس جگہ جمع ہو چکے تھے اور روشن چاندنی میں، سکتہ زدہ کرنے والی یہ انوکھی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک ٹوپوٹا گاڑی بھی نور کے پیچھے چلی۔ یہ پھولوں سے سنبی ہوئی تھی۔ شاید یہ دہی گاڑی تھی جس پر ہسمہ کو لے جایا جاتا تھا۔۔۔۔۔ زندہ یا مردہ۔۔۔۔۔ (چودھری طغزل نے یہی کہا تھا) گاڑی برق رفتاری سے نور کے تعاقب میں پہنچی تو وہ دائیں جانب کے ان محور زدہ کھیتوں میں گھس گئی جن میں کچی منڈیریں بنا کر، انہیں آباد کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی بری طرح پھد کے اور ڈمکناے لگی۔ نور اور تعاقب کرنے والوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم برق کی طرح حرکت کر رہے تھے۔۔۔۔۔ بال لہر رہے تھے۔ وہ ایک ایتھلیٹ کی

بھاگنے کا اور کھاپریوں کے ہاتھ نہ آنے کا کہا تھا..... وہی تو تھے جو اسے عین النور کے نام سے پکارتے تھے۔ بے شک یہ وہی تھے۔ اس آواز نے نور کے حوصلوں کو پہاڑ کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ آج اسے کوئی نہیں چھو سکے گا اور کوئی نہیں چھو سکا تھا۔

اب بھی وہ پوری ہمت کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس کے کپڑے سخت سردی میں نالے کے پانی سے بھیک کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے مگر شدید جسمانی مشقت کے سبب اس کے زیریں جسم کو بالکل سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فقط شانوں اور چہرے کو ہوا کے پتھڑے لگ رہے تھے۔ اسے ڈر صرف ایک ہی بات کا تھا، کہیں عقب سے پھرے ہوئے کھاپری اس پر کوئی فائز نہ کر دیں۔ ابھی تک تو خیریت مگر یہی تھی اور اسے لگتا تھا کہ خیریت ہی رہے گی۔ یہ امانالے کے میلے کے دن تھے۔ علاقے کے بدترین افراد بھی نسلوں سے چلے آنے والے رواج کے مطابق فائر ہونے والے ہتھیاروں کو چھو نہ سکتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ سیدھی پولیس چوکی کی طرف جا رہی ہے۔ کل دوپہر اس نے آسانی جمولے کی بلندی سے جو فضائی منظر دیکھا تھا، وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ پھر بھاگتے بھاگتے ایک دم ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ ڈر گئی۔ میلے کے دنوں میں علاقے میں آتشیں ہتھیار منسوخ ہو جاتے تھے۔ کیا پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہوتے تھے؟ اس بارے میں اسے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا لیکن اگر پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں تھے تو پھر..... وہ پھرے ہوئے ہجوم کو اور جنوبی کھاپریوں کو کیسے روک سکتے تھے؟

اس نے اپنی شلوار کے پانچوں کوجرابوں میں مٹھاسکر ٹراؤز کی شکل دے رکھی تھی۔ جو گزر کے تیسے بھی کس کر باندھ رکھے تھے، پھر بھی ایک جگہ اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ گرتے گرتے پٹی۔ چاندنی پھر ایک دم ادھل ہوئی تھی اور اسے تیز بھاگنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پروفیشنل اسٹینمک مالک ہونے کے باوجود ہانپ رہی تھی مگر اسے پتا تھا کہ اب چوکی زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید ایک دو منٹ کا فاصلہ تھا..... یہی وقت تھا جب اسے عقب سے ایک فائرسائیڈ دیا۔

☆☆☆

ذوالقرنین کا دل شام سے ہی کھڑا ہوا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ رات

گہری ہونے کے ساتھ ساتھ گرج چمک اور بارش کا سلسلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ذوالقرنین کو کسی کروٹ چھین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا، ابھی، اسی وقت۔ نور کی مسلسل سرد مہری نے ذوالقرنین کو جیسے اس کی اپنی نظروں سے ہی گرا دیا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ گرے پڑے لڑکوں کی طرح وہ کام کر رہا ہے جسے عرف عام میں ”بھونڈی“ کہا جاتا ہے۔ وہ اصلاح معاشرہ کا ٹھیکیدار بننا تھا اور اپنے دل کے ہاتھوں اتنا مجبور تھا کہ کسی موہوم امید کے سہارے نور کے پیچھے یہاں موراں والی تک چلا آیا تھا۔ بے شک میلا دیکھنے کی دعوت اسے پچھلے سال اشفاق مہرا صاحب نے بھی دی تھی اور یہ ایک معقول بہانہ تھا مگر جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ تو ذوالقرنین ابھی طرح جانتا تھا۔

اردو بازار کے تین اور دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ سب ایک مقامی کے گھر کرائے پر پھر رہے ہوئے تھے۔ میلے کے دنوں میں اپنے گھر کرائے پر دینے کا رواج موراں والی میں بھی پایا جاتا تھا۔ رات گیا رہ بارہ بجے تک ذوالقرنین کی طبیعت اتنی بیزار ہو گئی کہ اسے اپنا دم ٹھٹھا ہو محسوس ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی موراں والی سے نکل جائے گا..... (دوستوں کو بتائے بغیر) وہ لوگ علیحدہ گاڑی پر آئے تھے اور جب چاہے جا بھی سکتے تھے۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ خاموشی سے اٹھا۔ وضو کر کے نماز کا حاجت ادا کی۔ سفر کے نفل پڑھے۔ صرف ایک دوست رمیز کو اکٹھا یا جس سے وہ اپنی کیفیت شیئر کر سکتا تھا۔ اسے اپنی روانی کا بتا کر اور قائل کر کے وہ چپ چاپ اپنی قیام گاہ سے نکل آیا۔ بارش ہلکی ہو چکی تھی اور کسی وقت بند بھی ہو جاتی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی ادنیٰ کوہانی چادر اچھی طرح بالائی جسم پر لپیٹ لی۔ نیلی ایف ایکس گاڑی کھلے میں کھڑی تھی اور برف ہو رہی تھی۔ فوری طور پر تو گاڑی کا ہیڈ بھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور موراں والی سے اور موراں والی کے میلے سے نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں وہاں سے نکلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بار بار وہ منظر آ جاتا تھا جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ٹھیلے والے کے پاس کھڑی تھی اور پھر اسے دیکھ کر بالکل منہ پھیر کر کھڑی ہوئی تھی۔ تپتی بے اعتنائی، بیگانگی اور بیزاری جھلکتی تھی اس کے انداز سے۔

سے نکلے اور چوکی کا بیرونی دروازہ ہیٹھا شروع کر دیا۔ بیرونی دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی۔
”دروازہ کھولیں، جلدی کریں۔“ نور چلانے والے انداز میں بولی۔

اس سے ملتا جلتا فقرہ ذوالقرنین نے بھی دہرایا۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں دروازہ بھی پیٹ رہے تھے۔ پھر ذوالقرنین کے ذہن میں آیا اور اس نے گاڑی کی کھلی کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ گزار کر باران پر رکھ دیا۔

اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ”ہتا نہیں بھنگ پتی کر سو گئے ہیں سارے۔“ ذوالقرنین جھلا کر بولا۔
نور سخت پریشانی میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور سینے کا زبردست دھماکا تھا۔

اچانک ذوالقرنین کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ وہ اسے جلا کر دیوار کے بالکل قریب لے آیا۔ پھر اس کی چھت پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس نے بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیا۔ نور اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ ”کنڈی چڑھا دیں۔“ ذوالقرنین نے کہا اور صحن پارکر کے اندر دوئی کروں کی طرف لپکا۔

اس نے ایک کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ دیا۔ اس مرتبہ یہ کوشش رانگاں نہیں گئی۔ دروازہ کھلا اور سادہ کپڑوں میں ایک بھاری بھر کم شخص نظر آیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ چوکی انچارج سب انسپکٹر جان محمد تھا اور خاصا دنگ شخص تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالقرنین نے جھلا کر کہا۔ ”آپ لوگ کس طرح کی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ باہر غدر مچا ہوا ہے اور آپ نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔“

سب انسپکٹر نے اپنی سرخ آنکھوں سے ذوالقرنین کو گھورا، ہوسکتا تھا کہ وہ جواب میں کوئی سخت بات کہتا لیکن اس کی نگاہ خستہ حال نور پر پڑ گئی۔ ”کیا ہوا ہے؟“ اس نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

نور اپنا سر ڈھا پیتی ہوئی آگے آئی اور بولی۔ ”آپ یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا۔ کھاپریوں نے ہمارے گھر کو گھیر لیا ہے۔ ایک بندے کو سخت زخمی اور دوسرے کو قتل کر دیا ہے۔ وہ..... میرے پیچھے..... بھی لگے ہوئے ہیں۔“ اس کا گلہ بندھ گیا۔

دو تین اور کمروں کے دروازے اب کھل گئے تھے۔ کچھ باردوری اور کچھ سادہ لباس والے اہلکار باہر نکل آئے

اس نے گاڑی کو دوسرے گیزر میں ڈالا اور کچے کچے راستے پر بجنگو لے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پختہ سڑک تک پہنچنے کے لیے اسے قریباً دو کلومیٹر تک اسی نیم پختہ راستے پر جانا تھا اور پھر برساتی نالے کا تنگ پل بھی پار کرنا تھا۔

اس کے دائیں بائیں جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔ چاند نے تھوڑی دیر کے لیے گہرے بادلوں کی اوٹ سے جھلک دکھائی تھی اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ اچانک ذوالقرنین بری طرح ٹھنک گیا۔ اسے بائیں جانب سے کچھ فاصلے پر فائر کی آواز سنائی دی..... ابھی وہ اسی پر غور کر رہا تھا کہ بائیں جانب کے سرکنڈوں میں عجیب سی حرکت ہوئی اور کوئی تیزی سے بھاگ کر سامنے سے گزرا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ایف ایس کی ہیڈ لائٹس کے سامنے آیا تھا۔ ذوالقرنین کتے میں رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ بھیکے لباس اور بھیکے بالوں والی وہ دروازہ لڑکی جولو کھڑائی ہوئی سی بھاگ رہی تھی..... نور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی.....

حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے گاڑی کے بریک و بانے اور کھڑکی کھول کر اپنے پیچھے پھڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ”نور..... نور۔“
وہ رک گئی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ”یہ میں ہوں نور۔“ وہ پھر چلا یا۔

تب تک شاید وہ بھی ذوالقرنین کی نیلی ایف ایس پہچان چکی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت رہنے کے بعد گاڑی کی طرف جھپٹی اور دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ ”جلدی کرو..... پولیس چوکی چلو۔ انہوں نے حویلی کو گھیر لیا ہے..... وہ..... میرے پیچھے بھی آ رہے ہیں۔“ اس کی آواز دہشت کے سبب ناقابل شناخت ہو رہی تھی۔

ذوالقرنین بھی حیرت اور سنسنی کے شدید گھیرے میں آ گیا لیکن کوئی سوال پوچھنے کے بجائے اس نے گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا کر مناسب سمجھا۔ گاڑی غیر ہموار راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی..... اور پھر اس نے ایک جگہ سے نالے کا پل پار کر لیا۔

”آپ زخمی تو نہیں ہیں؟“ ذوالقرنین نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور بیچانی لہجے میں پوچھا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ غصہ آواز میں بولی۔

ایک آدھ منٹ کے اندر ہی وہ پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ پولیس چوکی کے مختصر صحن میں تاریکی تھی۔ ایک دو کمروں کے روشن دانوں میں لائٹیں وغیرہ کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ نور اور ذوالقرنین ایک ساتھ گاڑی

یوں لگا کہ وہ مثال لینے سے انکار کر دے گی مگر پھر خاموش رہی۔ ”اس کو اچھی طرح لپیٹ لیں۔“ ذوالقرنین نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

کچے پکے راستے پر گاڑی اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پولیس موبائل کی عقبی سرخ بتیاں ذوالقرنین کی راہنمائی کر رہی تھیں۔ ان کے عقب میں خانہ بدوشوں کے ریزہ سے اور گدھار یڑھیاں تھیں۔ غالباً ان کے دو چار کتے بھی شور مچاتے ساتھ آ رہے تھے۔۔۔۔۔

تھوڑے دو طویل میدان میں پہنچتے ہی حویلی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید حویلی کے کسی کو نے میں آگ بھی سلگ رہی تھی۔ سب انسپٹر نے تنقیدی کا مظاہرہ کیا اور ایک جگہ گاڑی روک کر آٹو ٹینک رائلوں سے کئی برسٹ چلوائے۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی اور بولوائیوں کے لیے پیغام تھا کہ پولیس آگئی ہے، وہ نکر نہ لیں۔

..... کچھ دیر بعد جب وہ لوگ حویلی کے سامنے پہنچے تو گھبراؤ کرنے والے کھڑے ہوئے۔ ذوالقرنین اور نور نے کچھ ٹویلیوں کو دریا کی جانب بھاگتے دیکھا۔ کچھ مارچوں اور لالینوں کی دور دوری ہوئی روشنیاں سرکنڈوں کی جانب نظر آ رہی تھیں۔

نور نے دیکھا مشتعل کھاپڑیوں نے حویلی کے قدیم چونی دروازے کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش یقیناً نور کے فرار ہونے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ مگر کلونی اور لوہے سے تیار ہونے والے اس دروازے کا کچھ خاص نہیں بگڑ سکتا تھا۔ اب خانہ بدوش بھی پہنچ گئے تھے اور پولیس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ زبردست ہوائی فائرنگ اور پولیس گاڑی کا مسلسل ہونسن کر حویلی والوں کو یقین ہو گیا کہ پانسالٹ چکا ہے۔ حویلی کا جہازی ساز دروازہ کھول دیا گیا۔ نور کی نگاہ سب سے پہلے شرنبل، چچا احسان اور اپنے ابا جان پر پڑی وہ لپک کر ان کی طرف گئی۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر گر گئی۔ ٹھٹک گئی، جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر وہ ایسے ہی منتشر ہو گیا جیسا کہ تھی لیکن اس بار صورت حال مختلف رہی۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے عجب کیفیت میں اپنے دونوں بازو نور کے لیے کھول دیے۔ وہ لپک کر گئی اور ان کی انہوں میں سما گئی۔

”میری بھئی..... میری بین النور۔“ وہ پکارتے چلے گئے۔ ”آج تم نے وہ کیا جو کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ آج تم میرا بیٹا بنی ہو۔ آج تم نے ہم سب کو ایک بہت بڑی مصیبت اور

تھے۔ نور مسلسل بولتی چلی گئی اور ایک منٹ کے اندر اندر اس نے تقریباً ساری صورت حال پولیس والوں کے گوش گزار کر دی۔ یہ انکشاف ذوالقرنین کے لیے بھی تھمکے خیز تھا کہ حویلی کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہیں اور نور کی بہن، سمدہ کو ایک طرح سے اغوا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نالے کی طرف کوئی فائر کیا گیا ہے بلکہ شاید یہ دو فائر تھے۔ فائر اور وہ بھی میلے کے دنوں میں۔ گڑبڑ تو ضرور ہو رہی ہے جی۔“

دو تین منٹ کے اندر اندر پولیس اہلکار چوکی سے باہر نکل آئے۔ ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ کچھ وردی میں اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ دو چار کچھوڑ کربس کے پاس اسلحہ موجود تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سب انسپٹر جان محمد خود بھی کھاپڑی برادری سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس نے فوراً بذریعہ فون قریبی قحانے تک بھی اطلاع پہنچا دی تھی۔ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے پار حویلی کی جانب روشنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کہیں تھوڑی بہت آگ بھی لگی ہوئی تھی۔

سب انسپٹر جان محمد اپنی نفری کے ساتھ پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ کچھ اہلکار موٹر سائیکلوں پر تھے، تین چار ذوالقرنین کی ایف ایکس میں لد گئے۔ تھوڑا آگے جا کر سب انسپٹر نے گاڑی رکوالی۔ یہاں بہت بڑی ایک جھونپڑا جستی تھی۔ بارش کی وجہ سے ان میں سے کئی لوگ جاگ رہے تھے۔ سب انسپٹر نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ پکی رکتوں والے پانچ چھ افراد لپک کر اس کی طرف آئے۔ اس نے ان سے کچھ کھسک پرسی۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اس جھونپڑا جستی میں پچھل نظر آئی اور درجنوں افراد کھڑکیوں اور لاشیوں سے مسلح ہو کر نکل آئے۔ ان میں سے کچھ تھوڑا ریزہ میوں پر اور کچھ گدھا گاڑیوں پر سوار ہو گئے۔ اس سارے قافلے نے ہل پار کیا اور تیزی سے وقوعہ کی طرف بڑھا۔

نور، ذوالقرنین کے ساتھ ایف ایکس میں اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس غم تھا اور اب وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ پولیس اہلکاروں کو حویلی کی تشویشناک صورت حال سے بھی آگاہ کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح بچ کر یہاں پہنچ پائی ہے۔

ذوالقرنین نے اسے کانپتے دیکھا تو اپنی گرم کوبانی شال اتار کر نور کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ پہلے تو جھنجھکی اور

ایک دم کبرہام ساج گیا تھا۔ کوئی جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ”ماردوں گا..... کاٹ ڈالوں گا..... ٹوٹے کر دوں گا۔“ نور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور ابا جان نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ نور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نارچوں کی روشنی تصادم والی جگہ پر پہنچی تو نور نے دیکھا کہ چوڑا چکلا ابدال کسی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جس سے لپٹا ہوا تھا، وہ ذوالقرنین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ابدال کے ہاتھ میں جھوٹے دستے والی چمک دار کلبھاری تھی اور اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے شعلے تھے۔ صاف طور پر پتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے..... اور کسی بھیڑیے سے بڑھ کر خون آشام ہو رہا ہے۔ اس کی کلبھاری پر ذوالقرنین نے بھی گرفت بنارہی تھی اور دونوں تقریباً ختم ختم گھما تھے۔ پھر وہ دونوں گر گئے لیکن ذوالقرنین نے کلبھاری کے دستے پر اپنی گرفت ختم نہیں ہونے دی۔ اس کی مزاحمت زبردست تھی۔

پھر پولیس والے اور دیگر افراد بھی ابدال پر چھینے اور اس خون آشام کو دبوچ لیا گیا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں دھاڑتا رہا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ بس ایک فقرہ ہی نور کی سمجھ میں آیا۔ ”اپنی دوہٹی لے کر جاؤں گا، چھوڑ دوں گا نہیں اسے.....“

نور یہ سوچ کر لرز گئی کہ یہی وہ شخص تھا کہ آج رات بسہ کو جس کے حوالے کیا جانا تھا۔ پولیس والوں نے وہیں گیٹ کے قریب اسے بے دریغ پٹا اور نیم بے ہوش کر ڈالا۔ لرزتی کانپتی نور کو اس کے ابا جان نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ نور نے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان جاک ہو گیا تھا۔ ہونٹوں سے خون رس رہا تھا لیکن ویسے وہ بالکل ٹھیک تھا۔

چوکیدار گل محمد کے چہرے پر کلبھاری کا سخت وار لگا تھا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور ایک طرف کا گال قریباً کان تک چکر کر رہ گیا تھا۔ ایک دوسری گاڑی میں اسے بھی فوراً اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

صورت حال سے صاف پتا چل رہا تھا کہ پولیس پارٹی کی آمد پر بات کی لوگ تو یہاں سے تیز تر ہو گئے تھے مگر یہ شرابی ابدال کہیں آس پاس چھپ گیا تھا اور کسی موقع کا منتظر تھا۔ گیٹ کھلنے کے بعد یہ موقع اسے نور پر حملے کی صورت میں ملا جو چوکیدار گل محمد اور ذوالقرنین نے ناکام بنا دیا۔

سب کے سامنے ہی بری طرح مدہوش ابدال کو اپنی جھٹکڑی لگا کر پولیس کی گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ وہ ہوبہو لہان

خواری سے بچا یا ہے.....“ انہوں نے اسے ہانہوں میں سمجھ لیا اور اس کا سر اور ماتھا چومتے چلے گئے۔

وہ سسک رہے تھے اور وہ بھی رورہی تھی۔ وہ جب روتی تھی تو بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلا کرتے تھے لیکن آج اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔

اس کے ابا جان اشک بار آواز میں بولے۔ ”میری بہادر بیٹی..... میری دلیر بیٹی..... شیر بیٹی.....“

سب انکسٹر جان محمد اور اس کے ماتحت تعجب سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ نور کے ابا جان نے خود کو نور سے علیحدہ کرتے ہوئے غریبہ لہجہ میں کہا۔ ”یہ میری بیٹی ہے..... یہ..... بہت بڑی رز رہے..... بڑے میڈل جیت چکی ہے۔ اسی نے آج ان بد بخت کھاپریوں کا گھیرا توڑا ہے اور آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ سوچنے نے اسے ہم سب کی جان آبرو کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔“

انہوں نے ایک بار پھر نور کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ نور بولی ”ماموں مراد کہاں ہیں۔ انہیں اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔“

”تمہارے تایا اور عثمان وغیرہ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو گاڑی آرہی ہے۔“ انہوں نے ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کیا۔ تاریکی کو چیرتی ہوئی ہیڈ لائٹس گیٹ تک آئیں۔

گاڑی قریب پہنچی تو تایا ابا نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر نور کی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف جھکا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اشک بار آنکھوں کے ساتھ لیے جانے والے اس بوسے میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ نور نے پچھلی نشست پر دراز ماموں مراد کو دیکھا۔ ان کے سر کی بینڈیج خون سے تر تھی۔ آنکھیں بند تھیں، عثمان نے کہا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں نور! ٹرکولائزر کے اثر میں ہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ یہی وقت تھا جب ایک چٹکھٹا سی نور کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ گیٹ کے بالکل پاس گل عباسی کے پودوں کے پیچھے سے ایک پرچھائیں سی چھپتی ہوئی نظر آئی۔ تاریکی میں نور کو بس یہی نظر آیا کہ حویلی کے چوکیدار گل محمد کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص پرچھائیں سے لپٹ گیا..... ورنہ یہی لگ رہا تھا کہ وہ پرچھائیں سیدھی نور کی طرف آئے گی۔

تھا اور ایک ٹوٹا ہوا چمکیلا ہار اب بھی اس کے گلے سے لٹک رہا تھا۔ سب انسپکٹر جان محمد کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے حویلی کے ارد گرد سرچ آپریشن شروع کر دیا کہ کوئی اور کھاپری بھی کہیں گمات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ حویلی کا گیٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

ماسوں اور چچا وغیرہ اب ذوالقرنین سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ پھر سب انسپکٹر جان محمد نے ماسوں اور چچا کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران میں نور نے دیکھا کہ ذوالقرنین آگے آیا۔ نور کے اباجی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”انکل! زنجیوں کو اس طرح اکیلے نہیں بھیجا جائیے، کوئی ساتھ ہو۔ یہ لوگ یہاں سے تو بھاگ گئے ہیں لیکن ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔“

ذوالقرنین کی بات کا وزن سب نے محسوس کیا۔ افراتفری میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ذوالقرنین نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے۔ تین مسلح پولیس اہلکار اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی زخمی چوکیدار والی گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گئی۔..... حویلی میں اب حالات مکمل کنٹرول میں تھے۔ معلوم ہوا کہ جب نور جہمت سے چھلانگ لگا کر بھاگ گیا اور کھاپریوں کی زد سے نکل کر سرکنڈوں میں اوجھل ہو گئی تو مایوس ہو کر اور جھنجھلا کر کھاپریوں نے حویلی کے گیٹ کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دیوار کے اوپر سے تختن میں کچھ بیٹرول بم بھی پھینکے۔ جواب میں ان پر جہمت سے سخت خشت باری کی گئی۔..... بیٹرول بموں سے دو تین افراد کو معمولی زخم آئے۔ کسی بڑے نقصان سے بچت ہوئی۔

..... خطرہ ٹل چکا تھا پھر بھی سب انسپکٹر جان محمد نے چند اہلکار گیٹ پر متعین کر دیے اور باتیوں کو ساتھ لے کر لاش کے معائنے کے لیے چلا گیا۔ نور کے ابا جان، چچا جان اور دیگر محرم بھی ساتھ گئے نور، چچو جاہرہ اور تانی راحت کے ساتھ خواتین والے حصے میں آ گئی۔ آبی بول، بمبہ، مہرین، سلیمہ سب اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی تک لرزاں تھیں۔ وہ ان سب جیسی تھی لیکن سب جیسی نہیں تھی۔ وہ مختلف تھی اور آج ایک بڑے واقعے نے یہ ثابت بھی کر دیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں سناٹش تھی اور محبت آ سیز نمی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں والی بمبہ نے اسے ایک بار پھر اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیا اور سسکتی گئی۔ جب وہ دونوں جدا ہوئیں تو سب ارد گرد بیٹھ گئیں اور نور پر سوالات

کی پوچھاڑ کر دی۔ حویلی سے باہر اب پولیس کی مزید گاڑیوں کے موٹر سائیکل دینے لگے تھے۔

☆☆☆

..... اور یہ منظر تھا لاہور میں مولوی اشفاق مہرا کی رہائش گاہ کا۔ نور اب اپنے گھر میں تھی۔ کچھ لمحے عجیب کا یا پلٹتے ہوئے ہیں۔ تشکیلیں آسان کر دیتے ہیں۔ بلند و بالا دیواریں جن کے گرنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، ریت بن کر مسمار ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب ابا جان نے اسے حویلی کے دروازے پر سینے سے لگایا تھا اور اس کا ماتھا چومنا اور اسے بہادر بنی کہہ کر اس کی پیٹھ تھپکی تھی۔..... انہی لمحوں میں..... ہاں، انہی لمحوں میں نور نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے ابا جان کو بھی کہیں گے وہ سر تسلیم خم کرے گی۔ اب وہ ساری زندگی ان کی کسی بات کو رد نہیں کرے گی۔ شاید اس کے ابا جان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی ایک تھپکی کی قیمت کتنی زیادہ ہے۔ وہ اس ایک تھپکی پر اپنی زندگی بٹا کر سکتی تھی۔

اپنے والد کی مرضی و منشا کے لیے جو یہ خداداد آوازیں اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، وہ اسے اب ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جلد از جلد اسے استعمال میں لے آنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے اٹھ کر وہ ایک دن تاپا ابا کے گھر میں جا رہی تھی۔ دل فکار اور پارہ پارہ۔ گھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جنوری کی شبنم رنگ شام لاہور کے آسمان کو چھو رہی تھی۔ رنگ برنگی پتلیں فرانسے بھرتی ہوئی فضا میں تیر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ٹھکانوں کی طرف سٹ رہی تھیں۔ ایسی مختصر اور سرد شاخیں اسے اکثر اداسی کر دیتی تھیں۔ اس نے براؤن رنگ کی وہ گرم کوہانی چادر دیر بھی جسے اس نے استری کر کے تہ کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ غدیجہ سے ملاقات ہو تو وہ اس کے بھائی کی چادر اسے واپس کر دے۔ اس نے بے خیالی میں چادر پر ہاتھ بھیرا۔ وہ منظر اس کی نگاہوں میں بھر گیا جب اس تہلکہ خیز رات میں حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھاما تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر کندھوں سے اتار کر نور کے شانوں پر پھیلا دی تھی۔ ان لمحوں میں وہی تڑپ، وہی لگن اور لازوال انتظار دکھائی دیتا تھا جس کا مشاہدہ اس نے ایک دوبار پہلے بھی کیا تھا اور جس نے اسے سرتاپا لرزادیا تھا۔ وہ شروع میں اسے بہت برا شخص سمجھتی تھی پھر وہ اسے صرف برا سمجھنے لگی لیکن اب وہ اس کے لیے ایک اچھا شخص بن چکا تھا۔ سچا، گھرا اور شاید انسانیت سے محبت کرنے والا بھی لیکن

نور، ابا جان کے سر کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ ان کے عقب میں تھی۔ اپنی بات کہنے کے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ ابا جان نور کو حویلی کے حالات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کے مطابق فدا حسین کے بیٹے رشید کے نکل کا مقدمہ چودھری طفل اور اس کے بڑے بیٹے ابدال کے خلاف ہی درج ہوا تھا۔ آٹھ دس اور افراد بھی نامزد تھے مگر بڑے مجرم یہی دونوں تھے۔

ابا جان نے کہا۔ ”یہ بھی پتا چلا ہے کہ پرسوں طفل کو پولیس اسٹیشن میں دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے جہلم کے اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ اس کی حالت ڈانواں ڈول ہے۔ دراصل سب انسپکٹر جان محمد نے دونوں باپ بیٹے پر بڑی ٹائٹ ایف آئی آر کاٹی ہے۔ دو تین اور کیس بھی کھل گئے ہیں ان کے خلاف۔ پھانسی سے بچ بھی گئے تو آٹھ دس سال تو باہر نہیں آئیں گے انشاء اللہ۔“

”ابو! اس فائر کی سمجھ نہیں آئی آجوتالے کے پار کیا گیا۔ پتا نہیں کہ مجھے نشانہ بنایا گیا تھا یا پھر وہ ہوائی فائر تھے؟“

”اس کا بھی پتا چل گیا ہے۔“ ابا جان نے اپنے ہاتھ میں موجود ٹھیکسی سی بیج کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے نکل جانے کے بعد یہ لوگ ناچ کر رہ گئے تھے۔ مایوسی میں ہی انہوں نے گیت پر پھول ڈال کر آگ لگانے کی کوشش کی اور اسی مایوسی اور بدحواسی میں ایک کھاپری نے یہ دو فائر بھی کیے۔ یہ فائر تالے کے پار کے ایک ڈیرے سے کیے گئے۔ وہاں ایک چری فیکٹری ڈرائیور نے بھوسے کے ڈھیر میں ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہوا میں دو گولیاں چلائیں اور سمجھا کہ شاید تم اس طرح ڈر جاؤ گی مگر تب تک تم چوکی کے سامنے پہنچ چکی تھیں۔“

تھوڑی دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ہولے سے بولی۔ ”ابو! ایک بات کہوں؟“

”ہاں ہاں، بولو میں انور۔“

”میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ آپ مجھے ذلی کی گہرائی سے معاف کر دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں، ابھی آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گی۔ آئندہ زندگی کے بارے میں آپ میرے متعلق جو فیصلہ بھی کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔“

انہوں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے تھے۔ اسے بازو سے پکڑ کر انہوں نے اپنے سامنے کرسی پر بٹھالیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ

وہ کیا کرتی؟ وہ اچھا ہونے کے باوجود بلکہ بہت اچھا ہونے کے باوجود اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ مجبوری ہو جاتی تھی۔ کیوں مجبور ہو جاتی تھی؟ شاید..... کوئی آئیڈیل اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ ملین شیڈو، ماڈرن لباس، جلیبلا۔ یا پھر کوئی انجانا خوف تھا جو اس کا راستہ روکتا تھا۔ یہ کیا کیفیت تھی؟ وہ خود بھی سمجھ نہ پاتی تھی۔

مہرین بھی کبھی زیادہ بے تکلف ہو جاتی تھی۔ اس نے ایک دو بار اس تہلکہ خیز رات کے حوالے سے اسے چھیڑا بھی تھا۔

ایک دن کہنے لگی تھی۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم چوکی کی طرف جا رہی تھیں، خدیجہ کا بھائی اتفاقاً ہی تمہیں آ ملا تھا؟“

”کیا مطلب؟“

”کہیں کوئی رابطہ وغیرہ تو نہیں ہوا تھا پہلے؟“

”تمہاری عقل کھاس چر نہ کی ہوئی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ گلاس مار کر تمہارا سر توڑ دوں۔“

”مگر اس سے مجھے جواب تو نہیں مل جائے گا۔ اچھا چلو چھوڑو اس بات کو..... جب تم دونوں اکٹھے گاڑی میں حویلی جا رہے تھے کیا محسوس ہوا تمہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی بات تو کی ہوگی اس نے یا نیلی کے لیے تمہارا ہاتھ شاتھ تھا یا ہوگا.....“

”اس وقت تین پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے گاڑی میں..... اور یکجہانہ کو آ رہا تھا۔“ نور نے بیزار لہجے میں کہا تھا اور اٹھ کر پکن کی طرف چلی گئی تھی۔

حویلی والے واقعات کو اب قریباً دس روز ہو چکے تھے۔ دو تین اخبارات میں حویلی والے واقعے کی تفصیلی خبر بھی چھپ چکی تھی..... اس میں جانی پہچانی ایتھلیٹ نور کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا اور بتایا گیا کہ اس نے کس طرح ایک نہایت سنگین صورت حال میں اپنی فیملی کی مدد کی اور بھاگ کر ایک قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچی۔ جو بھی نور سے ملتا تھا، پہلے اس حیرت انگیز واقعے کے بارے میں ہی پوچھتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا جان گھر میں ہی تھے۔ آپی بتول، آپی کے شوہر غیاث اور بسہ ماموں مراد کی خبر گیری کے لیے اسپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے سر کا باقاعدہ آپریشن ہوا تھا اور اب وہ رو بہ صحت تھے۔ چونکہ ارملی محمد کے چار وائٹ ٹوٹ گئے تھے اور جڑے کی ہڈی بھی فریکچر ہوئی تھی۔ وہ زیر علاج تھا۔ مہرا فیملی اس کی پوری نگہداشت

رہی تھی وہ اس کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔
 ”میری بچی! انہوں نے بڑے جذبے سے کہا اور اسے بھیج کر
 اپنے ساتھ لگایا۔“ تم..... بھی مجھے معاف کرو۔ میں نے بھی
 تمہیں ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔ تمہیں دکھ دیا ہے۔“

نور کا سر ان کے سینے پر تھا۔ وہ اپنے سر کو نفی میں
 ہلانے لگی۔ آنکھوں کے کنارے جل ہی نہیں رہے تھے،
 بھیگ بھی رہے تھے۔

وہ مگلوگیر لہجہ میں بولے۔ ”دیکھو، قدرت بھی کیا کیا
 منظر دکھاتی ہے۔ میں نے تمہارے شوق کو ہمیشہ بُرا کہا.....
 اس وجہ سے ہمیشہ تم سے خفا رہا مگر..... تمہارے اسی شوق کی
 وجہ سے اس رات ہم سب نے نئی زندگی پائی۔ جو کام کوئی
 اور نہ کر سکا، وہ تم نے کیا۔ میں ان لمحوں کو بھی بھول نہیں سکتا
 نور۔ اگر تم ان کے ہاتھ آ جاتیں تو..... تو.....“ وہ اس سے
 آگے کچھ بول نہ سکے اور چند لمحوں کے لیے رقت آمیز کیفیت
 میں رہے۔

تب سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔
 ”انسان خود کو عقل کل سمجھتا ہے اور قدرت اسے بتاتی ہے کہ
 اس کی نہم و دانش کی کیا حقیقت ہے..... پتا نہیں کیوں آج
 مجھے لگتا ہے کہ تم اس رویے کی حقدار نہیں تھیں جو میں نے
 اب تک تم سے اپنائے رکھا.....“

”ابو جی! اب چھوڑ دے ان باتوں کو۔ یہ سب ماضی کا
 حصہ ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بس آپ کی بیٹی
 ہوں۔“ اس نے اپنے گرم آنسو اپنے ابو کے سینے کو سونپ
 دیے۔ وہ حیران تھی کہ یہ آنسو کئی برسوں تک کیوں اس کی
 آنکھوں میں آزاں نہ رہا تھا۔ کیا پہلے..... کیا پہلے..... وہ اپنی
 شناخت چاہتی تھی، اپنی ذات کو منوانا چاہتی تھی، اس کے بعد
 ان آنسوؤں کو راستہ ملتا تھا؟

☆☆☆

یہ دو ماہ بعد کی بات ہے۔ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہ بہار
 کے آغاز کی ایک سہانی رات تھی۔ سارے میں مینے اوز
 گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔
 پرسوں نور کی سگائی تھی۔ اباجان کی دیرینہ آرزو کے مطابق
 اس کی منگنی مولانا حبیب اللہ مرحوم کے فرزند ذوالقرنین سے
 ہی ہونے والی تھی۔ اپنے عزم کے مطابق اس نے اباجان اور
 تایاجان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ تائی راحت نے
 اپنے دلنشین انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”نور.....
 عورت کے لیے بہت بہتر ہوتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے
 جو اسے چاہتا ہے۔ نہ کہ اس سے جسے وہ چاہتی ہے۔“

سپینس ڈائجسٹ

اور وہ بھی جانتی تھی کہ ذوالقرنین دل کی گہرائیوں
 سے نور پر فدا ہے۔ اس کے کئی ثبوت تھے جن میں سے ایک
 یہ بھی تھا کہ وہ امتاں والے کے میلے میں بھی موجود تھا اور
 اس موقع پر بھی موجود تھا جب طوفانی شب میں نور اس
 ویران پولیس چوکی کے دروازے پر دھکیں دے رہی
 تھی..... اور اس وقت بھی جب چوکیدار گل محمد حملہ ورا بدال
 کو روکنے کی کوشش میں گر چکا تھا..... وہ خاموش محبت اپنے
 سینے میں لیے برسوں سے اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔

اور نور بھی یہی سوچ رہی تھی۔ انسان کو وہ سب کچھ تو
 نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے اور ایک دن شادی کہیں نہ
 کہیں تو کرنا ہی تھی..... تو پھر کیوں نا اس میں بڑوں کی
 خوشنودی شامل ہو جاتی۔

اگلے روز نور ایک اور امتحان سے دو چار ہو گئی۔ یہ بھی
 کڑا امتحان تھا۔ وہ تا یا زادہ مرین سے مل کر واپس اپنے گھر
 آئے تو ملازمہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ شاید
 آپ کا ہے چھوٹی بی بی۔“

نور نے لفافہ دیکھا اور اس کے پورے جسم میں سنسنی
 پھیل گئی۔ یہ جھلکی لے لیتا تھا۔ اسی مہرباں تا مہرباں ادارے کی
 طرف سے جس نے جاہ فراہم کی تھی اور جس کی نمائندگی وہ
 قومی کمپلیوں میں کر چکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ہونے والے
 ٹرانسز کی بنیاد پر نہ صرف اس کی ملازمت بحال کر دی گئی تھی
 بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ دو دوسری ایجنسیوں کے
 ساتھ نیشنل اسپورٹس میں ٹیم کی نمائندگی بھی کرے گی۔

یہ ایک بڑی خوشخبری تھی لیکن ایک ایسے موقع پر آئی
 تھی جب اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو
 زندگی کے ایک مشکل ترین دورا پر محسوس کیا۔ خط اس
 کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی
 اور اسپورٹس دونوں کام ایک ساتھ بھی نہیں چل سکتے۔ وہ
 اپنے ہونے والے سرکاریوں کے خیالات اچھی طرح جانتی
 تھی اور اپنے اباجان کے حراج کو بھی۔ وہ ان دونوں
 راستوں میں سے بس ایک ہی راستہ چن سکتی تھی۔ ایک جاں
 مسلسل کشش کے بعد اس نے وہی راستہ چنا جو اسے چنا
 چاہیے تھا۔ اس نے نہ صرف وہ خط پھاڑ دیا بلکہ گھر کے عینی
 گھرے میں پہنچی۔ یہاں وہ سارے ایوارڈز اور ٹرافیوں
 وغیرہ موجود تھے جو تا یا ابا کے گھر سے واپس اس کے گھر میں
 آئی تھیں۔ چھوٹی امی زلفت نے یہ ٹرافیوں اس کمرے میں
 سجادی تھیں۔ اس نے ان ساری ٹرافیوں اور ایوارڈز کو ایک
 ڈبل بیڈ شیٹ میں گھڑی کی طرح باندھا اور تہ خانے میں

ضرور ہے، کئی معاملوں میں دو ٹوک رائے رکھتا ہے لیکن یہ سختی دیکھی ہی ہے جیسے..... اخروٹ کی ہوتی ہے۔ اندر سے کتنا نرم اور مزیدار ہوتا ہے۔“

نور بولی۔ ”لیکن اخروٹ کی ”نری“ تک پہنچنے کے لیے کافی مشکل پیش آ یا کرتی ہے جناب..... کچھ کی ”نری“ تو اپنے سخت خول سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔“

”وہ ایسا نہیں ہے نور! تم بے فکر رہو۔ بس تھوڑا سا..... ٹائم دینا اسے۔“

اور یہ نور کی شادی کی رات تھی۔ اپریل کی درمیانی تاریخیں تھیں۔ بہار کا شباب تھا..... اور شباب پر بہار تھی۔ پوری راتوں کا چاند دک رہا تھا۔ بہار اور چاندنی کا ملاپ دلوں میں جادو چکا دیا کرتا ہے۔ وہ اپنے جملہ عرودی میں پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گاؤں کیسے سے ٹپک لگائے بیٹھی تھی۔ اسے میک اپ اور بھاری کپڑے وغیرہ بھی پسند نہیں رہے تھے مگر کچھ معاملات وقت کی مجبوری ہوتے ہیں۔ اسے اپنا یہ روپ بالکل بھلا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اسے دل و جان سے نبھانا چاہتی تھی اور پھر وہ گھڑیاں آئیں جب اس کا شریک حیات، اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ نور کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ سانسوں کی آمدورفت تیز ہو گئی۔ گلاب، گیندے اور زگس کے پھولوں کی مہک اس کے حواس کو ڈھانپ رہی تھی۔ سرخ جوڑے کے اندر اس کا سیمیں بدن تھا اور اس بدن کے اندر اس کا دل تھا اور اس دل میں امید کی کرنیں روشن تھیں۔ کچھ خوشگوار سی دھڑکنیں ان نیلی سفید کونوں کو دھڑکانے لگی تھیں۔ کرنیں تحریر تھیں اور جھلملہا رہی تھیں۔

اس نے کھونٹ اٹھایا۔ چند زخمی فقرے ادا کیے اور پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پاؤں پر مہندی تھی اور نقرتی بازوؤں کی جھلملہاٹ تھی۔ اس نے نور سے تمام تر توجہ ہٹا کر اس کے پاؤں پر نگاہ جمالی، پھر عجیب انداز سے ان پر ہاتھ پھیرا۔

ایک نور کے ذہن میں ایک سیاہ جھکڑ چلا اور اس کے پورے بدن میں پھیل گیا۔

اسے لگا..... اسے لگا اس کے ہر سام سے پھینا بہہ نکلا ہے۔ وہی مناظر اس کے ذہن پر جھپٹے جو ایک مرتبہ غنودگی کے عالم میں اس کے پردہ تصور پر ابھرے تھے۔ اس نے کہا تھا، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی کہ تمہیں پانے کے بعد کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہذا مجھے ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ تمہاری جہانگیری کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں..... اور پھر.....

جا کر اس پرانی جستی پٹی میں پھینک دیا جو شاید اسی کام کے لیے خالی پڑی تھی۔ اس پر عجیب کی کیفیت طاری تھی، سینے میں جیسے دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوق سے یوں بھڑھڑا رہی تھی جیسے کوئی دیرینہ محبوب ساتھی سے بھڑھڑاتا ہے۔ ملازمہ سودا سلف لینے قریبی مارکیٹ جا چکی تھی۔ اس وقت نور گھر میں اکیلی تھی۔ وہ ایک الماری تک پہنچی۔ وہاں وہ اپورنڈ اسٹیلٹکس خوزر رکھے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تیار ابا نے اسے یو ایس اے سے منگوا کر دیے تھے۔ یہ اس کے سب سے محبوب شوز تھے۔ وہ انہیں لے کر چھت پر چلی گئی۔ ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ دکھادی۔ وہ جل گئے تو ان کی راکھ ایک شاپر میں ڈال کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ اس کے بعد کمرے میں بند ہو کر اس نے دیر تک آنسو بہائے اور ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اسے نیند آ گئی۔ وہ تب جاگی جب شام گہری ہو گئی اور ڈرائنگ روم میں پھر سے ڈھونڈ بچنا شروع ہو گئی..... اس کی معننی میں اب بس چوبیس گھنٹے باقی رہ گئے تھے اور شادی میں بھی زیادہ دن نہیں تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی وقت پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ شاید ان دنوں بھی ایسا ہی تھا۔ دن بھر تھے اور شادی کی تیاری میں صبح سے شام اور پھر رات ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ شاپنگ ہو رہی تھی۔ دو تین بار خدیجہ بھی نور کے ساتھ گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بھائی کی ولی مراد پوری ہو رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ جیسے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ایک دن وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”شادی سے پہلے اپنے ہونے والے میاں سے نہیں ملو گی؟“

”وہ کیوں؟“

”بھئی، تمہاری ہچکچاہٹ اور خوف میں کمی واقع ہو جائے گی۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کے بھائی خوفناک ہیں؟“

”مگر خوفناک نہیں تو پھر تم نے سگائی کے بعد ایک بار بھی میل ملاقات کی خواہش کیوں ظاہر نہیں کی؟“

”اب ایک ہی بار مل لیں گے..... اور بھگت بھی لیں گے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”بہت برا لفظ استعمال کیا ہے تم نے..... بھگت لیں گے۔“ خدیجہ نے اس کے سر پر ہولے سے چت لگائی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”نور! تم سے کہا تھا کہ وہ سخت

...خون کی پچکاریاں اور نور کی اپنی ہی آہ و بکا اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں منحنے کے اوپر سے رکاوٹ ڈالے گئے تھے۔ نہ رہیں گئے پاؤں، نہ بھگے گی تو۔۔۔ نہ بھاگے گی تو۔

تو کیا آج وہی تصور حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا۔۔۔ یا اس تصور جیسا کوئی اور بے رحم منظر سامنے آنے والا تھا؟ پھولوں کی لڑیوں کے درمیان سے نور کو ذوالقرنین کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اس کی کریم کلر شیر دانی، اس کی ہموار ڈاڑھی کی ایک سائڈ اور اس کا ایک ہاتھ جس میں ایک چابی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ان کے تاثرات۔ اس نے چابی سے الماری کھولی اور اس میں سے کچھ نکال لیا۔ وہ دیکھ نہیں سکی۔ اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ بزدلی نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے کیا نکالا تھا؟ کیا ایک تیز دھار چا پر۔۔۔ یا اس جیسی کوئی اور چیز؟ نہیں، وہ چا پر نہیں تھا۔ وہ ایک ڈبا تھا جو خون میں لٹھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی گہرا سرخ خون جو اس کے عروسی لباس کا تھا۔۔۔ مگر نہیں، وہ سرخ خون نہیں تھا۔ وہ تو سرخ رنگ کا ڈبا تھا جس کے نیچے کی طرف سفید دھاریاں تھیں۔ وہ ڈبا لے کر اس کے قریب آیا۔ اسے کھولا۔۔۔ اس میں اتھلیک شوز تھے۔ اسپورٹس، سفید رنگ کے یو ایس اے کے بنے ہوئے، اسپر نئرز کے لیے مخصوص۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی، نہیں، یہ حقیقت تھی۔ ذوالقرنین نے شوز نکالے۔ عجیب نظروں سے نور کی طرف دیکھا۔ محبت سے مسکرایا اور بولا۔ ”پاؤں آگے کرو نور۔“ وہ ششدر تھی۔ کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی۔ کون کہتا ہے محبت لوگوں کو نہیں بدلتی؟

محبت لوگوں کو بدلتی ہے۔

ان کی سوچوں کو بدلتی ہے۔

ان کے خیالات کی سب سے گہری پرتوں میں بھی اتر جاتی ہے اور وہاں نئے معیار ایجاد کرتی ہے۔ یہی محبت کا معجزہ ہے۔

☆☆☆

شادی کے بعد چند روز کے اندر ہی وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب آ گئے تھے کہ نور سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ شریک حیات کے لیے جو ایک موہوم سا آئیڈیا تھا۔ دل و دماغ میں ابھرا کرتا تھا، نچانے پہاں کھو گیا تھا۔ اس آئیڈیل کی جگہ حقیقت نے لے لی تھی اور حقیقت خوبصورت تھی۔ اس شخص سے کہیں زیادہ

خوبصورت اور دلنواز تھی جو کبھی ایک میگزین کے اسپورٹس انچارج کے طور پر اس کے سامنے آیا تھا۔۔۔ اب وہ اس کا نام بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔

”ماشاء اللہ۔“ ذوالقرنین نے اس کے عقب میں آ کر کہا اور وہ اپنے خیالوں سے بری طرح چوک گئی۔ ڈریسنگ میز کے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کھانے کی ایک دعوت پر جا رہے تھے۔ نور نے ہمیشہ کی طرح بہت ہلکا میک اپ کیا تھا۔ چوڑیاں اور جھکے پہنا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ یہ بھی نہ پہنتی۔ اس معمولی تیاری کے ساتھ بھی وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ ذوالقرنین نے کندھوں سے تمام کر اسے اور اس کے سنگھار کو سونگھا پھر ایک فرحت بخش سانس لے کر بولا۔ ”اللہ آپ کو نظر بد سے بچائے۔ میں اپنی قسمت پر ناز کر سکتا ہوں۔“

”کیا اب مجھے شکر یہ ادا کرنا ہوگا؟“ وہ مسکرائی۔

”نہیں۔ صرف، میری شیر دانی کا اوپر والا مٹن بند کرنا ہوگا۔“ وہ بھی ہلکے ہلکے انداز میں بولا۔

نور نے اس کی خوبصورت تراش کی براؤن شیر دانی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ بچ رہا تھا۔ نور نے شیر دانی کا بالائی مٹن ذرا زور لگا کر بند کیا۔ کارٹھوڑا سا ٹائٹ تھا۔ وہ مصنوعی انداز میں کراہنے لگا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اتنے تنگ گلے والی شیر دانی میرے سر ایوں نے سازش کے تحت سلوا کی ہے۔۔۔ جب مجھ سے پیچھا چھڑانے کو دل چاہے گا، آپ مجھے یہ شیر دانی پہننے کے لیے دے دیں گی۔“

”آپ زیادہ ڈراما نہ کریں۔ ہاں، یہ ہے کہ دو ماہ پہلے کے حساب سے تھوڑا سادازن بڑھ گیا ہے آپ کا۔“

”آپ اتنا اچھا لگتی ہیں تو پھر یہی کچھ ہوگا۔“ اس نے اسے بانہوں میں لپیٹے ہوئے کہا۔

”چلیں، اب دیر ہو رہی ہے۔ خدیجہ اور خالہ نیچے انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ پیچھے بیٹھے ہوئے بولی اور آئینے کے سامنے دوبارہ لپ اسنگ درست کرنے لگی۔

وہ بولا۔ ”ارے ہاں یاد آیا۔ صبح آپ نے ایف اے ایس، بھی جانا ہے، کتنے بیچ اٹھنا ہوگا؟“

”چھ بیچے سے پہلے۔“ وہ مسکرائی۔ ”کل رنگ سیشن بھی ہوتا ہے۔“

”یا خدا۔۔۔ یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟“ ذوالقرنین نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ کتنا Cool لگ رہا تھا۔

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بار بار

آج وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم وکٹری اسٹینڈنگ کو تو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی ترنگ تھی اور اس ترنگ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پرانی حریف نیشنلٹی بھی پوری تیار کے ساتھ ایونٹ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کے بارے میں اٹوٹی اٹوٹی خبر یہ تھی کہ اس نے کسی فنس پر اہل کم کا شکار ہو کر اپنا فریام ایک چوتھائی سیکنڈ ہوا ہے۔

بظاہر سنجیدہ لیکن اندر سے متبسم ذوالقرنین حوصلہ افزا
انداز میں نور کے ارد گرد موجو د تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی نور
کے لیے بے جدا تھی۔ نور کی پر فارمیں اب تک بہت بہتر
تھی۔ اس نے جاں سکل کوشش کے ساتھ اپنی پرانی فارم
تقریباً تقریباً حاصل کر لی تھی۔ ابتدائی بیس میں ایک مرتبہ
اس کی ٹائمنگ 12.05 بھی رہی تھی۔

اسٹڈیم کھینچ بھرا ہوا تھا۔ کیمرے حرکت کر رہے تھے۔ اس کی محترم کو چڑنبیلہ وجدان اور میڈم فرحانہ بھی موجود تھیں۔ اپنے مختلف لباس اور اسکارف کی وجہ سے نور ہمیشہ علیحدہ سے نظر آتی تھی۔ کچھ لوگ اس حلے کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور کچھ ہونٹنگ بھی کرتے تھے۔ نوبلی اس کے پاس سے گزری اور حسب معمول ایک فقرہ اچھال گئی۔ ”سو نے پہرا کا ہے یا! ایک تو بینڈو، اور سے شادی شدہ۔“

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا نظریہ ہمیشہ سے یہی تھا کہ اصل جواب میدان میں ہوتا ہے۔

فائل ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اس کے پیارے تایا ابا اس کے پاس آئے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے اپنے ساتھ لگا یا اور بولے۔ ”بیٹا! ہرجیت ٹھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ کوئی ہارتا ہے تو ہی کوئی جیتتا ہے نا۔ اصل چیز جو مستقل مزاجی ہے اور اپنی خوشی سے جڑے رہتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ غیر متقبل مزاج فارغ سے ایک ایسا مارنے والا کہیں بہتر ہے جو مستقل مزاجی سے کوشش جاری رکھتا ہے اور نتیجہ کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے..... تم جیت سکتی ہو اور باہر بھیجی سکتی ہو۔ دونوں صورتوں میں تم ہماری جان ہو..... کیونکہ تم..... مورال والی میں وہ جیتا اپنے نام کر چکی ہو جو کسی مار میں نہیں بدل سکتی۔“

نور کو تویا ابا کا جملہ بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر ایک سایہ سا اس کے چہرے پر لہرایا۔ وہ بولی۔ ”ابا جان نہیں آئے نا؟“

”نہیں..... لیکن انہوں نے تمہاری کامیابی کی دعا کی ہے۔ ان کی ساری گنڈ و شتر تمہارے ساتھ ہیں۔“

تایا ابا کی بات یاد آتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا۔
”مصور تیں دھوکا دیتی ہیں نور۔ جب تک کسی بندے کے ساتھ
رہا نہ جائے اسے پرکھا نہ جائے، کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔“
بے شک وہ درست کہا کرتے تھے۔

”چھ بجے تو اندر میرا ہوتا ہے تو وجہ محترمہ۔“ وہ بولا۔
 ”امید ہے کہ جلد ہی آپ کی شکایات دور ہو جائیں گی۔ جب میں ٹیم چھوڑ دوں گی، پھر ٹائٹنگ کی یہ سختیاں نہیں رہیں گی۔“

”لیکن یکم سے آپ نے مکمل نانا تو نہیں توڑنا۔ جب آپ کو جنگ وغیرہ کی طرف آئیں گی تب بھی وقت تو دینا ہی پڑے گا۔ صبح چھ بجے نہ سکی، سات بجے سکی۔ سات بجے نہ سکی، آٹھ بجے سکی..... نو بجے سکی۔“

”نو بجے سے جناب کو کیا پریشانی ہوگی؟“ وہ بولی۔
 ”پریشانی تو مجھے دس اور گیارہ بجے سے بھی ہو سکتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ، آہستہ آہستہ کچھ کرم فرمادے۔ دل کی بے قرار یوں کو ذرا قرار آجائے۔“ وہ کسی چٹپٹ لڑکے کی طرح بولا۔

ذوالقرنین کے مزاج کا یہ رخ نور کے لیے بڑا دل آویز تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ ہمیشاں کتنی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اگر کچھ عرصہ پہلے بی بی اے کے پوچھ سے ذوالقرنین کو ایک سخت فون کرتے کرتے وہ رک نہ جاتی اور ارادہ بدل نہ دیتی تو تجب نے ان کے درمیان کتنی بڑی سلجج حاصل ہو جاتی۔ قدرت کے کام قدرت ہی جانتی ہے۔ نور اور ذوالقرنین کے درمیان اس کال والا معاملہ بھی صاف ہو چکا تھا۔ ایک دن رومانی موڈ میں ذوالقرنین نے اس سے پوچھا تھا کہ میبلے پر جانے سے پہلے ایک دن سہ پہر کو نور نے اسے کال کی تھی؟ نور بان گئی تھی مگر یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ کال اس نے اچھے نہیں برے موڈ میں کی تھی۔ بس اتنا کہا کہ آپ کو سمجھانا بھانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد ذوالقرنین نے بھی سے بتا دیا تھا کہ میبلے کے دوران میں اس کے سر پر پٹی کیوں نظر آئی تھی۔ فون تیل سن کر سیزمیںوں سے اس کا ٹھک جانا ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ نور اور ذوالقرنین دونوں ہنسنے ہوئے سرخ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

..... اور پھر آخروہ دن آن پہنچا جس کا انتظار مدت سے تھا۔ آج نور ایک بار پھر میٹروڈ کے میدان میں تھی۔ یہ میگا یونٹ تھا۔ قومی کمپل تھے اور اس کے سامنے وہی ٹریک تھا جس پر وہ کئی بار ہاری تھی اور ایک بار بری طرح گری بھی تھی لیکن

تھا۔ جس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہی تھی۔ جس کو وہ بچہ بن کر دکھانا چاہتی تھی، جس کی نگاہوں میں وہ اپنی سائنس دیکھنے کے لیے ہمیشہ ترسی تھی۔ کبھی بچپن میں بے تکی شرارتیں کی تھیں، کبھی بندر کی طرح اچھلی کودی تھی۔ کبھی نیک پروین بن گئی تھی، کبھی جھگڑے کیے تھے اور بے ڈھنگے لباس پہنتے تھے، کبھی کوئی انوکھا ہنر سیکھنا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔ ابو! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، ابو میری طرف بھی دیکھیں۔۔۔۔۔۔ ابو! میں تیری ہوں لیکن آپ کی ہوں۔۔۔۔۔۔ نگاہوں میں آنے کے لیے ہی تو کیا تھا۔ اپنی اس کوشش میں ابو! نے اسے دوسرے دور ہونی چاہی تھی مگر پھر بیٹے والا واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی برسوں پرانی آرزو میں پوری کر دی اور وہ بھی۔۔۔۔۔۔ نہ صرف وہ دعاؤں سے محروم تھی بلکہ بقول مجھ جارجہ ایک بد دعا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج صورت حال بالکل مختلف تھی۔

اسپرنٹرز ٹریک پر پہنچ چکی تھیں۔ اب کسی بھی وقت پوزیشن ہونے کا اعلان ہو سکتا تھا۔ اچانک نور نے دیکھا کہ اس کے تایا انتظامیہ کے ایک شخص سے آبرو گنت کر رہے ہیں۔ وہ شاید نور سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اپنی پٹی کیپ درست کرتے ہوئے سیدھا نور کی طرف آئے۔

”کیا ہوا تایا ابا؟“ وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی سے تمنا شاہیوں کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آئی ٹی کی تیسری یا چوتھی رومیں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کے ابا جان کا چہرہ تھا۔ وہ آگئے تھے۔۔۔۔۔۔ وہ پہنچ گئے تھے، وہ مسکرا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ نور کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی۔ یہ ترنگ توانائی کی ایک شعاع بن کر اس کے پاؤں کے

یہ وہی ساعتیں تھیں جن میں صد بولر پرانے سنے پورے ہوتے ہیں، پردہ ہٹا دیا جاتا ہے جن میں شستوں کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور فتح مسلسل مزاجوں کے قدم چومنے سے اور یہ وہی وقت تھا جب سرے سے سادہ سجدہ منکر کے لیے جھک جاتے ہیں۔

نور نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ جیت چکی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے سپورٹرز کے وہ پُر جوش نعرے گونج رہے تھے جن کے لیے آج تک اس کی سماعت ترسی تھی۔ سفید بادلوں کے پیچھے سے بہار کا مہربان سورج نکلا اور لاہور کے آسمان پر مسکرانے لگا۔

ختم شد

”پرائیویٹوں نے وعدہ کیا تھا۔“

”اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ مگر نور! وہ تم سے خوش ہے۔ تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔“

اناؤنٹمنٹ ہوئی کہ فاضل رئیس میں کھد لپنے والی اسپرنٹرز ٹریک پر آجائیں۔

دیکھو نور کیوں اس طرح بھی پہنچ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ابو جان یہاں آئیں۔ انہوں نے اسے نیک دعاؤں سے رخصت کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے جلدی واپس آگئے تو اسٹینڈیم پہنچیں گے۔

نور نے ان کی دلی ہوئی دعاؤں کو یاد کیا اور ان کی کدو کر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دعا اور بد دعا میں پہلے ابو جان کی دعا تھی اس کے ساتھ نہیں تھیں۔۔۔۔۔۔ نہ صرف وہ دعاؤں سے محروم تھی بلکہ بقول مجھ جارجہ ایک بد دعا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج صورت حال بالکل مختلف تھی۔

اسپرنٹرز ٹریک پر پہنچ چکی تھیں۔ اب کسی بھی وقت پوزیشن ہونے کا اعلان ہو سکتا تھا۔ اچانک نور نے دیکھا کہ اس کے تایا انتظامیہ کے ایک شخص سے آبرو گنت کر رہے ہیں۔ وہ شاید نور سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اپنی پٹی کیپ درست کرتے ہوئے سیدھا نور کی طرف آئے۔

”کیا ہوا تایا ابا؟“ وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی سے تمنا شاہیوں کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آئی ٹی کی تیسری یا چوتھی رومیں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کے ابا جان کا چہرہ تھا۔ وہ آگئے تھے۔۔۔۔۔۔ وہ پہنچ گئے تھے، وہ مسکرا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ نور کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی۔ یہ ترنگ توانائی کی ایک شعاع بن کر اس کے پاؤں کے

یہ وہی ساعتیں تھیں جن میں صد بولر پرانے سنے پورے ہوتے ہیں، پردہ ہٹا دیا جاتا ہے جن میں شستوں کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور فتح مسلسل مزاجوں کے قدم چومنے سے اور یہ وہی وقت تھا جب سرے سے سادہ سجدہ منکر کے لیے جھک جاتے ہیں۔

نور نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ جیت چکی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے سپورٹرز کے وہ پُر جوش نعرے گونج رہے تھے جن کے لیے آج تک اس کی سماعت ترسی تھی۔ سفید بادلوں کے پیچھے سے بہار کا مہربان سورج نکلا اور لاہور کے آسمان پر مسکرانے لگا۔